مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

و دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ تلمیذ علامہ کشمیری

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240)

جلد ۵-۶-۷

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

و دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

(تلمیذ علامہ کشمیری)

ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

☎061-540513-519240

نام کتاب..................انوار الباری ۵-۶-۷
جدید کمپیوٹر ایڈیشن
تاریخ اشاعت.................. ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ
ناشر...... اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
طباعت.................. سلامت اقبال پریس ملتان
مصححین: مولانا قاری محمد ابوبکر فاضل قاسم العلوم ملتان
مولانا مجیب الرحمٰن جامعہ خیر المدارس ملتان

ضروری وضاحت: ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کیلئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لئے پھر بھی کسی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گذارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

فہرست مضامین

فہرست مضامین جلد ۵

تقدمہ ۱۷
تشکر و امتنان ۱۸
محسنین و معاونین پاک و ہند و افریقہ ۱۸
حضرت اقدس مولانا محمد زکریا صاحب ۱۹
حضرت علامہ محدث مولانا مفتی سید محمد مہدی حسن صاحب ۱۹
حضرت علامہ محدث مولانا محمد بدر عالم صاحب مولف ۱۹
حضرت الشیخ علامہ مولانا محمد انوری صاحب لائل پوری ۲۰
حضرت علامہ محدث مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری مولف ۲۰
حضرت علامہ محدث مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی صاحب تعلیقات ''مسند حمیدی'' ۲۰
حضرت علامہ مولانا سید فخر الحسن صاحب ۲۰
حضرت علامہ محدث مولانا ابوالوفا صاحب افغانی ۲۱
حضرۃ مولانا ذاکر حسن صاحب پھلتی شیخ التفسیر بنگلور دامت برکاتہم ۲۱
عزیز عالی قدر مولانا محمد انظر شاہ صاحب ۲۱
بَابُ اَدَاءِ الْخُمُسِ مِنَ الْاِیْمَان ۲۲
حدیث الباب میں حج کا ذکر کیوں نہیں ۲۵
فوائد حدیثیہ ۲۶
خمس سدس وغیرہ ۲۶
حافظ و عینی کے ارشادات ۲۶
نواب صاحب کی عون الباری ۲۶
نیت وضو کا مسئلہ ۲۸
احکام سے کیا مراد ہے؟ ۲۸
شاکلہ کی تحقیق ۲۸
جہاد و نیت کی شرح ۲۸
نفقہ عیال کا ثواب ۲۹
امام بخاری کا مقصد ۳۳
حقیقت ایمان و اسلام حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی نظر میں ۳۴
ایمان کا محل ۳۴
ہر چیز کے تین وجود ہیں ۳۴
ایمان کا وجود عینی ۳۴
ایمان کا وجود ذہنی ۳۵
ایمان کا وجود لفظی ۳۵
ایمان کی اقسام ۳۵
اسلام کیا ہے؟ ۳۵
نور ایمان کا تعلق نور محمدی سے ۳۶

کِتَابُ الْعِلْمِ

علم کے لغوی معنی ۳۷
علم کی اصطلاحی تعریف ۳۷
علم کی حقیقت ۳۷
فلاسفہ کی غلطی ۳۷
علم و معلوم الگ ہیں ۳۸
علم کا حسن و قبح ۳۸
علم و عمل کا تعلق ۳۸
خفاء و صابئین ۳۸

حضرت آدمؑ کی فضیلت کا سبب ۳۸
استحقاق خلافت ۳۹
بحث فضیلت علم ۳۹
ائمہ اربعہ کی آراء ۳۹
علم پر ایمان کی سابقیت ۳۹
باب فضل العلم کا تکرار ۴۰
حافظ عینی پر بے محل نقد ۴۲
حضرت گنگوہیؒ کی توجیہ ۴۲
ترجمۃ الباب کے تحت حدیث نہ لانے کی بحث ۴۲
نااہل وکم علم لوگوں کی سیادت ۴۳
رفع علم کی صورت ۴۳
علمی انحطاط کے اسباب ۴۳
اہتمام کا مستقل عہدہ ۴۴
علمی ترقیات سے بے توجہی ۴۴
اساتذہ کا انتخاب ۴۴
اساتذہ کی اعلیٰ صلاحیتیں بروئے کار نہیں آتیں ۴۵
بَابُ مَنْ سُئِلَ عِلْمًا وَّ هُوَ مُشْتَغِلٌ فِيْ حَدِيْثِهٖ ۴۵
فَاَتَمَّ الْحَدِيْثَ ثُمَّ اَجَابَ السَّآئِلَ ۴۵
بَابُ مَنْ رَّفَعَ صَوْتَهٗ بِالْعِلْمِ ۴۷
مسح سے مراد غسل ہے ۴۸
ترجمہ سے حدیث الباب کا ربط ۵۰
بَابُ طَرْحِ الْاِمَامِ الْمَسْئَلَةَ عَلٰى اَصْحَابِهٖ
لِيَخْتَبِرَ مَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ ۵۰
وجہ شبہ کیا ہے؟ ۵۱
اختلاف مذاہب ۵۲
حدیث الباب میں حج کا ذکر کیوں نہیں؟ ۵۲
واقعہ ہلاکت وبربادی خاندان شاہی ایران ۵۲
ایضاح البخاری کی تحقیق پر نظر ۶۰
بَابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِيْ بِهِ الْمَجْلِسُ وَمَنْ رَاٰى ۶۲
فُرْجَةً فِي الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيْهَا ۶۵
ترجمۃ الباب وحدیث کی مطابقت: ۶۶
جزاء جنس عمل کی تحقیق ۶۶
تیسرا آدمی کون تھا؟: ۶۶
اعمال کی مختلف جہات ۶۷
صنعت مشاکلت ۶۷
ابوالعلاء کا واقعہ ۶۷
بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ رُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ ۶۸
ربانی کا مفہوم ۷۱
حکماء، فقہاء وعلماء کون ہیں؟ ۷۱
تحقیق ایضاح البخاری سے اختلاف ۷۲
علم بغیر عمل کے لئے کوئی فضیلت نہیں ہے ۷۳
دلائل عدم شرف علم بغیر عمل ۷۳
بے عمل علماء کیوں معتوب ہوئے ۷۴
حضرت تھانوی کا فیصلہ ۷۵
مستشرقین کا ذکر ۷۵
عوام کی بات یا خواص کی ۷۶
کون سی تحقیق نمایاں ہونی چاہیے ۷۸
تمثالی ابوت والی تحقیق کا ذکر ۷۸
ترجمۃ الباب سے آیات وآثار کی مطابقت ۷۹
آخری گذارش ۷۹
بَابُ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
يَتَخَوَّلُهُمْ بِالْمَوْعِظَةِ وَالْعِلْمِ كَيْ لَا يَنْفِرُوْا ۸۱
بَابُ مَنْ جَعَلَ لِاَهْلِ الْعِلْمِ اَيَّامًا مَّعْلُوْمَةً ۸۳
ردّ بدعت اور مولانا شہید ۸۳

عنوان	صفحہ
بَابُ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ	۸۴
جماعت حقہ کون سی ہے؟	۸۵
جماعت حقہ اور غلبہ دین	۸۵
انما انا قاسم حضورؐ کی خاص شان ہے اسکو بطور مونو گرام استعمال کرنا غیر موزوں ہے	۸۶
سوانح قاسمی کی غیر محتاط عبارات	۸۶
تاسیس دارالعلوم اور بانیان کا ذکر خیر	۸۷
حضرت نانوتوی اور دارالعلوم کا بیت المال	۸۷
اکابر سے انتساب	۸۸
دارالعلوم کا اہتمام	۸۸
جعلی وصیت نامہ	۸۹
بَابُ الْفَهْمِ فِي الْعِلْمِ	۹۰
بَابُ الْاِغْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ	۹۱
مقصد ترجمہ ومعانی حکمت	۹۲
تحصیل علم بعد سیادت	۹۲
بَابُ مَا ذُكِرَ فِي ذَهَابِ	۹۳
علم خدا غیر خدا کا فرق	۹۷
سبب نزاع	۹۷
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضرؑ کا علمی موازنہ	۹۷
حضرت موسیٰؑ سے مناقشہ لفظیہ	۹۸
نوعیت نزاع:	۹۸
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ونسب وغیرہ	۹۹
حضرت یوشعؑ کی بھوک کیسی تھی؟	۹۹
ہر نسیان منافی نبوت نہیں	۱۰۰
اس مچھلی کی نسل موجود ہے یا نہیں؟	۱۰۰
مجمع البحرین کہاں ہے؟	۱۰۰
حضرت شاہ صاحب کی رائے	۱۰۱
ترجمان القرآن کا ذکر	۱۰۱
شرف علم وجواز رکوب بحر	۱۰۲
حضرت موسیٰ علیہ السلام ملاقات سے قبل کہاں تھے؟	۱۰۲
حضرت خضرؑ نبی ہیں یا نہیں	۱۰۳
حضرت خضرؑ زندہ ہیں یا نہیں	۱۰۳
ان شاء اللہ کہنے کا طریقہ:	۱۰۵
بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم	۱۰۵
کتاب سے کیا مراد ہے؟	۱۰۶
بَابٌ مَتٰى يَصِحُّ سِمَاعُ الصَّغِيْرِ	۱۰۷
محترم حضرت شاہ صاحب کے ارشادات گرامی	۱۰۸
لو کان فیھما آلھۃ کا مقصد:	۱۰۹
امام بخاری وامام شافعی کا اختلاف	۱۰۹
سترہ اور مذاہب اربعہ	۱۱۰
ایک اہم تاریخی فائدہ:	۱۱۱
بَابُ الْخُرُوْجِ	۱۱۲
ایک حدیث کے لیے ایک ماہ کا سفر	۱۱۴
حضرت ابو ایوب کا طلب حدیث کے لیے سفر	۱۱۴
حضرت عبیداللہ بن عدی کا سفر عراق	۱۱۵
حضرت ابو العالیہ کا قول	۱۱۵
حضرت امام شعبی کا ارشاد	۱۱۵
حضرت سعید بن المسیب (تابعی) کا ارشاد	۱۱۵
حضرت عبداللہ بن مسعود کا ارشاد	۱۱۵
امام احمد کا ارشاد	۱۱۵
طلب علم کے لئے بحری سفر	۱۱۵
علمی ودینی اغراض کے لئے سفر	۱۱۶
ذکر سفر استنبول	۱۱۶
ترکی میں دینی انقلاب	۱۱۶

بَابُ فَضْلِ مَنْ عَلِمَ وَ عَلَّمَ	۱۱۷	زائد از ضرورت علم مراد لینا محل نظر ہے	۱۳۲
تبلیغی سفر اور موجودہ تبلیغی تحریک کے سلسلے میں چند گذارشات	۱۱۸	حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے	۱۳۲
علامہ ابن حجر کی رائے	۱۲۲	لڑکیوں کے لئے کالجوں کی تعلیم	۱۳۲
علامہ طیبی پر حافظ کا نقد	۱۲۲	عصری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم	۱۳۳
حضرت شاہ صاحب کے ارشادات	۱۲۲	ذکر حضرت لیث بن سعدؒ	۱۳۳
امام بخاری کی عادت	۱۲۲	قول علیہ السلام "لاری الرجٰ" کے معنی	۱۳۳
بَابُ رَفْعِ	۱۲۴	تذکرہ حضرت بقی بن مخلد	۱۳۳
قول ربیعہ کا مطلب	۱۲۵	تقلید وعمل بالحدیث	۱۳۴
تذکرہ ربیعہ رضی اللہ عنہ	۱۲۵	بَابُ الْفُتيَا	۱۳۵
امام محمد نے سب سے پہلے فقہ کو حدیث سے الگ کیا	۱۲۶	حضرت شاہ صاحب کی رائے	۱۳۶
اصول فقہ کے سب سے پہلے مدون امام ابو یوسف تھے	۱۲۶	دابہ کی تشریح	۱۳۶
اضاعت علم کے معنی	۱۲۶	عادات امام بخاری رحمہ اللہ	۱۳۶
قلت ورفع علم کا تضاد	۱۲۷	اذبح ولاحرج کا مطلب	۱۳۷
رفع علم کی کیا صورت ہوگی؟	۱۲۷	حضرت شاہ صاحب کی بلند پایا تحقیق	۱۳۷
شروح ابن ماجہ	۱۲۷	امام غزالی اور خبر واحد سے نسخ قاطع	۱۳۷
قلت وکثرت کی بحث	۱۲۸	بَابُ مَنْ اَجَابَ الْفُتيَا	۱۳۸
زنا کی کثرت	۱۲۸	حضرت شاہ صاحب کا ارشاد	۱۳۸
عورتوں کی کثرت	۱۲۸	تشریح۔فتنوں سے کیا مراد ہے	۱۳۹
قیم واحد کا مطلب	۱۲۹	ھرج کیا ہے؟	۱۴۰
شراب کی کثرت	۱۲۹	رؤیت جنت وجہنم اور حافظ عینیؒ کی تصریحات	۱۴۲
حافظ ابن حجر پر نقد	۱۳۰	حضرت شاہ صاحب کے ارشادات	۱۴۳
امور اربعہ کا مجموعہ علامت ساعت ہے	۱۳۰	اقسام وجود	۱۴۳
فائدہ جلیلہ	۱۳۰	عالم مثال کہاں ہے؟	۱۴۳
بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ	۱۳۱	شیخ اکبر کا قول	۱۴۳
عطاء روحانی ومادی کا فرق	۱۳۱	محدث ابن ابی جمرہ کے افادات	۱۴۴
علوم نبوت بہر صورت نافع ہیں	۱۳۱	حافظ عینی وامام الحرمین وابوبکر بن العربی کے ارشادات	۱۴۴
علم ایک نور ہے	۱۳۱	جنت ونار موجود ومخلوق ہیں	۱۴۴

بعد و کثافت رؤیت سے مانع نہیں	۱۴۵	دیانت وقضا کا فرق	۱۵۷
مسئلہ علم غیب محدث ابن ابی جمرہ کی نظر میں	۱۴۵	دیانت وقضا کے احکام متناقض ہوں تو کیا کیا جائے؟	۱۵۸
ماعلمک بھذاالرجل ؟ کی بحث:	۱۴۵	دیانت وقضا کا فرق	۱۵۸
اشارہ کس طرف ہے؟	۱۴۶	دیانت وقضاء کا فرق سب مذاہب میں ہے	۱۵۸
صاحب مرعاۃ کا ریمارک	۱۴۶	حاصل مسئلہ	۱۵۹
صاحب تحفۃ الاحوذی کی نقل	۱۴۷	فارقہا کا مطلب	۱۵۹
حضرت شیخ الحدیث کی نقل	۱۴۷	مقصد امام بخاری	۱۵۹
علامہ ابن ابی جمرہ کے ارشادات	۱۴۸	بَابُ التَّنَاوُبِ فِی الْعِلْمِ	۱۵۹
کرامات اولیاء کرام	۱۴۸	مناسبت ابواب	۱۶۰
قبر مومن کے عجیب حالات	۱۴۹	عوالی مدینہ	۱۶۰
قبر میں سونے کا مطلب	۱۵۰	حادثہ عظیمہ	۱۶۰
حضرت شاہ صاحب کی تحقیق	۱۵۰	اللہ اکبر کہنے کی وجہ	۱۶۰
کافر سے قبر میں سوال ہوگا یا نہیں؟	۱۵۰	حدیث الباب کے احکام ثمانیہ	۱۶۰
کیا قبر کا سوال اسی امت کے ساتھ مخصوص ہے	۱۵۱	بَابُ الغَضَبِ	۱۶۱
قبر کا سوال اطفال سے؟	۱۵۱	سوال نصف علم ہے	۱۶۳
سوال روح سے ہوگا یا جسد مع الروح سے	۱۵۲	حضور علیہ السلام کا تعلیمی عتاب:	۱۶۳
جسم کو برزخ میں عذاب کس طرح ہوگا	۱۵۲	حضرت شاہ صاحب کا ارشاد	۱۶۳
سفر آخرت کا اجمالی حال	۱۵۲	ابن حذیفہ کے سوال و جواب وغیرہ کی تفصیل	۱۶۴
کافر مرد یا عورت، اور اسی طرح منافق و بدکار	۱۵۳	حضرت عمر کے ارشادات کا مطلب	۱۶۴
سورج و چاند کا گہن اور مقصد تخویف	۱۵۳	ایسا واقعہ بھی ضروری تھا	۱۶۴
حضرت شاہ صاحب کا ارشاد	۱۵۳	بَابُ مَنْ بَرَکَ رُکْبَتَیْهِ عِنْدَ الْاِمَامِ اَوِ الْمُحَدِّثِ	۱۶۵
بَابُ تَحْرِیْضِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ	۱۵۴	حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات	۱۶۵
بَابُ الرِّحْلَةِ	۱۵۶	بَابُ مَنْ اَعَادَ الْحَدِیْثَ	۱۶۶
نصاب شہادت رضاعت میں اختلاف	۱۵۶	تکرار بلاغت کا مقصد	۱۶۷
حدیث الباب دیانت پر محمول ہے	۱۵۶	تکرار اسلام کی نوعیت	۱۶۷
حدیث میں دیانت کے مسائل بکثرت ہیں	۱۵۷	تکرار مستحسن ہے یا نہیں	۱۶۸
تذکرہ محدث خیر الدین رملی	۱۵۷		

بَابُ تَعلِيمِ الرَّجلِ	۱۶۹
اشکال وجواب حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ	۱۶۹
افادات حافظ ابن حجر:	۱۷۱
افادات حافظ عینی	۱۷۲
دیگر افادات حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ	۱۷۳
تعلیم نسواں	۱۷۶
عورت کا مرتبہ اسلام میں	۱۷۷
بَابُ عِظَتِ الْاِمَامِ النِّسَاءَ وَ تَعْلِيمِهِنَّ	۱۷۸
بَابُ الْحِرْصِ عَلَى الْحَدِيْثِ	۱۷۹
شفاعت کی اقسام	۱۸۰
من اسعد الناس کا جواب	۱۸۰
بے عمل مومنوں کی صورت کفار جیسی	۱۸۱
علم غیب کلی کا دعویٰ	۱۸۱
محدث ابن ابی جمرہ کے افادات	۱۸۱
محبوب نام سے خطاب کرنا	۱۸۱
محبت رسول کامل اتباع میں ہے	۱۸۱
سوال کا ادب	۱۸۲
شفاعت سے زیادہ نفع کس کو ہوگا؟	۱۸۲
امور آخرت کا علم کیسے ہوتا ہے؟	۱۸۲
سائل کے اچھے وصف کا ذکر	۱۸۲
ظاہر حال سے استدلال	۱۸۲
مسرت پر مسرت کا اضافہ	۱۸۳
حدیث کی اصطلاح	۱۸۳
علم حدیث کی فضیلت	۱۸۳
حکم کیساتھ دلیل کا ذکر	۱۸۳
صحابہ میں حرص حدیث کا فرق	۱۸۳
عقیدہ توحید کا خلوص	۱۸۳

فہرست مضامین --- جلد ۶

ارباب علم سے درخواست	۱۸۵
علم کس طرح اٹھالیا جائے گا؟	۱۸۶
بَابٌ هَلْ يُجْعَلُ لِلنِّسَآءِ يَوْمٌ عَلٰى حِدَةٍ فِي الْعِلْمِ	۱۸۸
بَابُ مَنْ سَمِعَ شَيْئًا فَلَمْ يَفْهَمْهُ فَرَاجَعَهُ حَتّٰى يَعْرِفَهُ	۱۹۲
حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات گرامی	۱۹۳
علم غیب	۱۹۴
محدث ابن ابی جمرہ کے ارشادات	۱۹۴
امام اعظم محدث اعظم اور اعلم اہل زمانہ تھے	۱۹۵
بَابٌ لِيُبَلِّغِ الْعِلْمَ الشَّاهِدُ الْغَآئِبَ قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	۱۹۶
حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات	۱۹۷
قتال کی صورت میں بھی اختلاف ہے	۱۹۸
علامہ طبری کا قول	۱۹۸
ابن عربی اور علامہ ابن المنیر کے اقوال	۱۹۸
علامہ قرطبی کا قول	۱۹۸
حافظ ابن دقیق العید کا قول	۱۹۹
تذکرہ صاحب دراسات	۲۰۰
تحلیل مدینہ کا مسئلہ	۲۰۱
حافظ ابن حزم کی رائے	۲۰۱
تحفۃ الاحوذی کا ذکر	۲۰۲
حضرت عبداللہ بن زبیر سے قتال کے واقعات	۲۰۲
حضرت شاہ صاحب کا ارشاد	۲۰۵
حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے	۲۰۵
حضرت اقدس مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کا ارشاد	۲۰۵
بَابُ اِثْمِ مَنْ كَذَبَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	۲۰۶
حضرت سلمہ ابن الاکوع کے حالات	۲۰۸

عنوان	صفحہ
ثلاثیات بخاری	۲۰۸
جھوٹی حدیث بیان کرنے والے کا حکم	۲۰۸
امام نوویؒ کا فیصلہ	۲۰۹
حافظ عینی کا نقد	۲۰۹
حضرت شاہ صاحب کا ارشاد	۲۰۹
حافظ ابن حجر کا ارشاد	۲۰۹
کرامیہ کی گمراہی	۲۱۰
وعید کے مستحق کون ہیں؟	۲۱۰
مسانید امام اعظم	۲۱۱
دیدار نبوی کے بارے میں تشریحات	۲۱۲
قاضی ابوبکر بن الطیب کی رائے	۲۱۲
قاضی عیاض وابوبکر ابن عربی کی رائے	۲۱۲
دوسرے حضرات محققین کی رائے	۲۱۲
علامہ نوویؒ کا فیصلہ	۲۱۳
رؤیت کی بیداری کی بحث	۲۱۵
حضرت شیخ الہند کا ارشاد	۲۱۶
شاہ صاحب رحمہ اللہ کا فیصلہ	۲۱۷
حضرت شاہ صاحب کی آخری رائے	۲۱۷
رؤیت خیالیہ کی بحث	۲۱۸
خواب حجت شرعیہ نہیں ہے	۲۱۸
بَابُ کِتَابَةِ الْعِلْمِ	۲۱۸
عہد نبوی میں کتابت حدیث	۲۲۲
منع کتابت حدیث کے اسباب	۲۲۲
حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد	۲۲۲
تدوین وکتابت حدیث پر مکمل تبصرہ	۲۲۳
امام صاحب کثیر الحدیث تھے	۲۲۳
امام صاحب کی شرائط روایت	۲۲۳
امام صاحب کی اولیت تدوین حدیث وفقہ میں	۲۲۴
کتاب الآثار کے بعد موطا امام مالک	۲۲۵
علامہ شبلی اور سید صاحب کا مغالطہ	۲۲۵
کتابۃ العلم کا اولی واکمل مصداق	۲۲۵
علامہ کشمیری کی خصوصی منقبت	۲۲۵
لایقتل مسلم بکافر کی بحث	۲۲۶
حافظ عینیؒ نے حسب تفصیل مذکور اختلاف نقل کرکے لکھا	۲۲۶
جواب حافظ عینی رحمہ اللہ	۲۲۶
جواب امام طحاوی رحمہ اللہ	۲۲۷
جواب امام جصاص	۲۲۷
حضرت شاہ صاحب کا جواب	۲۲۷
حضرت شاہ صاحب کا دوسرا جواب	۲۲۸
توجیہ مذکورہ کی تائید حدیث ترمذی سے	۲۲۹
حافظ ابن حجر اور روایت واقدی سے استدلال	۲۲۹
حاصل کلام سابق	۲۲۹
دیت ذمی کے احکام	۲۳۰
امام ترمذی کا ریمارک	۲۳۰
فقہ حنفی کی نہایت اہم خصوصیت	۲۳۱
بے نظیر اصول مساوات	۲۳۱
فقہ اسلامی حنفی کی رو سے غیر مسلموں کیساتھ بے مثال رواداری	۲۳۱
موجودہ دور کی بہت سی جمہوری حکومتوں میں مسلمانوں کی زبوں حالی	۲۳۳
صحیفہ علیؓ میں کیا کیا تھا	۲۳۳
زکوٰۃ ابل میں امام بخاری کی موافقتِ حنفیہ	۲۳۴
الاوانہالم تحل لا حد قبلی ولا نحل لاحد بعدی	۲۳۵
ولا تلقط سا قطتها الاالمنشد	۲۳۵
قولہ علیہ السلام فمن قتل الخ:	۲۳۵

قولہ علیہ السلام امام ان یعقل و امان یقاد اھل القتیل ۲۳۵
حافظ ابن حجر کا تسامح ۲۳۶
امام طحاویؒ کے دو استدلال ۲۳۶
مہلب وغیرہ کا ارشاد ۲۳۷
تخریج ابن عباس ۲۳۷
تقلید ائمہ مجتہدین ۲۳۸
بَابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ ۲۳۸
بخاری میں ذکر کردہ پانچوں روایات کی تشریحات ۲۳۹
رب کاسیۃ کی پانچ شرحیں ۲۴۰
بحث ونظر ۲۴۰
حضرت شاہ صاحب کے ارشادات ۲۴۱
ہر شئی کے وجودات سبعہ ۲۴۱
حجرہ وبیت کا فرق ۲۴۱
انزال فتن سے کیا مراد ہے ۲۴۱
خزائن سے کیا مراد ہے ۲۴۱
حافظ عینی کے زمانہ میں زنان مصر کی حالت ۲۴۲
بہت بڑی اور قیمتی نصیحت ۲۴۲
حدیث الباب میں ازواج مطہرات کو خطاب خاص کیوں ہوا؟ ۲۴۲
رات کو نماز وذکر کے لئے بیدار کرنا ۲۴۲
عورتوں کا فتنہ ۲۴۲
عورتوں کے محاسن شارع علیہ السلام کی نظر میں ۲۴۳
عورتوں کو کن باتوں سے بچنا چاہیے ۲۴۴
سب سے بڑا فتنہ ۲۴۵
بَابُ السَّمَرِ بِالْعِلْمِ ۲۴۶
حضرت شاہ صاحب کی رائے ۲۴۷
سمر بالعلم کی اجازت اور اس کے وجوہ ۲۴۷
حضرت شاہ صاحب کی رائے ۲۴۸
لا یبقی الخ کی مراد ۲۴۸
حیات خضر علیہ السلام ۲۴۸
بابارتن کی صحابیت ۲۴۹
حافظ عینی کا ارشاد ۲۴۹
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور فرشتے ۲۴۹
جنوں کی طویل عمریں اور ان کی صحابیت ۲۴۹
حضرت ابن عباس کی شب گزاری کا مقصد ۲۵۰
قرضہ کی شکل ۲۵۰
ایک مد کا روپیہ دوسری مد میں صرف کرنا ۲۵۰
ترجمۃ الباب سے حدیث کی مناسبت ۲۵۰
حافظ ابن حجر کے اعتراضات ۲۵۱
حافظ عینی کے جوابات ۲۵۱
توجیہ حافظ پر حافظ عینی کا نقد ۲۵۱
بے محل طنز وتعلیل پر گرفت ۲۵۲
ایک لطیفہ اور تکمیل بحث ۲۵۲
علمی اشتغال نوافل سے افضل ہے ۲۵۲
بَابُ حِفْظِ الْعِلْمِ ۲۵۳
شبع بطن سے کیا مراد ہے؟ ۲۵۴
دو قسم کے علوم کیا تھے؟ ۲۵۵
فتنے عذاب استیصال کی جگہ ہیں ۲۵۵
قول صوفیہ اور حافظ عینی کی رائے ۲۵۶
علامہ قسطلانی کا انتقاد ۲۵۶
حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری رحمہ اللہ کا ارشاد ۲۵۶
حضرت گنگوہی کا ارشاد گرامی ۲۵۶
حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد گرامی ۲۵۷
ایک حدیثی اشکال وجواب ۲۵۷
حافظ ابن حجر کا جواب ۲۵۷

مضمون	صفحہ
حافظ کے جواب مذکور پر نقد	۲۵۷
حافظ عینی وحافظ ابن حجر کا موازنہ	۲۵۸
بَابُ الْاِنْصَاتِ لِلْعُلَمَآءِ	۲۵۸
روایت جریر کی بحث	۲۵۹
اکابر دیوبند اور حضرت شاہ صاحب	۲۶۰
بَابُ مَا يُسْتَحَبُّ لِلْعَالِمِ اِذَا سُئِلَ اَیُّ النَّاسِ اَعْلَمُ فَيَكِلُ الْعِلْمَ اِلَى اللهِ تَعَالٰى	۲۶۰
قولہ لیس موسیٰ بنی اسرائیل:	۲۶۳
کذب عدو اللہ کیوں کہا گیا؟	۲۶۳
فسئل ای الناس اعلم؟	۲۶۳
ابن بطال کی رائے	۲۶۳
علامہ مازری کی رائے	۲۶۴
حضرت شاہ صاحب کی رائے	۲۶۴
ابتلاء وآزمائش پر نزول رحمت وبرکت	۲۶۴
فعتب الله عز و جل عليه	۲۶۵
هو اعلم منك	۲۶۵
و كان لموسى و فتاه عجبا	۲۶۵
لقد لقينا من سفرنا هذا انصبا تشريح و تكوين کا توافق وتخالف	۲۶۵
اذا رجل مسجى بثوب	۲۶۶
فقال الخضر و انى بارضك السلام ؟!	۲۶۶
انت على علم الخ	۲۶۶
فجاء عصفور	۲۶۶
الم اقل لك	۲۶۶
نسیان کے مطالب ومعانی	۲۶۷
نسیان کی دوسری قسم	۲۶۸
حدیث الباب سے استنباط احکام	۲۶۹
حدیث الباب کے متعلق چند سوال وجواب	۲۷۰
حافظ ابن حجر پر تنقید	۲۷۰
بَابُ مَنْ سَاَلَ وَهُوَ قَائِمٌ عَالِمًا جَالِسًا	۲۷۱
کلمۃ اللہ سے کیا مراد ہے؟	۲۷۲
سلطان تیمور اور اسلامی جہاد	۲۷۳
صاحب بہجہ کے ارشادات	۲۷۴
بَابُ السُّؤَالِ وَالْفُتْيَا عِنْدَ رَمْيِ الْجِمَارِ	۲۷۴
ایک اعتراض اور حافظ کا جواب	۲۷۵
بَابُ قَوْلِ اللهِ تَعَالٰى وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا	۲۷۷
روح سے کیا مراد ہے؟	۲۷۸
روح جسم لطیف ہے؟	۲۷۸
روح ونفس ایک ہیں یا دو؟	۲۷۸
سوال کس روح سے تھا؟	۲۷۸
حافظ ابن قیم کی رائے پر حافظ ابن حجر کی تنقید	۲۷۸
علم الروح و علم الساعة حضور ﷺ کو حاصل تھا یا نہیں؟	۲۷۹
روح کے متعلق بحث نہ کی جائے؟	۲۷۹
عالم امر وعالم خلق	۲۷۹
روح کو فنا ہے یا نہیں؟	۲۷۹
روح کے حدوث وقدم کی بحث	۲۷۹
حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات	۲۸۰
عالم امر وعالم خلق کے بارے میں حضرت شاہ صاحب کا ارشاد	۲۸۰
حضرت علامہ عثمانی کی تفسیر	۲۸۱
حافظ ابن قیم کی کتاب الروح	۲۸۱
بَابُ مَنْ تَرَكَ بَعْضَ الْاِخْتِيَارِ مَخَافَةَ اَنْ يَّقْصُرَ فَهْمُ بَعْضِ النَّاسِ فَيَقَعُوْا فِىْ اَشَدَّ مِنْهُ	۲۸۱
بیت اللہ کی تعمیر اول حضرت آدم سے ہوئی	۲۸۲

عنوان	صفحہ
تعمیر اول میں فرشتے بھی شریک تھے	۲۸۲
بیت معمور کیا ہے	۲۸۲
دوسری تعمیر ابراہیمی	۲۸۲
تیسری تعمیر قریش	۲۸۲
چوتھی تعمیر حضرت ابن زبیر	۲۸۳
پانچویں تعمیر و ترمیم	۲۸۳
خلفاء عباسیہ اور بناء ابن زبیر	۲۸۳
حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد	۲۸۳
بَابُ مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ	۲۸۴
علم کے لئے اہل کون ہے؟	۲۸۵
حضرت سفیان ثوری کا ارشاد	۲۸۶
کلمہ طیبہ کی ذکری خصوصیت	۲۸۹
ایک اصول وقاعدہ کلیہ	۲۸۹
حضرت شاہ صاحب کی طرف سے دوسرا جواب	۲۸۹
اعمال صالحہ وکفارہ سیئات	۲۹۱
من لقی اللہ الخ کا مطلب	۲۹۱
آداب تلقین میت	۲۹۱
قولہ علیہ السلام ''اذا یتنکلوا'' کا مطلب	۲۹۲
حافظ ابن حجر کے افادات	۲۹۲
نقد پر نقد اور حافظ عینی علیہ السلام کے ارشادات	۲۹۳
قاضی عیاض کی رائے	۲۹۳
حافظ کا نقد اور عینی کا جواب	۲۹۳
حضرت شاہ صاحب کے ارشادات	۲۹۴
فضائل ومستحبات کی طرف سے لاپرواہی کیوں ہوتی ہے؟	۲۹۵
بَابُ الْحَیَاءِ فِی الْعِلْمِ	۲۹۶
(۱) حضرت زینب بنت ام سلمہ کے حالات	۲۹۷
(۲) حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا	۲۹۷
حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا	۲۹۸
استحیاء کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف	۲۹۹
حضرت شاہ صاحبؒ کے خصوصی افادات	۲۹۹
حیا اور تحصیل علم	۳۰۲
بَابُ مَنِ اسْتَحْیٰی فَاَمَرَ غَیْرَهٗ بِالسُّؤَالِ	۳۰۲
علامہ شوکانی اور ابن حزم کا اختلاف	۳۰۴
حافظ ابن حزم کا ذکر	۳۰۴
جمہور کا مسلک قوی ہے	۳۰۴
مقصد امام طحاوی	۳۰۴
حکم طہارت ونظافت	۳۰۵
قرآن مجید حدیث وفقہ کا باہمی تعلق	۳۰۵
بَابُ ذِکْرِ الْعِلْمِ وَالْفُتْیَا فِی الْمَسْجِدِ	۳۰۶
خوشبودار چیز میں، رنگا ہوا کپڑا احرام میں	۳۰۷
بَابُ مَنْ اَجَابَ السَّائِلَ بِاَکْثَرَ مِمَّا سَأَلَهٗ	۳۰۸
کتاب الوضوء	۳۰۹
وضوء علی الوضوء کا مسئلہ	۳۱۰
فاقد طہورین کا مسئلہ	۳۱۱
حضرت شاہ صاحب کا ارشاد	۳۱۱
وضوء میں پاؤں کا دھونا یا مسح	۳۱۱
رضی وابن ہشام کا اختلاف اور شاہ صاحب کا محاکمہ	۳۱۲
آیت فمن یملک کی تفسیر اور قادیانیوں کا رد	۳۱۲
مسح راس کی بحث	۳۱۴
مسح راس ایک بار ہے یا زیادہ	۳۱۴
خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی کا مسئلہ	۳۱۴
حنفیہ وشافعیہ کے نظریات میں فرق	۳۱۵
بَابٌ لَا یُقْبَلُ صَلٰوةٌ بِغَیْرِ طُهُوْرٍ	۳۱۶
بَابُ فَضْلِ الْوُضُوْءِ وَالْغُرُّ الْمُحَجَّلُوْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ	۳۱۷

احکام شرعیہ کی حکمتیں ۳۱۸
اطالہ غرہ کی صورتیں ۳۱۹
تحجیل کا ذکر حدیث میں ۳۱۹
بَابُ لَا یَتَوَضَّأُ مِنَ الشَّکِّ حَتّٰی یَسْتَیْقِنَ ۳۱۹
بَابُ التَّخْفِیْفِ فِی الْوُضُوْءِ ۳۲۰
حضرت شاہ صاحب کی تحقیق ۳۲۱
علامہ ابن حزم کا تفرد ۳۲۲
داؤدی کا اعتراض اور اس کا جواب ۳۲۲
بَابُ اِسْبَاغِ الْوُضُوْءِ ۳۲۳
جمع سفر یا جمع نسک ۳۲۴
حنفیہ کی دقت نظر ۳۲۴
دونوں نمازوں کے درمیان سنت و نفل نہیں ۳۲۵
حضرت گنگوہی کی رائے عالی ۳۲۵
بَابُ غَسْلِ ۳۲۶
بَابُ التَّسْمِیَةِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ وَ عِنْدَ الْوِقَاعِ ۳۲۷
نظر معنوی پر احکام شرعیہ کا ترتب نہیں ۳۲۹
ضرر رسانی کا مطلب ۳۲۹
ابتداء وضوء میں تسمیہ واجب ہے یا مستحب ۳۲۹
امام بخاری کا مقام رفیع ۳۳۰
امام بخاری و انکار قیاس ۳۳۰
وجوب و سنیت کے حدیثی دلائل پر نظر ۳۳۰
شیخ ابن ہمام کے تفردات ۳۳۱
بَابُ مَنْ یَّقُوْلُ عِنْدَ الْخَلَاءِ ۳۳۱
حافظ عینی کے ارشادات ۳۳۳
حضرت شاہ صاحب کے ارشادات ۳۳۳
بَابُ وَضْعِ الْمَاءِ عِنْدَ الْخَلَاءِ ۳۳۴
بَابُ لَا یُسْتَقْبَلُ الْقِبْلَةُ ۳۳۵
تفصیل مذاہب ۳۳۶
نقل و عقل کی روشنی میں کون سا مذہب قوی ہے؟ ۳۳۷
حضرت شاہ صاحب کے خاص افادات ۳۳۷
احادیث کا اختلاف و تنوع تفاوت مراتب احکام کا اشارہ ہے ۳۳۸
تخفیف کے بارے میں آراء ائمہ حنفیہ اور حضرت شاہ صاحب کا فیصلہ ۳۳۸
تفاوت مراتب احکام فقہاء حنفیہ کی نظروں میں ۳۳۹
عمل بالحدیث اور حضرت شاہ صاحب کا زریں ارشاد ۳۴۰
دور نبوت میں اور عہد صحابہ میں مراتب احکام کی بحث نہ تھی ۳۴۰
اجتہاد کی ضرورت ۳۴۱
استثناء بخاری ۳۴۱
محدث اسماعیلی کا جواب اور حافظ کی تائید ۳۴۱
محقق عینی کا اعتراض ۳۴۲
حضرت شاہ صاحب کا ارشاد ۳۴۲
دوسرا جواب اور حافظ عینی کا نقد ۳۴۲
تیسرا جواب اور حافظ عینی کا نقد ۳۴۳
چوتھا جواب اور محقق عینی کا نقد ۳۴۳
محقق عینی کا جواب ۳۴۳
اصل مسئلہ کے حدیثی دلائل ۳۴۳
حنفیہ کے جوابات ۳۴۳
حاصل جواب ۳۴۴
حضرت شاہ صاحب کی طرف سے خاص وجہ جواب ۳۴۴
حضرت شاہ صاحب کی تحقیق مذکور پر نظر ۳۴۵
بناء مذہب تشریع عام اور قانون کلی پر ہے ۳۴۶
حدیث جابر رضی اللہ عنہ کا دوسرا جواب ۳۴۷
افضلیت والا جواب اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق ۳۴۷
حضرت علیؓ کی فضیلت و خصوصیت ۳۴۸

مسئلہ طہارت وفضلات انبیاء علیہ السلام	۳۴۸	حضرت شاہ صاحب کا ارشاد	۳۶۴
بحث افضلیت حقیقت محمدیہ	۳۴۸	حجاب کی شدت کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اصرار	۳۶۴
حضرت اقدس مجدد صاحبؒ کے افادات	۳۴۹	عورتوں کے بارے میں غیرت وحمیت کا تقاضہ	۳۶۵
حضرت مجدد صاحب اور حضرت نانوتوی صاحب		حجاب کے تدریجی احکام	۳۶۵
کے ارشادات میں تطبیق	۳۵۰	اہم اشکال واعتراض	۳۶۵
حدیث عراک کی تحقیق	۳۵۰	حافظ ابن کثیر کا جواب	۳۶۶
حضرت شاہ صاحب کی دوسری رائے	۳۵۱	کرمانی وحافظ کا جواب	۳۶۶
حضرت شیخ الہند کی تحقیق	۳۵۱	حفظ عینی کا نقد اور جواب	۳۶۶
حافظ عینی کے ارشادات	۳۵۱	شیخ الاسلام کا جواب	۳۶۷
مسئلہ زیر بحث میں صاحب تحفۃ الاحوذی کا طرز تحقیق	۳۵۵	حضرت گنگوہی کا جواب	۳۶۷
سبب ممانعت کیا ہے؟	۳۵۵	حضرت شاہ صاحب کی رائے	۳۶۹
استقبال کس عضو کا معتبر ہے؟	۳۵۶	دوسرا اشکال	۳۶۹
جہت کا مسئلہ	۳۵۶	حافظ کا جواب	۳۶۹
حدیث حذیفہ اور اس کا حکم	۳۵۶	حضرت شاہ صاحب کا جواب	۳۶۹
تائیدات مذہب حنفی	۳۵۷	وجہ شہرت آیت حجاب	۳۶۹
روایات ائمہ واقوال مشائخ	۳۵۷	امہات المومنین کا حجاب شخصی	۳۶۹
ائمہ اربعہ کے عمل بالحدیث کے طریقے	۳۵۷	حافظ ابن حجر کا نقد	۳۷۰
بَابُ مَنْ تَبَرَّزَ عَلٰی الْبِنَتَیْنِ	۳۵۸	حجاب نسواں امت محمدیہ کا طرہ امتیاز ہے	۳۷۰
حافظ کی رائے	۳۵۸	حجاب شرعی کیا ہے!	۳۷۰
محقق عینی کی رائے	۳۵۹	حضرت عمر کی خداداد بصیرت	۳۷۱
بَابُ خُرُوْجِ النِّسَآءِ اِلَی الْبَرَازِ	۳۶۰	اصاغر کی نصیحت اکابر کو	۳۷۱
حضرت اقدس مولانا گنگوہی کا ارشاد	۳۶۰	حدیث الباب کے دوسرے فوائد	۳۷۱
آیات حجاب کا نسق وترتیب	۳۶۱	حضرات اکابر وفضلاء عصر کی رائے میں	۳۷۲
آیات سورۂ احزاب اور خطاب خاص وعام	۳۶۲		

جلد نمبر ۷ کی فہرست آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

انوار الباری ۵

اردو شرح

صحیح البخاری

تقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ وحدہٗ والسلام علی من لا نبی بعدہ اما بعد

''انوارالباری'' کی پانچویں قسط پیش ہے، جس میں کتاب الایمان ختم ہوکر کتاب العلم شروع ہوئی ہے جو اس جلد سے گزر کر چھٹی قسط تک پھیلی ہوئی ہے، امام بخاریؒ نے کتاب الایمان کے ابواب میں بہت توسع فرمایا تھا، اور ایمان سے تعلق رکھنے والے تمام ہی امور کو اپنے بے نظیر تبحر و وسعت علم کے تحت ایک سلک میں پرو دیا تھا، اور ان کے ایک خاص نقطہ نظر کو چھوڑ کر، جو زیر بحث آ چکا ہے، کتاب الایمان کی اس وسعت و ہمہ گیری کے علمی و عملی فوائد و منافع بہت ہی قابل قدر ہیں، اسی لئے ہم نے ان تمام احادیث پر پوری طرح شرح و بسط سے کلام کیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ناظرین نے بھی اس کا مطالعہ پوری اہمیت و قدر سے کیا، جس کے ثبوت میں ہمیں ان کے سینکڑوں خطوط ملے ہیں، اسی طرح امام عالی مقام نے کتاب العلم کو بھی اس کی شان رفیع کے مطابق وسعت دی ہے۔ اور علم نافع سے تعلق رکھنے والے تمام امور قرآن و حدیث کی روشنی میں یکجا کر دیئے ہیں۔ امید ہے کہ اس کے بھی عظیم المرتبت تراجم ابواب، آیات و احادیث، اقوال سلف، تشریحات محدثین اور ابحاث و انظار سے ناظرین انوارالباری پوری طرح محظوظ و متمتع ہوں گے۔

یہاں شاید اس امر واقعی کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ دور حاضر میں علمی اقدار تیز رفتاری کے ساتھ بدل رہی ہیں، علوم نبوت سے بے اعتنائی اور مادی و سطحی علوم کی طرف رغبت و دلچسپی روز افزوں ہے، خود علماء میں بھی تجدد پسندی کا رجحان بڑھ رہا ہے اور کچھ علوم سلف سے مناسبت کی کمی اور کچھ وسعت مطالعہ سے محرومی کے سبب، اپنے اپنے غیر معیاری نظریات پیش کر رہے ہیں۔ آج کل قاہرہ میں ''علماء اسلام'' کی موتمر ہو رہی ہے، جس میں تمام ممالک کے جید علماء جمع ہوکر وقتی مشکل مسائل کا حل شریعت حقہ اسلامیہ کی روشنی میں تلاش کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس میں شرکت ایسے علماء محققین کاملین کی ہونی چاہیے، جن کی نظر تمام علوم اسلامیہ خصوصاً حدیث، فقہ و اصول فقہ پر محیط ہو، پورا لٹریچر محققین سلف و خلف کی آراء و اقوال ان کے سامنے ہوں،، مگر اب تک کی معلومات کے پیش نظر امید نہیں کہ اس نمائندہ اجتماع میں زیادہ تعداد صحیح نمائندوں کی پہنچ سکے گی۔ ولعل اللّٰہ یحدث بعد ذالک امرا۔

خدا کا شکر ہے کہ انوارالباری میں ہر حدیث کے تحت اس کی مکمل شرح اور محققین علماء امت کی بلند پایہ تحقیقات درج ہو رہی ہیں، خصوصیت سے نمونہ سلف امام العصر بحر العلوم حضرت شاہ صاحب قدس سرہ' کے فیصلہ کن ارشادات و اقوال نقل ہوتے ہیں، اگلی جلد میں ایک نہایت ہی اہم بحث ''مراتب احکام'' کی آ رہی ہے جو علماء، اساتذہ، اور تمام ناظرین کے لئے حرز جان بنانے کے قابل ہوگی۔ اس سے جہاں منصب نبوت و منصب اجتہاد کی نوعیت الگ الگ واضح ہوگی، ائمہ مجتہدین کے وجوہ اختلاف بھی منظر عام پر آ جائیں گے اور تمام مسائل خلافیہ کے نزاع و جدال کی در بندیاں ہوکر، اتفاق و اتحاد اور یک رنگی کی فضا پیدا ہوگی، جس کی ضرورت تو ہر زمانہ میں تھی، مگر آج سب سے زیادہ ہے، ناظرین واقف ہیں کہ انوارالباری میں مسائل خلاف کو نہایت اعتدال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ نہ ان میں تشدد برتا گیا، اور نہ حق و ناحق کا

سوال اٹھایا گیا؛ یہ دوسری بات ہے کہ تحقیق وریسرچ کے نقطہ نظر سے علماء کی مختلف آراء موضوع بحث ونظر بنی ہیں اور علمی کاوشوں کو سامنے لانا، ایک علمی کتاب کا واجبی حق ہے، اس میں ردوقدح، دلائل کی چھان بین اور تنقید وتبصرہ بھی ضروری ہے مگر اس ضمن میں حاشاوکلا!! کسی ایک عالم و محقق کی بھی کسرشان وتنقیص مقصود نہیں ہے، علماء امت بلا استثناء سب ہی لائق صدعزت واحترام ہیں، اوران کی علمی ودینی خدمات چھوٹی یا بڑی سب ہی قابل قدر ہیں، اگرچہ علم وشریعت کی رو سے غلطی جس کی بھی ہو اس کا اظہار واعلان بھی بے رورعایت ہونا چاہیے!!

یہی سبق ہم نے حضرت شاہ صاحب اوراپنے دوسرے اکابر مقتدایاں سے حاصل کیا اس سلسلہ میں اگر راقم الحروف کی کسی تنقید سے کسی محترم بزرگ کو ناگواری ہو تو اللہ معاف کریں اور جو غلطی ہو اس سے بھی متنبہ فرمائیں، تاکہ آئندہ کسی موقع سے اس کی تلافی کی جاسکے۔ ولہم الاجر۔

تشکر وامتنان

''انوارالباری'' کی توسیع واشاعت کے لئے جو اکابر واحباب سعی فرمارہے ہیں، ان کا میں تہ دل سے شکر گزار ہوں اسی طرح جو حضرات ہند، پاک وافریقہ حرمین شریفین سے پسندیدگی کتاب اور حوصلہ افزائی کے خطوط بھیج رہے ہیں اور کتاب کی تکمیل کے لئے مفید مشوروں اور نیک دعاؤں سے مدد کررہے ہیں وہ سب میرے دلی شکریہ اور دعاؤں کے مستحق ہیں۔

چاندپور ضلع بجنور کے مشہور عالم جامع معقول ومنقول حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن صاحب سے ناظرین واقف ہوں گے، دار العلوم دیوبند میں مدت تک درس حدیث ونظامت تعلیمات کی خدمات انجام دیں۔ بہترین مقرر اور بلند پایہ مناظر اسلام بھی تھے، بہت سی گراں قدر علمی تصانیف چھوڑیں اور سب سے بڑی ان کی یادگار ان کا عظیم الشان کتب خانہ ہے جس میں آپ نے ہر علم وفن کی بہترین نادر کتابیں جمع فرمائیں تھیں، راقم الحروف کی عرصہ سے تمنا تھی کہ اس کتب خانہ کے علمی نوادر سے استفادہ کروں، مگر حضرت مولاناؒ نے تحفظ کے خیال سے کتب خانہ کو وقف فرمادیا تھا، اوران کے صاحبزادوں نے مستعار کتابیں لینے والوں کی بے احتیاطی کے چند تلخ تجربوں کے بعد یہ احتیاط کی کہ کتب خانہ سے باہر کتابیں دینا بند کردیا تھا، ایسے حالات میں مجھے بڑی مایوسی تھی، لیکن مولانا حکیم محمد انور صاحب خلف صدق حضرت مولانا مرحوم کا نہایت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے تالیف انوارالباری کی ضرورت واہمیت کا لحاظ فرما کر کتابیں بجنور لاکر استفادہ کی اجازت دے دی، حق تعالیٰ حضرت مولانا مرحوم اوران کے اخلاف کو اس کا اجر عظیم فرمائے آمین۔

محسنین ومعاونین پاک وہندوافریقہ

حضرت مولانا عبدالمالک صاحب نقشبندی مجددی، حضرت مولانا ابراہیم صاحب کانھوی لاہور، حضرت مولانا فضل محمد صاحب صدیقی قصور (لاہور) مولانا محمد طاسین صاحب ناظم مجلس علمی کراچی، مولانا عزیز الرحمٰن صاحب ابن حضرت مولانا محمد انوری صاحب لائل پور، مولانا ممتاز احمد صاحب تھانوی۔ مولانا حکیم محمد زمان صاحب کلکتہ، مولانا محمد ذاکر حسن صاحب بنگلور، جناب حسین شکور سیٹھ صاحب بنگلور، مولانا محمد جمال الدین صدیقی مجددی ہاکولہ مولانا اسماعیل صاحب گارڈی، مولانا ابراہیم بن مولانا محمد بن موسیٰ میاں صاحب، مولانا مفتی ابراہیم صاحب سنجالوی، جناب الحاج عبدالحق مفتی صاحب، جناب ابراہیم بھائی کوساڑیہ صاحب، جناب احمد محمد ناخدا صاحب، جناب حاجی موسیٰ بڈھانیہ صاحب، مولانا قاسم محمد سیما صاحب، مولانا بایزید شہید صاحب، حافظ عبدالرحمٰن میاں صاحب، مولانا یوسف احمد عمر وارطی صاحب، مولانا احمد محمد گرواصاحب۔ یہ سب حضرات (قدیم وجدید) ''انوارالباری'' سے قوی رابطہ رکھتے ہیں، جزاھم اللہ خیر الجزاء

اس کے بعد بعض اہم مکاتیب کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

حضرت اقدس مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور

دام ظلہم نے تحریر فرمایا "کئی دن ہوئے ہدیہ سینہ فاخرہ انوارالباری حصہ اول پہنچا تھا، برابر عریضہ لکھنے کا ارادہ کرتا رہا، مگر دوران سر وغیرہ تکالیف کے سبب معذور رہا، روز افزوں امراض نے ایسا معطل کر رکھا ہے کہ باوجود انتہائی اشتیاق کے بھی کتابوں کا دیکھنا اور دماغی کام مشکل ہوگیا، حق تعالیٰ شانہٗ اپنے فضل وکرم سے اس ناکارہ کے حال پر رحم فرمائے۔

مبارک ہدیہ جب سے آیا ہے میرے پاس ہی رکھا ہے اور کسی کسی وقت ایک دو ورق دیکھ بھی لیتا ہوں، حق تعالیٰ شانہٗ اپنے فضل وکرم سے اس مبارک سلسلہ کو تکمیل تک پہنچائے، مساعی جمیلہ کو مثمر ثمرات و برکات بنائے، لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اس سے انتفاع کی توفیق عطا فرمائے، آپ کے لئے دارین کی ترقیات کا ذریعہ بنائے۔" (ناظرین حضرت مدظلہ، کی صحت کے لئے دعا فرمادیں)

حضرت علامہ محدث مولانا مفتی سید محمد مہدی حسن صاحب

"شاہجہاں پوری صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، عم فیضہم نے تحریر فرمایا

"گزشتہ دنوں میں امراض کی شدت رہی، آج کل قدرے تخفیف ہے، کئی دن سے عریضہ لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، اس وقت بھی شب کے دو بجنے والے ہیں یہ چند سطور لکھ رہا ہوں، ہدیہ سینہ قیمہ پہنچا، باوجود تکلیف کے اسی وقت انوارالباری کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا اور اتنا لطف اندوز ہوا کہ نصف حصہ کو پڑھ گیا، مرحبا صد آفرین بر ہمت مردانہ تو۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ معانی ومطالب حدیث کے علاوہ نتائج کی طرف بوضاحت اشارات قابلِ داد ہیں جگہ جگہ پر امام العصر کے جستہ جستہ ریمارک' نکات اور تطبیق نے چار چاند لگا دیئے ہیں' جن سے کتاب اور اس کے مضامین پر ہی نہیں، بلکہ مطالعہ کرنے والوں پر بھی افادات کے انوار کی بارش ہوتی جاتی ہے۔ جس شئی کی تمنا تھی خداوند قدوس آپ کے علمی ذوق سے پورا کرا رہا ہے، طلباء وعلماء دونوں جماعتوں کے لئے بیش بہا مضامین آپ نے جمع کر دیئے اللہ تعالیٰ مزید توفیق اتمام کی عطا فرمائے تا کہ علمی دنیا مستفید ہو، آمین۔

اللہ تعالیٰ علمی دنیا کی طرف سے آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، آپ اتنے اہم کام کو انجام دے رہے ہیں جو دوسروں سے بحالت موجودہ انجام پذیر نہیں ہوسکتا، انوارالباری علمی خزانہ ہے، جس کے پاس ہوگا مالدار ہوگا۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہے کہ اس کی ثنا وصفت کر سکوں۔ انوارالباری شرح البخاری اپنی نظیر آپ ہے، جس میں اکابر کی آراء وتحقیقات کو جمع کر کے علمی دنیا پر احسان کیا ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اختتام پر پہنچائیں اور دنیا اس کے انوار سے منور ہو، مقبولیت کی سند کے لئے احباب مخلصین کے رؤیائے صادقہ کافی ہیں۔" ناظرین حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ کی صحت کیلئے بھی دعا فرمائیں۔

حضرت علامہ محدث مولانا محمد بدر عالم صاحب مولف

"فیض الباری" مہاجر مدنی، دامت برکاتہم نے تحریر فرمایا:

"ابھی ابھی انوارالباری کی پہلی جلد موصول ہوئی، میرے لئے اسم بامسمی بن گئی، جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء کتاب کی صحیح قدردانی اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ کرنا ہے جس سے اس وقت یہ ناچیز محروم ہے، آپ کی علمی خدمت پر رشک آتا ہے، آپ سے قدیم تعلق ہے، اس لئے یہ سطور لیٹ کر بمشکل لکھ رہا ہوں تا کہ آپ کو یہ محسوس ہو جائے کہ جو کام آپ نے شروع کیا ہے اس کی قدر و قیمت اور اہمیت میری نظر میں کتنی زیادہ ہے"

حضرت مولانا نے چند قیمتی مشورے بھی دیئے ہیں جو تالیف کتاب میں ملحوظ رہیں گے، ناظرین سے حضرت موصوف کے لئے بھی دعاء صحت کی درخواست کی جاتی ہے۔

حضرت الشیخ علامہ مولانا محمد انوری صاحب لائل پوری (خلیفہ حضرت رائے پوریؒ)

دامت فیوضہم نے تحریر فرمایا:

''انوارالباری جلد اول موصول ہوئی، کتاب بہت مفید ہے اس کو جلد از جلد نکالئے کہ انوارالباری کے انوار سے دنیا جگمگا اٹھے، میں اس کی توسیع اشاعت کے لئے کوشاں ہوں لیکن اکثر مریض رہتا ہوں اس لئے علی الدوام والاستمرار کام کو مسلسل جاری نہیں رکھ سکتا'' حضرت موصوف کی بھی صحت کے واسطے دعا کی جائے آپ کا تذکرہ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ میں آچکا ہے، نہایت قابل قدر مفید مشورے بھی دیتے ہیں اور بعض احادیث کے بہترین شروح اور حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات خصوصی کی طرف اشارات کئے ہیں جن کو انوارالباری میں پیش کیا جائے گا۔ کثر اللہ امثالھم و نفعنا بعلومھم . آمین

حضرت علامہ محدث مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری مولف

''معارف السنن شرح الترمذی'' دامت فیوضہم نے تحریر فرمایا:۔

''انوارالباری کی تالیف وطباعت کی رفتار سے بہت مسرت ہوئی کل شام کو تیسری جلد بھی پہنچ گئی۔ آنکھوں کو روشن کیا، جزاکم اللہ خیرا، تیس چالیس صفحات بہت عجلت میں دیکھے، دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ امت کو جلد اس گوہر گرانمایہ سے مستفید فرمائے، اور امام العصر حضرت شیخ کے علوم و جواہر سے امت کو اس اردو شرح کے ذریعہ فیضیاب بنائے۔ کاش! میں بجنور ہوتا یا آپ کراچی میں ہوتے تو حضرت شیخ کے انفاس قدسیہ کی خدمت میں، اور تشریح وتبییض میں میرا حصہ بھی ہوتا، آپ کی جوان ہمتی تو میرے لیے قابل رشک ہے اور آپ کے جراءت مندانہ اظہار حق سے دل بہت خوش ہوتا ہے۔ شیخ کوثری کے نفائس منتشرہ کا جمع کرنا بھی بہت مفید رہے گا، الحمدللہ کہ آپ خوب توجہ دے رہے ہیں۔''

حضرت علامہ محدث مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی صاحب تعلیقات ''مسند حمیدی''

دامت فیوضہم نے تحریر فرمایا ہے:۔

''ایک ہفتہ سے زائد ہوا، آپ کا ہدیہ سامیہ (انوارالباری جلد سوم) باعث عزت افزائی ہوا چونکہ میں اپنے کام میں بہت زیادہ منہمک ہوں اس لیے بالاستیعاب مطالعہ کی فرصت نہیں نکال سکا، سرسری طور پر جستہ جستہ دیکھا، دل سے دعا نکلی بس یہ دعا کہ خدا کرے یہ خدمت انجام کو پہنچ جائے''

حضرت علامہ مولانا سید فخر الحسن صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

دام فیضہم نے تحریر فرمایا ''انوارالباری شرح صحیح البخاری''

''اول کا مطالعہ قریباً سو صفحے بالاستیعاب کیا، جس میں باب بدء الوحی اور ایمان کے مباحث بھی داخل ہیں۔ میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کی بات ہے کہ وہ آپ سے اس شاندار علمی کام کو لے رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان میں ایسا بیش قیمت علمی ذخیرہ نظر سے نہیں گزرا، ایمان کے مباحث بھی بحمداللہ بہت خوب جمع کر دیئے حق تعالیٰ قبول فرمائے، آمین۔''

حضرت علامہ محدث مولانا ابوالوفا صاحب افغانی

شارح کتاب الآ ثارامام محمد دامت فیوضہم نے تحریر فرمایا:۔

''انوارالباری کی وصول یابی سے دل کو سرور ہوا، اور شکر رب کریم بجالایا، اللہ جل شانہٗ اس قیمتی شرح کو آپ کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچائے، چوتھی جلد کی طباعت سے بھی عنقریب فراغت کی خوشخبری نے روح کو تازہ کردیا، وفقک اللہ تعالیٰ لکل خیر، یہ کام اتنا قیمتی ہے کہ پورا ہونے کے بعد عمروں قوم اس کی قدر کرے گی الحمد للہ علی ما وفقک وھداک لھذا وما کنا لھتدی لولا ان ھدانا اللہ آج کل بہت ہی عدیم الفرصت ہوں، دعا فرمائیے اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ جلد اس کے مطالعہ سے مشرف ہوسکوں۔''

حضرت مولانا ذاکر حسن صاحب پھلتی، شیخ التفسیر بنگلور دامت برکاتہم

نے تحریر فرمایا:۔انوارالباری کی تیسری جلد موصول ہوئی، مطالعہ کیا، ماشاءاللہ ترتیب بہت اچھی رکھی ہے، تشریح و بحث ونظر کو جوا لگ الگ کردیا یہ بہت ہی بہتر ہوا، فجزاک اللہ تعالیٰ کتاب کے معنوی محاسن علمی افادات بہت اعلیٰ ہیں۔ ہر مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ احناف کا مسئلہ خوب واضح اور مدلل فرمایا گیا ہے۔ جس سے طبیعت بے حد مسرور ہوئی، جزاکم اللہ عنا خیرا الجزاء ۔ بہرحال! آپ کی شرح بخاری شریف علمی دنیا میں ایک عظیم اور قابل قدر اضافہ ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو آپ ہی کے ہاتھوں مکمل فرماوے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز .

عزیز عالی قدر مولانا محمد انظر شاہ صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند سلمہ اللہ تعالیٰ

نے تحریر فرمایا:۔اس سال موسم گرما میں کشمیر جانا ہوا تو وہاں ایک مختصر مطبوعہ تقریر حضرت والد صاحب کی دستیاب ہوئی جو آپ نے سری نگر میں کی تھی، اور اس میں مسائل خلافیہ فاتحہ خلف الامام وغیرہ پر کلام فرمایا تھا، یہ عجیب علمی تحفہ ہے کچھ لوگوں کو آپ کی بعض تنقیدات اوپری معلوم ہوئی تھیں۔ مگر اباجی مرحوم کی اس تقریر سے معلوم ہوا کہ حنفیت سے دفاع میں آپ ان کے نقطہ نظر کی صحیح ترجمانی کررہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بَابُ اَدَاءِ الْخُمُسِ مِنَ الْاِیْمَانِ

(خمس کا ادا کرنا ایمان سے ہے)

(۵۱): حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعْبَۃُ عَنْ اَبِیْ جَمْرَۃَ قَالَ کُنْتُ اَقْعُدُ مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ فَیُجْلِسُنِیْ عَلٰی سَرِیْرِہٖ فَقَالَ اَقِمْ عِنْدِیْ حَتّٰی اَجْعَلَ لَکَ سَھْماً مِنْ مَالِیْ فَاَقَمْتُ مَعَہٗ شَھْرَیْنِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَیْسِ لَمَّآ اَتَوُا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ الْقَوْمُ اَوْ مَنِ الْوَفْدُ قَالُوْ ارَبِیْعَۃُ قَالَ مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ اَوْ بِالْوَفْدِ غَیْرَ خَزَایَا وَلَا نَدَامٰی فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَنَّا لَا نَسْتَطِیْعُ اَنْ نَّاْتِیَکَ اِلَّا فِی الشَّھْرِ الْحَرَامِ وَ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکَ ھٰذَا الْحَیُّ مِنْ کُفَّارِ مُضَرَ فَمُرْنَا بِاَمْرٍ فَصْلٍ نُخْبِرُ بِہٖ مَنْ وَّرَاءَ نَا وَ نَدْ خُلُ بِہِ الْجَنَّۃَ وَ سَاَلُوْہُ عَنِ الْاَشْرِبَۃِ فَاَمَرَھُمْ بِاَرْبَعٍ وَّ نَھَا ھُمْ عَنْ اَرْبَعٍ اَمَرَھُمْ بِالْاِیْمَانِ بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ قَالُوْا اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ شَھَادَۃُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَ نَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءُ الزَّکٰوۃِ وَصِیَامُ رَمَضَانَ وَ اَنْ تُعْطُوْا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ وَ نَھَاھُمْ عَنْ اَرْبَعٍ عَنِ الْحَنْتَمِ وَ الدُّبَّآءِ وَ النَّقِیْرِ وَالْمُزَفَّتِ وَرُبَمَا قَالَ الْمُقَیَّرِ وَقَالَ احْفَظُوْا ھُنَّ وَ اَخْبِرُوْ ابِھِنَّ مَنْ وَرَآءَ کُمْ۔

ترجمہ: حضرت ابو جمرہ سے روایت ہے کہ میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس بیٹھا کرتا تھا تو وہ مجھے اپنے تخت پر بٹھا لیتے تھے (ایک بار) انہوں نے مجھ سے فرمایا یہیں میرے پاس ٹھہرو تا کہ تمہارے لیے میں اپنے مال میں سے کچھ حصہ نکال دوں، تب میں ان کے ساتھ دو ماہ رہا، پھر (ایک دن) انہوں نے مجھ سے کہا کہ جب (قبیلہ) عبدالقیس کا وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان سے دریافت کیا کہ کس قبیلہ کے لوگ ہیں؟ یا پوچھا کہ کون وفد ہے؟ انہوں نے عرض کیا، ہم ربیعہ کے لوگ ہیں، آپ نے فرمایا مرحبا: ان لوگوں کو یا اس وفد کو، یہ نہ رسوا ہوئے، نہ شرمندہ ہوئے، اس کے بعد انہوں نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کی خدمت میں ماہ محرم کے سوا کسی اور وقت حاضر نہیں ہو سکتے (کیونکہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا یہ قبیلہ رہتا ہے، لہٰذا ہمیں کوئی ایسی قطعی بات بتلا دیجئے جس کو ہم اپنے پیچھے رہ جانے والوں کو بھی خبر کر دیں۔ اور جس کی وجہ سے ہم جنت میں جا سکیں، اور آپ ﷺ سے انہوں نے پینے کی چیزوں کی بابت پوچھا، تو آپ نے انہیں چار باتوں کا حکم دیا، اور چار باتوں سے منع کیا، ان کو اللہ واحد پر ایمان لانے کا حکم دیا اور پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ ایک اللہ پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول اس کی بارے میں زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا، اس بات کا اقرار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات عبادت واطاعت کے لائق نہیں۔ اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، اور زکوۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا، اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرنا۔ اور چار چیزوں سے آپ نے انہیں منع فرمایا: حنتم، دُبَّاء، نقیر، اور مزفت کے استعمال سے اور فرمایا کہ ان باتوں کو محفوظ کر لو اور اپنے پیچھے رہ جانے والوں کو (جو آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے انھیں) خبر دے دو۔

تشریح: ابو جمرہ راوی حدیث حضرت ابن عباسؓ کے خاص مصاحبین میں سے تھے اور حضرت ابن عباسؓ ان کا اعزاز و اکرام فرماتے تھے، جس کی کئی وجہ تھیں۔، ایک یہ کہ وہ حضرت ابن عباسؓ اوران لوگوں کے درمیان ترجمانی کی خدمت انجام دیتے تھے، جو آپ کے پاس بطور وفود یا بسلسلہ مقدمات وغیرہ آتے تھے۔ اور مختلف زبانیں بولتے تھے، جن سے ابو جمرہ واقف تھے۔ یہ وجہ صحیح البخاری کی کتاب العلم سے معلوم ہوئی ہے، دوسری وجہ بخاری کتاب الحج ص ۲۲۸ سے معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابو جمرہ نے اشہر حج میں عمرہ کیا تھا، جس کو لوگ مکروہ سمجھتے تھے، حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا تو آپ نے اجازت دی۔ پھر ابو جمرہ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص بلند آواز سے کہہ رہا ہے عمرہ بھی مقبول ہے اور حج بھی مبرور ہے حضرت ابن عباسؓ کو اس خواب سے مسرت ہوئی کہ فسخ عمرہ ان کے فتوے کے مطابق ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ نے وفد عبدالقیس کے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا واقعہ بیان فرمایا قبیلہ عبدالقیس بحرین میں آباد تھا (بحرین وعمان عرب سے مشرقی جانب میں ہیں۔ اور عرب و بحرین کے درمیان میں قبائل مضر وغیرہ آباد تھے، جن سے ان کی جنگ رہتی تھی، اس لیے سوائے اشہر حج کے دوسرے اوقات میں وہ لوگ عرب کی طرف سے نہ آسکتے تھے، بحرین میں اسلام منقذ بن حبان کے ذریعہ پہنچا تھا جو کپڑے کے بڑے تاجر تھے اور مدینہ طیبہ میں بھی سامان تجارت لاتے تھے ایک دفعہ نبی کریم ﷺ ان سے ملے اور بحرین کے حالات معلوم فرمائے، اس کے ضمن میں منقذ کے خسر کا حال بھی دریافت فرمایا، وغیرہ منقذ آپ کی ملاقات اور انوار نبوت سے نہایت متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے، اور بحرین واپس ہو کر کچھ دن اپنا اسلام چھپایا، پھر آہستہ آہستہ تبلیغ اسلام کرتے رہے، ان کے خسر اور گھر والے بھی مسلمان ہو گئے۔

۶ ھ میں پہلا وفد وہاں کے ۱۲ مسلمانوں کا حاضر خدمت نبوی ہوا، اس کے بعد دوسرا وفد چالیس مسلمانوں کا فتح مکہ کے سال ۸ ھ میں حاضر ہوا، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ جواثی میں مسجد عبدالقیس بنی تھی، جس میں مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلے جمعہ کی نماز ہوئی فرمایا اس کو یاد رکھنا، یہ بات مسئلہ جمعہ فی القری میں کام آئے گی۔

قبیلہ ربیعہ، مضر انمار، اور زید چاروں ایک ہی باپ کی اولاد میں تھے، مضر سے آنحضرت ﷺ کا شجرہ نسب ملتا ہے اور اس لحاظ سے وفد مذکور آپ کے بنی عمام میں سے تھا۔

حضور ﷺ نے وفد کو مرحبا بالقوم فرمایا جو عرب کے آنے والے مہمان کے لیے مشہور و معروف جملہ ہے، مرحبا، رحب سے ہے جس کے معنی وسعت و گنجائش کے ہیں، آنے والے کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کو اجنبی محسوس نہ کرے اور اسکا دل اس امر سے خوش ہو کہ میزبان کے دل میں میرے لیے بڑی قدر و منزلت اور وسعت صدر ہے ظاہر ہے کہ میزبان کی طرف سے فراخ حوصلگی اور اعزاز و اکرام کا ثبوت ملے گا، تو مہمان کا دل مسرت و خوشی سے معمور ہو جائے گا۔

پھر حضور ﷺ نے وفد کو ''غیر خزایا ولا ندامیٰ'' فرمایا یعنی تم ایسے طریقہ پر آئے ہو کہ نہ اس میں رسوائی کی صورت ہے نہ ندامت و شرمندگی کی، کیونکہ اسلام سے مشرف و معزز ہو کر آئے ہو، ندامیٰ ندمان کی جمع ہے، نادم کی نہیں ندمان کا اکثری استعمال اگرچہ ہم نشین مجلس شراب کے لئے ہوتا ہے، مگر نادم کے معنی میں بھی آیا ہے، اس لئے یہاں ندامیٰ اسی ندمان کی جمع ہے جو بمعنی نادم ہے، اس کے علاوہ ندامی بجائے نادمین کے یہاں اس لئے بھی زیادہ موزوں ہوا کہ خزایا کے وزن سے ملتا ہے، جیسے ''غدایا وعشایا'' بولتے ہیں، حالانکہ غدایا عدوۃ سے ہے، غداوا ہونا چاہئے تھا، لیکن عشایا کا وزن ملانیکے لئے غدایا زیادہ فصیح قرار پایا، جو غدوۃ کی جمع خلافِ قیاس ہے، یہ صنعت مشاکلت کہلاتی ہے کہ دو کو ہم شکل ہم وزن بنا کر بولا جاتا ہے

امر هم بالایمان للہ وحدہٗ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مطول میں واحد اور احد کا فرق بیان ہوا ہے، واحد وحد سے مشتق ہے، جو واؤ الف کی تبدیلی سے احد ہو جاتا ہے، پس احد دو ہیں، ایک وحد سے جو اثنین کے عدد مقابل پر بولا جاتا ہے، دوسرا بمعنی منفرد عن الشئی ہوتا ہے، اول فقط نفی کے موقع پر آتا ہے جیسے **ولا یظلم ربک احدا** میں، دوسرا اثبت میں مستعمل ہے جیسے **قل ھو اللہ احد** (یعنی سب سے منفرد) واحد کی جمع نہیں آتی البتہ حماسہ کے شعر میں ہے

قوم اذا الشرا بدیٰ ناجذ یہ لھم　　　طاروا الیہ زرافات و وحدانا

(وہ ایسی بہادر ونڈر قوم ہے کہ جب شر وفساد کی کوئی بات ان کے سامنے نوک پنجے نکال کر ان کے سامنے آجاتی ہے تو اسکے مقابلہ کے لئے وہ سب ٹولیاں بنا کر اور تنہا بھی ہر طرح سے دوڑ پڑتے ہیں)

علامہ تبریزی (شارح حماسہ) نے کہا کہ یہاں واحدان جمع واحد بمعنی منفرد ہے، نہ بمعنی واحد عدد مقابل اثنین ہے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہاں واحدان جمع واحد بمعنی عدد ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اور اس کے استعمالات کی تفصیل کلیات ابی البقاء میں موجود ہے، اس میں بتلایا ہے کہ احدیت وواحدیت ذاتی انفراد کے لئے ہے یا فعلی انفراد کے واسطے نیز سہیلی نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے۔

صیام رمضان کے لفظ پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ صیام مصدر ہے، صوم کی جمع نہیں ہے اور کتب فقہ میں جو مسئلہ لکھا ہے کہ جو شخص علی صیام کہے، اس کو تین روزے رکھنے پڑیں گے، وہ بوجہ عرف حادث ہے۔ حنتم:۔ سبز رنگ کی روغنی گھڑیا یا ٹھلیا (مرتبان جیسی) کہ اس میں نبیذ بنایا کرتے تھے، دبا، تو نبڑی، نقیر، کھجور کی جڑ میں کھود کرید کر گڑھا بنا لیتے تھے جس میں تند و تیز قسم کی نبیذ تیار ہوتی تھی۔

مزفت: زفت سے ہے، جو تارکول جیسا ایک تیل بصرہ سے آتا تھا، اور اس کو کشتی پر ملتے تھے، تاکہ پانی اندر نہ آئے زفت کا ترجمہ رال صحیح نہیں ہے جیسا کہ غیاث میں ہے، مزفت وہ ٹھلیا وغیرہ جس پر یہ روغن ملایا جاتا تھا، ان سب برتنوں میں چونکہ نبیذ تیار کی جاتی تھی، اور ان میں سکر بہت جلد آجاتا تھا، اس لئے حرمت سکرات کے تحت ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے ابتداء اسلام میں روک دیا گیا تھا، اس کے بعد ہر برتن میں نبیذ بنانے کی اجازت ہوگئی بشرطیکہ اس میں اتنی دیر نہ رکھی جائے کہ سکر آجائے، ترمذی شریف باب الاشربہ میں حدیث ہے کہ۔ کوئی برتن کسی چیز کو حلال وحرام نہیں بناتا، البتہ ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے"۔

بحث ونظر اور اہم اشکال وجوابات

حدیث الباب میں ایک بڑا اشکال ہے کہ حضور علیہ السلام نے وفد عبدالقیس کو چار چیزوں کا امر فرمایا اور چار چیزوں سے منع فرمایا حالانکہ ایمان کو بھی شمار کریں تو بجائے چار کے پانچ چیزوں کا امر موجود ہے اور اگر بعد کی چار چیزوں کو ایمان کی تفسیر قرار دیں تو صرف ایک چیز کا امر رہ جاتا ہے اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) قاضی بیضاوی نے شرح المصابیح میں کہا کہ ایمان باللہ ایک امر ہے اور اقامت صلوٰۃ وغیرہ سب ایمان ہی کی تفسیر ہے اور باقی تین چیزوں کا ذکر راوی حدیث نے بھول کر یا اختصار کے لئے ترک کر دیا (قسطلانی) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس جواب کا حاصل رجم بالغیب ہے۔

(۲) علامہ نووی نے ابن بطال وغیرہ کے جواب کو زیادہ صحیح قرار دیا کہ حضور علیہ السلام نے چار ہی باتوں کا حکم فرمایا تھا، جن کا وعدہ فرمایا تھا، اس کے بعد پانچویں چیز اداء خمس والی بڑھا دی کیونکہ وہ اس وفد کے حسب حال تھی وہ کفار مضر کے پڑوسی تھے، اہل جہاد تھے، مال غنیمت میں سے اداء خمس کا حکم بتلانا بھی ان کے لئے بہت اہم تھا اس لئے وعدہ سے زیادہ چیز بتلادی، جس میں کوئی مضائقہ نہیں، علامہ نووی نے لکھا ہے کہ دو

سرے جوابات بھی ہیں مگر وہ ہمیں پسند نہیں آئے، اس لئے ان کا ذکر نہیں کیا،

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ جواب امام بخاریؒ کے ترجمہ سے بہت دور ہوجاتا ہے کیونکہ اس طرح اداءِ خمس ایمان سے خارج ہوجاتا ہے، حالانکہ امام بخاریؒ نے اس کے من الایمان ہونے پر ہی باب قائم کیا ہے لیکن اس کا یہ جواب ہوسکتا ہے کہ باوجود خارج عن الایمان ہونے کے بھی وہ امام بخاری کے نزدیک ایمان میں سے شمار ہوسکتا ہے، کیونکہ امام بخاری کا طریقہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ تمام اشیاء متعلقہ ایمان کو ایمان ہی قرار دیتے ہیں۔

(۳) چار کا عدد باعتبار اجزاء تفصیلیہ کے ہے، پس ایمان تو واحد ہے اور عدد مذکور اس کی تفصیل ہے۔

(۴) اداءِ خمس کا عدد علیحدہ مستقل نہیں ہے بلکہ وہ اداءِ زکوٰۃ کا ہی ایک فرد ہے۔

(۵) ذکر شہادتین بطور تبرک ہے، جیسے کہ **واعلموا انما غنمتم من شئی فان الله خمسه** میں اللہ تعالیٰ کے لیے خمس کا ذکر کرنا بطور تبرک ہے، دوسرے اس لیے بھی ذکر ایمان کی ضرورت نہ تھی کہ وہ لوگ مومن ہوکر ہی آئے تھے۔ پس بطور تمہید وتبرک یا اس لیے ذکر کیا گیا کہ وہ لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ ایمان صرف شہادتین پر مقصود ہے جس طرح ابتداء میں نزول احکام سے قبل تھا، لیکن اس جواب پر یہ معارضہ کیا گیا ہے کہ خود صحیح بخاری ہی میں (باب المغازی) حماد بن زید کی روایت ابو جمرہ سے اس طرح ہے کہ حضور علیہ السلام نے چار باتوں کا حکم فرمایا اور ایمان باللہ کے ذکر پر ایک انگلی کا عقد فرمایا، جس سے معلوم ہوا کہ شہادت بھی شمار میں ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہاں عقد سے اشارہ توحید نہ سمجھا جائے، کیونکہ وہ نصب مسبحہ سے ہوتا ہے (جس طرح تشہد میں) عقد سے نہیں ہوتا، جس کو راوی نے ذکر کیا ہے۔

(۶) علامہ قسطلانی نے نقل کیا ہے کہ ابوعبداللہ الابی نے کہا "سب سے زیادہ تام وکامل جواب وہ ہے جو ابن صلاح نے ذکر کیا کہ جملہ **وان تعطوا من المغنم الخمس** اربع پر معطوف ہے یعنی چار باتوں کا اور اداءِ خمس کا حکم فرمایا یہ کامل وتام جواب اس لیے ہے کہ اس سے روایت کے دونوں طریقے متفق ہوجاتے ہیں۔ اور اشکال بھی رفع ہوجاتا ہے۔

(۷) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک بہتر جواب یہ ہے کہ ایمان مع اپنے مقتضیات مابعد کے چار کے عدد میں اسلیے داخل ہے کہ وہ مابعد کی چیزیں سب ایمان کی تفسیر ہیں، پس ایمان کا درجہ اجمال کا اور ان امور کا مرتبہ تفصیل کا ہے اگر ایمان کی طرف نظر کریں تو وہ ایک ہے اور ان امور کی طرف خیال کریں تو چار ہیں۔

یہ جواب امام بخاریؒ کے منشا سے بھی مطابق ہے کہ انہوں نے یہاں اداءِ خمس کو ایمان سے قرار دیا ہے اور کتاب السیر والجہاد میں باب اداء خمس من الدین ذکر کیا ہے، نیز باب سوال جبرئیل میں بھی حضور علیہ السلام کا یہی جواب ذکر کیا ہے جو آپ علیہ السلام نے وفد عبدالقیس کو دیا ہے۔

حدیث الباب میں حج کا ذکر کیوں نہیں

ایک بحث یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے یہاں حج کا ذکر کیوں نہیں فرمایا، اس کا مشہور جواب تو یہ ہے کہ یہ وفد ۶ھ یا ۸ھ میں آیا ہے، اور اس وقت تک حج فرض نہیں ہوا تھا، حافظ ابن حجر نے بھی فرمایا کہ حج اس کے بعد فرض ہوا، قاضی عیاض نے فرمایا کہ حج ۹ھ سے پہلے فرض نہیں ہوا، علامہ قسطلانیؒ نے لکھا ہے کہ یہ جواب فرضیت حج کے بارے میں قول مذکور پر تو چل سکتا ہے مگر زیادہ راجح یہ ہے کہ حج کی فرضیت ۶ھ میں ہوچکی ہے لہٰذا ممکن ہے کہ حج کا ذکر اس لیے نہ فرمایا ہو کہ وہ لوگ کفار مضر کے سبب حج پر نہ آسکتے تھے، یا اس لیے کہ حج کی فرضیت علی التراخی ہے یا اس لیے کہ اس کے بعد علامہ موصوف نے دوسری وجہ زیادہ قوی ذکر کی ہے کہ وفد کا سوال یہ تھا کہ کون سے اعمال دخول جنت کا سبب ہیں، حضور اکرم علیہ السلام

نے جواب میں صرف وہ امور بتلا دیئے، جن کو بالفعل ادا کرنا ان کے لیے ممکن تھا، تمام احکام اسلام، جنکی تعمیل فعلاً و ترکاً ضروری ہے، بتلانا مقصود نہیں تھا۔ اسی لیے آپ ﷺ نے ممنوعات میں سے بھی صرف خاص برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع فرمانے پر اکتفا فرمایا' حالانکہ ممنوعات شرعیہ میں اس سے زیادہ شدید قسم کے ممنوعات و محرمات موجود ہیں، وہ لوگ چونکہ اس وقت نبیذ بنانے اور اس کے استعمال کے بہت عادی تھے، اس لیے اس ہی کا ذکر فرمایا۔

فوائد حدیثیہ

علامہ نووی نے شرح بخاری میں لکھا کہ حدیث الباب میں مہمات وارکان اسلام سواحج کے ذکر ہوئے ہیں۔ اور اس میں اعمال پر ایمان کا اطلاق بھی ہوا ہے، جو بخاریؒ کا خاص مقصد ہے اور اس میں یہ بھی تلقین ہے کہ فاضل کا اکرام کرنا چاہیے اور یہ کہ ایک عالم دوسرے سے تفہیم حاضرین کے لیے مدد لے سکتا ہے، جیسے حضرت ابن عباس ؓ نے کیا، اور اس امر کا بھی استحباب معلوم ہوا کہ اپنے پاس آنے والوں کو مرحبا و خوش آمدید وغیرہ کہنا چاہیے، اور اس سے کسی کے منہ پر تعریف کرنے کا بھی جواز نکلتا ہے، بشرطیکہ اس کے کبر وغرور کا اندیشہ نہ ہو۔ وغیرہ

حدیث الباب کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں دس جگہ روایت کیا ہے یہاں کتاب الایمان میں، پھر کتاب العلم، صلوٰۃ، زکوٰۃ خمس، خبر واحد، مناقبِ قریش، مغازی، ادب و توحید میں، امام مسلم نے اس کو کتاب الایمان و باب الاشربہ میں روایت کیا ہے۔ امام نسائی علم اور ایمان وصلوٰۃ میں ذکر کیا ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۳۵۳ ج ۱)

خمس سدس وغیرہ

خمس کا لفظ دوسرے حرف کے پیش وجزم دونوں کے ساتھ درست ہے، جس طرح لفظ ثلث، ربع، سدس، سبع، ثمن، تسع، عشر میں بھی یہ دونوں صحیح ہیں۔

حافظ و عینی کے ارشادات

حدیث الباب کے اندر اصیلی و کریمہ کی روایت میں الا فی شہر الحرام اضافت کے ساتھ ہے، جس کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری ص ۹۸ ج ۱ میں لکھا کہ یہ اضافہ الشیء الی نفسہ سے ہے، جیسے مسجد الجامع اور نساء المومنات میں ہے، اس پر علامہ محقق حافظ عینیؒ نے تعقب کیا اور فرمایا کہ اضافۃ الشئی الی نفسہ جائز نہیں ہے اور فرمایا کہ یہاں بظاہر اضافۃ الاسم الی صفۃ ہے، جیسے مسجد الجامع اور نساء المومنات میں، یعنی مسجد الوقت الجامع اور یہاں بتاویل وتقدیر الا فی شہر الاوقات الحرام ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۳۵۶ ج ۱)

نواب صاحب کی عون الباری

حدیث الباب کے تحت نواب صاحب نے اول جملہ کا انعقاد مسجد عبد القیس بجواثی کا ذکر فرما کر مسلک حنفی اشتراط مصر للجمعہ پر تنقید کی ہے اور دیہات میں جواز جمعہ کو امر محقق فرمایا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا تھا نواب صاحب کی شرح بخاری علامہ قسطلانی کی شرح کی بلفظہٖ نقل ہے اور بغیر حوالہ ہے اس طرح وہ نہایت آسانی سے شارح بخاری بن گئے، البتہ کہیں کہیں کوئی جملہ اپنی طرف سے بڑھا دیتے ہیں۔ جس کا مقصد ائمہ مجتہدین کے مذاہب حقہ پر طعن وطنز ہوتا ہے، واللہ المستعان

جمعہ فی القریٰ کی بحث میں ہم نواب صاحب وغیرہ کے بلند بانگ دعاوی کا جائزہ لیں گے، اور اس اہم مسئلہ کی تحقیق پوری طرح کرینگے۔ ان شاء اللہ العزیز۔ و منہ الاستعانۃ و علیہ التکلان

بَابُ مَا جَآءَ اَنَّ الْاَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالْحِسْبَةِ وَلِكُلِّ امْرِءٍ مَّا نَوٰى فَدَخَلَ فِيْهِ الْاِيْمَانُ وَالْوُضُوْءُ وَالصَّلٰوةُ وَالزَّكٰوةُ وَالْحَجُّ وَالصَّوْمُ وَالْاَحْكَامُ وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ عَلٰى نِيَّتِهٖ وَ نَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلٰى اَهْلِهٖ يَحْتَسِبُهَا صَدَقَةٌ وَّقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ

(اعمال کا دارومدار نیت واحتساب پر ہے اور ہر شخص کو وہی چیز ملتی ہے جسکی وہ نیت کرتا ہے، اس میں ایمان وضو، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ، اور دوسرے احکام شرعیہ بھی داخل ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہر شخص اپنے دل کے ارادے کے مطابق عمل کرتا ہے، اور انسان کا اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا بھی اگر نیک نیتی سے ہو تو وہ صدقہ ہے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ فتح مکہ کے بعد اب ہجرت تو باقی نہیں لیکن جہاد اور نیت باقی ہیں۔)

(۵۳ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُسْلَمَةَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ يَحْيٰى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَقَّاصٍ عَنْ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ وَلِكُلِّ امْرِءٍ مَانَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِامْرَاَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَاهَاجَرَ اِلَيْهِ.

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہو، تو جس نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کی تو وہ اللہ اور اس کے رسول ہی کے لیے شمار ہوگی، اور جس نے حصول دنیا کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کی غرض سے ہجرت کی تو وہ اسی مد میں شمار ہوگی، جس کے لیے اس نے ہجرت اختیار کی۔

تشریح: اس حدیث کے عنوان میں امام بخاری نے یہ بات ملحوظ رکھی ہے کہ آدمی کے جملہ افعال اس کے ارادے کے تابع ہوتے ہیں، یہ حدیث بالکل ابتداء میں بھی گزر چکی ہے، تقریباً سات جگہ امام بخاری اس روایت کو لائے ہیں، اور اس سے یا تو یہ ثابت کیا ہے کہ اعمال کی صحت نیت پر موقوف ہے یا یہ بتلایا ہے کہ ثواب کا دارومدار نیت پر ہے اس جگہ یہی بتلایا گیا ہے کہ ثواب صرف نیت پر موقوف ہے جیسے اپنے بال بچوں پر آدمی روپیہ پیسہ محض اس لیے خرچ کرے کہ انکی پرورش میرا دینی فریضہ ہے، اور حکم خداوندی ہے، تو یہ خرچ کرنا بھی صدقہ میں شمار ہوگا۔ اور اس پر صدقے کا ثواب ملے گا۔

بحث ونظر: امام بخاری کا مقصد اس باب سے یہ ہے کہ صرف اقرار لسانی بغیر تصدیق قلبی کے نجات کیلئے کافی نہیں ہے اس لیے فرمایا کہ ایمان بھی عمل ہے اور ہر عمل کی نیت ضروری ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ ایمان کے لیے دل کی نیت ضروری ہے، مگر یہ بات امام بخاریؒ کی اپنی خاص رائے ہے ورنہ ایمان خود اذعان قلبی کا نام ہے پھر اسکے لیے نیت کا ضروری ہونا بے وزن بات ہے۔

دوسری بات قابل لحاظ یہ بھی ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ فرمایا "میرا خیال ہے کہ کوئی شخص محض اقرار کو کافی قرار دینے والا نہیں ہے اور جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے، ان کا مقصد وہ نہیں ہے جو نقل کرنے والوں نے نقل کیا ہے ان کے بارے میں حسبہ اور احتساب کا مقصد ایک ہی ہے۔ جس کی بحث پہلے گزر چکی ہے"۔

نیت وضو کا مسئلہ: امام بخاریؒ نے حدیث الباب کے تحت ایمان، وضو، نماز وغیرہ سب احکام کو بھی داخل کیا ہے، ایمان کے بارے

میں ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔اس کے علاوہ امام بخاری نے چونکہ اشتراط نیت کے مسئلہ میں حجازین کی موافقت کی ہے اس لیے عبادات مقصودہ وغیر مقصودہ سب کو برابر کردیا،لیکن بقول حضرت شاہ صاحبؒ یہ بات امام بخاریؒ کے مذہب حنفیہ سے پوری طرح واقفیت نہ ہونے کے سبب ہے ورنہ وضو بلانیت کے حنفیہ کے یہاں بھی کوئی ثواب نہیں ہے جیسا کہ خزانۃ المفتین میں تصریح ہے اور یہاں امام بخاری بھی حسبۃ واحتساب ہی پر زور دے رہے ہیں۔تو وضو کے بارے میں باعتبار حصول ثواب وعدم حصول ثواب کیا فرق رہا؟ رہا صحت وعدم صحت کا مسئلہ تو اس کی بحث ہم حدیث **انما الاعمال بالنیات** میں کر چکے ہیں۔ اور یہ امر بھی خوب واضح ہو چکا ہے کہ **انما الاعمال بالنیات** سب ہی کے نزدیک مخصوص ہے کیونکہ طاعات وقربات تو کافر کی بھی صحیح ہیں۔اوران میں نیت کی ضرورت کسی کے نزدیک بھی نہیں ہے۔

احکام سے کیا مراد ہے؟

لفظ احکام پر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ امام بخاریؒ کی اس سے کیا مراد ہے،فقہاء تو احکام کے لفظ سے مسائل قضا مراد لیا کرتے ہیں۔بظاہر امام بخاریؒ نے بقیہ معاملات کا ارادہ کیا ہے حالانکہ قول مشہور پر معاملات کا تعلق حدیث الباب سے نہ حنفیہ کے یہاں ہے نہ شوافع کے نزدیک ہے پھر فرمایا:۔میں سمجھتا ہوں کہ معاملات میں بھی نیت ہوتی ہے،اس طرح کہ معاملات میں دو لحاظ ہیں باعتبار تعلق عباد تو ان میں نیت معتبر نہیں،مگر بلحاظ تعلق باللہ کے نیت ان میں بھی معتبر ہے،لہٰذا حدیث میرے نزدیک بھی عام ہے، جیسے کہ امام بخاری کی رائے ہے۔

شاکلہ کی تحقیق

علے شاکلتہ پر فرمایا کہ امام بخاریؒ نے شاکلہ کی تفسیر نیت سے کی ہے،لیکن اس کے اصل معنی مناسبت طبیعہ کے ہیں کہ ہر انسان اپنی طبعی افتاد ومناسبت کے مطابق عمل کرتا ہے،جس کی خلقت وجبلت میں سعادت ونیک بختی ہوتی ہے۔وہ سعادت کے کام کرتا ہے،اور جس کی جبلت میں شقاوت وبد بختی ہوتی ہے وہ اعمال بد میں لگا رہتا ہے۔

حافظ عینیؒ نے لیث کا قول نقل کیا ہے کہ "**الشاکلہ من الامور ماوافق فاعله**"یعنی ہر شخص اپنے اس طریقہ پر عمل پیرا ہوتا ہے جو اس کے اخلاق سے مطابقت کرتا ہے،مثلاً کافر اپنے طریقہ سے میل کھانے والے اعمال کرتا ہے،نعمت خداوندی کے وقت اعراض وروگردانی،شدت ومصیبت کے وقت یاس ودل شکستگی وغیرہ اور مومن اپنے طریقہ سے ملتے جلتے اعمال اختیار کرتا ہے،نعمت وفراخی کے وقت شکر و اطاعت خداوندی،بلاو مصیبت کے وقت صبر،عزم وحوصلہ وغیرہ،اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا" **فربکم اعلم بمن هو اهدی سبیلا** " (تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون زیادہ ہدایت یافتہ اور صحیح راستہ پر چلنے والا ہے)یعنی جن کے اندرونی ملکات واخلاق درست ہوں گے،وہی ظاہری اعمال کے لحاظ سے بھی اچھے ہوں گے۔

جہاد ونیت کی شرح

" **ولکن جهاد و نیته** " حافظ عینی نے لکھا کہ یہ حدیث ابن عباس کا ٹکڑا ہے جس میں ہے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت مدینہ طیبہ کی ضرورت نہیں رہی(کیونکہ مکہ معظمہ بھی دارالاسلام بن گیا ہے)البتہ جہاد ونیت باقی ہے،اور جب کہیں جہاد کے لئے اپنے دیار واوطان سے نکلنے کی ضرورت پیش آئے،تم نکل کھڑے ہو اس کو امام بخاریؒ نے یہاں تعلیقاً روایت کیا اور مسنداً حج جہاد اور جزیہ کے باب میں روایت کیا ہے،

اورامام مسلمؒ نے جہاد میں،امام ابوداودؒ نے جہاد اور حج میں،امام ترمذیؒ نے سیر میں،امام نسائیؒ نے سیر وبعیت وحج میں،روایت کیا ہے۔نیت سے مراد ہرنیت صالحہ ہے،ترغیب دی ہے کہ ہر کام میں اچھی نیت کی جائے اور بتلایا کہ نیت خیر پر بھی ثواب حاصل ہوتا ہے (عمدۃ القاری ص ۳۶۷)

نفقہ عیال کا ثواب

" نفقه الرجل " پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ثواب کے لئے اجمالی نیت کافی ہے بلکہ صرف بری نیت کا نہ ہونا ضروری ہے، اس لئے نفقہ عیال کی صورت میں بغیر احتساب کے بھی اجر وثواب حاصل ہو جانا چاہیے،کیونکہ احتساب نیت پر زائد چیز ہے (جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے) رہی یہ بات کہ یہاں احتساب کی قید کیوں لگائی گئی،اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ موقع ذہول کا ہے،کوئی شخص یہ خیال نہیں کرتا کہ اپنے اہل وعیال پر صرف کرنا بھی اجر وثواب کا موجب ہوسکتا ہے اس لئے تنبیہ فرمائی گئی۔

(۵۴) حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بْنُ مِنْهَالٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عَدِیُّ بْنُ ثَابِتٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ يَزِيْدَ عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلٰٓی اَهْلِهٖ يَحْتَسِبُهَا فَهِیَ لَهٗ صَدَقَةٌ.

(۵۵) حَدَّثَنَا الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِیِّ قَالَ حَدَّثَنِیْ عَامِرُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍؓ اَنَّهٗ اَخْبَرَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّکَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِیْ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ اِلَّا اُجِرْتَ عَلَيْهَا حَتّٰی مَا تَجْعَلُ فِیْ فَمِ امْرَاَتِکَ.

ترجمہ: (۵۴) حضرت ابومسعودؓ رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ جب آدمی اپنے اہل وعیال پر ثواب کی خاطر روپیہ خرچ کرے (تو) وہ اس کے لئے صدقہ ہے (یعنی صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔)

ترجمہ: (۵۵) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں ہر اس خرچ ونفقہ پر ثواب دیا جائے گا جس سے تمہارا مقصد حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنی ہوگی،حتیٰ کہ وہ لقمہ بھی جسے تم اپنی بیوی کے منہ میں رکھو موجب اجر وثواب ہے۔

تشریح: امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں تین امور ذکر کئے (۱) اعمال کے لئے نیت ضروری ہے (۲) اعمال کے لئے حسبہ چاہیے (۳) ہر شخص کو اس کی نیت کا ثمرہ ملتا ہے،ان تینوں کے لئے علی الترتیب تین احادیث لائے ہیں،پہلی حدیث کی تشریح ہوچکی،دوسری حدیث حضرت ابن مسعودؓ کی ہے،جس سے معلوم ہوا کہ بعض اعمال ایسے بھی ہیں جو بظاہر طاعت وعبادت کی صورت میں ادا نہیں ہوتے بلکہ ان کو انسان اپنے طبعی تقاضوں کے تحت کرتا ہے۔اگر ان میں بھی اچھی نیت کے ساتھ،حصول ثواب کا قصد اور نیت کا استحضار ہو تو وہ اعمال بھی طاعات بن جاتے ہیں،اہل وعیال پر صرف کرنا اس میں داخل ہے،اسی طرح اگر مال کمانا اس لئے ہو کہ جن لوگوں کا تکفل خدا نے اس کے ذمہ کردیا ہے، خدا کا حکم ادا کرنے کے خیال سے کماتا ہے اور ان پر صرف کرتا ہے سونا اس لئے ہے کہ صحت اچھی رہے گی تو خدائی احکام کی تعمیل بھی خوب کرے گا،آرام اس لئے کرتا ہے کہ بدن میں نشاط آجائے اور پھر حسب فرمان خداوندی روزی بھی دل جمعی سے حاصل کرے گا اور فرائض شریعت بھی پورے انبساط قلب سے ادا کرے گا،تو اس قسم کی تمام باتیں اس حدیث کے تحت آجاتی ہیں۔

تیسری حدیث حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے کہ جو خرچ بھی لوجہ اللہ ہوگا اس پر اجر وثواب ملے گا،حتیٰ کہ اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ بھی دے گا تو اچھی نیت اور خدا کی مرضی کے تحت ہونے کے سبب موجب اجر وثواب ہوگا،غرض یہ بتلایا کہ اجر وثواب صرف اسی

صرف وخرچ پر نہ ملے گا، جو دوسروں اور غیروں پر کیا جائے، بلکہ اپنی ذات پر اپنے بال بچوں پر، اپنی بیوی اور دوسرے اقارب واعزہ پر بھی جو کچھ خرچ کرے گا وہ سب حکم صدقہ میں ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ اس پر اجر وثواب دیتے ہیں، اس پر بھی دیتے ہیں اور اگر نیت کا استحضار بھی عمل کے وقت ہو (جس کو حسبہ کہتے ہیں) تو اس عمل خیر کا ثواب مزید ہو جاتا ہے، بیوی کے منہ میں لقمہ دینے کا ذکر اس لئے ہوا کہ بظاہر اس میں خواہش نفسانی اور تقاضاءِ طبعی کا دخل بہت زیادہ ہے اور اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اشکال بھی پیش آیا تھا، عرض کیا یا رسول اللہ! کیا قضائے شہوت میں بھی اجر ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا ضرور ہے، اس لئے کہ اگر وہ حرام میں مبتلا ہوتا تو ظاہر ہے وہ قضائے شہوت خدا کی معصیت عظیم ہوتی، اب چونکہ اس سے بچ کر خدا کی مرضی کا پابند ہوا ہے تو اجر خداوندی کا مستحق کیوں نہ ہوگا؟

دیگر فوائد علمیہ: حضرت محقق ابن ابی جمرہ اندلسیؒ نے اس مقام میں چند اہم فوائد لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے (۱) نفقہ اہل وعیال سے مراد وہ تمام مصارف ضروریہ ہیں، جو ایک شخص اپنے اہل وعیال کے کھانے پینے پہننے رہنے وغیرہ کے ضروریات پر خرچ کرتا ہے۔

(۲) احتساب کے ساتھ ایمان باللہ کا احضار بھی ضروری ہے یا نہیں، اس میں دو صورتیں ہیں، اگر حدیث الباب میں ایمان واحتساب دونوں مراد ہیں تو ایمان کا ذکر نہ کرنا اس کے علم وشہرت کے سبب ہے کہ سب کو معلوم ہے اور بہت سی احادیث میں ایمان واحتساب کا ساتھ ذکر آچکا ہے، لہٰذا احتساب کا ذکر ایمان کے ذکر کو بھی شامل ہے اور اگر مراد صرف احتساب ہے تو یہاں احضار ایمان کی شرط لگائی جائے گی، اور حدیث الباب اپنے ظاہر پر رہے گی اور بظاہر یہی صورت راجح ہے، واللہ علم۔ کیونکہ بعض احادیث میں صرف احتساب کا لفظ آیا ہے اور اس کا ثواب صدقہ کے ثواب سے مساوی قرار دیا ہے، بعض میں صرف ایمان کا ذکر ہے، وہاں اس کا ثواب حسنات کی شکل میں بتلایا ہے، **قال علیہ السلام: "من احتبس فرساً فی سبیل اللہ ایمانا باللہ و تصدیقا بوعدہ، فان شبعہ وریہ وروثہ وبولہ حسنات فی میزانہ یوم القیامۃ"** (جس نے خدا پر ایمان اور اس کے وعدوں کی سچائی پر یقین کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے گھوڑا پالا، قیامت کے دن اس گھوڑے کے چارے، پانی، لید وپیشاب کے وزن کے برابر نیکیاں، اس شخص کی ترازو کے پلڑے میں رکھی جائیں گی) اور جن احادیث میں ایمان واحتساب دونوں کا ذکر ہوا وہاں اس کا ثواب ذنوب ومعاصی کی مغفرت بتلائی گئی ہے، جو سب سے اعلیٰ مرتبہ ثواب کا ہے، جیسے فضیلت لیلۃ القدر میں آیا ہے۔

(۳) یہ صدقہ کا ثواب صرف مصارف اہل وعیال کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اور بھی بہت سے اعمال پر بتلایا گیا ہے مثلاً راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، کوئی کلمہ خیر کسی کے لئے کہہ دیا جائے تو وہ بھی صدقہ ہے۔ بشاشت وحسن خلق کے ساتھ کسی مسلمان سے ملے تو وہ بھی صدقہ ہے وغیرہ۔

(۴) اس حدیث سے صفاء باطن والوں کی فضیلت نکلتی ہے کہ وہ اپنے واجب ومستحب تمام اعمال میں نیک نیات کے سبب زیادہ اجر وثواب حاصل کر لیتے ہیں، واجبات میں بھی ایمان واحتساب کی رعایت زیادہ کرتے ہیں اور مستحبات کو نذر کر کے واجب بنا لیتے ہیں، جس سے اجر بڑھ جاتا ہے اور مباحات کے ذریعہ طاعات وعبادات پر مدد لیتے ہیں، اس لئے وہ بھی ان کے لئے مستحبات کے درجہ میں ہو جاتے ہیں اس طرح دوسروں کی نسبت سے ان کے اعمال کی فی نفسہ بھی قیمت بڑھی ہوتی ہے اور احضار ایمان واحتساب کے سبب اجر مزید کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ **"ان اللہ لا ینظر الی صورکم و لکن ینظر الی قلوبکم"** او کما قال علیہ السلام۔

(۵) اگر کہا جائے کہ احضار ایمان واحتساب پر اس قدر زیادہ اجر وثواب کیوں رکھا گیا، حالانکہ اس میں کوئی تعب ومشقت بھی نہیں اور

جوارح کو کچھ کرنا بھی نہیں پڑتا اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس کو امر تعبدی قرار دیں تب تو بحث کی گنجائش ہی نہیں جس چیز پر حق تعالیٰ جو کچھ اجر دیں، اس کو حق و اختیار ہے، البتہ اس کو معقول المعنی قرار دیں تو دلیل و بیان کی ضرورت ہے اور بظاہر یہی صورت یہاں ہے تو وجہ یہ ہے کہ قلب بھی جوارح ہی میں سے ہے اور نیت کا استحضار وغیرہ جس طرح مطلوب ہے وہ یقیناً تعب نفس کا سبب ہے اور بقدر زیادہ تعب، زیادہ اجر معقول ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا" والذین جاهدوا فینالنهدینهم سُبُلَنَا " ظاہر ہے کہ التعاب نفس کی تمام اقسام مجاہدہ میں داخل ہیں، دوسرے یہ کہ ہر شخص بغیر احضار ایمان واحتساب کے بھی واجبات و مستحبات شرعیہ ادا کر سکتا ہے، بلکہ بعض اعمال بغیر احضار نیت کے بھی انجام دے سکتا ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔" خیر الاعمال ماتقدمته النیة " (بہتر عمل خیر وہ ہے جس سے پہلے نیت کر لی جائے، حضور اکرم ﷺ نے احضار نیت کو باب خیریت میں سے قرار دیا اور جب یہ صرف باب خیریت سے ہوا تو عمل کا وقوع وایقاع اس کے بغیر بھی جائز بلکہ لائق جزاوثواب ہوا اور اس رائے کو اکثر علماء نے اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ بات اس درجہ عام و مطلق نہیں ہے جیسی عمومی لفظ سے سمجھ میں آتی ہے، البتہ بعض اعمال میں ضرور صحیح ہے، جس کی تفصیل شرائط نیت اور ان میں اختلاف فقہا سے معلوم ہوسکتی ہے۔

(۶) اگر کہا جائے کہ اعمال باطن کا ثواب اعمال ظاہر کی نسبت سے کیوں زیادہ ہے؟ اور اکثر اعمال ظاہر کے لئے احضار باطن کی قید کیوں لگی ہے؟ جواب یہ ہے کہ امر تعبدی ہے۔ اس کے لئے کسی حکمت و دلیل کا جاننا اور بتلانا ضروری نہیں، دوسری صورت یہ کہ اس کو معقول المعنی کہا جائے تو حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے (واللہ علم) کہ سب تعبدات اور تمام نعمتوں سے افضل و برتر، اعلی واشرف ایمان کی نعمت وتعبد ہے، جس کا محل قلب ہے، اس لئے جتنی چیزیں اس جلیل القدر مقام سے صادر و متعلق ہوں گی، وہ بھی دوسرے جوارح کے اعمال سے افضل واشرف ہوں گی۔ اس لئے حدیث میں قلب کے صلاح وفساد پر سارے جسم کے صلاح وفساد کو منحصر کہا گیا ہے۔ کیونکہ سارے جوارح اسی کے خادم اور مطیع ومنقاد ہیں۔ جعلنا الله ممن اصلح منه الظاهر والباطن بمنه و کرمه　(بہجۃ النفوس ص ۱۰۱ ج ۱)

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ اَلدِّيْنُ النَّصِيحَةُ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهِ وَلاَ ئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَآ مَّتِهِمْ وَقَوْلِهٖ تَعَالٰى اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ.

رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ، اور اس کا رسول، ائمہ مسلمین اور عام مسلمانوں کے لئے خیر خواہی کرنا دین ہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب وہ خدا اور رسول خدا کے ساتھ خلوص وخیر خواہی کا معاملہ کریں (تو ان کی فروگذاشتوں پر مواخذہ نہ ہوگا)

(۵۶) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ اِسْمٰعِيْلَ قَالَ حَدَّثَنِيْ قَيْسُ بْنُ اَبِيْ حَازِمٍ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْبَجَلِيِّ قَالَ بَا يَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ وَ النُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ

(۵۷) حَدَّثَنَا اَبُو النُّعْمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُو عَوَانَةَ عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ قَالَ سَمِعْتُ جَرِيْرَ ابْنَ عَبْدِاللّٰهِ يَوْمَ مَاتَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ قَامَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَ اَثْنٰى عَلَيْهِ وَ قَالَ عَلَيْكُمْ بِاتِّقَآءِ اللّٰهِ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَالْوَقَارِ وَالسَّكِيْنَةِ حَتّٰى يَاْ تِيَكُمْ اَمِيْرٌ فَاِنَّمَا يَاْ تِيْكُمُ الْاٰنَ ثُمَّ قَالَ اِسْتَعْفُوْا لِاَمِيْرِكُمْ فَاِنَّهٗ كَانَ يُحِبُّ الْعَفْوَ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ اَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ قُلْتُ اُبَايِعُكَ عَلَى الْاِسْلَامِ فَشَرَطَ عَلَيَّ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ فَبَا يَعْتُهٗ عَلٰى هٰذَا وَرَبِّ هٰذَا الْمَسْجِدِ اِنِّيْ لَنَا صِحٌ لَّكُمْ ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ .

ترجمہ: (۵۶) جریر بن عبداللہ ؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کی خیرخواہی پر بیعت کی۔

ترجمہ: (۵۷): زیاد بن علاقہ ؓ نے بیان کیا کہ جس دن مغیرہ ابن شعبہ کا انتقال ہوا، اس روز میں نے جریر بن عبداللہ ؓ سے سنا، کھڑے ہوکر اول اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور (لوگوں سے) کہا، تمہیں صرف خدائے وحدہ لاشریک سے ڈرنا چاہیے اور وقار وسکون اختیار کرو، جب تک کہ کوئی امیر تمہارے پاس آئے، کیونکہ وہ (امیر) ابھی تمہارے پاس آنے والا ہے پھر کہا، اپنے (مرحوم) امیر کے لئے خدا سے مغفرت مانگو، کیونکہ وہ بھی درگزر کرنے کو پسند کرتا تھا پھر کہا اب اس (حمد وصلوٰۃ) کے بعد (سن لو! کہ) میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ میں اسلام پر آپ ﷺ کی بیعت کرتا ہوں، تو آپ ﷺ نے مجھ سے اسلام پر قائم رہنے کی اور ہر مسلمان کی خیرخواہی کی شرط لی میں نے اسی پر آپ ﷺ کی بیعت کی اور قسم ہے اس مسجد کے رب کی کہ یقیناً میں تمہارے لئے خیرخواہ ہوں، پھر استغفار کی اور منبر پر سے اتر گئے۔

تشریح: نصیحت، نصح الرجل ثوبہ سے ہے، کپڑا سینے کے معنی میں آتا ہے۔ نصیحت سے بھی دوسرے شخص کے برے حال اور پھٹے پرانے کی اصلاح ہوتی ہے اسی سے توبہ نصوح ہے گویا معاصی لباس دین کو چاک کردیتے ہیں اور توبہ اس کو سی کر درست کرتی ہے، یا نصحت العسل سے ہے، جب شہد کو موم وغیرہ سے صاف کرلیتے ہیں، نصیحت سے بھی برائی کو دور کیا جاتا ہے (قالہ المازری) محکم میں ہے کہ نصح نقیض وضد غش ہے، گویا نصیحت کرنے والا صاف اور کھری اور صاف ستھری بات کہتا ہے یا مخلصانہ رہنمائی کرتا ہے جامع میں ہے کہ نصح سے مراد خالص محبت اور صحیح مشورہ پیش کرنے کی سعی بلیغ ہے، کتاب ابن طریف میں ہے کہ نصح قلب الانسان سے ہے جبکہ ایک شخص کا دل کھوٹ سے بالکل خالی ہو، علامہ خطابی نے فرمایا نصیحت ایک جامع کلمہ ہے، جس کے معنی نصیحت کئے ہوئے شخص کے لئے خیرخواہی کا حق ادا کرنے کے ہیں، بعض علماء نے کہا کہ نصیحت کلام عرب میں سے وہ چھوٹا نام اور مختصر کلام ہے کہ اس کے پورے معنی ادا کرنے کے لئے کوئی دوسرا کلمہ نہیں ہے جس طرح فلاح کا لفظ بھی اسی شان کا ہے کیونکہ اس کے معنی بھی دین ودنیا کی بھلائی جمع کرنے کے ہیں، یہ سب تفصیل علامہ محقق حافظ عینی نے عمدۃ القاری میں کی ہے جو ماشاء اللہ ہر علم وفن کے مسئلے میں تحقیق کے دریا بہاتے ہیں۔ نہایت افسوس ہے کہ کم ہمت علماء نے حافظ عینی کے علوم سے استفادہ نہیں کیا، اس کے بعد حافظ عینی نے فرمایا کہ:

(۱) نصیحۃ للہ: یہ ہے کہ اس پر ایمان صحیح ہو، شرک کے پاس نہ پھٹکے، اس کی صفات میں الحاد نہ کرے (یعنی کج روی اختیار نہ کرے)، اس کو صفات جلال وجمال اور اوصاف کمال کا مظہر اتم خیال کرے۔، اور تمام نقائص وبرائیوں سے اس کو منزہ سمجھے، اس کی طاعت سے سرمو انحراف نہ کرے اور اس کے معاصی ومحرمات سے پورا اجتناب کرے، اس کے مطیع بندوں کے ساتھ تعلق موالات کا رکھے، نافرمانوں سے دلی عداوت اور ترک تعلق کرے اس کی نعمتوں کا اعتراف وشکر کرے اور تمام اعمال خیر میں اخلاص کو کام میں لائے وغیرہ۔

درحقیقت اس نصیحت للہ کا تمام تر فائدہ انسان کے اپنے حق میں ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی ناصح کی نصیحت کی نہ ضرورت ہے نہ اس سے اس غنی عن العالمین کو کچھ فائدہ!!

(۲) نصیحۃ لکتاب اللہ: (کتاب اللہ کے لئے نصیحت صحیح مسلم وغیرہ کی روایت میں ہے وہ یہ کہ اس کے کلام خداوندی ہونے پر ایمان ویقین ہو، مخلوق کے کلام میں سے کوئی کلام اس جیسا نہیں ہوسکتا، اس جیسے کلام پر مخلوقات میں سے کوئی قدرت نہیں رکھتا، پھر اس کی کماحقہ تعظیم وتلاوت کا حق ادا کرنا، اس کے تمام مضامین کی دل سے تصدیق اور اس کے علوم کو سمجھنے کی کوشش کرنا، اس کے محکمات پر عمل اور متشابہات پر بے چون وچرا ایمان لانا، اس کے ناسخ ومنسوخ، عام وخاص وغیرہ وجوہ واقسام کی بحث وتحقیق کرنا، اس کے علوم کی اشاعت اور دعوت وتبلیغ وغیرہ کرنا۔

(۳) نصیحۃ للرسول: یہ ہے کہ اس کی رسالت کی تصدیق کی جائے، اس کی لائی ہوئی ہر چیز پر ایمان ویقین ہو، اس کے اوامر ونواہی کی اطاعت ہو، دیاً ومیتاً اس کی نصرت کی جائے اس کا حق معظم ہو اور اس کے طریق وسنت کو ہمیشہ زندہ رکھنے کی سعی، سنن رسول کی تعلیم وتعلم کا اہتمام ہو، اس کے اخلاق جیسے اپنے اخلاق بنائے جائیں اور اس کے آداب ومعاشرت سے اپنی زندگی کو مزین کیا جائے اور اس کے اہل بیت واصحاب سے محبت کی جائے، وغیرہ۔

(۴) نصیحۃ للائمہ: یہ کہ حق پر ان کی اطاعت واعانت کی جائے، ان کی اصلاح کے لئے حسب ضرورت نرمی کے ساتھ ان کو وعظ ونصیحت کی جائے، ان کے مقابلہ میں خروج بالسیف وغیرہ سے احتراز کیا جائے، ان کے پیچھے نماز پڑھی جائے اور ان کے ساتھ جہاد میں شرکت کی جائے، بیت المال کے لئے ان کو صدقات ادا کئے جائیں، حافظ عینی نے فرمایا کہ یہ سب قول مشہور کے اعتبار سے لکھا گیا کہ ائمہ سے حدیث میں اصحاب حکومت مراد ہیں، جیسے خلفاء وشاہان اسلام، لیکن بعض کی رائے یہ بھی ہے کہ ائمہ سے مراد "علماء دین" ہیں، لہٰذا ان کے لئے نصیحت یہ ہے کہ جو کچھ وہ دین کے بارے میں بتلائیں، اس کو قبول کیا جائے، احکام شرعیہ میں ان کی اتباع کی جائے اور ان کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے۔

(۵) نصیحۃ للعامہ: یہ کہ ان کو مصالح دنیا وآخرت بتلائے جائیں، ان کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے، ان کی جہالت دور کی جائے، بروتقوی پر ان کی اعانت کی جائے، ان کے عیوب پر پردہ ڈالا جائے، ان پر شفقت کی جائے، ان کے حق میں وہ سب خیر وفلاح کی چیزیں پسند کی جائیں جو ہم اپنے لئے پسند کرتے ہیں، ان کے ساتھ خلوص کا معاملہ کیا جائے، بغیر کسی کھوٹ دغا اور فریب کے، وغیرہ۔

تنبیہ: واضح ہو کہ یہاں حدیث میں دعا مستہم سے مراد عامہ مسلمین ہی ہیں، اس لئے عامۃ الناس سے اس کا ترجمہ کرنا درست نہیں، یہ امر آخر ہے کہ ہمارے دین اسلام کا ایک حصہ عامۃ الناس، بلکہ ہر جاندار کے ساتھ بھی رحم وشفقت کا برتاؤ کرنا ہے اور دین اسلام پوری دنیائے انسان وجن وحیوان کے لئے سراپا رحمت وبرکت ہے۔

اسی لئے یہاں ترجمۃ الباب کے بعد کی دونوں حدیث میں بھی النصح لکل مسلم کی تصریح ہے، پھر یہاں سے عامۃ الناس کا مطلب نکالنا یا امام بخاری کی طرف اس کو منسوب کرنا کیسے صحیح ہوگا؟ واللہ علم

امام بخاری کا مقصد: ترجمۃ الباب سے یہ مقصود تھا کہ دین کا اطلاق عمل پر ہوتا ہے اور وہی حدیث سے بھی ثابت ہوا ابن بطالؒ نے کہا کہ امام بخاریؒ نے اس سے اس شخص کا رد کیا جو کہتا ہے کہ اسلام صرف قول ہے عمل نہیں، حافظ عینی نے فرمایا کہ بظاہر تو عکس مقصود ہو رہا ہے، کیونکہ جب رسول اکرم ﷺ نے اسلام پر بیعت لے لی اور اس کے بعد شرط کی نصح کل مسلم کی، تو معلوم ہوا کہ نصح کل مسلم اسلام میں داخل نہ تھی، اس لئے الگ سے اس کا ذکر کیا گیا، پھر یہ کہ اسلام اور دین کا اطلاق تو مجموعہ ارکان پر ہوتا ہی ہے اس میں اہل حق کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

فائدہ مہمہ علمیہ: حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ "الدین النصیحتہ" میں تعریف طرفین کے سبب قصر مفہوم ہو رہا ہے، اس مسئلہ میں علامہ تفتازانی کی رائے یہ ہے کہ قصر صرف ایک طرف سے ہوا کرتا ہے یعنی فقط معرف بلام الجنس کی طرف سے۔ لہٰذا ان کے نزدیک الامیر زید اور زید الامیر دونوں کا ایک ہی معنی ہوگا، ہر اعم کو اخص پر مقصور کریں گے۔

علامہ زمخشری نے ہر دو جانب سے قصر کو مانا ہے، کبھی مبتدا کی طرف سے، کبھی خبر کی طرف سے، میرے نزدیک بھی یہی حق ہے" فائق" میں حدیث " لا تسبو االدھر فان اللہ ھو الدھر " پر لکھا کہ اللہ مقصور ہے اور دہر مقصور علیہ، یعنی حق تعالیٰ حوادث خیر وشر کا جالب

وخالق ہی ہے، غیر جالب وخالق نہیں، میری رائے یہ ہے کہ اس میں تعریف المبتداء بحال الخبر ہے، جس طرح اس قول شاعر میں

فان قتل الھوی رجلا فانی ذلک الرجل

لہٰذا حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جس دہر کو تم بحیثیت جالب خیر وشر کے جانتے پہچانتے ہو، پس حق تعالیٰ ہی وہ دہر ہے (صرف اسی کی طرف یہ سب نسبتیں صحیح ہوسکتی ہیں) اور اسی کی طرح زمخشری نے کشاف میں "**اولئک ھم المفلحون**" کو کہا ہے، اور میرے نزدیک حدیث **ھو الطھور ماؤہ** بھی اسی کے مثل ہے، یعنی تم جس "طہور" کو قرآن مجید کی آیت "**وانزلنا من السماء ماء طھورا**" سے سمجھ چکے ہو وہ طہور یہی ہے اور "**الدین النصیحة**" کے معنی یہ ہوئے کہ دین صرف نصیحت وخیر خواہی پر مقصود ہے کہ اس میں کھوٹ قطعاً نہیں، مقصور اور خبر مقصور علیہ ہے۔

اسی طرح "**الدعاء ھو العبادة**" کے معنی یہ ہیں کہ دعاء مقصور ہے۔ صفت عبادت پر یہ نہیں کہ عبادت مقصور ہے دعاء پر جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا اور ترجمہ کیا کہ دعاء ہی عبادت ہے، حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے دعاء عبادت ہی ہے۔

حقیقت ایمان واسلام حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی نظر میں

"کتاب الایمان کے ختم پر ہم حضرت شیخ الشیوخ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے افادات کا خلاصہ ان کی تفسیر فتح العزیز سے پیش کرتے ہیں، جس کا حوالہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی مشکلات القرآن ص۱۲ میں دیا ہے۔

ایمان کا محل

ایمان کے معنی تصدیق کے ہیں، جس کا تعلق قلب سے ہے، اسی لئے **وقلبه مطمئن بالایمان** وغیرہ فرمایا گیا ہے، جن آیات میں ایمان کے ساتھ اعمال صالح کا ذکر کیا گیا ہے، یا باوجود ایمان برے اعمال پر توبیخ وزجر کیا گیا ہے، وہ اس کی دلیل ہے کہ نیک اعمال ایمان کا جزو نہیں ہیں، اور نہ برے اعمال ایمان سے باہر کرنے والے ہیں، نیز بغیر تصدیق قلب، محض لسانی اقرار کی بھی مذمت کی گئی ہے کیونکہ اقرار لسانی محض حکایت ایمان ہے، اگر وہ مطابق محکی عنہ نہیں تو وہ سراسر دھوکہ وفریب ہے۔

ہر چیز کے تین وجود ہیں

اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ ہر چیز کے تین وجود ہوتے ہیں۔ عینی، ذہنی ولفظی۔ چنانچہ ایمان کے لیے بھی یہ تینوں وجود ہیں۔ اور یہ بھی مقررہ ومسلمہ قاعدہ ہے۔ کہ ہر چیز کا وجود عینی تو اصل ہے ۱۲۔ باقی دونوں وجود اس کی فرع وتابع ہیں۔

ایمان کا وجود عینی

پس ایمان کا وجود عینی وہ نور ہے جو حق تعالیٰ اور بندے کے درمیان کے حجابات رفع ہو جانے کے سبب دل میں القاء ہوتا ہے اور اسی نور کی مثال آیت "**اللہ نور السموات والارض**" میں بیان ہوئی ہے اور اس کا سبب مذکورہ آیت "**اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور**" میں بیان ہوا ہے۔

یہ نور ایمان انوار محسوسات کی طرح قابل قوت وضعف بھی ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ جوں جوں حجابات مرتفع ہوتے جاتے ہیں۔ ایمان

میں زیادتی وقوت پیدا ہوتی ہے۔حتی کہ اوج کمال تک پہنچ جاتا ہے۔اور وہ نور پھیلتے پھیلتے تمام قویٰ و اعضائے انسانی کو احاطہ کر لیتا ہے اس وقت مومن کا سینہ کھل جاتا ہے۔وہ حقائق اشیاء پر مطلع،اور غیوب عالم غیب سے واقف ہو جاتا ہے،ہر چیز کو اپنے محل میں دیکھتا ہے،انبیائے کرام علیہم السلام کی بیان کی ہوئی تمام باتوں پر وجدانی طور سے یقین کرتا ہے اور اسی نور کی قوت وزیادتی کے باعث تمام شرعی اوامر ونواہی کی اطاعت اس کا قلبی داعیہ بن جاتی ہے،پھر یہ نور معرفت انوار اخلاق فاضلہ،انوار ملکات حمیدہ اور انوار اعمال صالحہ متبرکہ وغیرہ کے ساتھ مل کر اس کے شبستان ظلمات بہیمیہ وشہوانیہ میں چراغاں کا کام انجام دیتا ہے،تمام اندھیریاں کافور ہو جاتی ہیں،اور اسکا دل بقعۂ نور بن جاتا ہے جو مہبط انوار الٰہیہ ومرکز فیوض وبرکات سرمدیہ لامتناہیہ ہوتا ہے۔ **نور علی نور، یهدی الله لنوره من یشاء نورهم یسعی بین ایدیهم وبایمانهم** وغیرہ آیات اس پر شاہد ہیں

ایمان کا وجود ذہنی

اس کے دو مرتبے ہیں۔اجمالی وتفصیلی،اجمالی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے معارف متجلیہ وغیوب منکشفہ کا بوجہ کلی واجمالی ملاحظہ کرے،یہ مرتبہ کلمہ طیبہ **لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کی ذہنی وقلبی تصدیق کے وقت ہی حاصل ہو جانا چاہیے۔جس کو ''ایمان مجمل'' یا تصدیق اجمالی بھی کہتے ہیں۔تفصیلی یہ ہے کہ غیوب متجلیہ وحقائق منکشفہ کے ہر ہر فرد کا ملاحظہ مع ان کے باہمی ارتباط کے کرے،اس ملاحظہ کو ''تصدیق تفصیلی'' یا ایمان مفصل بھی کہتے ہیں۔

ایمان کا وجود لفظی

یہ صرف شہادتین کا زبانی اقرار ہے اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کا صرف لفظی وجود جبکہ اس کے لیے کوئی حقیقت ومصداق واقعی نہ ہو قطعاً بے سود ولا حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی نظر انداز نہیں ہو سکتی کہ موجودہ عالم اسباب میں کسی کے دل کا حال بھی ہم بغیر اس کے زبانی اقرار یا انکار کے معلوم نہیں کر سکتے اس لیے کلمہ شہادت کی زبانی ادائیگی ہی کو بظاہر حکم ایمان کا مدار قرار دینا پڑا،اور حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا **امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ،فاذا قالوها عصموا منی ومالهم دمائهم الا بحقها و حسابهم علی اللہ**. اس پوری تفصیل سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ ایمان کی زیادتی وکمی یا قوت وضعف کا کیا مطلب ہے اور واضح ہوا کہ حدیث صحیح میں جو **"لا یزنی الزانی حین یزنی وهو مومن" "الحیاء من الایمان"** اور **"لا یومن احدکم حتی یامن جاره بوائقه"** وارد ہوا ہے،وہ سب کمال ایمان اور اس کے وجود عینی پر محمول ہے اور جن حضرات نے ایمان میں زیادتی وکمی سے انکار کیا ہے ان کے پیش نظر ایمان کا پہلا مرتبہ وجود ذہنی کا ہے (یعنی تصدیق اجمالی یا ایمان مجمل والا مرتبہ) لہٰذا اہل حق کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے۔

ایمان کی اقسام

ایمان کی پہلی تقسیم یہ ہے کہ وہ تقلیدی بھی ہوتا ہے اور تحقیقی بھی،پھر تحقیقی کی دو اقسام ہیں۔استدلالی وکشفی اور ان دونوں کی بھی دو قسم ہیں،ایک وہ کہ ایک حد وانجام پر پہنچ کر رک جائے،اس سے تجاوز نہ کرے،جس کو علم الیقین کہتے ہیں۔دوسرے وہ کہ اس کی ترقی کے لیے کوئی حد وانجام نہ ہو،پھر اگر وہ نعمت مشاہدہ سے بہرہ ور ہو تو عین الیقین ہے اور شہود ذاتی سے مشرف ہو تو حق الیقین ہے اور آخر کی دونوں قسمیں ایمان بالغیب میں داخل نہیں ہیں۔ (فتح العزیز ص ۸۷، ۸۸)

اسلام کیا ہے؟ آیت " الذین ینقضون عهدالله من بعد میثاقه " کے تحت حضرت شاہ صاحبؒ نے تحریر فرمایا کہ جو شخص کلمہ اسلام پڑھ لیتا ہے یا پیغمبر خدا یا کسی اس کے خلیفہ سے بیعت کر لیتا ہے وہ خدا سے عہد و میثاق کر لیتا ہے کہ اس نے پیغمبر خدا کے ذریعہ آئے ہوئے تمام احکام کو قبول کر لیا، اور کتب سیر وشمائل کا مطالعہ کر کے پھر وہ معجزات وکرامات کے احوال دیکھ کر اپنے علم ویقین کو پختہ کر کے، اپنے عہد کو پختہ کر لیتا ہے اس کے بعد اگر خدانخواستہ اس عہد و میثاق میں کوئی بھی رخنہ اندازی یا عقائد واعمال میں کوئی غلطی یا تساہل گوارہ کرے گا تو سرحد ایمان واسلام سے نکل کر سرحد کفر وفسق میں داخل ہونے کے خطرہ سے دوچار ہوگا۔ و هذا اخر کتاب الایمان ولله الحمد والمنة و یتلوه کتاب العلم (فتح العزیز ص ۱۴۳)

نور ایمان کا تعلق نور محمدی سے

آخر کتاب الایمان میں حضرت شیخ عبدالعزیز دباغ قدس سرہ کے کلمات ''ابریز'' سے نقل کیے جاتے ہیں تا کہ دلوں کی روشنی بڑھ جائے اور نور ایمان میں قوت ہو (بقاء وجود کا) مادہ ساری مخلوق کی طرف ذات محمدی سے چلا ہے نور کے ڈوروں میں کہ نور محمدی سے نکل کر انبیاء، ملائکہ اور دیگر مخلوقات تک جا پہنچا ہے۔ اور اہل کشف کو اس استفاضہ نور کے عجائب وغرائب کا نظارہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک صالح شخص نے دیکھا کہ آں حضرت علیہ کے نور مکرم سے ملا ہوا ایک ڈورا ہے کہ کچھ دور تک دبنہ درخت کی طرح اکیلا چلا گیا ہے پھر اس میں سے نور کی شاخیں نکلنی شروع ہوئیں اور ہر شاخ ایک نعمت سے جو ذوات مخلوق کو منجملہ نعمتوں کی عطا ہوئی ہے جا ملی ہے۔

اسی طرح نور ایمان کو بھی نور محمدی کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے کہ جہاں یہ تعلق العیاذ باللہ، قطع ہوا فوراً ہی نور ایمان سلب ہو جاتا ہے۔

اللهم نور قلوبنا بانواره وبركاته وفيوضه صلى الله عليه وسلم . واعنا على ذكرك و شكرك وحسن عبادتك .

كِتَابَ الْعِلْمَ

بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ وَقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ .وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ وَ قَوْلِهٖ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا

(فضیلت علم اور حق تعالیٰ کا ارشاد کہ وہ اہل ایمان وعلم کو بلند درجات عطا کرے گا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال سے پوری طرح واقف ہے۔ اور حق تعالیٰ کا اپنے رسول کریم ﷺ کو ارشاد کہ آپ کہیے "میرے رب میرے علم میں زیادتی عطا فرما"

علم کے لغوی معنی

علامہ محقق حافظ عینیؒ نے علم کے لغوی معنی تفصیل سے بتلائے، اور یہ بھی لکھا کہ جوہری نے علم و معرفت میں فرق نہیں کیا، حالانکہ معرفت ادراک و جزئیات اور علم ادراک کلیات ہے، اسی لیے حق تعالیٰ کے لیے عارف کا اطلاق موزوں نہیں، ابن سیدہ نے کہا کہ علم نقیض جہل ہے، علامہ عالم انساب کو کہتے تھے یا بہت زیادہ اور امتیازی علم رکھنے والے کو ابوعلی نے کہا کہ علم کو علم اس لیے کہا گیا کیونکہ وہ علامت سے ہے جس کے معنی دلالت اور اشارت کے ہیں۔ اور علم ہی کی ایک قسم یقین ہے مگر ہر علم یقین نہیں ہوتا۔ البتہ ہر یقین علم ہوگا۔ کیونکہ یقین کا درجہ استدلال ونظر کے کمال اور پوری بحث وتمحیص کے بعد حاصل ہوتا ہے اور درایت بھی علم ہی کی ایک خاص قسم ہے۔

علم کی اصطلاحی تعریف

حد علم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے تو کہا کہ اس کی حد وتعریف ہو ہی نہیں سکتی جس کی وجہ سے امام الحرمین اور امام غزالی نے اس کی دشواری بتلائی اور کہا کہ صرف مثالوں اور اقسام سے اس کو سمجھایا جاسکتا ہے، امام فخر الدین رازی نے کہا کہ بدیہی اور ضروری امر ہے اس لیے اس کی حد نہیں ہوسکتی۔ دوسرے حضرات نے کہا اسکی حد وتعریف ہوسکتی ہے، پھر ان کے اقوال اس میں مختلف ہیں اور سب سے زیادہ صحیح حد وتعریف علم یہ ہے کہ وہ ایک صفت ہے، صفات نفس میں سے، جس سے امور معنویہ میں تمیز غیر محتمل النقیض حاصل ہوجاتی ہے تمیز کی قید سے حیات نکل گئی، غیر محتمل النقیض سے ظن وغیرہ خارج ہوا امور معنویہ سے ادراک حواس نکل گیا۔ (عمدۃ القاری ص ۳۸۰)

علم کی حقیقت

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علم ماتریدیہ وغیرہ کے نزدیک ایک نور یا صفت ہے جو قلب میں ودیعت رکھی گئی ہے، جس سے خاص شرائط کے ساتھ کوئی شئ منجلی اور روشن ہوجاتی ہے، جس طرح آنکھ میں قوت باصرہ ہوتی ہے پس علم واحد ہے اور معلومات متعدد ہوتی ہیں۔ البتہ تعدد اضافات ضروری ہے کیونکہ ہر معلوم کے ساتھ علم کا تعلق ہوتا ہے اور اسی سے متکلمین نے کہا ہے کہ علم اضافت ہے۔ ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ علم نور قلب یا صفت نفس نہیں ہے اور وہ محض اضافت ہے، جس پر فلاسفہ نے اعتراض کیا، غرض ماتریدیہ اور متکلمین میں حقیقت علم کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہے۔

فلاسفہ کی غلطی

پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فلاسفہ جو کہتے ہیں کہ علم حصول صورت یا صورت حاصلہ ہے اسکے لیے انکے پاس کوئی محکم وقوی دلیل نہیں ہے۔

علم ومعلوم الگ ہیں

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم ومعلوم متغایر بالذات ہیں اور فلاسفہ جو کہتے ہیں کہ متحد بالذات ہیں درست نہیں موجود کی طرح علم کا تعلق معدوم کیساتھ بھی ہوتا ہے جس کے لیے تخلل وتوسط صور کی ضرورت نہیں، جیسا کہ فلاسفہ نے کہا کیونکہ جب انہوں نے علم بالمعدوم کو مستحیل سمجھا تو درمیان میں صورتوں کا توسط مانا کہ پہلی صورت حاصل ہوتی ہے۔ پھر اسی کے واسطہ سے معدوم کا علم حاصل ہوجاتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ اس کو ان کے جہل وسفاہت سے تعبیر فرماتے تھے۔

علم کا حسن وقبح

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ علم کے حسن وقبح کا تعلق معلوم کے حسن وقبح سے ہے۔ اسی لئے امام بخاری نے اپنی کتاب کی بہترین ترتیب قائم کی ہے، اول وحی کو رکھا کہ ایمان وجمیع متعلقات دین کی معرفت اس پر موقوف ہے۔ نیز وہی سب سے پہلی خیر ہے۔ جو آسمان سے اس امت کی طرف نازل ہوئی۔ پھر کتاب الایمان لائے (کہ مکلّف) پر سب سے پہلا فریضہ وہی ہے اور تمام امور دین میں سے افضل علی الاطلاق بھی ہے۔ نیز ہر بھلائی ونیکی کا مبدأ اور ہر چھوٹے بڑے کمال کا منشاء بھی وہی ہے پھر کتاب العلم لائے کہ آئندہ آنے والی تمام کتب وابواب کا مدار اسی پر ہے۔ پھر طہارت کو ذکر کیا کہ مقدمہ صلوٰۃ ہے، پھر صلوٰۃ کہ وہ افضل عبادات ہے اور اسی طرح بعد کے ابواب درجہ بدرجہ ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ یہاں جس علم کی فضیلت بیان ہوئی ہے اس سے مراد علم شرعی ہے، جس سے مکلّف کو امور دین شریعت کی واقفیت حاصل ہوئی، مثلاً علم ذات وصفات باری، اس کے اوامر ونواہی اور عبادات، معاملات محرمات شرعیہ وغیرہ کا علم، تنزیہ باری تعالیٰ نقائص سے وغیرہ اس کا مدار علم تفسیر، علم حدیث وفقہ پر ہے اور جامع صحیح بخاری میں ان تینوں علوم کا بڑا ذخیرہ ہے۔ (فتح الباری ص ۱۰۵ ج ۱)

علم وعمل کا تعلق

علم اسی وقت کمال سمجھا جائے گا کہ وہ وسیلہ عمل ہو، جس سے رضاء خداوندی کا حصول میسر ہو، جو علم ایسا نہ ہوگا وہ صاحب علم کے لیے وبال ہوگا، اسی لیے حق تعالیٰ نے فرمایا "واللہ بما تعملون خبیر" تنبیہ فرمادی کہ کس بات سے اہل علم کا کمال اور فوز بالدرجات ہوگا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ خدا کی مرضی صرف عمل صحیح سے حاصل ہوگی جس کا علم بغیر واسطہ نبوت نہیں ہوسکتا، اس لیے اقرار رسالت کی ضرورت ہوئی اور جو لوگ رسالت سے منکر ہوئے وہ صابی کہلائے جیسے حضرت نوحؑ کے بعد کفار یونان وعراق نے رسالت سے انکار کیا۔

حنفاء وصابئین

حافظ ابن تیمیہ صابئین کی تحقیق سے قاصر رہے۔ شہرستانی نے اپنی کتاب ملل میں حنفا وصابئین کے مناظرہ کا حال تقریباً تیس ورق میں تحریر کیا ہے اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ صائبین طریق نبوت کے منکر تھے۔

حضرت آدمؑ کی فضیلت کا سبب

پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مفسرین نے سبب فضیلت آدم علیہ السلام میں بحث کی ہے اور انکی رائے ہے کہ فضیلت کا سبب علم تھا، لیکن میرے نزدیک اس کا سبب ان کی عبودیت تھی، کیونکہ خلافت کے مستحق بظاہر تین تھے، حضرت آدمؑ، ملائکہ اور ابلیس۔

استحقاق خلافت

ابلیس تو اباء استکبار و کفر وغیرہ کے سبب محروم ہوا، ملائکہ نے بنی آدم کے ظاہری احوال سے سفک دماء وفساد فی الارض وغیرہ کا اندازہ کر کے حق تعالیٰ کی جناب میں بے محل سوال کر دیا لیکن چونکہ ان کو اپنی غلطی پر اصرار نہ تھا، انکی مغفرت ہوگئی، رہے حضرت آدمؑ تو وہ ہر موقع پر عاجزی، نہایت تذلل اور تضرع وابتہال ہی کرتے رہے، اور حق تعالیٰ کی جناب میں کوئی بات بھی بجز عبودیت کے ظاہر نہیں کی، حالانکہ وہ بھی حجت ودلیل اور سوال وجواب کی راہ اختیار کر سکتے تھے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب مناظرہ ہوا تو ایسی قوی حجت پیش فرمائی کہ حسب ارشاد صادق ومصدوق علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام ہی غالب آگئے، یہی دلیل وہ حق تعالیٰ کے سامنے بھی پیش کر سکتے تھے مگر ایک حرف بطور عذر گناہ نہیں کہا، بلکہ اس کے برخلاف اپنے قصور کا اعتراف فرما کر مدت دراز تک توبہ واستغفار عجز ونیاز گریہ وزاری میں مشغول رہے، یہی وہ عبودیت اور سراپا طاعت نیازمندی کا وہ مقام تھا، جس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام خصوصی فضیلت اور خلعت خلافت سے سرفراز ہوئے اور حق تعالیٰ نے جو حضرت آدم علیہ السلام کے وصف علم کو اس موقع پر نمایاں فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کا وصف ظاہر تھا، جس کو سب معلوم کر سکتے تھے، اس لیے نہیں کہ وہ مدار فضیلت تھا، بخلاف وصف عبودیت کے کہ وہ ایک مستور وپوشیدہ صفت ہے اس کو معلوم کرنا دشوار ہے۔

بحث فضیلت علم

لہٰذا معلوم ہوا کہ علم کی فضیلت جب ہی ظاہر ہوتی ہے کہ عمل بھی اس کا مساعد ہو، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا علم تھا، اور ان کا علم عبودیت ہی کے سبب ان کے لیے فضل وکمال بن گیا تھا، دوسری وجہ یہ ہے کہ علم وسیلہ عمل ہے۔ اور ظاہر ہے جس کے لیے وسیلہ بنایا جاتا ہے وہ اس وسیلہ سے فائق وبرتر ہوا کرتی ہے۔

اس تمام تفصیل سے یہ مقصود نہیں کہ فی نفسہ علم کی فضیلت کا انکار کیا جائے کیونکہ وہ بھی اپنی جگہ ایک مسلم حقیقت ہے۔

ائمہ اربعہ کی آراء

بلکہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالکؒ تو فرماتے ہیں کہ علمی مشاغل، مشغولی نوافل سے افضل ہیں، امام شافعیؒ اس کے برعکس کہتے ہیں، امام احمدؒ سے دو روایت ہیں۔ ایک فضیلت علم کے بارے میں دوسری فضیلت جہاد کے بارے میں۔ (ذکرہ الحافظ ابن تیمیہ فی منہاج السنۃ) غرض یہاں بحث صرف وجہ وسبب خلافت سے تھی اور جس کو میں نے اپنے نزدیک حق وصواب سمجھا ہو وہ بیان کی گئی، واللہ اعلم بالصواب۔

علم پر ایمان کی سابقیت

قولہ تعالیٰ "یرفع اللہ الذین آمنوا الآیہ" پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں ایمان کی سابقیت علم پر بیان ہوئی ہے اور آیت کی غرض صرف علماء کی فضیلت بیان کرنا نہیں بلکہ پہلے عامۂ مومنین کی فضیلت بیان کرنا ہے۔ اور ثانوی درجہ میں علماء کی اور والذین اوتوا العلم سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان سے مشرف ہونے کے ساتھ دوسری چیز یعنی علم سے بھی نوازے گئے۔

درجات درجہ کی جمع ہے جس کا اطلاق صرف مدارج جنت پر ہوتا ہے، اس کے مقابل درکات ہے درکہ کی جمع، جس کا اطلاق صرف جہنم کے طبقات پر ہوتا ہے ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار۔

فائدہ: قاضی ابوبکر بن العربیؒ نے کہا کہ امام بخاریؒ نے علم کی تعریف وحقیقت نہ بیان کر کے، صرف فضیلت ذکر کی یا تو اس لیے کہ وہ نہایت واضح اور بدیہی چیز ہے یا اس لیے کہ حقائق اشیاء میں نظر و بحث موضوع کتاب نہیں تھی۔

قاضی صاحب موصوف نے اپنی شرح ترمذی میں ان لوگوں پر نکیر بھی کی ہے جنہوں نے علم کی حقیقت بتائی ہے اور کہا ہے کہ وہ بیان ووضاحت کی ضرورت سے قطعاً بے نیاز ہے۔ (فتح الباری ص۱۰۴ ج۱)

باب فضل العلم کا تکرار

یہاں ایک اہم بحث یہ چھڑ گئی کہ امام بخاریؒ نے یہاں بھی باب فضل العلم لکھا اور چند ابواب کے بعد پھر آگے بھی یہی باب ذکر کیا۔ اس تکرار کی کیا وجہ ہے؟

علامہ محقق حافظ عینیؒ کی رائے یہ ہے کہ بخاری کی زیادہ صحیح نسخوں میں یہاں باب فضل العلم کا عنوان موجود نہیں ہے بلکہ صرف کتاب العلم اور اس کے بعد **قول اللہ تعالیٰ یرفع اللّٰہ الذین امنوا الآیہ** ہے اور اگر صحیح مان لیا جائے تو اس لیے تکرار نہ سمجھنا چاہیے کہ یہاں مقصد علماء کی فضیلت بتلانا ہے، اور آئندہ باب میں علم کی فضیلت بتلائی ہے۔ فضیلت علماء یہاں اس لیے معلوم ہوئی کہ دونوں آیتیں جو ذکر کی ہیں اس پر دلیل واضح ہیں۔ اور باب فضل العلماء اس لیے نہ کہا کہ علم عالم کی صفت ہے جب ایک صفت کا فضل عنوان میں آ گیا تو لازمی طور سے اس کے موصوفین کی فضیلت بیان ہوگئی اور اگر ہم یہاں علماء کی فضیلت نہ سمجھیں گے تو دونوں آیتوں کے مضمون سے مطابقت بھی نہ ہو سکے گی اس لیے شیخ قطب الدین نے اپنی شرح میں ان دونوں آیتوں کے بعد فرمایا'' آثار سے ثابت ہو چکا ہے کہ علماء کے درجات، انبیاء علیہم السلام کے درجات سے متصل ہیں اور علماء ورثۃ الانبیاء ہیں، جو علوم انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوئے اور ان کو امت تک پہنچایا اور جاہلوں کی تحریفات سے انکو بچایا۔ پھر ایسے اور آثار بسط وتفصیل سے ذکر کئے جن سے علماء کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

ابن وہب نے مالک سے نقل کیا کہ میں نے زید بن اسلم سے سنا کہتے تھے **نرفع درجات من نشاء** . میں رفع درجات علم کی وجہ سے ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا کہ **یرفع اللّٰہ الذین امنوا منکم** میں حق تعالیٰ نے علماء کی مدح فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ علم سے بھی سرفراز فرمایا گیا ان کے دینی درجات ان لوگوں سے بہت بلند ہیں جن کو صرف ایمان کی دولت دی گئی ہے، بشرطیکہ وہ اوامر الٰہیہ کی پابندی کریں، بعض نے کہا ان کی رفعت ثواب وکرامت کے لحاظ سے ہے، بعض نے کہا رفعت بصورت فضل ومنزلت دنیوی مراد ہے، بعض کی رائے ہے کہ حق تعالیٰ علماء کے درجات آخرت میں بلند کرے گا۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جو صرف مومن ہونگے اور عالم نہ ہونگے۔

اسی طرح **رب زدنی علما** میں کہا گیا ہے کہ زیادتی علم کی باعتبار علوم قرآن کے ہے، اور جب بھی حضور علیہ السلام پر قرآن مجید کا کوئی کلمہ اترتا تھا، آپ علیہ السلام کے علم میں زیادتی ہوتی تھی، ظاہر ہے کہ آپ علیہ السلام کے علم وفہم کو کسی کا علم وفہم نہیں پہنچ سکتا اور جس قدر علوم قرآنیہ آپ علیہ السلام پر منکشف ہوئے کسی دوسرے پر منکشف نہیں ہوئے۔ اس لیے یہاں بھی آپ علیہ السلام کی فضیلت علمی کے ذیل میں بھی علماء ہی کی فضیلت نکلتی ہے، پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضور علیہ السلام کو بجز طلب زیادہ علم کے اور کسی چیز کی زیادتی طلب کرنے کا حکم نہیں ہوا، اور آپ علیہ السلام نے اس کے موافق زیادہ سے زیادہ علم طلب فرمایا بھی ہوگا جس کی قبولیت بھی بے ریب ہے، اس لیے آپ علیہ السلام کی علمی فضیلت کا مقام سب سے زیادہ بلند ہو جاتا ہے اور درجہ بدرجہ اسی طرح اور علماء کے درجات بھی سمجھے جا سکتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہاں حافظ عینی نے یہ بات اقوال سلف وغیرہ سے مدلل کردی کہ دونوں آیات مذکورہ سے علماء کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے، اور اگر یہاں باب فضل العلم کا نسخہ صحیح مان لیا جائے تو امام بخاری کا مقصد بھی فضیلت علماء کی طرف اشارہ ہے، اس کے بعد جب باب رفع العلم کے بعد امام بخاری باب فضل العلم لائے ہیں تو وہاں حافظ عینیؒ نے لکھا کہ یہاں علم کی فضیلت مقصود ہے۔ اور اسکی تحقیق ہم ابتداء کتاب العلم میں پوری طرح کر آئے ہیں۔ پھر لکھا کہ بعض (یعنی حافظ ابن حجر) نے جو یہ کہا کہ یہاں مراد فضل سے فضیلت مراد نہیں ہے، بلکہ فضل بمعنی زیادۃ اور ماجی و ما فضل ہے اور اس معنی کی وجہ سے تکرار ابواب بھی لازم نہ آئے گا، تو یہ بات اس لیے صحیح نہیں کہ امام بخاری نے یہ باب فضل بمعنی زیادۃ یا فضل کے لغوی معنی بتلانے کے لیے ذکر نہیں کیا، بلکہ ان کا مقصد اس باب سے فضیلت علم ہی بیان کرنا ہے، خصوصاً اس لیے بھی کہ یہ باب بھی دوسرے ابواب علم ہی کی طرح ہے، اس کو فضل لغوی کی طرف لے جانا درست نہیں، اور اگر اس بات کو حافظ ابن حجرؒ نے حضور اکرم ﷺ کے قول ثم اعطیت فضلی عمر سے سمجھا ہے تو اس کو ترجمۃ الباب میں کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ ترجمۃ الباب کا مقصد حضور ﷺ کا اپنا بچا ہوا عمر کو دینے کا بیان نہیں ہے، بلکہ علم ہی کا فضل و شرف بیان کرنا ہے۔ جس کا استنباط امام بخاری نے اس طرح کیا کہ حضور ﷺ نے جو خواب میں اپنا بچا ہوا دودھ حضرت عمرؓ کو دیا ہے اس کی تعبیر علم سے کی گئی ہے، اور یہی عین فضیلت ہے کیونکہ رؤیا جزء نبوت ہے۔ اور جو کچھ حضور ﷺ کا بچا ہوا ہے وہ یقیناً شرف و فضیلت ہی ہے۔ اور اس کی تعبیر و تفسیر علم سے ہوئی تو علم کی فضیلت ظاہر ہے۔

(عمدۃ القاری ص ۴۷۶ ج ۱)

حافظ نے حدیث مذکورہ کے تحت لکھا کہ ابن المنیر نے حدیث سے فضیلت علم کی وجہ اس حیثیت سے لی ہے کہ حضور ﷺ نے اس کی تعبیر علم سے دی ہے کیونکہ وہ حضور ﷺ کا بچا ہوا تھا۔ اور خدا کی دی ہوئی نعمت کا ایک حصہ تھا، اس سے بڑی فضیلت اور کیا ہوسکتی ہے؟ حافظ نے کہا کہ ابن المنیر نے فضل سے مراد فضیلت سمجھی ہے اور انہوں نے ہمارے ذکر کئے ہوئے نکتہ سے غفلت کی۔ (فتح الباری ص ۱۳۱ ج ۱)

حافظ نے اپنے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا کہ تکرار ابواب سے بچنے کے لیے یہاں فضل سے مراد باقی اور فاضل بچی ہوئی چیز لینا چاہیے جس کو حافظ عینیؒ نے خلاف تحقیق قرار دیا ہے اور امام بخاری کے مقصد سے بھی بعید بتلایا ہے۔

حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ نے درس بخاری شریف میں فرمایا کہ حدیث الباب میں اس امر کی دلالت ہے کہ اخذ علم، حضور ﷺ کا پس خوردہ حاصل کرنا ہے، اور یہ علم کی کھلی ہوئی فضیلت ہے لہٰذا روایت ترجمہ کے مطابق ہے۔ (لامع الدراری ص ۵۲ ج ۱)

اس کے علاوہ فضل العلم سے مراد فاضل اور بچا ہوا علم مراد لینا اس لیے بھی مناسب نہیں کہ اس معنی میں فضل العلم کا کوئی تحقق خارجی دشوار ہے اگر علم اور وہ بھی علم ربانی بھی ضرورت سے زیادہ یا فاضل ہوتا یا ہوسکتا تو نبی کریم ﷺ کو طلب زیادتی علم کی ترغیب و تحریض نہ ہوتی اور علم سے مراد کتب علم کی زیادتی وغیرہ لینا تاویل بعید معلوم ہوتی ہے، واللہ اعلم۔

حضرت شیخ الہند نے جو یہاں فضل علم سے فاضل و زائد علم مراد لیا اور اس کی توجیہ کسی بے حاجت شخص کے تحصیل علم خاص سے کی یا اس سے دوسرے علوم تجارت و زراعت وغیرہ مراد لئے وہ بھی اس مقام کے لئے موزوں نظر نہیں آتی، اور یہ سب محض اس لئے کہ تکرار ابواب کا مسئلہ حل کیا جائے، حالانکہ حافظ عینی نے اس قسم کے اعتذارات وغیرہ کی ضرورت اس لئے بھی نہیں سمجھی کہ صحیح نسخوں میں صرف ایک ہی جگہ باب فضل العلم ہے، دو جگہ نہیں۔

اس پوری تفصیل کے بعد یہ بات روشن ہے کہ حافظ عینی کی رائے زیادہ قوی اور مدلل ہے اور انہوں نے پہلے باب فضل العلم میں فضل کو

فضیلت علماء پر اس لئے محمول نہیں کیا کہ تکرار سے بچانے کی فکر تھی، بلکہ اس لئے کہ امام بخاری نے جو آیات پیش کی ہیں وہ فضل علماء ہی سے متعلق ہیں اور یہ رائے صرف ان کی نہیں بلکہ اکابر مفسرین و محدثین اور حضرت زید بن اسلم ؓ، حضرت ابن مسعود ؓ وغیرہ کی بھی ہے جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

حافظ عینی پر بے محل نقد

اس لئے صاحب ایضاح البخاری دام مجدہم کا یہ فرمانا کہ "علامہ عینی نے تکرار سے بچنے کے لئے یہاں مقصد فضیلت علماء بتایا ہے" اور یہ کہنا کہ "علامہ کی زبان سے یہ بات اچھی نہیں لگتی" پھر فرمایا کہ اس سے زیادہ غیر مناسب بات وہ ہے جو علامہ نے اس کے لئے بطور دلیل بیان کی ہے کہ ان آیات کا تعلق فضل علماء سے ہے نہ کہ فضل علم سے" عمدۃ القاری کے ان ہر دو متعلقہ مقامات کو اگر غور سے پڑھ لیا جاتا تو شاید اس طرح حافظ عینی کی تحقیق کو نہ گرایا جاتا۔ علامہ نے محض تکرار سے بچنے کے لئے نہ فضیلت علماء کا مقصد ذکر کیا اور نہ علم کے معنی میں تغیر کیا، بلکہ امام بخاری نے جو آیات ذکر کی ہیں ان کو خود اکابر امت نے ہی فضیلت علماء پر محمول کیا ہے اور حافظ نے ان کی اقتداء فرمائی، اگر علم کی فضیلت سے علماء کی فضیلت سمجھنا (جبکہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم جیسے ہیں) علم کے معنی میں تغیر کرنا ہے، تو اس کے مرتکب حافظ عینی سے پہلے شیخ قطب الدین وغیرہ بھی ہیں، جنہوں نے فضل العلم کے تحت امام بخاریؒ کی لائی ہوئی آیات کو فضل علماء کے لئے متعین فرمایا، نیز علامہ نے اس طرح کب لکھا کہ ان آیات کا تعلق فضل علماء سے ہے نہ کہ فضل علم سے، یہ جملہ "نہ کہ فضل علم سے" کا اضافہ کہاں سے نکل آیا؟ حالانکہ حافظ عینی خود فرماتے ہیں کہ فضیلت علم اور فضیلت علماء ایک دوسرے کو لازم ہیں، ایک چیز کو بھی ثابت کر لیا جائے تو دوسری ضرور اس کو مستلزم ہو جاتی ہے، پھر بھی ان کی طرف اس اضافی جملہ کی نسبت کس طرح مناسب ہے، اس کے بعد گذارش ہے کہ اگر چہ دوسری جگہ فضل سے مراد فاضل اور زائد کے لے سکتے ہیں مگر بقول حضرت گنگوہیؒ کے اس سے مطابقت روایت و ترجمہ باقی نہیں رہتی، اور خود حضرت شیخ الہند نے بھی تسلیم فرمایا ہے کہ مناسبت روایت و ترجمہ کے لئے تاویل و توجیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

حضرت گنگوہیؒ کی توجیہ

آخر میں حضرت گنگوہیؒ کی وہ توجیہ بھی ذکر کی جاتی ہے جو ابھی تک کہیں نظر سے نہیں گزری اور حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم و عمت فیوضہم نے حاشیہ لامع الدراری ص ۸۲ مولانا الشیخ المکی کے حوالے سے نقل کی ہے کہ حدیث رویا اللبن کا باب فضل العلم میں تو فضل جزی بیان ہوا ہے اور ابتداء کتاب العلم کے باب فضل العلم میں فضل کلی مراد ہے، اس طرح بھی تکرار نہیں رہتا اور فضل کے معنی میں تغیر بھی نہیں ہوتا۔

ترجمۃ الباب کے تحت حدیث نہ لانے کی بحث

ایک بحث یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے یہاں باب کے تحت کوئی حدیث ذکر نہیں کی، اس کی وجہ کیا ہے؟ بعض نے کہا کہ امام بخاری نے آیت سے استدلال فرمایا، اس لئے احادیث کی ضرورت نہ رہی، بعض نے کہا حدیث بعد کو ذکر کرتے، موقعہ میسر نہ ہوا ہوگا، بعض نے کہا کہ کوئی حدیث ان کی شرط کے موافق نہ ملی ہوگی بعض نے کہا کہ قصداً حدیث ذکر نہیں کی تاکہ علماء کا امتحان لیں کہ اس موقعہ کے لئے وہ خود مناسب احادیث منتخب کریں، بعض نے کہا کہ آئندہ ابواب میں جو حدیث آ رہی ہیں وہ سب مختلف جہات و حیثیات سے فضل علم پر دلالت کر رہی ہیں اگر یہاں کوئی حدیث ذکر کرتے تو اس سے صرف کوئی ایک جہت فضل معلوم ہو سکتی تھی۔

نااہل وکم علم لوگوں کی سیادت

حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا کہ اگلے باب میں جو حدیث آرہی ہے اس سے اس باب فضل العلم کا مقصد بھی پوری طرح ثابت ہورہا ہے، اس لئے یہاں حدیث ذکر نہیں کی اور یہ وجہ سب سے زیادہ دل کو لگتی ہے حضرتؒ نے فرمایا کہ نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد ہے "جب امور مہمہ نااہل لوگوں کو سونپے جانے لگیں تو قیامت کا انتظار کرو" کیونکہ امور مہمہ کو ان کے اہل و مستحق لوگوں کو سپرد کرنا اس امر پر موقوف ہے کہ ان امور اور ان کے اہل و مستحق لوگوں کے احوال و مراتب سے خوب واقفیت و علم ہو، گویا بقاء عالم تو سید امور الی الاہل پر موقوف ہے اور وہ علم پر موقوف ہے" لہٰذا علم کی فضیلت ظاہر ہے کہ وہ سبب بقاء نظام عالم ہوا۔ اسی طرح حافظ نے فتح الباری میں حدیث **اذا وسد الامر** پر لکھا کہ اس کی مناسبت کتاب العلم سے اس طرح ہے کہ **اسناد الامر الی غیر اهله** اسی وقت ہوگی جب غلبۂ جہل ہوگا اور علم اٹھنے لگے گا اور یہی علامات قیامت سے ہے، حدیث کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جب تک علم قائم رہے گا، خیر باقی رہے گی۔

پھر لکھا کہ امام بخاری نے یہاں اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ علم کو اکابر سے لینا چاہیے اور اس سے اس روایت ابی امیۃ الجمحی کی طرف تلمیح ہے کہ رسول اکرم علیہ السلام نے فرمایا "علامات قیامت میں سے یہ بھی ہے کہ علم اصاغر کے پاس سے طلب کیا جائے گا" (فتح الباری ص ۱۰۶ ج ۱)

رفع علم کی صورت

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ باب رفع العلم کے تحت معلوم ہو جائے گا کہ دنیا سے علم کے اٹھنے کے اسباب کیا ہوں گے؟ صحیح بخاری میں ہے کہ تدریجی طور سے علماء ربانیین کے اٹھنے کے ساتھ ساتھ علم بھی اٹھتا جائے گا (دفعۃً نہیں اٹھالیا جائے گا) مگر ابن ماجہ کی ایک صحیح روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کو علماء کے سینوں سے ایک رات میں نکال لیا جائے گا، جس کی توفیق و تطبیق ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ پہلے تو اسی طرح ہوگا، جس طرح بخاری میں ہے، مگر قیام قیامت کے وقت علم کو دفعۃً واحدۃً سینوں سے نکال لیا جائے، لہٰذا زمانوں کے اختلاف کی صورت میں کوئی تعارض نہیں۔

علمی انحطاط کے اسباب

اپنے چالیس سال کے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں اس سلسلہ کی چند سطور لکھی جاتی ہیں **وذلک لمن کان له قلب اوالقی السمع وهو شهید**

تحصیل علم کے سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کا پہلا چار سالہ قیام اس وقت ہوا تھا کہ دارالعلوم کا علمی عروج اوج کمال پر تھا، حضرت شاہ صاحب، حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمان صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب، حضرت میاں صاحب ایسے علم کے آفتاب و مہتاب مسند نشین درس تھے، حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب کے بے نظیر تدبر وانتظامی صلاحیتوں سے دارالعلوم نفع پذیر تھا، ہزاروں خوبیوں کے ساتھ کچھ خرابیاں بھی دراندازی کے راستے نکال لیا کرتی ہیں، اس سے ہمارا محبوب دارالعلوم کس طرح اور کب تک محفوظ رہتا، حضرت شاہ صاحب مفتی صاحب کے قلوب زاکیہ وصافیہ کسی خرابی کو کیسے پسند کرتے، ایک معمولی اور نہایت معقول اصلاح کی آواز اٹھائی گئی، جس کا آخری نقطہ صرف یہ تھا کہ چند اکابر کو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں داخل کر لیا جائے، مگر دیکھا یہ گیا کہ ارباب اہتمام واقتدار کے لئے اصلاح کی آواز سے زیادہ کسی چیز سے چڑ نہیں ہوتی اور اس کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جاسکتا، ان کا مزاج ہر بات کو برداشت کرسکتا ہے مگر

اصلاح کے الف کو بھی گوارا نہیں کرسکتا، چنانچہ چند جزوی اصلاحات قبول کرنے کے مقابلے میں حضرات اکابر وافاضل کی علیحدگی نہایت اطمینان ومسرت کے ساتھ گوارا کرلی گئی اور برملا کہا گیا کہ دارالعلوم کو ان حضرات کی ضرورت نہیں، ان ہی کو دارالعلوم کی ضرورت ہے اور دارالعلوم ان جیسے اور بھی پیدا کرسکتا ہے وغیرہ، واقعی! ایسے دل خوش کن اور اطمینان بخش جملوں سے اس وقت کتنے ہی قلوب مطمئن ہوگئے ہوں گے، مگر کوئی بتلا سکتا ہے کہ ان ۳۸ سال کے اندر دارالعلوم نے کتنے انورشاہ، کتنے عزیزالرحمان اور کتنے شبیراحمد عثمانی پیدا کئے؟

اہتمام کا مستقل عہدہ

کم وبیش اسی قسم کے حالات دوسرے اسلامی مراکز ومدارس کے بھی ہیں، اہتمام کا عہدہ جب سے الگ اور مستقل ہوگیا ہے اور وہ بیشتر غلط ہاتھوں میں پہنچ جاتا ہے، اسی وقت یہ خرابیاں رونما ہوئی ہیں، پہلے زمانہ میں مدرسہ کا صدر مدرس یا پرنسپل ہی صدر مہتمم بھی ہوتا تھا اور وہ اپنے علم وعمل کی بلندی مرتبت کے سبب صحیح معنی میں معتمد وامین ہوتا تھا۔ عصری کالجوں کے پرنسپل بھی ایسے ہی بلند کردار اور معتمد حضرات ہوتے ہیں۔ جس زمانے سے اہتمام کا عہدہ مستقل ہوا اور اس کے تحت بڑے بڑے علماء ومشائخ مسلوب الاختیار اور اہتمام کے دست نگر بن گئے تو ارباب اہتمام کے دماغ عرش معلےٰ پر پہنچ گئے، اور وہ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے شب وروز تدابیر سوچتے رہتے ہیں، اگر مدارس عربیہ کے صدر مدرس، شیخ الحدیث یا شیخ التفسیر وغیرہ کو کلی اختیارات حاصل ہوں، یا کم از کم غلط طریقہ پر اختیارات استعمال کرنے پر ارباب اہتمام کی گرفت کرنے کا ان کو حق ہو تو علم واہل علم کی یوں بے قدری نہ ہو، جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مدارس کو جس قدر رقوم دی جاتی ہیں وہ مہتممان مدارس کے اطمینان پر یا ان کے بے جا تصرفات کے لئے نہیں، بلکہ محض اہل علم وارباب تقوی کے اعتماد واطمینان پر دی جاتی ہیں، دوسرے درجہ میں خرابیوں کی ذمہ دار مدارس کی منتظمہ جماعتیں ہیں، اور ان میں سے جو لوگ ارباب اہتمام واقتدار کی غلطیوں پر گرفت نہیں کر سکتے، یا کسی تعلق ومصلحت کے تحت اصلاح حال کا حوصلہ کرنے سے عاجز ہیں وہ کسی طرح بھی ان امانات الٰہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کے اہل نہیں ہیں اور وہ بھی **اذا وسد الامر الی غیر اھلہ الحدیث** کے مصداق ہیں۔

علمی ترقیات سے بے توجہی

ایک عرصہ سے علمی انحطاط کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ارباب اہتمام اپنے اداروں کی علمی ترقیات پر بہت کم توجہ صرف کرتے ہیں اور بہت سوں کی خود ذاتی مصروفیات اور کاروبار ہی اتنے ہیں کہ وہ معمولی اوپر کی دیکھ بھال اور حسب ضرورت جوڑ توڑ کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتے، بلکہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے ان عہدوں کو ذاتی وجاہت اور شخصی منفعتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اہتمام کے نام سے بیش قرار مشاہرے الگ وصول کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ علمی درسگاہوں کے فارغین بھی اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور اپنے محسن علمی مرکزوں کی اصلاح حال کے لئے خاص توجہ کریں، تاکہ علم کے روز افزوں انحطاط نیز مدارس کی انتظامی خرابیوں اور بیجا مصارف وغیرہ کا سدباب ہوسکے۔

اساتذہ کا انتخاب

آج کل مہتممین مدارس ایسے اساتذہ کو پسند کرتے ہیں جو ان کی خوشامد وتملق کریں، غائب وحاضران کی مدح سرائی کریں، ہر موقعہ پر ان کی جاوبیجا حمایت کریں، غرض اینکہ ماہ وپرویں کے صحیح مصداق ہوں۔ خواہ علم وعمل کے لحاظ سے کیسے ہی کم درجہ کے ہوں، یہی وجہ ہے کہ بہت سے بڑے مدارس میں طلبہ کو ایسے اساتذہ سے علم حاصل کرنا پڑتا ہے، جن سے بہت زیادہ علم وفضل والے چھوٹے مدارس میں

موجود ہوتے ہیں اس طرح یہ ارباب اہتمام طلبہ کو مجبور کرتے ہیں کہ بجائے اکابر اہل علم کے اصاغر اہل علم سے اخذ علم کریں۔ جس کی پیش گوئی حدیث میں قرب قیامت کے سلسلے میں کی گئی ہے اور یہ بھی ایک بڑا سبب علمی انحطاط کا ہے۔

اساتذہ کی اعلیٰ صلاحیتیں بروئے کار نہیں آتیں

اس کے علاوہ علمی انحطاط کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ بہت سے مستعد اور اعلیٰ قابلیت کے اساتذہ بھی کسی ادارے میں پہنچ کر وہاں کے ماحول سے متاثر ہوتے ہوئے اپنے خاص علمی مشاغل اور مطالعہ کتب وغیرہ کو چھوڑ کر دوسرے دھندوں میں لگ جاتے ہیں، اس طرح ان کی بہتر علمی صلاحیتوں سے ادارہ کو فائدہ نہیں پہنچتا، غرض اس قسم کی خرابیاں اور نقائص ہمارے علمی اداروں میں اکثر پیدا ہوگئی ہیں، الا ماشاء اللہ، اللہ تعالیٰ علوم نبوت کی ان نشر گاہوں اور اسلام و شریعت کے ان محافظ قلعوں کو تمام نقائص سے پاک کر کے پہلے کی طرح زیادہ نفع بخش فرمائے وما ذلک علی اللہ بعزیز

بَابُ مَنْ سُئِلَ عِلْمًا وَّ هُوَ مُشْتَغِلٌ فِیْ حَدِیْثِهٖ فَاَتَمَّ الْحَدِیْثَ ثُمَّ اَجَابَ السَّآئِلَ

باب اس شخص کے حال میں جس سے کوئی علمی سوال کیا گیا، جبکہ وہ دوسری گفتگو میں مشغول تھا، تو اس نے گفتگو کو پورا کیا، پھر سائل کو جواب دیا۔

(۵۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ قَالَ ثَنَا فُلَیْحٌ ح قَالَ وَحَدَّثَنِیْ اِبْرٰهِیْمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُلَیْحٍ قَالَ ثَنَا اَبِیْ قَالَ حَدَّثَنِیْ هِلَالُ بْنُ عَلِیٍّ عَنْ عَطَآءِ بْنِ یَسَارٍ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ بَیْنَمَا النَّبِیُّ صَلَّے اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ مَجْلِسٍ یُحَدِّثُ الْقَوْمَ جَآءَهٗ اَعْرَابِیٌّ فَقَالَ مَتَی السَّاعَةُ؟ فَمَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّے اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُحَدِّثُ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ سَمِعَ مَا قَالَ فَکَرِهَ مَاقَالَ وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَمْ یَسْمَعْ حَتّٰی اِذَا قَضٰی حَدِیْثَهٗ قَالَ اَیْنَ اُرَاهُ السَّآئِلَ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ هَا اَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَاِذَا ضُیِّعَتِ الْاَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ فَقَالَ کَیْفَ اِضَاعَتُهَا قَالَ اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے ارشادات فرما رہے تھے کہ ایک اعرابی حاضر ہوا اور سوال کیا؟ قیامت کب آئے گی؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پہلی گفتگو برابر جاری رکھی (جس پر) بعض لوگوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو درمیان گفتگو اس کا سوال ناگوار ہوا اور بعض نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید اس کی بات ہی نہیں سنی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بیان ختم فرما کر پوچھا کہ قیامت کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ سائل نے عرض کیا میں حاضر ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب امانت ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو" عرض کیا کہ امانت ضائع کرنے کی کیا صورت ہے؟ فرمایا کہ جب مہمات امور نا اہل لوگوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو قیامت (قریب ہی ہوگی) اس کا انتظار کرنا چاہیے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ ضیاع امانت سے مراد یہ ہے کہ کسی دوسرے پر اعتماد باقی نہ رہے۔ نہ دین کے معاملہ میں، نہ دنیا کے اور

میرے نزدیک امانت ایک ایسی صفت ہے، جو ایمان پر بھی مقدم ہے اسی لئے حدیث میں ہے " **لا ایمان لمن لا امانة له** " لہٰذا سب سے پہلے دل پر امانت کی صفت اپنا رنگ جماتی ہے اس کے بعد ایمان کا رنگ چڑھتا ہے کیونکہ جس طرح وصف امانت کے سبب لوگ کسی پر بھروسہ و اعتماد کرتے ہیں اسی طرح ایمان بھی ایک صفت اعتماد ہے بندہ اور خدا رسول خدا علیہ کے درمیان؟ چنانچہ علماء نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک شخص اگر پوری شریعت کو اپنی ذاتی تحقیق کی بناء پر یقینی جانتا ہو مگر رسول خدا پر اس کو اعتماد نہ ہو تو وہ کافر ہے اور اگر رسول علیہ پر بھی وثوق و اعتماد ہو گا تو وہ مومن ہے، یہی وثوق و اعتماد کی صفت امانت و ایمان میں مشترک ہے؟ حدیث میں آتا ہے کہ امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں اتری، پھر قرآن مجید نازل ہوا اس سے معلوم ہوا کہ امانت بمنزلہ تخم ہے پھر ایمان و اعمال صالحہ وغیرہ سے اس کی آبیاری اور نشو ونما کی صورت ہوتی ہے۔

حدیث سے متعدد آداب معلوم ہوئے، سوال ایسے وقت کرنا چاہیے کہ جواب دینے والا فارغ ہو، اور جواب دینے والے کے لئے اس امر کی گنجائش ہے کہ اپنا کام یا کلام پورا کر کے جواب دے، سائل کو جواب سے تشفی نہ ہو تو تحقیق مزید کر سکتا ہے، حافظ عینی نے فرمایا کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجیب جواب کے اندر وسعت کر سکتا ہے، بلکہ کرنی چاہیے اگر ضرورت و مصلحت ہو، اور تقدیم اسبق بھی معلوم ہوئی، کیونکہ رسول اکرم علیہ نے پہلے لوگوں کی تعلیم جاری رکھی، پھر بعد والے کو حق دیا، لہٰذا قاضی، مفتی، مدرس وغیرہ کو بھی تقدیم اسبق کا اصول اختیار کرنا چاہیے۔

حافظ عینی نے اس باب کی باب سابق سے وجہ مناسبت کے لئے لکھا ہے کہ اس باب میں اس عالم کا حال بیان ہوا ہے جس سے ایک مشکل مسئلہ دریافت کیا گیا، اور ظاہر ہے کہ مسائل مشکلہ علماء فضلاء و عاملین بالعلم سے ہی پوچھے جا سکتے ہیں جو آیت " **یرفع الله الذین آمنوا والذین اوتوا العلم درجات** ." کے مصداق ہو سکتے ہیں۔

" **اذا وسد الامر الی غیر اهله** " پر حضرت شاہ صاحبؒ نے چند ائمہ و محدثین کے واقعات سنائے، فرمایا کہ امام شافعیؒ مالدار نہیں تھے اور جو ہدایا و تحائف لوگ پیش کرتے تھے ان کو بھی فوراً مستحقین پر صرف کر دیتے تھے، اس لئے ہمیشہ عسرت میں بسر کرتے تھے، ان کے ایک شاگرد ابن عبدالحکم بڑے مالدار تھے، اور وہ امام صاحب کی بہت خدمت کرتے تھے، ایک مرتبہ امام شافعیؒ ان کے یہاں مہمان ہوئے، تو انہوں نے ضیافت کا نہایت اہتمام کیا، باورچی کو انواع و اقسام کے کھانے تیار کرنے کی ہدایت کی اور ان کھانوں کے نام لکھ کر اس کو دیئے امام شافعیؒ کی نظر اس فہرست پر پڑی تو آپ نے بھی ایک کھانے کا نام اپنی رغبت کے مطابق اس میں اپنے ہاتھ سے لکھ دیا، ابن عبدالحکم کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس کی خوشی میں اپنے غلام کو آزاد کر دیا،...... اتنے قریبی تعلق و احسانات کے باوجود جب امام شافعی کی عمر ۵۴ سال کو پہنچی اور آپ کو احساس ہوا کہ سفر آخرت کا وقت قریب ہے تو لوگوں نے آپ سے درخواست کی کہ اپنا جانشین نامزد فرمائیں، اس وقت ابن عبد الحکم بھی موجود تھے اور ان کو توقع بھی تھی کہ مجھ کو اپنا جانشین بنائیں گے، مگر امام شافعی نے اس بارے میں کسی کی رعایت نہیں کی اور جو صحیح معنی میں مستحق جانشینی کے تھے، یعنی شیخ اسماعیل بن یحییٰ مزنی شافعیؒ (امام طحاوی کے ماموں) ان ہی کو جانشین مقرر کیا۔

اسی طرح ہمارے شیخ ابن ہمام حنفی نے بھی کیا انہوں نے مدۃ العمر درس و تعلیم کی کوئی اجرت نہیں لی بوجہ اللہ علم کی خدمت کرتے تھے، بڑے زاہد و عابد اور شیخ طریقت تھے، خانقاہ کے متولی بھی خود تھے اور اس کی آمدنی سے محض گذارہ کے موافق لیتے تھے، بادشاہ مصر آپ کے نہایت معتقدین میں سے تھا جب کسی معاملہ میں رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی تو آپ ہی سے سوال کرتا تھا حالانکہ اس وقت حافظ عینی اور حافظ ابن حجر بھی موجود تھے۔

جس وقت آپ کی وفات کا وقت قریب ہوا اور جانشین کا سوال ہوا تو آپ نے بھی بے رورعایت اپنے سب سے بہتر تلمیذ علامہ قاسم بن قطلو بغا حنفی کو نامزد فرمایا کیونکہ آپ کے تلامذہ میں سے وہی سب سے زیادہ اورع واتقی تھے اور ان کے غیر معمولی ورع وتقوی ہی کے باعث دوسرے مذاہب کے علماء وصلحاء بھی ان کے معتقد تھے حتی کہ جب انہوں نے شیخ عبدالبر بن الشجنہ (تلمیذ شیخ ابن ہمام) سے بادشاہ وقت کی موجودگی میں مناظرہ کیا تو مذاہب اربعہ کے علماء دور دور سے آکر ان کی تائید کے لئے جمع ہو گئے تھے۔

ایسا ہی واقعہ شیخ ابوالحسن سندی کا ہے (بارہویں صدی ہجری کے اکابر محدثین میں سے تھے) جو اپنے شیخ واستاذ المحدثین مولانا محمد حیات سندیؒ کے درس میں ساکت وصامت بیٹھے رہا کرتے تھے، کوئی دوسرا ان کے ظاہری حال سے علم وفضل اور کمالات باطنی کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا، مگر جب ان کے شیخ موصوف کی رحلت کا وقت قریب ہوا تو ان ہی کو جانشین بنایا لوگ متعجب ہوئے، مگر جب آپ کے بے نظیر کمالات رونما ہوئے تو سمجھے کہ آپ سے بہتر جانشین نہیں ہوسکتا تھا۔

راقم الحروف کو حضرت العلام مولانا محمد بدر عالم صاحب مولف فیض الباری دامت برکاتہم کی رائے سے اتفاق ہے کہ ۱۳۳۲ھ میں جب حضرت استاذ الاساتذہ شیخ الہند قدس سرہؒ نے سفر حجاز کا عزم فرمایا تو آپ کے بہت سے تلامذہ ایک سے ایک فائق اور علوم وکمالات کے جامع موجود تھے مگر آپ نے بلا کسی رورعایت کے حضرت اقدس علامہ کشمیریؒ کو جانشینی کے فخر سے نوازا جو شیخ ابوالحسن سندیؒ کی طرح نہایت خاموش طبیعت زاویہ نشین اور نمود ونمائش سے اپنے کوسوں دور رکھنے والے تھے، مگر حضرت شیخ الہندؒ سے آپ کے کمالات کی برتری اور بہترین صلاحیتیں مخفی نہ تھیں، آپ نے جانشینی سے قبل وبعد صرف گزارہ کے مطابق مشاہرہ قبول فرمایا، آپ کا زمانہ قیام دارالعلوم کی علم ترقیات کا نہایت زریں اور بے مثال دور تھا اور آپ کے بے نظیر علم وتقوی کے گہرے اثرات اور انوار وبرکات سے دارالعلوم اور باہر کی پوری فضا متاثر تھی مگر "خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود" واللہ الامر من قبل ومن بعد

بَابُ مَنْ رَفَعَ صَوْتَهُ بِالْعِلْمِ

(اس شخص کا بیان جو کسی علمی بات کو پہنچانے کے لئے آواز بلند کرے)

(۵۹) حَدَّثَنَا اَبُو النُّعْمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ عَوَانَةَ عَنْ اَبِیْ بِشْرٍ عَنْ یُوْسُفَ بْنِ مَاهَکَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ تَخَلَّفَ عَنَّا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ سَفْرَةٍ سَافَرْنَاهَا فَاَدْرَکَنَا وَقَدْ اَرْهَقَتْنَا الصَّلٰوةُ وَ نَحْنُ نَتَوَضَّاءُ فَجَعَلْنَا نَمْسَحُ عَلٰی اَرْجُلِنَا فَنَادٰی بِاَعْلٰی صَوْتِهٖ وَیْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ مَرَّتَیْنِ اَوْ ثَلٰثًا.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ ہم سے پیچھے رہ گئے، پھر (آگے بڑھ کر) آپ ﷺ نے ہم کو پالیا، اور اس وقت نماز کا وقت تنگ ہونے کی وجہ سے (ہم عجلت کے ساتھ) وضو کر رہے تھے۔ تو ہم (جلدی میں) اپنے پیروں پر پانی پھیرنے لگے، آپ نے پکار کر فرمایا، ایڑیوں کے لئے آگ (کے عذاب) سے خرابی ہے، دو مرتبہ یا تین مرتبہ (فرمایا)

تشریح: نماز کا وقت تنگ ہونے کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم پاؤں پر فراغت کے ساتھ پانی ڈالنے کی بجائے ہاتھ سے ان پر پانی پھیرنے لگے۔ اس وقت چونکہ رسول اللہ ﷺ ان سے ذرا فاصلے پر تھے، اس لئے آپ ﷺ نے پکار کر فرمایا کہ ایڑیاں خشک رہ جائیں گی تو وضو پوری نہ ہوگی جس کے سبب عذاب ہوگا۔

حدیث میں جس نماز کا ذکر ہے وہ نماز عصر تھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ سمجھ کر کہ نماز کا وقت تنگ ہوا جا رہا ہے جلد جلد وضو کیا اور اسی عجلت میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے پیر دھونے کی پوری رعایت نہ ہو سکی، بعض کی ایڑیاں خشک رہ گئیں جن کو دیکھ کر حضور اکرم ﷺ نے تنبیہ فرمائی اور بلند آواز سے ناقص وضو والوں کا انجام بتلایا۔

مقصد ترجمۃ الباب: یہ ہے کہ جہاں بلند آواز سے سمجھانے بتانے کی ضرورت ہو وہاں آواز کا بلند کرنا درست اور مطابق سنت ہے اور بے ضرورت علم و تعلیم کے وقار کے خلاف ہے، حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے کو نصیحت فرمائی تھی۔ "**واغضض من صوتک ان انکر الاصوات لصوت الحمیر**،، (بولنے میں اپنی آواز پست رکھو بیشک سب آوازوں سے کریہہ آواز گدھے کی ہوتی ہے) وہ بے ضرورت اور عادۃً چیختا ہے اس طرح بہت زور سے بولنے میں بعض اوقات آدمی کی آواز بھی ایسی ہی بے ڈھنگی اور بے سری ہو جاتی ہے اس سے روکا گیا اور حسب ضرورت بلند آواز کی اجازت دکھلائی گئی۔

افادات انور: حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ "**نمسح علی ار جلنا**" میں مسح کنایہ عجلت و جلد بازی سے ہے کہ عجلت میں پانی بہادیا، کہیں پہنچا، کہیں نہیں پہنچا، اور پانی کی قلت تو ظاہر تھی ہی خصوصاً حالت سفر میں، یہ مقصد نہیں ہے کہ انہوں نے پیروں پر مسح عرفی کیا تھا، اور یہ بھی صحیح نہیں کہ پہلے پیروں کا مسح جائز تھا پھر منسوخ ہو گیا جیسا کہ طحاوی سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی رائے تھی امام طحاویؒ کو لفظ مسح سے مغالطہ ہوا یا ممکن ہے مسح سے مراد غسل خفیف لیا گیا ہو جو ابتداء اسلام میں ہوگا کہ پوری رعایت سے پورے پیر دھونے کا اہتمام نہ تھا، جیسا کہ یہاں حدیث الباب میں بھی عجلت میں بے اعتنائی کی صورت ہوئی لیکن جب آنحضرت ﷺ نے اس معاملہ میں صحابہ کی لاپروائی دیکھی تو سخت تنبیہ فرما کر اہتمام سے پورے پاؤں دھونے کا حکم فرمایا اور اسی کو امام طحاویؒ نے نسخ فرمایا کیونکہ نسخ کا اطلاق تخصیص و تقلید پر بھی ہوا ہے اس کے علاوہ امام طحاوی کے یہاں مسح رجلین کا ثبوت بعض قوی آثار سے اب بھی ہے، مگر وہ وضوء علی الوضوء میں ہے، وضو حدث یا وضو صلوٰۃ میں نہیں ہے۔

حدیث الباب کے تحت حافظ عینی نے مابک کی تحقیق بہت خوب کی ہے' جو آپ کے امام عربیت ہونے پر شاہد ہے' اور اس تحقیق کے ضمن میں" آپ نے حافظ ابن حجر اور علامہ کرمانی کی آراء پر نقد بھی کیا ہے' جو قابل مطالعہ ہے' ہم بخوف طوالت اس کو ترک کر دیا ہے۔

مسح سے مراد غسل ہے

حافظ عینیؒ نے لکھا کہ قاضی عیاض نے بھی مسح سے مراد غسل ہی لیا ہے، پھر حافظ عینی نے فرمایا کہ امام طحاوی کی طرف جو بات منسوب ہوئی ہے اس میں نظر ہے، کیونکہ مسح الرجل سے مراد غسل خفیف بھی ہو سکتا ہے، جو مشابہ مسح ہے اور دیکھنے والا اس کو مسح ہی سمجھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر پہلے سے پیروں کا دھونا فرض نہ ہوتا تو وعید کا ذکر کیوں فرماتے، بغیر وعید کے صرف یہ ارشاد فرمادیتے کہ آئندہ غسل کیا کرو۔ (عمدۃ القاری ص ۳۸۸ ج ۱)

ویل للاعقاب من النار: محدث ابن خزیمہؒ نے فرمایا:۔ "اگر مسح سے بھی اداء فرض ہو سکتا تو وعید بالنار نہ ہوتی" اس سے ان کا اشارہ فرقہ شعیہ کے اختلاف کی جانب ہے جو کہتے ہیں کہ قراءت وارجلکم (بالخفض) سے وجوب مسح ہی ثابت ہے اسکے علاوہ حضور ﷺ کے وضو کی صفت متواتر احادیث سے منقول ہے جس سے پاؤں کا دھونا ہی ثابت ہے اور آپ کے متواتر عمل سے امر خداوندی کا بیان ہو گیا تیسرے یہ کہ کسی صحابی سے بھی اس کے خلاف ثابت نہیں ہے بجز حضرت علی و عباس کے، اور ان سے بھی رجوع ثابت ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلی نے فرمایا کہ تمام اصحاب رسول اللہ ﷺ کا اجماع و اتفاق پاؤں دھونے پر ہو چکا ہے۔ (رواہ سعید بن منصور)

فتح الباری میں ہے کہ امام طحاویؒ وابن حزم نے مسح کے منسوخ ہونے کا دعوی کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ وضو میں پاؤں دھونے کا انکار ایسا ہے کہ جیسے کوئی معاند غزوہ بدر واحد جیسے واقعات کا انکار کردے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے فرمایا:۔ جن حضرات نے حضور اکرم ﷺ کے وضوء کا حال قولاً وفعلاً نقل کیا ہے اور جن لوگوں نے حضور ﷺ سے وضوء کو سیکھا ہے اور آپ ﷺ کے زمانے میں وضوء کیا اور ان کو وضوء کرتے ہوئے حضور ﷺ نے مشاہدہ فرمایا اور پھر ان کے وضوء کا حال بعد کے لوگوں نے نقل کیا وہ سب ان لوگوں کے لحاظ سے بہت ہی زیادہ ہیں جنہوں نے آیت مذکورہ کولام کے زیر کے ساتھ نقل کیا ہے۔ الخ (فتح الملہم ص ۴۰۴ ج ۱)

بَابُ قَوْلِ الْمُحَدِّثِ حَدَّثَنَا وَاَخْبَرَنَا وَاَنْبَاَنَاوَقَالَ الْحُمَيْدِيُّ كَانَ عِنْدَ ابْنِ عُيَيْنَةَ حَدَّثَنَا وَاَخْبَرَنَا وَاَنْبَاَنَا وَسَمِعْتُ وَاحِداًوَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَ سَلَّمَ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ وَقَالَ شَقِيْقٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَ سَلَّمَ كَلِمَةً كَذَاوَقَالَ حُذَيْفَةُ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ حَدِيْثَيْنِ وَقَالَ اَبُو الْعَالِيَةِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِيْمَا يَرْوِيْهِ عَنْ رَّبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ وَقَالَ اَنَسٌ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَرْوِيْهِ عَنْ رَّبِّهٖ عَزَّ وَجَلَّ وَقَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَرْوِيْهِ عَنْ رَّبِّكُمْ عَزَّوَجَلَّ.

(محدث کے الفاظ حدثناء، اخبرنا اور انبانا کا بیان) حمیدی نے کہا کہ حضرت ابن عیینہ، حدثنا، اخبرنا انبانا اور سمعت کو برابر سمجھتے تھے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے حدیث بیان فرمائی اور آپ صادق ومصدوق ہیں۔ شقیق نے حضرت ابن مسعود سے روایت کی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک کلمہ سنا، حضرت حذیفہؓ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے ہم سے دو حدیثیں بیان فرمائیں، ابوالعالیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اور حضرت رسالت مآب نے اپنے رب عز وجل سے روایت کی، حضرت انسؓ نے بھی حضور اکرم ﷺ سے آپ کی روایت رب عز وجل سے نقل کی، اور حضرت ابو ہریرہ نے کہا یہ روایت نبی کریم ﷺ سے کررہا ہوں جو آپ نے تمہارے رب عز وجل سے روایت فرمائی ہے۔

(۶۰) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنُ دِيْنَارٍ عَنْ ابْنُ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَّا يَسْقُطُ وَرَقُهَاوَاِنَّهَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ فَحَدِّثُوْنِيْ مَاهِيَ فَوَقَعَ النَّاسُ فِيْ شَجَرِ الْبَوَادِيْ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ وَوَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ اَنَّهَا النَّخْلَةُ فَاسْتَحْيَيْتُ ثُمَّ قَالُوْا حَدِّثْنَا مَاهِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ هِيَ النَّخْلَةُ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا درختوں میں سے ایک ایسا درخت ہے جس کے پتے خزاں میں نہیں جھڑتے اور وہ مومن کی طرح ہے تو مجھے بتاؤ کہ وہ درخت کیا ہے؟ اسے سن کر لوگ جنگلی درختوں (کے دھیان) میں پڑ گئے، عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میرے جی میں آیا کہ وہ کھجور کا پیڑ ہے لیکن مجھے شرم آئی کہ (بڑوں کے سامنے کچھ کہوں) پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ ہی فرمایئے وہ کونسا درخت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ کھجور (کا پیڑ) ہے

تشریح: حافظ ابن حجر نے فتح الباری ص ۱۰۷ ج ۱، پر فرمایا امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام صیغے اور الفاظ برابر درجہ کے ہیں، اور

اس امر میں باعتبار اصل لغت کے اہل علم میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے البتہ اصطلاحی لحاظ سے اختلاف ہے بعض حضرات نے سب کو برابر درجہ میں کہا، ان میں امام زہری، امام مالک، ابن عیینہ، یحییٰ القطان، اور اکثر اہل حجاز و اہل کوفہ ہیں۔ اسی پر مغاربہ کا بھی بالاستمرار عمل رہا ہے، اس کو ابن حاجب نے اپنی مختصر میں ترجیح دی ہے۔ اور حاکم نے نقل کیا کہ ائمہ اربعہ کا مذہب یہی ہے۔ ملا علی قاری حنفی نے بھی تصریح کی کہ یہی مسلک امام اعظم رحمہ اللہ کا ہے اور طبقات حنفیہ قرشی سے بھی عبدالکریم ابن الہیثم کے حالات میں اس کی صراحت ہے، لیکن جمہور محدثین مشرق کا مختار یہ ہے کہ تحدیث کا طریقہ بمقابلہ اخبار کے زیادہ قوی ہے، اس کے بعد ایک اختلاف یہ ہے کہ اگر روایت بطریق اخبار ہوئی ہے یعنی شیخ کے سامنے پڑھا ہے تو یہ روایت بغیر کسی قید کے علی الاطلاق معتبر ہے یا کسی قید کی ضرورت ہے۔ امام بخاری، امام مالک اور اکثر علماء کوفہ و بصرہ و حجاز بغیر قید کے معتبر مانتے ہیں۔ امام احمد، نسائی و دیگر بعض محدثین قید لگاتے ہیں۔ کہ روایت معتبر اس وقت ہوگی کہ قراءۃ علیہ وانا اسمع،...... یا حدثنی الشیخ قراءۃ علیہ وغیرہ کہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ حدثنا کے لفظ کے ساتھ تو کسی قید کی ضرورت نہیں۔ البتہ اخبرنا کے ساتھ ضرورت ہے، اور بعد کے محدثین نے بھی حدثنا اور اخبرنا میں فرق ملحوظ رکھا ہے۔ سماع من الشیخ کے لیے حدثنا یا سمعت لانے لگے، اخبرنا کا استعمال ایسے موقع پر نہیں کرتے اور قراءۃ علی الشیخ کے لیے اخبرنا لانے لگے، حدثنا نہیں لاتے۔

امام اوزاعی، امام مسلم، امام ابوداؤد وغیرہ کا یہی مختار معلوم ہوتا ہے اور امام اعظم و امام مالک کا بھی ایک قول یہی ہے امام بخاریؒ نے اپنے ترجمۃ الباب ہی کے مناسب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال بھی تائید میں پیش کیے ہیں۔ بلکہ امام بخاری ابوالعالیہ کے قول کو ذکر کر کے جس میں عن کے ذریعہ روایت ہے اپنے اس مسلک کو بھی ثابت کر گئے کہ معنعن روایت بھی دوسری روایات مذکورہ کی طرح معتبر ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی روایت عن کے ذریعہ ہو اور راوی معروف ہوں، نیز تدلیس کے عیب سے بھی بری ہوں اور راوی کا مروی عنہ سے لقاء بھی ثابت ہو تو ایسے راوی کی تمام معنعن روایات بھی بدرجہ روایات متصلہ صحیحہ قرار دی جائیں گی۔

ترجمہ سے حدیث الباب کا ربط

حسب تحقیق حافظ عینی و حافظ ابن حجرؒ حدیث الباب کا ترجمہ سے یہ ربط ہے کہ اس حدیث کو مختلف طرق سے روایت کیا گیا ہے، یہاں حضور علیہ السلام کا ارشاد حدثونی ماھی؟ روایت ہوا کتاب التفسیر حضرت نافع کے طریق سے اخبرونی ماہی؟ مروی ہوا اور اسماعیلی کے طریق میں انبؤنی ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے حدثنا ماہی اور اخبرنا بھی آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ تحدیث کی جگہ اخبار، انباء وغیرہ الفاظ بھی برابر بولے جاتے تھے، لہٰذا سب مساوی المرتبت ہیں۔

حدیث الباب کی شرح اگلی حدیث ۶۱ میں آ رہی ہے، ملاحظہ کریں، اور قراءت شیخ و قراءت علی الشیخ کے مسئلہ کی نہایت مکمل و مفصل تحقیق حضرت علامہ عثمانی نے مقدمہ فتح الملہم ۷۶ میں ذکر کی ہے جس کا مطالعہ خصوصیت سے اہل علم کے لیے نافع ہے بلکہ پورا مقدمہ اہل علم و اساتذہ حدیث کے مطالعہ میں رہنا چاہیے اور اس کا اردو ترجمہ بھی مستقل کتابی صورت میں تشریحات کے ساتھ شائع کرنا نہایت مفید ہوگا۔ واللہ الموفق۔

بَابُ طَرْحِ الْاِمَامِ الْمَسْئَلَةَ عَلٰى اَصْحَابِهٖ لِيَخْتَبِرَ مَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ

(ایک امام مقتدا یا استاذ کا اپنے اصحاب سے بطور امتحان کوئی سوال کرنا)

(۶۱) حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ مُخْلِدٍ قَالَ ثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ بَلَالٍ قَالَ ثَنَا عَبْدُاللهِ بْنُ دِيْنَارٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ عَنِ النَّبِيِّ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَاَنَّهَا مِثْلُ الْمُسْلِمِ حَدِّثُوْنِيْ مَا هِيَ قَالَ فَوَقَعَ النَّاسُ فِيْ الشَّجَرِ الْبَوَادِيْ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ فَوَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ اَنَّهَا النَّخْلَةُ فَاسْتَحْيَيْتُ ثُمَّ قَالُوْا حَدِّثْنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِمَا هِيَ؟ قَالَ هِيَ النَّخْلَةُ .

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ نے ایک بار ارشاد فرمایا درختوں میں سے ایک ایسا درخت ہے جس کے پتے خزاں میں نہیں جھڑتے اور وہ مومن کی طرح ہے تو مجھے بتلاؤ کہ وہ درخت کونسا ہے؟ عبداللہ فرماتے ہیں لوگ جنگلی درختوں (کے دھیان) میں پڑ گئے، عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میرے جی میں آیا کہ وہ کھجور کا پیڑ ہے لیکن مجھے شرم آئی کہ (بڑوں کے سامنے کچھ کہوں) پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ علیہ آپ ہی فرمایئے وہ کونسا درخت ہے؟ آپ علیہ نے فرمایا وہ کھجور (کا پیڑ) ہے۔

تشریح: ترجمہ کا مقصد یہ ہے کہ جیسے پہلے ابواب میں اشارہ ہوا دین کی باتیں بیان کرنے میں سند کا لحاظ و ذکر ضروری ہے، بے سند باتیں کہنا اور وہ بھی دین کے بارے میں خاص طور پر مذموم ہیں۔ یہاں امام بخاری بتلانا چاہتے ہیں۔ کہ جس طرح دین کی باتیں بیان کرنے کے وقت پورے تیقظ و بیداری کو کام میں لانا چاہیے اسی طرح اپنے مستفیدین و طلبہ کو بھی متیقظ رکھنے کی سعی کی جائے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ان سے گاھے بگاہے سوالات کیے جائیں، پھر حدیث بھی لائے جو ترجمہ سے پوری طرح مرتبط ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے یہ توجیہ فرمائی کہ ابوداؤد شریف میں حضرت معاویہ کے طریق سے ایک روایت مروی ہے کہ حضور علیہ نے اغلوطات سے منع فرمایا، یعنی مغالطہ میں ڈالنے والی باتوں سے کہ ان سے لوگوں کے ذہن تشویش میں پڑتے ہیں۔ تو امام بخاری نے یہ بتلانا چاہا کہ حدیث معاویہ کا مقصد امتحان سے روکنا نہیں ہے کیونکہ اس سے مقصد علمی ترقی اور ذہن کی تشحیذ ہے مقصد کسی کو پریشانی میں ڈالنا نہیں ہے تاہم اگر کسی ممتحن کا مقصد بھی دوسرے کو ذلیل و پریشان کرنا ہی ہو تو اس کا سوال امتحان بھی مذموم ہوگا۔

دوسری حدیث میں سوال کی نوعیت اس طرح قائم کی گئی ہے کہ مجیب کے جواب کے لیے کچھ رہنمائی مل جائے اور زیادہ پریشانی نہ ہو کیونکہ حضور علیہ نے اس درخت کی کچھ نشانیاں بتلا دیں کہ اس کے پتے سارے سال رہتے ہیں۔ ان پر خزاں نہیں آتی اور فرمایا کہ اس کا نفع کسی موسم منقطع نہیں ہوتا کہ اس کے پھل ہر زمانے میں کسی نہ کسی صورت میں کھائے جاتے ہیں۔

وجہ شبہ کیا ہے؟

حدیث الباب اور اس سے قبل کی حدیث میں بھی مسلمان کو کھجور سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔

(۱) استقامت میں تشبیہ ہے کہ جس طرح مسلمان قد و قامت کے ساتھ اخلاق و عادات فاضلہ اور دوسرے اعمال زندگی میں مستقیم ہوتا ہے اسی طرح کھجور کا درخت بھی مستقیم القامت ہونے کے ساتھ مستقیم الاحوال ہوتا ہے اس کے پھل کچے اور پکے ہر طرح کارآمد و نافع ہیں پتے کارآمد اور تنا بھی نفع بخش ہوتا ہے دوا و غذا دونوں میں مفید ہیں۔

(۲) جس طرح مسلم اپنی زندگی اور بعد موت بھی دوسروں کے لیے سرچشمہ خیر بن سکتا ہے اسی طرح کھجور کا درخت بھی بحالت حیات اور مرنے اور سوکھنے کے بعد بھی کارآمد ہوتا ہے۔

(۳) جس طرح انسان کا اوپری حصہ سر وغیرہ کاٹ دیا جائے تو وہ مردہ ہو جاتا ہے کھجور کا تنا بھی اوپر سے کاٹ دیا جائے تو

وہ مرزدہ ہوجاتا ہے، مگر یہ وجہ اور اس قسم کی دوسری وجوہ مومن و کافر سب میں مشترک ہیں۔

(۴) کھجور کی جڑیں گہری اور مضبوط ہوتیں ہیں جس طرح مومن کے قلب میں ایمان مضبوطی سے جڑ پکڑے ہوئے ہوتا ہے

(۵)۔ کھجور سدابہار پیڑ ہے اس کا پھل نہایت شیریں، خوش رنگ وخوش ذائقہ ہوتا ہے جس طرح ایک سچا مسلمان بھی ہر لحاظ سے دیکھنے اور برتنے کے بعد پسندیدہ اور محبوب ہوتا ہے۔ وغیرہ (عمدۃ القاری ص ۳۹۴، ج ۱)

(۶)۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ وجہ شبہ عدم مضرت ہے کہ جس طرح کھجور کے تمام اجزاء محض نافع ومفید اور غیر مضر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک مسلمان کی شان ہے کہ اس سے بجز سلامت روی ونفع رسانی کے کوئی بات ضرررسانی وایذاء کی صادر نہیں ہوسکتی۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده.

پھر فرمایا کہ تشبیہ کا معاملہ سہل ہے، اس میں زیادہ تعمق وتنگی اختیار کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔

(۷)۔ اوپر کی وجوہ مشابہت سے معلوم ہوا کہ ایک سچے مومن کی شان بہت بلند ہے، وہ کھجور کے درخت کی طرح سدا بہار مستقیم الاحوال، سب کو نفع پہنچانے والا، اور اپنے ظاہر و باطن کی کشش اور بے مضرتی کی شان میں ممتاز ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ سب اوصاف اس کو نبی الانبیاء ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی واقتدا کے باعث حاصل ہوتے ہیں درخت مذکور سے مشابہت دے کر مومن کے اچھے اخلاق وکردار کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور برائیوں وضرررسانیوں سے بچنے کی تلقین ہوئی ہے یہ اس کے چند اوصاف کا اشارہ ہے ورنہ تفصیل میں جایئے تو ایک مومن کے اندر وہ تمام ہی اوصاف، عادات اخلاق ومکارم ہونے چاہئیں جو رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں موجود تھے۔

وفقنا الله جمیعا لاتباع هدیه وسنن صلی الله علیه وسلم بعد وکل ذرة الف الف مرة

بَابُ الْقِرَاءَةِ وَالْعَرْضِ عَلَى الْمُحَدِّثِ وَرَأَى الْحَسَنُ وَالثَّوْرِيُّ وَمَالِكٌ الْقِرَآءَةَ جَائِزَةً قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللهِ سَمِعْتُ اَبَا عَاصِمٍ يَّذْكُرُ عَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ وَمَالِكٍ اَنَّهُمَا كَانَا يَرَيَانِ الْقِرَآءَةَ وَالسَّمَاعَ جَائِزًا. حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ مُوْسٰى عَنْ سُفْيَانَ قَالَ اِذَا قُرِئَ عَلَى الْمُحَدِّثِ فَلَا بَاْسَ اَنْ يَّقُوْلَ حَدَّثَنِيْ وَسَمِعْتُ وَاحْتَجَّ بَعْضُهُمْ فِي الْقِرَاءَةِ عَلَى الْعَالِمِ بِحَدِيْثِ ضِمَامِ بْنِ ثَعْلَبَةَ اَنَّهُ قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آللّٰهُ اَمَرَكَ اَنْ نُصَلِّيَ الصَّلٰوَاتِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَهٰذِهٖ قِرَآءَةٌ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخْبَرَ ضِمَامٌ قَوْمَهٗ بِذٰلِكَ فَاَجَازُوْهُ وَاحْتَجَّ مَالِكٌ بِالصَّكِّ يُقْرَاُ عَلَى الْقَوْمِ فَيَقُوْلُوْنَ اَشْهَدَنَا فُلَانٌ وَيُقْرَاُ ذٰلِكَ قِرَآءَةً عَلَيْهِمْ وَيُقْرَاُ عَلَى الْمُقْرِئِ فَيَقُوْلُ الْقَارِئُ اَقْرَاَنِيْ فُلَانٌ.

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ الْوَاسِطِيُّ عَنْ عَوْفٍ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ لَا بَاْسَ بِالْقِرَاءَةِ عَلَى الْعَالِمِ وَحَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ مُوْسٰى عَنْ سُفْيَانَ قَالَ اِذَا قَرَاَ عَلَى الْمُحَدِّثِ فَلَا بَاْسَ اَنْ يَّقُوْلَ حَدَّثَنِيْ قَالَ وَ سَمِعْتُ اَبَا عَاصِمٍ يَّقُوْلُ عَنْ مَالِكٍ وَسُفْيَانَ الْقِرَآءَةُ عَلَى الْعَالِمِ وَقِرَاءَتُهٗ سَوَاءٌ.

(محدث کے سامنے قراءت حدیث کرنا یا محدث کی لکھی ہوئی حدیث اسی کو سنا کر اجازت چاہنا، حسن بصریؒ، سفیان ثوریؒ، اور امام

مالکؒ قراءت کے طریقہ کو جائز ومعتبر سمجھتے تھے امام بخاریؒ نے فرمایا کہ میں نے ابو عاصم سے سنا کہ سفیان ثوریؒ اور امام مالکؒ دونوں حضرات قراءت علی الشیخ اور سماع عن الشیخ کو جائز سمجھتے تھے۔عبیداللہ بن موسی، حضرت سفیان سے روایت کرتے ہیں کہ جب محدث کے سامنے قراءت کی جائے تو حدثنی یا سمعت میں کوئی مضائقہ نہیں، اور بعض محدثین نے عالم کے سامنے قراءت کرنے پر ضمام بن ثعلبہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا۔کیا حق تعالیٰ نے آپ کو نمازوں کی ادائیگی کے بارے میں حکم فرمایا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! کہا یہی تو قراءت علی النبی ﷺ ہے ضمام بن ثعلبہ نے اپنی قوم کو خبر دی اور ان لوگوں نے اس کو جائز ومعتبر سمجھا، اور امام مالک نے صک (دستاویز یا قبالہ) سے استدلال کیا جو قوم کے سامنے پڑھا جائے، چنانچہ وہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں فلاں نے گواہ بنایا حالانکہ یہ صرف ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے اور مقری کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو قاری کہتا ہے کہ مجھے فلاں شخص نے پڑھایا محمد بن سلام نے بیان کیا کہ محمد بن الحسن واسطی نے حضرت حسن سے بواسطہ عوف نقل کیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، عالم کے سامنے قراءت کی جائے اور ہم سے عبیداللہ بن موسیٰ نے سفیان سے نقل کیا کہ جب محدث کے سامنے حدیث پڑھی جائے تو روایت کے وقت حدثنی کہنے میں کوئی حرج نہیں۔امام بخاری نے کہا کہ میں نے ابوعاصم سے امام مالک وسفیان کا یہ ارشاد سنا کہ تلامذہ کا استاذ کے سامنے پڑھنا یا استاذ کا شاگردوں کے سامنے پڑھنا دونوں برابر ہیں۔

تشریح: پہلے باب میں طلبہ کی علمی آزمائش وامتحان کا ذکر تھا یہاں طلبہ کا حق بتلایا گیا کہ وہ بھی اپنے اساتذہ سے استفسار واستصواب کر سکتے ہیں اور محدث کے سامنے قراءت وعرض وغیرہ کرکے استفادہ واستجازہ بھی کرسکتے ہیں احادیث کو محدث سے سن کر روایت کرنے کو تو سب ہی نے بالاتفاق اعلیٰ درجہ میں تسلیم کیا ہے جو کچھ اختلاف ہے وہ اس میں ہے کہ شیخ کو سنا کر یا استاذ کی روایات کسی صحیفہ میں لکھی ہوئی موجود ہیں تو شاگردان کو استاذ پر پیش کرکے تصدیق واجازت چاہے تو وہ کس درجہ میں ہے امام بخاری وغیرہ سب کو مساوی درجہ میں رکھتے ہیں۔اس لیے یہاں ان کو کم درجہ دینے والوں پر رد کرنا چاہتے ہیں۔ضمام بن ثعلبہ والی حدیث سے امام بخاری وغیرہ کی پوری تائید ہوتی ہے کہ وہ اسلامی احکام سنا کر پیش کرتے ہیں۔اور حضور ﷺ ان کو درست بتلاتے ہیں، امام مالک کا استدلال دستاویز وقبالہ سے بھی بہت پختہ ہے کہ قبالہ نویس، بائع مشتری یا دائن ومدیون کے معاملہ کو دستاویز میں لکھ کر گواہ بنالیتا ہے اور وہ گواہ شرعی عدالت میں بھی معتبر ہوتے ہیں۔حالانکہ اس قبالہ کا مضمون متعاقدین اور گواہوں کو سنا دیا جاتا ہے وہ متعاقدین اپنی زبانوں سے خود کچھ نہیں سناتے، نیز حافظ نے فتح الباری ۱۰۱ج ۱ میں لکھا کہ امام مالک نے قراءت حدیث کو قراءت قرآن پر بھی قیاس کیا جیسا کہ خطیب نے کفایہ میں طریق ابن وہب سے نقل کیا کہ میں نے امام مالک سے سنا جبکہ ان نوشتوں کے بارے میں سوال کیا جو ان پر پیش ہوتے تھے کہ کیا عرض کے بعد حدثنی کہہ سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں! یہ تو قرآن مجید کی طرح ہے کہ ایک شخص استاذ کو قرآن مجید پڑھ کر سناتا ہے اور پھر کہا کرتا ہے کہ مجھے فلاں شخص نے قرآن مجید پڑھایا (حالانکہ اس نے تو صرف سنا تھا، پڑھا پڑھایا نہیں تھا)

حاکم نے علوم الحدیث میں مطرف سے نقل کیا کہ میں سترہ سال امام مالک کی خدمت میں رہا، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ تلامذہ حدیث کو موطاء پڑھ کر سناتے ہوں، بلکہ وہی پڑھکر سناتے تھے اور امام مالک ان لوگوں پر سخت نکیر کرتے تھے، جو روایت حدیث کے سلسلہ میں سماع عن الشیخ کے سوا ہر طریقہ کو غیر معتبر کہتے تھے فرماتے تھے کہ حدیث میں دوسرے طریقے کیونکر غیر معتبر ہوسکتے ہیں جبکہ وہ قرآن مجید میں معتبر مانے گئے ہیں۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ یہ شرف امام محمدؒ ہی کو حاصل ہوا ہے کہ امام مالک نے احادیث موطاء کی قراءت فرمائی تھی اور امام محمدؒ نے ان کا سماع کیا، امام مالک کے تعامل سے بھی سمجھا گیا کہ وہ عرض وقراءت کو بعض وجوہ سے راجح سمجھتے ہیں، اور امام ابوحنیفہ سے بھی ایک قول اسی طرح کا ہے اور دوسرے قول سے دونوں طریقوں کی مساوات معلوم ہوتی ہے کچھ حضرات نے یہ تطبیق دی کہ اگر استاذ حدیث اپنی یاد سے زبانی احادیث سنا رہا ہے تو تحدیث راجح ہے اور اگر کتاب سامنے ہے تو عرض قراءت کی صورتیں راجح ہیں۔

اس معاملہ میں اساتذہ کے امزجہ عادات اور انکے تعلیمی زمانے کے اختلاف سے بھی فرق پڑسکتا ہے کہ ایک استاذ پڑھ کر سنانے میں زیادہ متثبت ہو دوسرا سننے میں ایک کے قویٰ پورے تیقظ کے ساتھ سنانے کے متحمل ہوں۔ دوسرے کے نہ ہوں اور وہ صرف سننے ہی میں حق ادا کرسکتا ہو وغیرہ، حضرت یحیٰ القطان وغیرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ استاذ کہیں غلطی کرے تو طالب علم کو اس غلطی پر متنبہ کرنے کی جراءت نہ ہوگی، یا غلط ہی کو صحیح سمجھ کر خاموش ہو رہے گا اس کے برعکس استاذ شاگردوں کو بے تکلف روک ٹوک سکتا ہے۔ اور ابو عبید فرماتے تھے کہ میرے حق میں تو دوسروں کی قراءت زیادہ اثبت وافہم ہے، بہ نسبت اس کے کہ میں خود پڑھ کر دوسروں کو سناؤں، اس کو فتح الباری ص ۱۱۱ ج ۱ میں نقل کیا ہے، واللہ علم۔

(۶۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ سَعِيْدٍ هُوَ الْمَقْبُرِيُّ عَنْ شَرِيْكِ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ نَمِرٍ اَنَّهُ سَمِعَ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُوْلُ بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ دَخَلَ رَجُلٌ عَلٰى جَمَلٍ فَاَنَاخَهُ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ عَقَلَهُ ثُمَّ قَالَ اَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ وَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئٌ بَيْنَ ظَهْرَانَيْهِمْ فَقُلْنَا هٰذَا الرَّجُلُ الْاَبْيَضُ الْمُتَّكِئُ فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ يَابْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَجَبْتُكَ فَقَالَ الرَّجُلُ اِنِّيْ سَائِلُكَ فَمُشَدِّدٌ عَلَيْكَ فِي الْمَسْئَلَةِ فَلَا تَجِدْ عَلَيَّ فِيْ نَفْسِكَ فَقَالَ سَلْ عَمَّا بَدَالَكَ فَقَالَ اَسْاَلُكَ بِرَبِّكَ وَرَبِّ مَنْ قَبْلَكَ آللّٰهُ اَرْسَلَكَ اِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ؟ فَقَالَ اللّٰهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ آللّٰهُ اَمَرَكَ اَنْ تُصَلِّيَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ فِي الْيَوْمِ وَ اللَّيْلَةِ قَالَ اللّٰهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ آللّٰهُ اَمَرَكَ اَنْ تَصُوْمَ هٰذَا الشَّهْرَ مِنَ السَّنَةِ؟ قَالَ اللّٰهُمَّ نَعَمْ قَالَ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ آللّٰهُ اَمَرَكَ اَنْ تَاْخُذَ هٰذِهِ الصَّدَقَةَ مِنْ اَغْنِيَائِنَا فَتَقْسِمَهَا عَلٰى فُقَرَائِنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللّٰهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ الرَّجُلُ اٰمَنْتُ بِمَا جِئْتَ بِهٖ وَاَنَا رَسُوْلُ مَنْ وَّرَآءِيْ مِنْ قَوْمِيْ وَاَنَا ضِمَامُ بْنُ ثَعْلَبَةَ اَخُوْبَنِيْ سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ رَوَاهُ مُوْسٰى وَعَلِيُّ بْنُ عَبْدِ الْحَمِيْدِ عَنْ سُلَيْمَانَ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهٰذَا.

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص اونٹ پر سوار ہوکر آیا اور اسے مسجد کے احاطے میں بٹھلا دیا، پھر اسے (رسی سے) باندھ دیا۔ اس کے بعد پوچھنے لگا تم میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے درمیان تکیہ لگائے بیٹھے تھے، اس پر ہم نے کہا، یہ صاحب سفید رنگ جو تکیہ لگائے ہوئے ہیں، تو اس شخص نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (ہاں کہو) میں جواب دوں گا، اس پر اس نے کہا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پوچھنے والا ہوں اور اپنے

سوالات میں ذرا شدت سے کام لوں گا، تو آپ علیہ میرے اوپر کچھ ناراض نہ ہوں؟ آپ علیہ نے فرمایا کہ پوچھو جو تمہاری سمجھ میں آئے، وہ بولا کہ میں آپ علیہ کو اپنے رب کی اور آپ علیہ سے پہلے لوگوں کے رب کی قسم دیتا ہوں سچ بتایئے کہ اللہ نے آپ علیہ کو تمام لوگوں کی طرف اپنا پیغام پہنچانے کے لئے بھیجا ہے؟ آپ علیہ نے فرمایا، اللہ جانتا ہے کہ ہاں یہ بات ہے پھر اس نے کہا میں آپ علیہ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں بتایئے کیا اللہ نے آپ علیہ کو دن رات میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے؟ آپ علیہ نے فرمایا کہ اللہ جانتا ہے کہ ہاں یہی بات ہے پھر وہ بولا کہ میں آپ علیہ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں (بتلایئے) کیا اللہ نے سال میں اس رمضان کے مہینے کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے؟ آپ علیہ نے فرمایا کہ اللہ جانتا ہے کہ ہاں یہی بات ہے، پھر وہ بولا میں آپ علیہ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا اللہ نے آپ علیہ کو یہ حکم دیا ہے کہ ہمارے مالداروں سے صدقہ لے کر ہمارے غرباء میں تقسیم کر دیں؟ آپ علیہ نے فرمایا، اللہ جانتا ہے کہ ہاں یہی بات ہے اس پر اس شخص نے کہا کہ جو کچھ احکام آپ علیہ اللہ کی طرف سے لے کر آئے ہیں، میں ان پر ایمان لایا، اور میں اپنی قوم کا جو پیچھے رہ گئی ہے ایلچی ہوں، میں ضمام ہوں ثعلبہ کا بیٹا! بنی سعد بن بکر کے بھائیوں میں سے ہوں۔

اس حدیث کو موسیٰ اور علی بن عبدالحمید نے سلیمان سے روایت کیا ہے، انہوں نے ثابت سے، ثابت نے انس رضی اللہ عنہ سے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں۔

تشریح: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہاں دو حدیث مروی ہوئیں۔ اگلی حدیث (۶۲) میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ہمیں قرآن مجید میں ممانعت[1] کر دی گئی تھی کہ حضور اکرم علیہ سے سوالات کریں، اسلئے ہمیں بڑا اشتیاق رہتا تھا کہ کوئی زیرک عقلمند بدوی آئے اور حضور اکرم علیہ سے سوالات کرے ہم آپ علیہ کے جوابات سے اپنی علمی پیاس بجھائیں، چنانچہ ایسا ہی ایک بدوی ضمام بن ثعلبہ آیا اور نہایت بے تکلفی سے سوالات کئے، بلکہ پہلے عرض کر دیا کہ مجھ سے سوال کرنے میں گنوار پن کا اظہار ہوگا، ممکن ہے کہ خلاف شان وادب بھی کوئی بات ہو جائے اس لئے آپ علیہ ناراض نہ ہوں، آپ علیہ نے بھی اس کو مطمئن فرما دیا تا کہ بے تکلف ہر بات پوچھ سکے، پھر آپ علیہ نے اس کے ہر سوال کا جواب نہایت خندہ پیشانی سے دیا۔

بحث ونظر: فاناخه في المسجد (اس نے اپنا اونٹ مسجد میں بٹھا دیا) اس سے مالکیہ نے استدلال کیا کہ جن جانوروں کے گوشت حلال ہیں۔ ان کے ابوال وازبال نجس نہیں، بلکہ پاک ہیں، لیکن اس سے استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ روایت میں بظاہر تسامح ہوا ہے، بٹھلایا تو مسجد کے باہر ہی کے حصے میں ہوگا، مگر چونکہ وہ حصہ مسجد سے متصل تھا یا اس سے متعلق اس لئے فی المسجد کہہ دیا۔

حافظ نے فتح الباری ص ۱۱۱ ج ۱ میں لکھا کہ یہاں سے استدلال اول تو اس لئے صحیح نہیں کہ صرف احتمال اس امر کا ہے کہ وہ اونٹ پیشاب وغیرہ کر دیتا، لیکن کر دینا ثابت نہیں، دوسرے یہ کہ ابونعیم کی روایت میں اس طرح ہے کہ وہ بدوی مسجد کے پاس پہنچا تو اونٹ کو بٹھایا اس کو باندھا اور پھر خود مسجد میں داخل ہوا، معلوم ہوا کہ اونٹ کے ساتھ مسجد میں داخل نہیں ہوا اور اس سے بھی زیادہ صریح روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے جو مسند احمد وحاکم میں ہے کہ اس نے اپنا اونٹ مسجد کے دروازہ پر بٹھایا اور باندھا پھر مسجد میں داخل ہوا، اس لئے حدیث الباب میں بھی یہی مراد لیں گے کہ مسجد کے آگے چبوترے پر یا دروازہ مسجد پر باندھا وغیرہ، اسی طرح حافظ عینی نے بھی مذکورہ بالا دونوں

---

[1] آیت کریمہ یہ ہے یاایها الذین امنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبدلکم تسؤکم (مائدہ) اے ایمان والو ایسی باتیں نہ پوچھا کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تم کو بری معلوم ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم علیہ سے صرف تیرہ سوالات کئے تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ سوالات ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور نہ یوں تو ان کی تعداد بہت زیادہ ہے

روایات لکھ کر جواب دہی کی ہے۔

بیان اختلاف مذاہب: واضح ہو کہ ماکول اللحم جانوروں کے ابوال وازبال امام اعظمؒ اور امام شافعیؒ وامام ابویوسفؒ کے مذہب میں نجس ہیں اور امام مالکؒ وامام احمدؒ وزفر اور امام محمدؒ کے نزدیک ابوال پاک ہیں اور امام مالکؒ کا مذہب ازبال کی بھی طہارت کا ہے امام محمدؒ سے ایک روایت بشاذہ طہارت کی ہے اس کی پوری بحث اور دلائل اپنے موقع پر آئیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قد اجبتک : حضرت شاہؒ صاحب نے فرمایا کہ یہی موضع ترجمۃ الباب ہے یعنی حضورﷺ نے سائل کی پوری بات سن لی اور ابھی اس کا جواب ارشاد فرمائیں گے۔

رواہ موسیٰ : حضرت شاہؒ صاحب نے فرمایا حافظ نے اس موقع پر لکھا کہ امام بخاریؒ نے یہاں تعلیق اس لئے کی ہے کہ موسیٰ بن اسماعیل کے استاذ سلیمان بن مغیرہ ہیں، ان کو امام بخاری نے قابل احتجاج نہیں سمجھا۔ اس لئے موصولاً ان کی روایت نہیں لی

حافظ عینیؒ نے اس پر حافظ کی گرفت کی اور فرمایا کہ یہ توجیہ اس لئے درست نہیں کہ موسیٰ بن اسماعیل کی روایت سلیمان بن مغیرہ کے ذریعہ موصولاً بخاری ہی میں باب **یرد المصلی من بین یدیہ** میں موجود ہے۔ پھر قابل احتجاج نہ سمجھنے کی بات کیسے چل سکتی ہے؟

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ معلوم ہوا کہ حافظ ہی اس میدان کے مرد نہیں ہیں، اور ہمارے حافظ عینی بھی کسی طرح کم نہیں ہیں اسی لئے حافظ پر ایسی کڑی گرفت کی ہے، یہ بھی عجیب حسن اتفاق ہے کہ جس طریق روایت پر اوپر بحث ہوئی ہے وہی اگلی حدیث (۶۳) میں (موسیٰ بن اسماعیل عن سلیمان بن مغیرہ) موجود ہے مگر چونکہ وہ صرف فربری کے نسخہ صحیح بخاری میں ہے، دوسرے نسخوں میں نہیں ہے، اس لئے نہ فتح الباری میں اس کا ذکر ہے نہ عمدۃ القاری میں، البتہ بخاری کے مطبوعہ نسخوں میں ہے، اسی لئے ہم نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور شاید اسی باعث حافظ عینی نے اس کا حوالہ نہیں دیا، اور صرف سترہ والی حدیث کا ذکر کیا، مگر تعجب ہے کہ حافظ نے دونوں ہی کو نظر انداز کر دیا۔

حدیث الباب میں حج کا ذکر کیوں نہیں؟

حافظ عینی اور حافظ ابن حجر دونوں نے اس کے جواب کی طرف توجہ کی ہے اور لکھا کہ اگرچہ یہاں شریک بن عبداللہ بن ابی نمر کی روایت انسؓ میں حج کا ذکر نہیں ہے، مگر مسلم شریف وغیرہ کی روایت ثابت عن انسؓ میں حج کا ذکر موجود ہے اور حضرت ابن عباسؓ وحضرت ابوہریرہؓ کی روایات میں بھی اس کا ذکر ہے، پھر حافظ عینی نے لکھا کہ کرمانی نے یہاں یہ وجہ قائم کی ہے کہ ضمام کی حاضری حج کی فرضیت سے پہلے کی ہے یا اس لئے کہ وہ حج کی استطاعت نہ رکھتے تھے، حافظ عینی نے لکھا کہ درحقیقت کرمانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ابن التین سے منقول ہے اور ان کو واقدی اور محمد بن حبیب کے اس قول سے مغالطہ ہوا کہ ضمام ۵ھ میں حاضر ہوئے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس وقت تک حج فرض نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ یہ قول کسی طرح درست نہیں ہو سکتا اور اس کے بطلان کی چند وجوہ یہ ہیں۔

(۱) مسلم شریف کی روایت سے ثابت ہے کہ ضمام کی آمد سورۂ مائدہ کی آیت نہی سوال کے بعد ہوئی ہے، اور آیت مذکورہ کا نزول خود بھی بہت بعد میں ہوا ہے۔

(۲) اسلام کی دعوت کے لئے قاصدوں اور دعوت ناموں کا سلسلہ صلح حدیبیہ کے بعد ہوا ہے (جو ۶ھ میں ہوئی تھی) بلکہ بیشتر حصہ فتح مکہ کے بعد ہوا ہے (جو ۸ھ میں ہوئی)

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ضمام کی قوم ان کی واپسی کے بعد اسلام لائی ہے اور بنوسعد کا قبیلہ

واقعہ حنین کے بعد داخل اسلام ہوا ہے یہ واقعہ شوال ۸ھ کا ہے۔

لہٰذا صحیح یہ ہے کہ ضمام کی آمد ۹ھ میں ہوئی ہے، جیسا کہ اسی کو ابن اسحاق، ابوعبیدہ وغیرہ نے یقین و جزم کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے یہاں یہ بھی لکھا ہے کہ بدر زرکشی سے بڑی غفلت ہوئی کہ اس طرح لکھ دیا۔ ''حج کا ذکر حدیث میں اس لئے نہیں ہوا کہ وہ ان کو شریعت ابراہیم علیہ السلام میں ہونے کے سبب پہلے سے معلوم تھا'' حافظ نے لکھا کہ زرکشی نے شاید صحیح مسلم وغیرہ کی مراجعت نہیں کی۔

(فتح الباری ص ۱۱۳ ج ۱، عمدۃ القاری ص ۴۰۳ ج ۱)

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ابن التین کے سامنے بھی مسلم شریف کی روایت مذکورہ بالا نہیں ہیں ورنہ وہ واقدی وغیرہ کے قول مرجوح سے استعانت نہ کرتے، واللہ علم۔

مہم علمی فائدہ: حضرت امام اعظم کی طرف مشہور قول یہ منسوب ہے کہ وہ قراءت علی الشیخ کو قراءت شیخ پر ترجیح دیتے تھے (کما ذکر فی التحریر وغیرہ) جو اکثر علماء و مذہب جمہور کے خلاف ہے لیکن جیسا کہ مقدمہ فتح الملہم میں ہے، یہی قول محدث ابن ابی ذئب وغیرہ کا بھی ہے اور ایک روایت امام مالک سے بھی اسی طرح ہے، نیز دار قطنی وغیرہ میں بہت سے علماء و محدثین کا یہی مذہب بیان ہوا ہے دوسرے یہ کہ خود امام اعظم سے بروایت ابی سعد صغانیؒ کا یہ قول بھی مروی ہے کہ وہ اور سفیان قراءت علی الشیخ و سماع عن الشیخ دونوں کو مساوی درجہ میں سمجھتے تھے، جو امام مالکؒ اور آپ کے اصحاب و اکثر علماء حجاز و کوفہ و امام شافعیؒ و بخاریؒ سے بھی مروی ہے لہٰذا اس مسئلہ میں کوئی اہم اختلاف نہیں ہے بلکہ محدث اگر اپنی حفظ پر اعتماد و بھروسہ کر کے تحدیث کرے گا تو اس کی وجہ سے اس کو قراءت علی الشیخ پر بھی ترجیح مل سکتی ہے، چنانچہ محدث کبیر ابن امیر الحاج نے فرمایا کہ ''اس صورت کے پیش نظر امام اعظمؒ سے ترجیح قراءت علی الشیخ کو علی الاطلاق بلا تفصیل مذکور کے نقل کرنا (جیسا کہ بہت سے حضرات نے کیا ہے) مناسب نہیں ہے (مقدمہ فتح الملہم ص ۷۶)

معلوم ہوا کہ حضرت امام اعظم کی طرف بعض اقوال کی نسبت بے احتیاطی سے یا بے تفصیل و تقیید ہونے سے بھی دوسروں کو غلط فہمی ہوئی ہے اور اس سے کچھ لوگوں کو زبان طعن کھولنے کا بھی موقع مل گیا۔ واللہ المستعان

(۶۳) حَدَّثَنَا مُوْسَى بْنُ اِسْمَاعِيْلَ قَالَ ثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ الْمُغِيْرَةِ قَالَ ثَنَا ثَابِتٌ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ نُهِيْنَا فِي الْقُرْاٰنِ اَنْ نَّسْاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ يُعْجِبُنَا اَنْ يُّجِيْءَ الرَّجُلُ مِنْ اَهْلِ الْبَادِيَةِ الْعَاقِلُ فَيَسْاَلُهُ وَنَحْنُ نَسْمَعُ فَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْبَادِيَةِ فَقَالَ اَتَانَا رَسُوْلُكَ فَاَخْبَرَنَا اِنَّكَ تَزْعَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ اَرْسَلَكَ قَالَ صَدَقَ فَقَالَ فَمَنْ خَلَقَ السَّمَآءَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ قَالَ فَمَنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالْجِبَالَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ فَمَنْ جَعَلَ فِيْهَا الْمَنَافِعَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ فَبِالَّذِيْ خَلَقَ السَّمَآءَ وَخَلَقَ الْاَرْضَ وَنَصَبَ الْجِبَالَ وَجَعَلَ فِيْهَا الْمَنَافِعَ آللّٰهُ اَرْسَلَكَ؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ زَعَمَ رَسُوْلُكَ اَنَّ عَلَيْنَا خَمْسَ صَلَوَاتٍ وَ زَكٰوةً فِيْ اَمْوَالِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ بِالَّذِيْ اَرْسَلَكَ آللّٰهُ اَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُوْلُكَ اَنَّ عَلَيْنَا صَوْمَ شَهْرٍ فِيْ سَنَتِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِيْ اَرْسَلَكَ آللّٰهُ اَمَرَكَ بِهٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُوْلُكَ اَنَّ عَلَيْنَا حَجَّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا، قَالَ صَدَقَ، قَالَ فَبِالَّذِيْ اَرْسَلَكَ آللّٰهُ اَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَوَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا اَزِيْدُ عَلَيْهِنَّ شَيْئًا وَلَا اَنْقُصُ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِنْ صَدَقَ لَيَدْخُلَنَّ الْجَنَّةَ۔

ترجمہ: حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ ہم کو قرآن میں اس کی ممانعت کردی گئی کہ رسول اللہ ﷺ سے بار بار سوال کریں اور ہماری یہ خواہش رہتی تھی کہ کوئی جنگل کا رہنے والا عاقل وزیرک آدمی آکر آپ ﷺ سے سوال کرے اور ہم (آپ ﷺ کا جواب سنیں) تو ایک دن ایک بادیہ نشین آیا اور اس نے آکر کہا کہ ہمارے پاس آپ ﷺ کا قاصد پہنچا تھا اور اس نے ہمیں بتلایا کہ آپ ﷺ (اس بات کے) مدعی ہیں کہ یقیناً آپ کو اللہ بزرگ و برتر نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس نے سچ کہا، اس شخص نے پوچھا، اچھا آسمان کس نے پیدا کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے، وہ بولا، اچھا زمین و پہاڑ کس نے بنائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، اللہ نے، اس نے کہا اچھا اس میں اتنے منافع کس نے رکھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ نے، اس کے بعد وہ کہنے لگا، تو اس ذات کی قسم جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، پہاڑوں کو قائم کیا اور اس میں نفع کی چیزیں رکھیں، کیا اللہ نے آپ ﷺ کو بھیجا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ تب اس نے کہا کہ آپ ﷺ کے قاصد نے ہمیں بتایا کہ ہم پر پانچ نمازیں اور اپنے مال کی زکوٰۃ نکالنا فرض ہے، آپ ﷺ نے فرمایا اس نے سچ کہا۔ پھر وہ بولا، اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو نبی بنا کر بھیجا ہے، کیا اس نے آپ ﷺ کو یہ حکم دیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں۔ پھر وہ بولا کہ آپ ﷺ کے قاصد نے ہمیں بتایا کہ سال بھر میں ایک ماہ کے روزے ہم پر فرض ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس نے سچ کہا (پھر) وہ بولا کہ آپ ﷺ کے قاصد نے ہمیں بتایا کہ ہمارے او پر حج فرض ہے بشرطیکہ کہ ہم میں بیت اللہ تک پہنچنے کی سکت ہو، آپ ﷺ نے فرمایا، اس نے سچ کہا (اس کے بعد) وہ کہنے لگا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا ہے کیا اللہ نے آپ ﷺ کو اس چیز کا حکم دیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں! پھر اس نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا میں ان باتوں پر نہ کچھ زیادہ کروں گا نہ ان میں سے کم کروں گا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اگر اس شخص نے اپنے دعوے کو سچا کر دکھایا تو ضرور جنت میں داخل ہوگا۔

تنبیہ: جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ یہ حدیث صرف فربری کے نسخہ سے لی گئی ہے ورنہ دوسرے نسخوں میں نہیں ہے، اسی لئے عمدۃ القاری اور فتح الباری میں اس کا ذکر و شرح وغیرہ کچھ نہیں ہے۔

ترجمہ سے ربط: ضمام نے فرستادہ، رسول اللہ ﷺ سے معلوم کی ہوئی باتیں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیں اور آپ ﷺ نے تصدیق فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ شیخ کا زبان سے بیان کرنا ہی ضروری نہیں بلکہ شاگرد پڑھے اور شیخ تصدیق کردے تو وہ بھی معتبر ہے، یہی امام بخاری کا مقصد ہے۔

تشریح: شرح حدیث مثل سابق ہے، ایک بات مزید یہ معلوم ہوئی کہ زمین آسمان پہاڑ وغیرہ سب خدا کی مخلوق اور حادث ہیں

افادات انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ خلق کا معنی کسی چیز کا کتم عدم سے اختیار و قدرت کے ذریعہ وجود میں آنا ہے اور ہمارے نزدیک تمام عالم اور اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز حادث و مخلوق ہے اور حدوث عالم کا ثبوت تواتر سے ہے، حافظ ابن تیمیہؒ نے فرمایا کہ فلاسفہ میں کوئی بھی قدم عالم کا قائل نہیں تھا اور افلاطون بھی حدوث کا قائل تھا تا آنکہ ارسطاطالیس آیا اور وہ قدم عالم کا قائل ہوا حالانکہ قدم عالم کا عقیدہ باطل ہے اور اس کا قائل کافر ہے ہم سے پہلے بھی تمام ادیان سماوی حدوث عالم کے عقیدہ پر متفق تھے، البتہ بعض صوفیا کی طرف بعض اشیاء عالم کا قدم منسوب ہوا ہے، جیسے شیخ اکبرؒ مگر علامہ شعرانی شافعیؒ نے کہا کہ اس قسم کی تمام عبارتیں شیخ اکبر کی طرف غلط منسوب ہوئی ہیں اور دوسروں نے ان کی تالیفات میں لکھ دی ہیں۔ پھر فرمایا کہ میرا گمان یہی ہے کہ بعض اشیاء کے قدم کی نسبت شیخ اکبر کی طرف صحیح ہے اور بحر العلوم نے بھی یہ نسبت کی ہے، اس کے علاوہ بعض مسائل میں بھی شیخ اکبر کا تفرد مشہور ہے، مثلاً یہ کہ ایمان فرعون کو معتبر سمجھا اگرچہ توبہ کے درجہ میں نہیں، اسی لئے کہا کہ فرعون کو عذاب تو ہوگا، مگر وہ مخلد فی النار نہ ہوگا۔

پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ علامہ دوانی نے جو حافظ ابن تیمیہؒ کی طرف جو قدم عرش کی نسبت کی ہے وہ میرے نزدیک

صحیح نہیں۔اور میں نے اس بات کو اپنے قصیدہ الحاقیہ بنونیۃ ابن القیمؒ میں بھی ظاہر کر دیا ہے۔

ع والعرش ایضاحادث عند الورى ومن الخطاء حکایۃالدوانی

پھر فرمایا کہ حدوث ذاتی کا بھی فلاسفہ میں سے کوئی قائل نہ تھا،اس کا اختراع سب سے پہلے ابن سینا نے کیا،جس سے اس کا مقصد اسلام وفلسفہ کو متحد کرنا تھا۔

فلاسفہ یونان افلاک وعناصر کو قدیم بالشخص اور موالید ثلاثہ (جمادات،نباتات وحیوانات کو) قدیم النوع مانتے ہیں،جس کا بطلان میں نے اپنے رسالہ حدوث عالم میں کیا ہے۔

ابن رشد نے،تہافت الفلاسفہ میں امام غزالیؒ پر اعتراضات کئے ہیں میں نے ایک رسالہ میں اس کے بھی جوابات لکھے ہیں مگر وہ رسالہ طبع نہیں ہوا،پھر فرمایا کہ میرے نزدیک ابن رشد،ابن سینا سے زیادہ حاذق ہے اور ارسطو کے کلام کو بھی اس سے زیادہ سمجھا ہے۔

بَابُ مَا يُذْكَرُ فِي الْمُنَاوَلَةِ وَ كِتَابِ اَهْلِ الْعِلْمِ بِا الْعِلْمِ اِلَى الْبُلْدَانِ وَقَالَ اَنَسٌ لِنَسَخَ عُثْمَانَ الْمَصَاحِفَ فَبَعَثَ بِهَآ اِلَى الآفَاقِ وَرَاى عَبْدُ اللهِ ابْنُ سَعِيْدٍ وَّمَالِكٌ ذٰلِكَ جَآئِزًاوَّ احْتَجَّ بَعْضُ اَهْلِ الْحِجَازِ فِي الْمُنَاوَلَةِ بِحَدِيْثِ النَّبِيِّ ﷺ حَيْثُ كَتَبَ لِاَمِيْرِ السَّرِيَّةِ كِتَابًا وَّقَالَ لَا تَقْرَاءَهُ حَتّٰى تَبْلُغَ مَكَانَ كَذَاوَ كَذَافَلَمَّا بَلَغَ ذٰلِكَ الْمَكَانَ قَرَاَهُ عَلَى النَّاسِ وَاَخْبَرَهُمْ بِاَمْرِ النَّبِيِّ ﷺ.

(مناولہ کا بیان) اور اہل علم کا علمی باتیں لکھ کر دوسرے شہروں کی طرف بھیجنا،حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف لکھوائے اور انہیں آفاق میں بھیج دیا اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ،یحییٰ بن سعید رضی اللہ عنہ،اور امام مالکؒ بھی اس کو جائز ومعتبر سمجھتے تھے،بعض اہل کفار نے مناولہ کے لئے حضور ﷺ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ نے امیر لشکر کو ایک مکتوب دیا اور فرمایا کہ جب تک تم فلاں مقام تک نہ پہنچ جاؤ اس تحریر کو نہ پڑھنا،چنانچہ جب وہ اس مقام کو پہنچ گئے تو اس تحریر کو سنایا اور انہیں رسول اکرم ﷺ کے حکم سے مطلع کیا۔

(۶۴) حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ بْنُ عَبْدِاللهِ قَالَ حَدَّثَنِيْ اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللهِ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ ؓ اَنَّ عَبْدَاللهِ بْنَ عَبَّاسٍ اَخْبَرَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ بَعَثَ بِكِتَابِهٖ رَجُلًا وَّ اَمَرَهُ اَنْ يَّدْفَعَهُ اِلٰى عَظِيْمِ الْبَحْرَيْنِ فَدَفَعَهُ عَظِيْمُ الْبَحْرَيْنِ اِلٰى كِسْرٰى فَلَمَّا قَرَاءَهُ مَزَّقَهُ فَحَسِبْتُ اَنَّ ابْنَ الْمُسَيَّبِ قَالَ فَدَعَا عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَنْ يُّمَزَّقُوْا كُلَّ مُمَزَّقٍ.

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اپنا خط دے کر بھیجا اور اسے یہ حکم دیا کہ اسے حاکم بحرین کے پاس لے جائے،بحرین کے حاکم نے وہ خط کسریٰ (شاہ ایران) کے پاس بھیج دیا۔تو جس وقت اس نے وہ خط پڑھا تو اسے چاک کر ڈالا راوی کہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ابن مسیب نے (اس کے بعد مجھ سے کہا کہ اس واقعہ کو سن کر رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے لئے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی بددعا فرمائی۔

تشریح: امام بخاریؒ نے سابق ابواب میں قراءت شیخ،سماع عن الشیخ اور عرض وغیرہ کی صورتیں بیان فرمائیں تھیں،یہاں دو صورتیں دوسری بیان فرمائیں،مناولہ یہ ہے کہ شیخ اپنی لکھی ہوئی روایت یا کتاب لکھ کر شاگرد کو دیتا ہے کہ میں ان روایات یا کتاب کی اجازت تم کو دیتا ہوں تم اس کی روایت میری سند سے کر سکتے ہو،اس مناولہ کو مناولہ مقرونہ بالاجازۃ کہتے ہیں یہ جمہور کے نزدیک حجت ہے۔گو تحدیث واخبار کے برابر نہیں،اس کے بعد اس امر میں اختلاف ہے کہ تلمیذ روایت کے وقت حدثنا واخبرنا کے الفاظ بغیر قید مناولۃً کے کہہ سکتا ہے یا نہیں؟

دوسری صورت مکاتبہ کی ہے کہ شیخ اپنے شاگرد کے پاس تحریر بھیجتا ہے، جس میں روایت جمع کی ہوئی ہیں اور لکھتا ہے کہ جب یہ روایات کی تحریر تمہارے پاس پہنچے تو تم انکی روایت میری سند سے کر سکتے ہو، مگر اس روایت کی اجازت جب ہی ہے کہ روایت کے وقت یہ ضرور ظاہر کرے کہ مجھے اس کی اجازت بذریعہ کتابت حاصل ہوئی ہے۔

امام بخاریؒ نے مناولہ کے جواز کے لئے توسیع کر کے حضرت عثمان ؓ کے مصاحف بھیجے کو بطور دلیل پیش کیا ہے اور پھر حضور اکرم ﷺ کے مکتوب گرامی کو پیش کیا جو زیادہ واضح طور پر جواز مناولہ پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت عثمان ؓ کے مصاحف کی تعداد ابو حاتم نے سات لکھی ہے، کیونکہ آپ نے ایک ایک نقل مکہ معظمہ، شام، کوفہ، بصرہ، بحرین ویمن، بھیجی تھی اور ایک نقل اپنے پاس رکھوالی تھی۔

معلوم ہوا کہ ارسال کتب کا طریقہ بھی معتبر ہے اور جب وہ قرآن مجید کے حق میں معتبر ہو سکتا ہے تو حدیث کے بارے میں بدرجہ اولیٰ مستند ہونا چاہیے۔

یہ امر بھی قابل ذکر کہ آیات کی ترتیب تو خود آنحضرت ﷺ کے وقت میں قائم ہوگئی تھی کہ ہر آیت کے نزول کے وقت آپ ﷺ کاتب وحی کو بلا کر فرما دیا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھ دیا جائے۔ لیکن یہ سب آیات و سور مختلف چیزوں پر لکھی ہوئی تھیں۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے زمانہ میں ہر صورت کے ان منتشر قطعات کو یکجا کر دیا گیا اور ہر سورت پوری پوری یکجا ہو کر مکتوب و محفوظ ہوگئی، پھر حضرت عثمان ؓ نے سب سورتوں کو یکجائی شکل (مصحف کی صورت) میں کر دیا اور صرف لغت قریش پر قائم کر دیا، جس پر اصل قرآن مجید کا نزول ہوا ہے اور آپ نے ایک ہی رسم الخط متعین کر کے اس کی نقول تمام ممالک کو بھجوا دیں، اس طرح آپ نے مختلف لغات کے عارضی توسعات ختم فرما دیئے تاکہ اختلافات کا کلی طور پر سد باب ہو سکے۔

واقعہ ہلاکت و بربادی خاندان شاہی ایران

حدیث الباب میں آیا کہ حضور اکرم ﷺ کے نامہ مبارک کو شہنشاہ فارس خسرو پرویز بن ہرمز بن نوشروان نے چاک کر دیا تھا (کیونکہ اس کو اس بات پر بڑا طیش آیا تھا کہ مکتوب کے سرنامہ پر پہلے حضور اکرم ﷺ کا اسم گرامی تحریر تھا اور اس کے بعد شہنشاہ مذکور کا، اور ایسی جراءت کبھی کسی نے نہیں کی تھی، دوسری طرف حق تعالیٰ کے علم ازلی میں یہ بات بھی طے شدہ تھی کہ سرور دو عالم ﷺ کے مکتوب گرامی کے ساتھ ایسی گستاخی کرنے کی سزا پورے خاندان شاہی کی بربادی ہوگی، چنانچہ حضور ﷺ کو جونہی اس گستاخی کی خبر ملی، فوراً ارشاد فرما دیا کہ اس گستاخ کی اتنی ...... عظیم الشان و وسیع ترین سلطنت بھی پارہ پارہ ہو جائے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا خسرو پرویز نے صرف مکتوب مبارک چاک کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ امام زہری کی روایت سے معلوم ہوا ہے کہ اس نے ماتحت ملک یمن کے حاکم و کمانڈر انچیف باذان کو خط لکھا کہ "(مجھے معلوم ہوا کہ قریش کا کوئی شخص دعوائے نبوت کر رہا ہے، تم جا کر اس سے توبہ کراؤ، اگر توبہ کرے تو اچھا ہے ورنہ میرے پاس اس کا سر بھیج دو)" باذان نے وہی خط حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ملاحظہ کے لئے بھیج دیا، آپ ﷺ نے اس کے جواب میں لکھوایا کہ "(حق تعالیٰ نے مجھے کسریٰ کے قتل کی خبر دی ہے فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ کو وہ مر جائے گا)" باذان کو مکتوب گرامی ملا تو کہا "اگر یہ واقعی نبی ہیں تو انکا ارشاد ضرور صحیح ہو کر رہے گا" چنانچہ ٹھیک اسی دن کسریٰ قتل ہو گیا، حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق وقت مقررہ پر کسریٰ کے قتل کی خبر باذان کو

پہنچی تو اپنے اور اپنے ساتھ کے ایرانی لشکریوں کے اسلام لانے کی خبر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیج دی، ابن سعدؒ کی روایت میں اس طرح ہے کہ جب کسریٰ نے مکتوب گرامی چاک کر دیا تو یمن کے گورنر باذان کو حکم دیا کہ اپنے پاس سے دو بہادر آدمی حجاز بھیجے، جو میرے پاس اس (مدعی نبوت) کے صحیح حالات لائیں۔ باذان نے اپنے خاص مدارالمہام اور ایک دوسرے شخص کو اپنا خط دے کر حضور اکرم ﷺ کے پاس بھیجا، وہ مدینہ طیبہ پہنچے اور آپ ﷺ کی خدمت میں وہ خط پیش کیا وہ اس وقت رعب و جلال نبوت کے سبب لرزہ براندام تھے، آپ ﷺ مسکرائے اور ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی۔

پھر فرمایا: اپنے آقا کو میری طرف سے یہ خبر پہنچا دینا کہ میرے رب نے اس کے رب کسریٰ کو اسی رات میں سات پہر کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور یہ منگل کی شب ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ تھی، اس طرح کہ حق تعالیٰ کی تقدیر و مشیت کے تحت خسرو پرویز کے بیٹے شیرویہ ہی نے باپ کو قتل کر دیا (عمدۃ القاری ص ۱۴۰ ج ۱) اس کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ شیرویہ اپنی مائنڈ شیریں نامی پر عاشق ہو گیا اور اس کے وصال کے لئے یہی تدبیر سوجھی کہ باپ کو قتل کر دے کسی طرح باپ کو بھی اس کے خطرناک ارادے کی اطلاع مل گئی تھی اس لئے اس نے یہ کیا کہ اپنے خاص شاہی دوا خانے میں ایک زہر کی شیشی پر ''اکسیر باہ'' کا لیبل لگا دیا، تاکہ بعد کو اسے بیٹا استعمال کر لے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، باپ کو قتل کرنے کے بعد شیرویہ نے شاہی مخصوص دوا خانہ کو کھولا اور اس شیشی کا لیبل پڑھ کر نہایت خوش ہوا، دھوکہ سے وہ زہر پی گیا اور فوراً ہی مر گیا، اس کے بعد زمام حکومت اس کی بیٹی کو سپرد ہوئی جو اس کو نہ سنبھال سکی اور زمانہ خلافت عثمانی تک اتنی عظیم الشان سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی جو ہزاروں سال سے چلی آ رہی تھی۔ سلطنت فارس کا آخری تاجدار شہنشاہ یزدوجرد جنگلات میں چھپا ہوا مارا مارا پھرتا تھا کہ کوئی اس کو پہچان نہ سکے ایک دن گڈریے کا روپ بنائے ہوئے حمام میں روپوش تھا کہ پکڑا گیا اور قتل کر دیا گیا۔

بظاہر اوپر کے ذکر کئے ہوئے دونوں واقعات درست ہیں، اور شاید ایسا ہی ہوا ہو کہ کسریٰ نے پہلے تو شدت غضب سے مغلوب ہو کر باذان کو یہی حکم دیا کہ خود جا کر آنحضرت ﷺ سے باز پرس کرے، اور باذان کے قاصد کو آپ ﷺ نے کسریٰ کے قتل ہونے کی خبر بقید ماہ و دن بتلا دی، اس کے بعد کسریٰ نے ٹھنڈے دل سے سوچا ہوگا کہ آپ ﷺ کے حالات معلوم کرے، باذان کو پھر لکھا اور اس پر باذان نے دوبارہ قاصد بھیجے اور وہ ان دنوں میں مدینہ طیبہ پہنچے ہیں۔ جن میں خسرو پرویز کا قتل ہوا ہے، **واللہ اعلم وعلمہ اتم، سبحانہ وتعالیٰ وھو الذی یغیر ولا یتغیر۔**

بحث و نظر: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مناولہ کی صورت تو مستند ہونی ہی چاہیے خصوصاً جبکہ مقرون بالاجازت ہو تو اور بھی قوی ہے، رہی مکاتبت کی صورت وہ جب ہی حجت ہوگی کہ کاتب و مکتوب الیہ کی تعیین غیر مشکوک ہو، پھر فرمایا کہ میرے نزدیک محقق بات یہ ہے کہ مال کے دعووں میں خط کافی نہیں ہے، مثلاً کوئی کہے کہ میرے پاس فلاں کی تحریر ہے، جس میں میرے ایک ہزار روپے قرض کا اس نے اقرار کیا ہے اور مدعیٰ علیہ اس سے منکر ہو، اس کے علاوہ دوسرے معاملات طلاق، نکاح، عتاق وغیرہ میں خط ضرور معتبر ہوگا اور ہمارے عام کتب فقہ میں بھی خط کے ذریعہ صحت وقوع طلاق کی تصریح موجود ہے، دیکھو فتح القدیر وغیرہ۔

ابن معین نے فرمایا کہ کتابت کے معتبر ہونے کے لئے ایک شرط امام اعظمؒ نے یہ بھی لگائی ہے کہ کاتب کو وہ تحریر اول سے آخر تک برابر یاد رہی ہو، کسی وقت درمیان میں بھول نہ گیا ہو، البتہ صاحبین نے اس میں توسع کیا ہے کہ اگر اپنی تحریر دیکھ کر بھی یاد آئے گا کہ یہ میری ہی تحریر ہے تب بھی وہ معتبر ہے، اور اول سے آخر تک برابر یاد رہنا ضروری نہیں۔

حضرت شاہؒ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ امام بخاری نے ان ابواب میں بہت سے مسائل اصول حدیث کے بیان فرمائے ہیں اور نہایت عمدہ و بہتر تالیف اصول حدیث میں شیخ شمس الدین سخاویؒ کی "فتح المغیث" ہے نیز حافظ ابن حجرؒ "النکت علی ابن الصلاح" بھی خوب ہے۔

ایضاح البخاری کی تحقیق پر نظر:

امام بخاریؒ نے جو ترجمۃ الباب میں یہ فرمایا کہ عبداللہ بن عمر، یحییٰ و مالک نے بھی مناولہ کو مستند سمجھا ہے اس پر مذکورہ بالا تقریر درس بخاری ص ۳۴ ج ۲ میں ایک لمبی بحث ملتی ہے جس کے اہم نقطے یہ ہیں

(۱) عبداللہ بن عمر سے اغلب یہ ہے کہ عبداللہ بن عمر عمری مراد ہیں یعنی عبداللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن عمر بن الخطابؓ عبداللہ بن عمر مراد نہیں کیونکہ ان سے مناولہ کے سلسلے میں اس قسم کی کوئی نقل منقول نہیں ہے۔

(۲) حضرت علامہ کشمیری کے نزدیک عبداللہ بن عمر عمری حسن کے درجہ کے راوی ہیں، امام ترمذی نے کتاب الحج میں ان کی حدیث کی تحسین فرمائی ہے، امام بخاریؒ نے بھی ان کا نام مقام احتجاج میں ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ عبداللہ بخاری کے نزدیک بھی قابل احتجاج ہیں احناف کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ امام بخاریؒ انہیں ضعیف نہیں مانتے۔

(۳) یہ عبداللہ عمری حدیث ذوالیدین کے راوی ہیں اور احناف ان سے استدلال کرتے ہیں۔

(۴) حافظ ابن حجر چونکہ احناف کے ساتھ رواداری برتنا نہیں چاہتے اس لئے کوشش فرماتے ہیں کہ یہ کسی طرح عمری ثابت نہ ہوں بلکہ یا عبداللہ بن عمر ہوں یا عبداللہ بن عمرو بن العاص، کیونکہ ان کا یحییٰ بن سعید سے قبل ذکر کرنا بتلاتا ہے کہ وہ قدر و منزلت میں یحییٰ سے زیادہ ہوں، حالانکہ عمری ایسے نہیں ہیں۔

(۵) حافظ عینی، حافظ ابن حجر کی مذکورہ بالا تحقیق سے راضی نہیں، انہوں نے فرمایا کہ یحییٰ سے قبل ذکر کرنا ہرگز اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ عمری نہ ہوں بلکہ اس کی مختلف وجوہ ہوسکتی ہیں اور عبداللہ بن عمرو بن العاص تو مراد ہو ہی نہیں سکتے، کیونکہ بخاری کے سب نسخوں میں عمر بغیر واؤ کے ہیں۔

اس لئے اغلب تو یہی ہے کہ اس سے مراد عبداللہ بن عمر عمری ہیں، ہاں! دوسرا احتمال حضرت عبداللہ بن عمر کا ضرور باقی ہے۔ واللہ اعلم، اب ہم ہر جز پر مفصل کلام کرتے ہیں۔، واللہ المستعان۔

(۱) عبداللہ بن عمر سے اغلب یہ ہے کہ عبداللہ بن عمر بن الخطاب مراد ہیں، عبداللہ بن عمری نہیں کیونکہ امام بخاریؒ ان سے خوش نہیں، نہ وہ ان کو مقام احتجاج میں یہاں لائے ہیں، نہ کہیں اور، پھر وہ بھی اس طرح کہ یحییٰ بن سعید اور امام مالک سے مقدم کرکے ذکر کریں، یہ زیادہ مستبعد ہے، امام بخاریؒ مراتب رجال کے دقیق فرق پر نظر رکھتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ کسی غلط فہمی یا ناراضی کے سبب اس امر کی رعایت ترک کردیں۔

حضرت شاہ صاحب سے العرف الشذی ص ۱۸۲ میں حدیث ذی الیدین کے تحت نقل ہوا ہے کہ " ورجاله ثقات الاعبدالله بن عمر العمری وهومتكلم فيه ولم يا خذ عنه البخاری وتبعه الترمذی ووثقه جماعة واتفقو اعلى صدقه ولكنه فی حفظه شیء ...... اقول انه من رواة الحسان ولم اجد احدا اخذه فی متون الحديث، بل اخذوه فی اسانيد الحديث ...... وايضا صحح ابن السكن بعض احاديث عبدالله العمری وعندی ثلاثة احاديث عنه حسنها بعض المحدثين "

اسی قسم کی تفصیل فتح الملہم ص ۱۲۸\۱ میں بھی ہے مرعاۃ المفاتیح ص ۳۰۴\۱ میں ہے کہ حاکم، ابن حبان، ابن مدینی ابوحاتم، صالح جزرہ،

یحییٰ بن سعید، نسائی و بخاری نے عبداللہ عمری کی تضعیف کی اور امام احمد، ابن معین، ابن عدی، یعقوب بن شیبہ و عجلی نے توثیق کی، حافظ ذہبی نے صدوق فی حفظه شیء کہا، خلیلی نے ثقة غیر ان الحفاظ لم یرضو احفظه کہا۔

امام ترمذی نے باب ماجاء فی الوقت الاول من الفضل میں کہا کہ ام فروہ والی حدیث ان کے علاوہ صرف عبداللہ عمری سے مروی ہے جو محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہیں حافظ نے تہذیب ص ۳۲۸ ج ۵ میں لکھا کہ امام ترمذی نے علل کبیر میں بخاری سے نقل کیا (''عبداللہ عمری بہت گیا گزرا آدمی ہے میں تو اس سے کچھ بھی روایت نہیں کرتا'') اور تاریخ کبیر ص ۱۴۵ ق ا جلد ۳ میں خود امام بخاریؒ نے لکھا کہ یحییٰ بن سعید ان کی تضعیف کرتے تھے اور یہی الفاظ اپنی کتاب الضعفاء میں بھی لکھے۔

غرض امام بخاریؒ کے بارے میں یہ لکھنا کہ انہوں نے عبداللہ عمری کو مقام احتجاج میں ذکر کیا ہے کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ اور امام ترمذی کے بارے میں یہ کہنا کہ انہوں نے عبداللہ عمری کی تحسین کی یہ بھی بے تحقیق بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے خود ضعیف کہا ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اور حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی فرمایا کہ اس بارے میں امام ترمذیؒ نے امام بخاریؒ کا اتباع کیا ہے، فرق اتنا ہے کہ امام بخاریؒ ان کو اسانید حدیث میں بھی قابل ذکر نہیں سمجھتے، امام ترمذیؒ اسانید کے بیان میں توسع کرتے ہوئے ان کو بھی لے لیتے ہیں، باقی جو حوالہ کتاب الحج کا دیا گیا ہے کہ اس میں امام ترمذی نے عبداللہ عمری کی تحسین کی، وہ محتاج ثبوت ہے کیونکہ ہم نے امام ترمذیؒ کی تحسین نہیں پائی بلکہ سرد اسانید کے موقع پر عبداللہ عمری کا ذکر بھی صرف ایک جگہ باب افراد الحج میں ہے، مگر مطبوعہ نسخوں میں حتی کہ مطبوعہ مجتبائی میں بھی (ص ۱۰۱) عبیداللہ بن عمر عن نافع عن ابن عمر ہے'' حق تعالیٰ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب رحمانی قدس سرہ کو اجر عظیم عطا فرمائے کہ اپنے نسخہ ترمذی میں اس کی تصحیح کی اور اپنی شرح ترمذی شریف میں بھی اس کی صراحت فرمائی، بظاہر اس اہم تصحیح کی طرف اور کسی نے توجہ نہیں کی، تحفۃ الاحوذی دیکھی تو وہاں بھی عبیداللہ ہی چھپا ہے اور شرح میں بھی اس پر کچھ نہیں لکھا تو گذارش یہ ہے کہ اگر یہی موقع صاحب ایضاح کے پیش نظر ہے تو وہاں بھی تحسین ترمذی کا وجود نہیں ہے، اور صرف اسانید میں ذکر آ جانا جیسا کہ ہم نے بصورت تصحیح ثابت کیا، تحسین کا مرادف نہیں ہے، خصوصاً اس لئے بھی کہ امام ترمذی خود دوسری جگہ انکی تضعیف بہ صراحت کررہے ہیں۔

اس کے بعد گذارش ہے کہ ''احناف کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ امام بخاری انہیں ضعیف نہیں مانتے'' ایسے جملے تحقیق پسند طبائع پر نہایت بار ہیں۔ رجال میں کلام ہر قسم کا ہوا ہے اور جس کے متعلق بھی جو بات انصاف سے کہی گئی ہے وہ نہایت قابل قدر ہے، کیونکہ اس کے سبب ہم احادیث نبوی کی قوت وضعف اور صحت وسقم وغیرہ حالات معلوم کرتے ہیں اور یہ اتنا عظیم مقصد ہے کہ اس کے لئے بہت سی تلخیاں برداشت ہونی چاہئیں، پھر اس کے لئے سہارے ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے: کھرا کھوٹا کھل کر سامنے آ جانا چاہیے، ہمارے نزدیک عبداللہ عمری کے بارے میں جو کچھ کلام ہوا ہے اس میں مسلکی عصبیت وغیرہ شامل نہیں ہے اور یہ کہنا کہ چونکہ ان کی کسی روایت سے احناف کو فائدہ پہنچا ہے اس لئے حافظ نے مندرجہ بالا سعی کی ہے، صحیح معلوم نہیں ہوتا، ہمارے علم میں ان کی وہ روایات بھی ہیں جن سے شوافع کو فائدہ پہنچتا ہے، تو کیا اتنی بات حافظ ابن حجر شافعی کو معلوم نہ تھی؟

(۲) حضرت شاہ صاحبؒ نے جو عبداللہ عمری کی تحسین کا کچھ مواد فراہم کیا ہے جیسا کہ اوپر کی عبارت ''العرف'' سے واضح ہے وہ فن حدیث کی صحیح واہم ترین خدمت ہے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے، ظاہر ہے اس کے لئے بڑے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے اور بغیر مراجعت اور کامل تیقظ کے یوں ہی چلتی ہوئی باتیں کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔

(۳) احناف کا استدلال عبداللہ عمری پر موقوف نہیں ہے، گو اس روایت مشہورہ سے بھی کچھ قوت ضرور ملتی ہے۔

(۴) حافظ ابن حجر کے بارے میں عام طور سے یہ رائے درست ہے کہ وہ احناف کے ساتھ بیجا تصرف برتتے ہیں مگر یہاں عبداللہ عمری کے بارے میں ان کی تحقیق اس سے برتر معلوم ہوتی ہے۔ والحق یقال۔

(۵) حافظ عینی کا نقد صحیح ہے، وہ کچی بات پسند نہیں کرتے اور اس مقام پر انہوں نے آخر میں لکھا کہ بظاہر تو یہاں عبداللہ عمری مراد ہیں اور کرمانی نے بھی اس کا جزم کیا ہے، مگر احتمال قوی اس امر کا بھی ہے کہ عبداللہ بن عمر مراد ہوں اور ان سے مناولہ کے بارے میں کوئی صریح قول نہ ملنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ فی نفسہ بھی کوئی روایت ان سے اس بارے میں موجود نہ ہو۔ (عمدۃ القاری ص ۷۰۴ج ۱)

(۶۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بنُ مُقَاتِلٍ اَبُوْ الْحَسَنِ قَالَ ثنا عبد الشقال اَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَتَبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ كِتَابًا اَوْاَرَادَ اَنْ يَّكْتُبَ فَقِيْلَ لَهٗ اِنَّهُمْ لا يَقْرَءُ وْنَ كِتَابًا اِلَّا مَخْتُوْمًا فَاتَّخَذَ خَاتَمًا مِّنْ فِضَّةٍ نَقْشُهٗ مُحَمَّدٌرَّسُوْلُ اللّٰهِ كَاَنِّي اَنْظُرُاِلٰى بَيَاضِهٖ فِيْ يَدِهٖ فَقُلْتُ لِقَتَادَةَ مَنْ قَالَ نَقْشُهٗ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَنَسٌ۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے (کسی بادشاہ کے نام دعوت اسلام کے لئے) ایک خط لکھا، یا لکھنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ سے کہا گیا کہ وہ بغیر مہر کا خط نہیں پڑھتے (یعنی بے مہر خط کو مستند نہیں سمجھتے) تب آپ ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں "محمد رسول اللہ" کندہ تھا گویا میں آج بھی آپ ﷺ کے ہاتھ میں اس کی سفیدی دیکھ رہا ہوں شعبہ راوی حدیث کہتے ہیں کہ میں نے قتادہ سے پوچھا کہ یہ کس نے کہا کہ اس پر محمد رسول اللہ کندہ تھا؟ انہوں نے جواب دیا انس رضی اللہ عنہ نے۔

تشریح: حضور اکرم ﷺ (اروا حنافداہ) نے سلاطین دنیا کو دعوت دین کے لیے مکاتیب مبارکہ ارسال فرمانے کا قصد فرمایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ دنیا کے بڑے لوگ بغیر مہر کے خطوط کو معتبر و محترم نہیں جانتے، اس پر آپ ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ یا اللہ رسول محمد کندہ کرایا گیا مذکورہ دونوں صورتیں نقل ہوئیں ہیں اوپر سے نیچے کو پڑھو یا برعکس۔

یہ امام بخاریؒ نے مکاتیب کے معتبر ہونے کی دلیل پیش کی ہے۔ علماء نے لکھا کہ مہر کا مقصد اس امر کا اطمینان دلانا ہے کہ کاتب کی طرف سے وہ تحریر جعلی یا بناوٹی نہیں ہے، اگرچہ ہو سکتا ہے کہ مہر کا بھی غلط طریقہ سے استعمال ہوا اور بغیر علم کاتب کے لگا دی جائے، اس لیے دوسری شرطیں بھی لگائی گئی ہیں مثلاً مکتوب الیہ کاتب کا خط پہچانتا ہو، یا شاہدوں کے ذریعے اطمینان کیا جائے، وغیرہ غرض مکاتبت کی صورت جب ہی شرعاً معتبر ہوگی کہ کسی طرح بھی یہ اطمینان ہو جائے کہ پوری تحریر کاتب ہی کی طرف سے ہے، جعلی نہیں ہے، نہ اس میں کوئی تغیر و تبدیلی کی گئی ہے۔

شبہ و جواب: حافظ عینی نے لکھا کہ اگر کہا جائے، حضور ﷺ تو خود اپنے دست مبارک سے نہیں لکھتے تھے، پھر حدیث الباب میں کتابت کی نسبت آپ کی طرف کس طرح ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ آپ کا خود دست مبارک سے تحریر فرمانا بھی منقول ہوا ہے، جس کا ذکر کتاب الجہاد میں آئے گا، اور اگر یہی بات محقق و ثابت ہو کہ آپ ﷺ نے کبھی خود تحریر نہیں فرمایا تو یہاں نسبت کتابت آپ کی طرف ایسی ہی مجازاً ہوگی جیسے امراء و سلاطین کی طرف ہوا کرتی ہے حالانکہ وہ خود نہیں لکھا کرتے۔ دوسروں سے لکھوایا کرتے ہیں۔ (عمدۃ القاری ص ۴۱۲ج ۱)

بَابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ وَمَنْ رَاٰى فُرْجَةً فِي الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا

(اس شخص کا حال جو مجلس کے آخر میں بیٹھ گیا اور اس شخص کا جو درمیان مجلس میں جگہ پا کر بیٹھ گیا)

(۶۶) حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ قَالَ حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ عَنْ اِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِيْ طَلْحَةَ اَنَّ اَبَا مُرَّةَ مَوْلٰى عَقِيْلِ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ اَخْبَرَهٗ عَنْ اَبِيْ وَاقِدِنِ اللَّيْثِيِّ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَمَا هُوَ جَالِسٌ فِي الْمَسْجِدِ وَالنَّاسُ مَعَهٗ اِذَا اَقْبَلَ ثَلٰثَةُ نَفَرٍ فَاَقْبَلَ اِثْنَانِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذَهَبَ وَاحِدٌ قَالَ فَوَقَفَا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَرَاٰى فُرْجَةً فِي الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيْهَا وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ وَاَمَّا الثَّالِثُ فَاَدْبَرَ ذَاهِبًا فَلَمَّا فَرَغَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ عَنِ النَّفَرِ الثَّلٰثَةِ اَمَّا اَحَدُهُمْ فَاَوٰى اِلَى اللّٰهِ فَاٰوَاهُ اللّٰهُ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَاسْتَحْيٰى فاستيحى اللّٰهُ مِنْهُ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَاَعْرَضَ فَاَعْرَضَ اللّٰهُ عَنْهُ.

ترجمہ: ابوواقد اللّیثی نے خبر دی کہ ایک مرتبہ رسول اللہ علیہ مسجد میں تشریف رکھتے تھے اور لوگ آپ کے پاس بیٹھے تھے کہ تین آدمی آئے، ان میں سے دو رسول اللہ علیہ کے سامنے پہنچ گئے اور ایک چلا گیا، راوی کہتے ہیں کہ پھر وہ دونوں رسول اللہ علیہ کے سامنے کھڑے ہوگئے اس کے بعد ان میں سے ایک نے جب مجلس میں ایک جگہ کچھ گنجائش دیکھی، تو وہاں بیٹھ گیا، دوسرا سب سے پیچھے بیٹھ گیا اور تیسرا پیٹھ پھیرے ہوئے واپس چلا گیا جب حضور علیہ فارغ ہوئے تو فرمایا کیا میں تمہیں ان تینوں آدمیوں کا حال نہ بتادوں؟ ایک نے قرب خداوندی حاصل کرنے کی حرص میں حضور علیہ کے قریب پہنچنے کی سعی کی تو اس کو خدا نے بھی قریب پہنچنے کی توفیق بخشی دوسرا شرم میں رہا کہ مجلس کے اندر جانے کا حوصلہ نہ کیا خدا نے بھی کمی رغبت کے سبب اس کی شرم کا صلہ دیا تیسرے نے بالکل ہی روگردانی کی تو حق تعالیٰ نے بھی اس کو محروم کردیا۔

تشریح: حدیث میں حضور اکرم علیہ کی ایک مجلس مبارکہ کا حال بیان ہوا ہے کہ اس کے پاس سے تین شخص گزرے، ان میں سے دو مجلس کی طرف آگئے اور کچھ توقف کے بعد ایک حلقہ کے اندر پہنچ گیا اور حضور علیہ سے قریب ہو کر ارشادات سے مستفید ہوا دوسرا اس کا ساتھی شرما حضوری کے طور پر مجلس میں شریک ہوا مگر بجائے آگے بڑھنے کے لوگوں کے پیچھے ایک طرف کنارے پر بیٹھ گیا اور مستفید ہوا، تیسرے آدمی نے اس مجلس مبارک کی کوئی اہمیت ہی نہ سمجھی اور منہ موڑ کر وہاں سے چلتا بنا۔

حضور علیہ نے ختم مجلس پر ارشاد فرمایا کہ میں ان تینوں کے خاص خاص احوال و درجات بتلاتا ہوں پہلے شخص نے پوری طرح مجلس مبارک اور حضور علیہ کے قرب کی اہمیت کو سمجھا دین و علم کی صحیح طلب نے اس کو قرب خداوندی سے نوازا دوسرا کم حوصلہ متساہل الطبع تھا کہ آگے نہ بڑھا اس کو شرم آئی ہوگی کہ مجلس مبارک سے قریب ہو کر یوں ہی واپس چلا جاؤں، اس لیے نیم دلی سے ایک طرف بیٹھ گیا، حق تعالیٰ نے بقدر اس کی نیت حسن و جذبہ خیر کے اس کو بھی اجر و ثواب سے نوازا تیسرا چونکہ بالکل ہی قسمت کا ہیٹا تھا اس کو اتنی توفیق بھی نہ ملی کہ مجلس کی کسی درجہ میں بھی شرکت کا اجر و شرف پالیتا۔

بظاہر یہاں دوسرے آدمی نے اپنی کوتاہی و تساہل ہی کے سبب مجلس کے اندر جانے کی سعی نہیں کی، ورنہ اس کو بغیر کسی کو ایذا دیئے بھی جانے کا موقع ضرور حاصل ہوا ہوگا، اسی لیے حدیث میں اس کو دوسرے درجہ میں اور گری ہوئی پوزیشن میں جگہ دی گئی کیونکہ اگر کوئی شخص مجلس کے اندر اس لیے نہ جائے کہ دوسرے پہلے سے بیٹھنے والوں کی گردنوں کے اوپر سے گزرنا پڑیگا اور ان کو تکلیف ہوگی، تو ایسا کرنا خود شریعت میں بھی محبوب و پسندیدہ ہے، وہ صورت بظاہر یہاں نہیں ہے ورنہ یہ دوسرا شخص بھی پہلے ہی کے برابر درجہ حاصل کر لیتا۔

ترجمۃ الباب وحدیث کی مطابقت:

اس کے بعد گزارش ہے کہ امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں ترتیب دوسری رکھی ہے جو حدیث کی ترتیب سے مطابق نہیں معلوم ہوتی، انہوں نے دوسرے درجہ کے آدمی کو اول اور اول کو ثانی بنایا ہے۔

اگر قاضی عیاض کی توجیہ لے لی جائے کہ دوسرا شخص لوگوں کی مزاحمت کر کے مجلس کے اندر اس لیے نہیں گھسا کہ اس طرح کرنے سے اسکو آنحضرت ﷺ اور دوسرے حاضرین سے شرم آئی، تو اس طرح اس کا درجہ اول کے لحاظ سے زیادہ نہیں گرتا اور برابر بھی کہا جا سکتا ہے اور اس توجیہ پر امام بخاریؒ کی ترجمۃ الباب کی ترتیب زیادہ محل نظر نہیں رہتی۔ واللہ اعلم۔

جزاء جنس عمل کی تحقیق

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث الباب میں صرف تنوع احوال دکھلایا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ جزاء مطابق جنس عمل ہوتی ہے جیسے کہ ''انا عند ظن عبدی بی'' میں ہے وہاں بھی یہ بحث بے موقع چھڑ گئی ہے کہ ذکر جہری افضل ہے یا ذکر سری؟ حالانکہ حدیث نے صرف یہ بات بتلائی کہ حق تعالیٰ ہر شخص کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق عمل فرماتے ہیں اور وہاں بھی جزاء جنس عمل سے ہے جو شخص حق تعالیٰ کو مجمع میں یاد کرے گا حق تعالیٰ اس کو اپنے گرد کے مجمع میں یاد فرمائیں گے جو شخص اپنے دل میں یاد کرے گا حق تعالیٰ بھی اس کو اسی طرح یاد فرمائیں گے کیونکہ اس کا عمل اسی قسم کی جزاء کا مستحق ہے لہٰذا حدیث میں کسی چیز کی افضلیت کا نہ ذکر ہے نہ اشارہ اسی طرح یہاں بھی ہے جو شخص مجلس کی شرکت سے محروم ہو کر چلا گیا وہ اس مجلس کے ثواب سے بھی محروم ہوا جس نے شرم وحیا ہی سے سہی مگر مجلس میں شریک ہو گیا تو اس کو اسی درجہ کا ثواب مل گیا اور اگر خمول پسندی اور اجتناب عن الشہرت کے جذبہ سے مجلس کے وسط میں نہ گیا تواضع اختیار کر کے ایک طرف بیٹھ گیا تو اس خاص سبب وحیثیت سے اس کو ایک فضیلت بھی مل گئی جیسا کہ حدیث (کنز العمال) میں ہے کہ جو شخص کسی دوسرے کی رعایت سے اور خدا کے تواضع سے صف واہل لحاظ سے مذکور حیا کرنے والے کو داخل حلقہ مجلس میں بھی فضیلت دے سکتے ہیں لہٰذا یہاں حدیث کے سبب کسی کی افضلیت ومفضولیت کا فیصلہ بے محل ہے۔ ہاں! دوسری وجوہ وحیثیات کے تحت ایسا کیا جائے تو مضائقہ نہیں۔

تیسرا آدمی کون تھا؟:

پھر فرمایا کہ جن لوگوں نے یہ کہا کہ تیسرا آدمی منافق تھا، وہ تو حد سے آگے بڑھ گئے کیونکہ اس پر کوئی دلیل وحجت نہیں ہے، اور ایک مومن بھی کسی ضرورت طبعی وشرعی کے سبب اگر کسی مجلس علمی ودینی سے غیر حاضر ہو جائے تو وہ مواخذہ سے بری ہے، البتہ اگر ایسی مجلس کو چھوڑ کر جانا نکیر ونفرت کی بناء پر ہو تو حرام ہوگا اور لاپروائی کے باعث ہوگا تو برا ہے کہ اس حصۂ علم ودین اور اس وقت کی خاص رحمت سے محروم ہوا۔

اعمال کی مختلف جہات

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بعض اعمال کی مختلف و متعدد جہات ہوتی ہیں اور ان کے لحاظ سے ہی فیصلہ کرنا چاہیے مثلاً حدیث ترمذی میں ہے کہ ایک صحابی سے جو باوجود مالدار ہونے کے پھٹے پرانے حال میں رہتے تھے، حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ تم پر خدا کی نعمت کے اثرات ظاہر ہونے چاہئیں'' یعنی اچھی حالت اور بہتر لباس وغیرہ اختیار کرنا چاہیے، معلوم ہوا کہ نعمت خداوندی کے مظاہرہ میں فضیلت ہے، دوسری حدیث میں اس طرح ہے کہ جو شخص خدا کے لئے تواضع وانکسار اختیار کر کے، زینت کا لباس ترک کرے گا (یعنی سادگی اختیار کرے گا تو اس کو حق تعالیٰ روز قیامت میں عزت و کرامت کے حلے پہنائیں گے، اس سے معلوم ہوا کہ سادہ وضع میں فضیلت ہے تو مختلف جہات کے سبب مختلف فضائل ہوتے ہیں۔ اس لئے فضیلت کلی کسی ایک چیز کو نہیں دی جاسکتی۔

صنعت مشاکلت

حق تعالیٰ کے لئے حدیث الباب میں ایواء استحیاء اور اعراض کے الفاظ بطور صنعت مشاکلت بولے گئے ہیں کہ یہ بلاغت کا ایک طریقہ ہے۔

فَرجہ یا فُرجہ؟ حدیث میں فرجہ کا لفظ فا کے زبر اور پیش دونوں سے مستعمل ہے اور بعض اہل لغت نے کہا کہ مجلس میں کشادگی کے لئے فرجہ پیش کے ساتھ اور مصائب و مشکلات سے نجات کے لئے زبر کے ساتھ زیادہ فصیح ہے۔

ابو العلاء کا واقعہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس بارے میں ابو العلاء نحوی کا واقعہ بہت مشہور ہے وہ خود بڑا امام لغت تھا مگر اس کو تردد تھا کہ فرجہ زیادہ فصیح ہے یا فُرجہ؟ ایک عرصہ تک وہ اس خلجان میں رہا، حجاج ظالم کے زمانہ میں تھا حجاج سے کسی بات پر نخ چق ہوگئی تو قصباتی رہائش ترک کر کے کسی گاؤں گوٹ میں بسر اوقات کرنے لگا تا کہ حجاج کے ظلم و تعدی سے امان ملے ایک روز کسی طرف چلا جا رہا تھا کہ ایک اعرابی حجاج کی وفات پر ایک شعر پڑھتا ہوا جا رہا تھا، غالباً اس کا دل بھی ابو العلاء کی طرح زخمی تھا

ربما تکره النفوس من الدهر له فَرجة کحل العقال

(بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ طبائع، زمانہ کی نہایت تلخ آزمائشوں سے تنگ آجاتی ہیں، لیکن خلاف توقع دفعۃً ان سے چھٹکارا مل جاتا ہے جیسے اونٹ کی رسی کھل گئی اور وہ آزاد ہوا)

غرض وہ اعرابی حجاج کے مرنے کی خوشی میں شعر مذکور پڑھتا جا رہا تھا، ابو العلاء کہتے ہیں کہ مجھے بھی حجاج کے مرنے کی بڑی خوشی ہوئی، مگر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے اس کے مرنے کی زیادہ خوشی ہوئی یا اس بات سے کہ فرجہ زبر کے ساتھ اعرابی نے پڑھا، جس سے مجھے یہ تحقیق ملی کہ بہ نسبت پیش کے وہی زیادہ فصیح ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ دیکھو پہلے زمانہ میں علم کی اتنی زیادہ قدر و قیمت تھی کہ حجاج کی وجہ سے مارا مارا پھرتا تھا۔ کسی طرح جان بچ جائے، کتنی کچھ تکالیف و مصائب برسوں تک برداشت کئے ہوں گے، مگر خود امام لغت ہونے کے باوجود ایک لفظ کی تحقیق پر اتنی بڑی خوشی منا رہا ہے کہ وہ سارے مصائب کے خاتمہ کی خوشی کے برابر ہوگئی غالباً یہ واقعہ نفحۃ الیمین میں بھی ہے۔ واللہ اعلم

فائدہ علمیہ: علامہ محقق ابن جماعہ کنانیؒ نے اپنی مشہور و مفید کتاب ''تذکرة السامع والمتکلم'' میں اسباب حصول علم کی شرح کرتے

ہوئے لکھا۔علم وفہم کی زیادتی اوراس کے مسلسل و بے تکان وملال مشغلہ کے اعظم اسباب میں سے اکل حلال ہے، جومقدار میں کم ہوامام شافعی ؒ نے فرمایامیں نے ۱۶سال سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا،اس کا سبب یہ ہے کہ زیادہ کھانے پر زیادہ شرب کی ضرورت ہوتی ہے جس سے نیند زیادہ آتی ہےاور حلاوت،قصورفہم،فتورحواس،وجسمانی کسل پیدا ہوتا ہے۔اس کے سوازیادہ کھانے کی شرعی کراہت اور بیماریوں کے خطرات الگ رہے جیسا کہ شاعر نے کہا

فان الداء اکثر ما تراہ یکون من الطعام اوالشراب

(اکثر بیماریاں کھانے پینے میں بے احتیاطی وزیادتی کے سبب ہوتی ہیں)

اس کے بعد علامہ نے لکھا کہ اہل علم کے لئے بڑی ضرورت ورع وتقوی کی بھی ہے کہ اپنے تمام امورطعام،شراب لباس مسکن وغیرہ ضرورتوں میں متورع ہو،صرف شرعی جواز وگنجائشوں کا طالب نہ ہوتا کہ اس کا قلب نورانی ہو کر قبول علم وصلاح کا مستحق ہواوراس کے علم ونور سے دوسروں کو بھی فائدہ ہو۔الخ (ص۷۳)

بَابُ قَوْلِ النَّبِیِّ ﷺ رُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰی مِنْ سَامِعٍ

(بعض اوقات وہ شخص جس تک حدیث واسطہ درواسطہ پہنچے گی براہ راست سننے والے کی نسبت سے زیادہ فہم وحفظ والا ہوگا)

(۶۷) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا بِشْرٌ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ عَوْنٍ عَنْ ابْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَكْرَةَ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ ذَكَرَ النَّبِیُّ ﷺ قَعَدَ عَلٰی بَعِيْرِهٖ وَاَمْسَکَ اِنْسَانٌ بِخِطَامِهٖ اَوْ بِزِمَامِهٖ قَالَ اَیُّ يَوْمٍ هٰذَا فَسَكَتْنَا حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَيُسَمِّيْهِ بِغَيْرِ اسْمِهٖ قَالَ اَلَيْسَ يَوْمَ النَّحْرِ قُلْنَا بَلٰی قَالَ فَاَیُّ شَهْرٍ هٰذَا فَسَكَتْنَا حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَيُسَمِّيْهِ بِغَيْرِ اسْمِهٖ قَالَ اَلَيْسَ بِذِی الْحِجَّةِ قُلْنَا بَلٰی، قَالَ فَاِنَّ دِمَآءَ كُمْ وَ اَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ بَيْنَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِیْ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِیْ بَلَدِكُمْ هٰذَا لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَآئِبَ فَاِنَّ الشَّاهِدَ عَسٰی اَنْ يُّبَلِّغَ مَنْ هُوَ اَوْعٰی لَهٗ مِنْهُ.

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ ؓ نے اپنے باپ سے روایت کی کہ وہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کرنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اونٹ پر بیٹھے تھےاور ایک شخص نے اس کی نکیل تھام رکھی تھی،آپ ﷺ نے پوچھا یہ کونسا دن ہے؟ ہم خاموش رہے حتی کہ ہم یہ سمجھے کہ آج کے دن کا آپ ﷺ کوئی دوسرا نام تجویز فرمائیں گے،آپ ﷺ نے فرمایا' کیا آج قربانی کا دن نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا' بیشک (اس کے بعد) آپ نے فرمایا' یہ کونسا مہینہ ہے؟ ہم اس پر بھی خاموش رہے' اور یہ بھی سمجھے کہ اس ماہ کا بھی آپ کوئی دوسرا نام تجویز فرمائیں گے' آپ نے فرمایا' کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا بے شک،تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ یقیناً تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبرو تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے اسی طرح حرام ہے،جس طرح آج کے دن کی حرمت تمہارے اس مہینے اوراس شہر میں،جوشخص حاضر ہے اسے چاہیے کہ غائب کو یہ بات پہنچاوے کیونکہ ایساممکن ہے کہ جو شخص یہاں موجود ہے وہ ایسے شخص کو یہ خبر پہنچائے جو اس سے زیادہ (حدیث کا) محفوظ رکھنے والا ہو۔

تشریح: رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کے لئے باہمی خون ریزی حرام ہے۔ایک مسلمان کے لئے دوسرے

مسلمان کی جان و مال اور آبرو کا احترام ضروری ہے، حج کے مہینوں میں اہل عرب لڑائی کو برا سمجھتے تھے، خصوصاً ماہ ذی الحجہ اور حج کے مخصوص دنوں کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے، اسی لئے مثالاً آپ ﷺ نے اسی کو بیان فرمایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ نے یہاں ترجمۃ الباب ہی میں قول النبی ﷺ کی تصریح سے شروع کیا ہے، جس سے اشارہ ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ بھی حدیث قوی ہے، نیز تنبیہ فرمائی کہ حدیث رسول اللہ ﷺ صرف حلال وحرام بیان کرنے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جو رسول اللہ ﷺ سے سنی جائے اور ترجمہ حدیث الباب سے یہ امر بھی ثابت ہوا کہ ممکن ہے کہ امت میں ایسے لوگ بھی آئیں جو احادیث رسول اللہ ﷺ کی حفظ ونگہداشت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی بڑھ جائیں (کیونکہ مخاطب صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں اور بعد کو آنے والے تابعین تبع تابعین وغیرہم ہیں، مگر یہ ایک جزوی فضیلت ہوگی، فضیلت کلی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کے لئے مخصوص رہے گی، کیونکہ ان کی سابقیت اسلام ونصرت دین اور شرف صحبت نبی الانبیاء علیہم السلام وغیرہ کے فضائل وشرف کو بعد والے نہیں پا سکتے۔

پہلے ابواب میں امام بخاریؒ نے شرف علم وفضیلت تحصیل علم پر روشنی ڈالی تھی یہاں تبلیغ وتعلیم کی اہمیت بتلانا چاہتے ہیں کہ جو کچھ علم حاصل ہوا ہے اس کو دوسروں کی طرف پہنچادو۔ اس کا خیال مت کرو کہ اس سے براہ راست سننے والے کو کتنا فائدہ پہنچے گا، کتنا نہیں پہنچے گا، کیونکہ بسا اوقات وہ علمی باتیں واسطہ در واسطہ ایسے لوگوں تک بھی پہنچ جاتی ہیں، جو تم میں سے بھی زیادہ ان کا فائدہ حاصل کرلیں گے، اور اس طرح نہ صرف یہ کہ علوم نبوت کا فیض باقی وقائم رہے گا بلکہ اس میں برابر ترقیات ہوتی رہیں گی، اسی لئے حدیث میں ہے کہ میری امت کی مثال بارش کی سی ہے کہ کبھی موسم کی ابتدائی بارشوں سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے اور کبھی آخری بارشوں سے۔ پہلے سے کوئی نہیں بتلا سکتا کہ موجودہ یا آئندہ سال میں کیا صورت پیش آئے گی؟

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بسا اوقات شاگرد استاذ سے یا مرید شیخ سے بڑھ جاتا ہے اور یہ بات صادق ومصدوق ﷺ کے ارشاد عالی کے مطابق ہر زمانہ میں صحیح ہوتی آئی ہے اور درست ہوتی رہے گی۔

تابعین کے آخری دور میں حضرت امام اعظمؒ کے علمی وعملی کمالات سے آپ انوار الباری کی روشنی میں واقف ہو چکے ہیں، آپ کے بعد دوسرے ائمہ مجتہدین ہوئے ان سب نے تدوین فقہ اسلامی کے سلسلہ میں اور اسی طرح طبقہ محدثین نے تدوین حدیث کے سلسلہ میں جو زریں خدمات انجام دیں وہ رسول اکرم ﷺ کے مذکورہ بالا ارشادات کا بہترین ثبوت ہیں، اسی طرح ہر دور کے مفسرین، شارحین حدیث اور فقہائے کرام نے جو ٹھوس علمی دینی کارنامے انجام دیئے وہ سب بھی نبی کریم ﷺ کے اقوال مبارکہ کی کھلی ہوئی تصدیق ہیں حضور اکرم ﷺ نے جو مذکور حدیث الباب میں حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد کی سوالی نوعیت اختیار فرمائی کہ آج کون سا دن ہے؟ یہ کونسا مہینہ ہے؟ یہ اس لئے تھا کہ حاضرین آپ ﷺ کے بعد کے ارشاد کی غیر معمولی اہمیت کو سمجھ لیں، اور ان کو اچھی طرح شوق وانتظار ہو جائے کہ حضور ﷺ کیا فرمانا چاہتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان مبارک ومقدس اشہر حرام کی عظمت وتقدیس سے تو تم پہلے ہی سے واقف ہو اور ان کی رعایت ہمیشہ سے کرتے آئے ہو اور اب اس بات کو بھی گرہ باندھ لو کہ مسلمان کی عزت وحرمت کی حفاظت اور اس کے جان ومال کا احترام ہر وقت اور ہر مقام میں اسی دن اور اسی ماہ ذی الحجۃ الحرام کی طرح ضروری وفرض ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ "مومن کی جان خدا کے نزدیک کعبہ مکرمہ سے بھی زیادہ عزیز ومحترم ہے، یہ دوسری بات ہے کہ کوئی مومن خود ہی جان بوجھ کر اپنی عزت اور جان ومال کو (دوسرے مسلمانوں کی

عزت یا جان و مال کوتلف کرنے کے سبب) اسلامی شریعت وقانون کے تحت ضائع اوررائگاں کردے۔ واللہ اعلم بالصواب

بَابُ الْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ لِقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَبَدَاَ بِالْعِلْمِ وَاَنَّ الْعُلَمَآءَ هُمْ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَرَّثُوا الْعِلْمَ مَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَّطْلُبُ بِهٖ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ وَقَالَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ وَقَالَ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ وَقَالَ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحَابِ السَّعِيْرِ وَقَالَ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَاِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ وَقَالَ اَبُوْ ذَرٍّ لَّوْ وَضَعْتُمُ الصَّمْصَامَةَ عَلٰى هٰذِهٖ وَاَشَارَ اِلٰى قَفَاهُ ثُمَّ ظَنَنْتُ اَنِّيْ اُنْفِذُ كَلِمَةً سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ تُجِيْزُوْا عَلَيَّ لَاَنْفَذْتُهَا وَقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَآئِبَ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ حُكَمَآءَ عُلَمَآءَ فُقَهَآءَ وَيُقَالُ الرَّبَّانِيُّ الَّذِيْ يُرَبِّي النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ قَبْلَ كِبَارِهٖ.

(علم کا درجہ قول وعمل سے پہلے ہے) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. (آپ جان لیجئے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے)

تو گویا اللہ تعالیٰ نے علم سے ابتداء فرمائی اور حدیث میں ہے کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں اور پیغمبروں نے علم ہی کا ترکہ چھوڑا ہے پھر جس نے علم حاصل کیا اس نے دولت کی بہت بڑی مقدار حاصل کرلی اور جو شخص کسی راستے پر حصول علم کے لئے چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کی راہ آسان کردیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو عالم ہیں اور دوسری جگہ فرمایا ہے اور اس کو عالموں کے سوا کوئی نہیں سمجھتا اور فرمایا، اور ان لوگوں (کافروں) نے کہا اگر ہم سنتے یا عقل رکھتے تو جہنمی نہ ہوتے اور ایک اور جگہ فرمایا، کیا اہل علم اور جاہل برابر ہوسکتے ہیں؟ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے ساتھ اللہ بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عنایت فرمادیتا ہے اور علم تو سیکھنے سے ہی آتا ہے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر تم اس پر تلوار رکھ دو اور اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا اور مجھے امید ہو کہ میں نے نبی ﷺ سے جو ایک کلمہ سنا ہے، گردن کٹنے سے پہلے بیان کرسکوں گا تو یقیناً میں اس کو بیان کردوں گا اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ حاضر مجلس کو چاہیے کہ وہ غائب تک میری بات پہنچادے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آیت کریمہ کونوا ربانین میں حکماء فقہاء وعلماء مراد ہیں اور ربانی اس عالم کو کہتے ہیں جو تدریجی طور سے لوگوں کی تعلیم وتربیت کرے۔)

تشریح: "وانما العلم بالتعلم" (علم صحیح کا حصول تعلم ہی سے ہوتا ہے، حافظ عینی نے لکھا کہ بخاری کے بعض نسخوں میں بالتعلیم ہے مقصد یہ ہے کہ علم معتمد ومعتبر وہی ہے جو انبیاء اور ان کے وارثین علوم نبوت کے سلسلہ سے ذریعہ تعلیم وتعلم حاصل کیا جائے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم کا اطلاق صرف علوم نبوت وشریعت پر ہوگا۔ اسی لئے اگر کوئی شخص وصیت کرجائے کہ میرے مال سے علماء کی امداد کی جائے تو اس کا مصرف صرف علم تفسیر، حدیث وفقہ پڑھنے پڑھانے والے حضرات ہوں گے۔ (عمدۃ القاری ص ۴۲۶ ج ۱)

یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کی تخریج ابن ابی عاصم اور طبرانی نے کی ہے ابونعیم اصبہانی نے بھی مرفوعاً نقل کیا ہے، البتہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے موقوفاً بزار نے تخریج کی ہے۔ اس حدیث کی اسناد حسن ہے۔ (فتح الباری ص ۱/۱۱۸)

معلوم ہوا کہ جو لوگ اس مذکورہ بالا سلسلہ سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی مطالعہ وغیرہ کے ذریعہ علم شریعت حاصل کرتے ہیں وہ معتمد نہیں۔
اور ہم نے اپنے زمانے میں اس کا تجربہ بھی کیا ہے کہ ایسے حضرات بڑی بڑی غلطیاں بھی کرتے ہیں، حتی کہ بعض غلطیاں تحریف تک پہنچ جاتی ہیں، اعاذنا اللہ منہا۔

ربانی کا مفہوم: ربانی کی نسبت رب کی طرف ہے، حافظ نے لکھا کہ ربانی وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے رب کے اوامر کا قصد کرے، علم و عمل دونوں میں، بعض نے کہا کہ تربیت سے ہے جو اپنے تلامذہ ومستفیدین کی علمی وروحانی تربیت کرے۔

ابن اعرابی نے فرمایا کہ کسی عالم کو ربانی جب ہی کہا جائے گا کہ وہ عالم باعمل اور معلم بھی ہو اور کتاب الفقیہ والمتفقہ للخطیب میں ہے کہ جب کوئی شخص عالم، عامل اور معلم ہوتا ہے تو اس کو ربانی کہتے ہیں اور جس میں ایک خصلت بھی ان تینوں میں سے کم ہوگی اس کو ربانی نہ کہا جائیگا۔ (لامع الدراری ص ۱۷۴)

حکماء، فقہاء وعلماء کون ہیں؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ ربانیین کی تفسیر میں فرمایا کہ حکیم، فقیہ وعالم بن جاؤ، حافظ عینی نے فرمایا کہ حکمۃ، صحت قول وفعل وعقد سے عبارت ہے، بعض نے کہا کہ فقہ فی الدین (دین کی سمجھ) حکمت ہے بعض نے کہا کہ حکمت **معرفة الاشياء على ماهي عليه** ہے (پوری طرح چیزوں کے حقائق کی معرفت) اسی سے کہا گیا کہ حکیم وہ ہے جس پر احکام شرعیہ کی حکمتیں منکشف ہوں، یعنی قانون شریعت کا عالم ہونے کے ساتھ، قانون کی علل وحکم سے بھی واقف ہو، فقہ سے مراد احکام شرعیہ کا علم ہے، ان کی ادلہ تفصیلیہ کے ساتھ یعنی مسائل کی واقفیت کے ساتھ ان کی وجوہ ودلائل کا بھی عالم ہو۔

علم سے مراد علم تفسیر، حدیث وفقہ ہے، بعض نسخوں میں حلماء ہے جمع حلیم کی، حلم سے، جس کا معنی بردباری، وقار اور غصہ وغضب کے موقع پر صبر، ضبط واطمینان کی کیفیت ہے۔

بظاہر ہر سہ اقسام مذکورہ بالا میں سے حکماء اسلام کا درجہ زیادہ بلند وبالا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے لقب "حکیم الاسلام" کا مستحق ہر زمانہ کا نہایت بلند پایہ محقق ومتبحر عالم ہی ہوسکتا ہے، آج کل علمی وشرعی القاب کے استعمال میں بڑی بے احتیاطی ہونے لگی ہے۔ **ربنا يوفقنا لما يحب ويرضى.** آمین

بحث ونظر

مقصد ترجمۃ الباب: امام بخاری کی غرض اس باب وترجمۃ الباب سے کیا ہے؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

(۱) علامہ عینی وعلامہ کرمانی نے فرمایا کہ کسی چیز کا پہلے علم حاصل کیا جاتا ہے اس کے بعد ہی اس پر عمل ہوتا ہے یا اس کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے، لہٰذا بتلایا کہ علم قول وعمل پر بالذات مقدم ہے اور بلحاظ شرف بھی مقدم ہے، کیونکہ علم عمل قلب ہے، جو اشرف اعضاء بدن ہے (اور عمل وقول کا تعلق جوارح سے ہے، جو بہ نسبت قلب کے مفضول ہیں)

(۲) علامہ ابن بطال نے فرمایا کہ علم سے اگرچہ مقصود ومطلوب عمل ہی ہے مگر عمل کی مقصودیت ومطلوبیت کا منشاء اس امر کا علم ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عمل پر اجر وثواب کا وعدہ فرمایا ہے، لہٰذا علم کا تقدم ظاہر ہے۔

(۳) علامہ سندھی نے فرمایا کہ علم کا تقدم قول وعمل پر بلحاظ شرف ورتبہ بتلانا ہے، باعتبار زمانہ کے نہیں، لہٰذا تقدم زمانی کا مفہوم بظاہر

امام بخاریؒ کی کسی بات سے نکالنا درست نہیں۔

(۴) حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ ظاہر ہے علم، اس کے موافق عمل کرنے پر اور علمی وعظ ونصیحت کرنے پر مقدم ہے (جب تک علم ہی نہ ہوگا، نہ اس کے موافق عمل کر سکے گا، نہ کسی علمی بات کو صحیح طور پر بیان کر سکے گا)، یہی بات ان آیات، روایات و آثار سے بھی ثابت ہوتی ہے، جو امام بخاری نے اپنے ثبوت مدعا کے لئے پیش کئے ہیں، کیونکہ جب علم ہی افضل ٹھہرا اور سب اعمال وغیرہ کی صحت وثواب وغیرہ کے لئے مدار ہوا تو اس کو یہاں مقدم ہونا ہی چاہیے۔

شبہ وجواب: حضرتؒ نے اس شبہ کا بھی جواب دے دیا کہ امام بخاریؒ نے تقدیم علم کا ترجمہ لکھا ہے اور جو آیات و آثار ذکر کئے ہیں ان میں سے کسی میں تقدیم والی بات کا ذکر نہیں ہے، ان میں صرف شرف علم کا ذکر ہے تو ان سے ترجمہ کی مطابقت کس طرح ہوئی؟ حضرتؒ نے جواب کا اشارہ فرمادیا کہ اگرچہ ان آیات و آثار میں تقدیم کا ذکر نہیں ہے، مگر فضل وشرف علم اور اس کا مدار عمل ہونا تو ان سے ثابت ہے اور جب ایک چیز دوسرے سے افضل ٹھہری اس سے تقدم بھی ثابت ہو گیا خواہ وہ زمانی نہ ہو، صرف شرف ورتبہ ہی کا ہو۔

(۵) علامہ ابن المنیر نے فرمایا، امام بخاریؒ کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ علم شرط ہے صحت قول وعمل کے لئے اور وہ دونوں بغیر علم غیر معتبر ہیں، لہٰذا علم ان پر مقدم ہوا کہ اس سے نیت صحیح ہوتی ہے، جس پر عمل کی صحت موقوف ہے،

امام بخاری نے اسی فضل وشرف علم پر تنبیہ کی تاکہ علماء کے اس مشہور قول سے کہ ''علم بغیر عمل کے بے فائدہ ہے''۔ علم کو غیر موقر سمجھ کر اس کی طلب وتحصیل میں سستی نہ ہو۔ (عمدۃ القاری ص۴۲۳ج۱)

(۶) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت فیوضہم نے اس موقع پر تحریر فرمایا کہ میرے نزدیک امام بخاریؒ کی غرض یہ ہے کہ ''علم بلا عمل'' پر جو وعیدیں آئیں ہیں، ان سے کوئی سمجھ سکتا ہے کہ جو عمل میں قاصر ہو اس کے لئے تحصیل علم مناسب نہیں، اس مغالطہ کو امامؒ نے دفع کیا اور اس باب کے ذریعے بتلایا کہ علم فی ذاتہٖ عمل پر مقدم ہے، اس کے بعد اگر علم کے مطابق عمل کی توفیق نہ ہوئی، تو یہ دوسری چیز ہے جو یقیناً موجب خسارہ ومستوجب وعیدات ہے اور یہی امر اکثر شارحین کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے (لامع الدراری ص۴۶ج۱)

(۷) حضرت شاہؒ صاحب نے فرمایا کہ امام بخاری علم قبل العمل بطور ''مقدمہ عقلیہ'' بیان کیا ہے۔ پھر اس کے لئے آیت کریمہ فاعلم انہ لا الٰہ الا اللہ کو بطور استشہاد پیش کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے اول علم کا ذکر فرمایا، اس کے بعد عمل کو لائے اور فرمایا و استغفر لذنبک. حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ امام بخاریؒ کا مقصد علم وعمل کا ذاتی وعقلی تقدم وتاخر بتلانا ہے، جس کے بعد علم کا شرف وفضل یا ضرورت واہمیت خود ہی سمجھ میں آجاتی ہے اور اس کا ثبوت آیات و آثار مذکورہ سے بھی ہوتا ہے

یہاں سے یہ بات صاف ہوگئی کہ امام بخاری کے سامنے علم بغیر عمل کا سوال نہیں ہے، نہ وہ اس کو زیر بحث لائے ہیں، نہ وہ علم بے عمل کی کوئی فضیلت ثابت کرنا چاہتے ہیں، علامہ ابن منیر کے قول پر صرف اتنی بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی شخص طلب وتحصیل علم سے بچنے کے لئے یہ بہانہ ڈھونڈے کہ علم بے عمل کے مفید نہیں تو امام بخاریؒ اس کی اہانتِ علم وتساہل کیشی پر نکیر کرنے کے لئے علم کی ضرورت واہمیت واضح کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ثابت نہیں ہوا کہ امام بخاریؒ علم بے عمل کو بھی فضیلت کے درجہ میں مانتے ہیں۔

تحقیق ایضاح البخاری سے اختلاف

اس موقع پر ہمیں حضرت مخدوم ومحترم صاحب ایضاح دامت فیوضہم کے اس طرز تحقیق سے سخت اختلاف ہے کہ انہوں نے چار پانچ صفحات

میں علم بے عمل کی فضیلت ثابت کی ہے، اس لئے یہاں ہم تحقیق مذکورہ نقل کریں گے، اس کے بعد حضرت شاہ صاحب اور دیگر اکابر کے ارشادات نقل کریں گے، واللہ المستعان۔

(۱) اس باب کے انعقاد کی اصل غرض اس بات کی تردید ہے جو لوگوں میں عام طور پر مشہور ہے کہ علم کے سلسلہ میں فضیلت کی آیات و حدیث اس علم کے ساتھ خاص ہیں، جس کے ساتھ عمل بھی ہو، چنانچہ عام حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ علم کی تمام فضیلتیں اور ثواب صرف اس وقت ہے جبکہ اس کے ساتھ عمل بھی ہو، لیکن اگر علم کے ساتھ عمل نہیں ہے تو اس کا کوئی ثمرہ نہیں، بلکہ وہ عالم کے لئے وبال ہے، مشہور ہے کہ "ویل للجاھل مرۃ وللعالم سبعین مرۃ" اس بات کے لئے دلیل ایک یہ دی جاتی ہے کہ علم وسیلہ ہے اور معلوم ہے کہ وسائل مقصود بالذات نہیں ہوا کرتے۔ اسی لئے اصل مقصد عمل ہے اور علم بغیر عمل لائق تعریف نہیں ہے، امام بخاریؒ نے یہ باب منعقد کر کے بتلا دیا کہ یہ مشہور بات درست نہیں ہے اور علم قول و عمل سے بالکل الگ چیز ہے، اس لئے جو فضائل علم کے بارے میں وارد ہوئے ہیں وہ علم ہی کے مخصوص فضائل ہیں، ہاں! علم کے ساتھ عمل بھی جمع ہو جائے تو اس کی فضیلتیں اور بھی زیادہ ہیں (ایضاح البخاری ص ۴۶ ج ۵)

(۲) مذکورہ بالا تحقیق کی بناء پر ترجمہ کے ذیل میں ذکر کردہ آیات و حدیث پوری طرح منطبق ہو جاتی ہیں اور اگر مقصد بخاری وہ قرار دیں جو عام شارحین کا مختار ہے، تو ذیل کی احادیث و اقوال کا ترجمۃ الباب سے انطباق نہیں ہوتا۔ (ص ۴۷ ج ۵)

(۳) ص ۴۷ تا ص ۵۰ میں امام بخاریؒ کی پیش کردہ ہر آیت، حدیث و اثر کے تحت لکھا گیا کہ اس میں صرف علم کی فضیلت کا ذکر ہے، عمل کا نہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ علم عمل کے بغیر بھی اپنے اندر ایک بڑا شرف رکھتا ہے کہیں کہا کہ یہاں بھی علم کے ساتھ عمل کا ذکر نہیں ہے معلوم ہوا کہ عمل کے بغیر بھی علم کا سیکھنا جنت کی راہ آسان کرتا ہے، ایک جگہ فرمایا، معلوم ہوا کہ علم ایک مستقل چیز ہے، جس کی فضیلت و شرف عمل پر منحصر نہیں۔" آیت ھل یستوی الذین یعلمون پر فرمایا کہ "اس سے بھی علم کی فضیلت ہی مراد ہے۔"

حضرت ابوذر کے قول پر لکھا کہ "اس میں فضیلت تبلیغ کا اشارہ ہے اور یہ خود مقصود بالذات ہے، اس کا یہ خصوصی فضل عمل پر موقوف نہیں ہے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر "ربانیین" پر فرمایا کہ "آپ نے اس کی تفسیر میں "عاملین" کو کوئی مقام نہیں دیا بلکہ علم کے درجات بیان فرمائے ہیں نیز ربانی کی جو تفسیر امام بخاریؒ نے یقال سے نقل کی وہ بھی علم ہی سے متعلق ہے۔"

آخر میں ارشاد فرمایا کہ امام بخاریؒ نے ان ارشادات کی نقل سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ علم خود ایک ذی مناقب ہے اور یہ خیال درست نہیں کہ علم کے ساتھ اگر عمل جمع نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں، بلکہ علم خود ایک فضیلت ایک کمال اور ایک ذی فضیلت چیز ہے، اس کے سیکھنے کی انتہائی کوشش کرنی چاہیے۔"

علم بغیر عمل کے لئے کوئی فضیلت نہیں ہے

ہم نے جہاں تک سمجھا کہ امام بخاریؒ کا مقصد صرف علم کی اہمیت و تقدم کی وضاحت ہے اور یہ کہ کسی وجہ سے بھی علم حاصل کرنے سے رک جانا درست نہیں اس کو سیکھنے کی ہر ممکن سعی کرنی چاہیے جیسا کہ مولانا نے بھی اپنے آخری مختصر جملہ میں فرمایا، باقی امام بخاری کا یہ مقصد سمجھنا کہ وہ علم بغیر عمل کی فضیلت و منقبت ثابت کرنا چاہتے ہیں، صحیح نہیں معلوم ہوتا جس کے لئے ہمارے پاس دلائل حسب ذیل ہیں۔

دلائل عدم شرف علم بغیر عمل

(۱) آیت کریمہ قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون کی تفسیر میں کبار مفسرین صاحب روح المعانی وغیرہ نے لکھا

کہ الذین یعلمون سے مرادوہی ہیں جوعلم کے ساتھ عمل کو بھی جمع کرتے ہیں معلوم ہوا کہ یہاں علم بے عمل کی فضیلت بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔

آیت کریمہ **مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفارا** کی تفسیر میں مفسرین کہتے ہیں کہ علماء توراۃ پر علم وعمل کا بار ڈالا گیا تھا، مگر انہوں نے توراۃ پر عمل کے بار کو نہ اٹھایا اور بہت سی علمی باتوں پر بھی پردہ ڈالا، اس لئے ان کی مثال اس گدھے کی سی ہوئی جس پر بہت بڑی بڑی کتابیں لدی ہوئی ہوں، حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے فرمایا کہ یہود کے عالم ایسے تھے کہ کتاب پڑھی مگر دل میں کچھ اثر نہ ہوا۔ احادیث صحیحہ میں بھی بے عمل علماء کے لئے سخت وعیدیں آئیں ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے ترجمہ فرمایا ''جن لوگوں کو توراۃ پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہوں نے اس پر عمل نہ کیا انکی حالت اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہو'' یہی تفسیر دوسرے مفسرین نے بھی کی ہے،

(۲) **العلماء ورثۃ الانبیاء** الحدیث کے تحت علم وعمل کو الگ کرنا اور بغیر عمل کے بھی علم کے لئے بڑا شرف ثابت کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ جبکہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ بے عمل علماء بہ نسبت جاہلوں کے زیادہ عذاب کے مستحق ہوں گے۔

شیخ المحدثین ابن جماعہ کنانی (م ۷۳۳ھ) نے تذکرہ السامع والمتکلم ص ۱۳ میں لکھا کہ ہم نے جو کچھ فضائل علم وعلماء کے لکھے ہیں وہ صرف ان علماء کے حق میں ہیں، جو اپنے علم کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں اور جو ابرار، متقین اور اپنے علم سے صرف رضا خداوندی کے طالب ہیں، وہ نہیں جو علم کو کسی بری نیت سے یا کسی دنیوی غرض، جاہ ومال، مکاثرہ وغیرہ کے لئے حاصل کریں، پھر ترمذی شریف کی حدیث نقل کی کہ جو شخص علم کو اس لئے حاصل کرے گا کہ بے وقوف لوگوں پر اثر جمائے، یا علماء پر اپنی برتری جتلائے، یا لوگوں کو اپنے دام میں پھنسائے، اس کو حق تعالیٰ نار جہنم میں داخل کریں گے، معلوم ہوا کہ یہ سب صورتیں علماء عاملین کی نہیں ہیں بلکہ ایسے سب عالم بے عمل یا بدعمل کہلائیں گے۔

پھر چند دوسری احادیث ترمذی وابوداؤد کی نقل کر کے مسلم ونسائی کی مشہور حدیث نقل کی کہ قیامت کے دن سب سے پہلے تین قسم کے آدمیوں کے فیصلے کئے جائیں گے، ان میں سے ایک قسم ان علماء کی ہوگی، جنہوں نے علم حاصل کیا، دوسروں کو پڑھایا اور قرآن مجید پڑھا تھا ان سے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہماری نعمتوں کا کیا حق ادا کیا؟ وہ کہیں گے کہ تیری راہ میں علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا اور تجھے خوش کرنے کے لئے قرآن مجید پڑھا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم نے جھوٹ کہا! تم نے تو علم اس لئے حاصل کیا تھا کہ تمہیں سب عالم کہیں اور قاری کہیں، چنانچہ دنیا میں خوب کہا گیا، اس کے بعد حق تعالیٰ کے حکم سے ان کو اوندھے منہ گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

بے عمل علماء کے بارے میں یہ کیسی سخت وعید ہے؟ اس کی بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی بے ہوش ہو جایا کرتے تھے، اور حضرت معاویہؓ کے سامنے ایک مرتبہ یہی حدیث سنائی گئی تو وہ بہت روئے، یہاں تک کہ روتے روتے بے حال ہو گئے۔

علماء عاملین کے لئے جہاں جنت کے اعلیٰ درجات ہیں (بشرطیکہ ان کے علم وعمل میں اخلاص ہو اور خدا ہی کے لئے اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچائیں) وہاں بے عمل، بدعمل، ریاء کار، دنیادار جاہ طلب علماء کے لیے جہنم کے اسفل درجات بھی ہیں۔ اس لیے اگر بے عمل کو دنیوی فضل تفوق کا ذریعہ مان بھی لیں تو ایک حد تک صحیح ہے مگر شریعت وآخرت کے لحاظ سے اس کی ہرگز کوئی قدر وقیمت یا فضل وشرف نہیں ہے، اسی لیے تو ساری دنیا کے انواع واقسام کے گنہگاروں سے پہلے ان لوگوں کا فیصلہ کیا جائے گا اور سب سے پہلے ہی ان کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

بے عمل علماء کیوں معتوب ہوئے

وجہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ دنیا میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے گئے تھے اور انکے علم وفضل کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی ان کے دنیا میں بڑے

بڑے القاب تھے، بلکہ بہت سے حضرات نے تو خود ہی بڑے بڑے لقب بنا کر دوسروں سے کہلائے اور لکھائے تھے، انہوں نے اپنی وعظ و درس کی مقبولیت سے لاکھوں روپیہ سمیٹا تھا مشیخت کے ڈھونگ رچا کر مریدین کی جیبیں خالی کی تھیں للّٰہیت، خلوص، تواضع و بے نفسی ان سے کوسوں دور بھاگتی رہی تھی، کیا ایسے لوگوں کا علم بے عمل فی نفسہٖ، فی ذاتہٖ مستقل طور سے، یا کسی نہج سے بھی شرف و فضل بن سکتا ہے؟

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا فیصلہ

اس معاملہ میں حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے حالات زمانہ کی مجبوری سے ایک درمیانی فیصلہ کیا تھا انہوں نے دیکھا کہ زمانے کی بڑھتی ہوئی خرابیوں کیساتھ خیارامت یعنی علماء میں بے عملی و بدعملی کے جراثیم بڑھ رہے ہیں۔ اوران کی روک تھام سخت دشوار ہوگئی ہے، خودان کے زیرتربیت علماء مشائخ میں بعض ایسے تھے کہ جن کے حب جاہ ومال کی اصلاح نہ ہوسکی تھی، اور حضرت کواس کا رنج وملال تھا۔ دوسری طرف طبقہ علماء کی طرف سے بعض سیاسی حالات کے تحت عام بدگمانیاں پھیلائیں گئی تھیں۔ واعظوں میں بھی بے عمل اور بدعمل نمایاں ہوتے جارہے تھے تو حضرت نے دینی فوائد کا لحاظ فرما کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ بے عمل کو واعظ بننا جائز ہے مگر واعظ کو بے عمل بننا جائز نہیں، جو کوئی علوم نبوت یا قرآن وحدیث کا وعظ کہے اس کو سن لو، اس پر عمل کرو اور اس واعظ کی بے قدری و بے عزتی بھی مت کرو کہ تمہیں تو اس سے دین کا علم حاصل ہو ہی گیا دوسرے یہ کہ کسی عالم وواعظ یا امام کی بے توقیری کرنا گویا دین ومذہب کی بے توقیری بن سکتی ہے، جو کسی طرح جائز نہیں، رہا خود اس بے عمل واعظ وعالم کا معاملہ اس کو خدا پر چھوڑ دو، آخرت میں اس سے باز پرس ہوجائے گی اور ظاہر ہے کہ جب اس کے لئے بے عمل یا بدعمل بننا ناجائز ہوا تو یہ اس کے علم کے شرف وفضل آخرت کے لئے خود ہی نقصان رساں ہے۔

(۳) جس طرح علم ذات وصفات حق تعالیٰ اور دوسری ایمانیات کا علم الگ چیز ہے اور اس کے مطابق عمل کا نام عقد قلب یا ایمان وعقیدہ ہے اوران سب کا علم یا جاننا کافی نہیں بلکہ ان کو مان لینا اصطلاحی ایمان ہے دنیا میں کتنے ہی کافر ومشرک ہوئے اور ہوں گے کہ ان کے پاس علم تھا، مگر عقد قلب وایمان سے محروم رہے۔

مستشرقین کا ذکر

اس زمانہ میں مستشرقین یورپ پورے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کے پاس علم کی کمی نہیں، بلکہ ان میں سے بہت سے ہمارے اس زمانے کے بعض علمی مشغلہ رکھنے والے علماء دین سے بھی وسعت مطالعہ اسلامیات میں بڑھے ہوئے ہوں گے، مگر اتنے علم کے باوجود وہ دولت ایمان واسلام سے محروم ہوتے ہیں۔ دوسری بڑی کمی ان کے علم میں یہ ہوتی ہے کہ ان کے علوم کی سند علوم نبوت سے متصل نہیں ہوتی اور نہ ہمارے طریقہ کے علم بالتعلم کی صورت وہاں ہوتی ہے وہ جو کچھ حاصل کرتے ہیں اپنے مطالعہ کی قوت ووسعت سے کرتے ہیں اور علم بالتعلم وعلم بالمطالعہ میں بہت بڑا فرق ہے، جس کو ہم آئندہ بیان کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ

اسی طرح علم احکام میں بھی ان میں بڑے عالم وفاضل ہوتے ہیں، مگر اس علم کے مطابق ان کے اعمال جوارح نہیں ہوتے تو کیا ان کے علم بے عمل کو بھی شرف وفضل کہا جائے گا؟ اگر کہا بھی جاسکتا ہے تو صرف دنیا کے اعتبار سے نہ کہ آخرت کے لحاظ سے، جو ہمارا موضوع بحث ہے، اسی لئے ہمارے یہاں علماء دنیا اور علماء آخرت کی تقسیم کی گئی ہے۔

(۴) حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، خلاصہ یہ کہ اول تو علم کا حسن وقبح، معلوم کے حسن وقبح پر موقوف ہے، لہٰذا ہر علم کو

فضل وشرف نہیں کہہ سکتے دوسرے یہ کہ وہی علم کمال وشرف ہوگا جو اس عمل کے لئے وسیلہ بنے، جس سے رضا باری تعالیٰ حاصل ہو، اگر ایسا نہیں تو وہ علم صاحب علم کے لئے وبال وعذاب ہوگا تیسرے فرمایا کہ علم وسیلۂ عمل ہے اور ظاہر ہے کہ وسیلہ کا درجہ متوسل الیہ سے نہیں بڑھ سکتا، اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ آیت کریمہ **یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات** کے بعد حق تعالیٰ نے آخر میں فرمایا **واللہ بما تعملون خبیر** (اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خبردار ہے) اس نے تنبیہ فرمائی ہے کہ اہل علم کا کمال اور درجات مذکورہ کا حصول عمل پر موقوف ہے۔

عوام کی بات یا خواص کی

معلوم ہوا کہ جس بات کو صاحب ایضاح نے عوامی بات کہا ہے وہ عوام کی نہیں خواص کی ہے اور حضرت شاہؒ صاحب ایسے متبحر عالم اس کی تصریح فرما رہے ہیں اور علامہ کتانی نے بھی لکھا کہ علماء وعلم کی فضیلتیں اس وقت ہیں کہ عمل بھی علم کی مطابق ہو اور بے عمل وبدعمل علماء کے لئے قیامت کے روز سب سے پہلے جہنم میں جھونکنے کا فیصلہ تو خود حق تعالیٰ ہی فرمائیں گے، جیسا کہ حدیث مسلم ونسائی سے معلوم ہوا تو علم بے عمل کا غیر مثمر اور بے فائدہ، بلکہ اور زیادہ وبال ومصیبت بن جانا، عوام کی مشہور کی ہوئی بات ہوئی یا خواص کی اور ایک مسلّم امر وحقیقت واقعی؟!

(۵) حضرت محترم نے آیت **انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء** پر فرمایا کہ یہاں بھی مدار علم پر ہی ہے عمل کا کوئی ذکر نہیں ہے اور جس قدر خشیت زیادہ ہوگی اخلاص زیادہ ہوگا۔

یہاں اس امر کی طرف توجہ نہیں فرمائی گئی کہ خشیت خداوندی کے ساتھ بے عملی یا بدعملی کیونکر جمع ہو سکتی ہے؟ اور حقیقت تو یہی ہے کہ جن علماء میں خشیت نہیں ہوتی وہی بے عمل ہوتے ہیں، تو آیت کریمہ پکار کر کہہ رہی ہے کہ خشیت وعمل لازم وملزوم ہیں اور دوسری جگہ بھی فرمایا۔ **وانها لکبیرۃ الا علی الخاشعین** پھر اسی آیت سے علم بے عمل کی فضیلت وشرف اور اس کا مثمر وموجب اجر وثواب ہونا کیسے ثابت ہوگا؟

اس کے علاوہ ایک اشکال یہ ہوگا کہ آیت میں علماء کی مدح کی گئی ہے اور وہ بھی ان کے وصف خشیۃ وخوف کے سبب، تو اگر بے عمل علماء بھی اس میں داخل ہیں اور وہ صرف فضیلت علم کی وجہ سے مستحق مدح ہیں تو کہنا پڑے گا کہ وہ باوجود خوف خداوندی کے بھی بے عملی میں مبتلاء ہیں اور یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ خوف وخشیۃ صحیح معنی میں ہو تو بے عملی کی نوبت آ ہی نہیں سکتی۔

دوسری قراءۃ میں **یخشی اللہ** بھی ہے (جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام اعظمؒ کی طرف منسوب ہے اس میں خشیہ کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور اس کی صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ عالموں کی تعظیم فرماتے ہیں یا ان کی رعایت فرماتے ہیں

اس پر محترم صاحب ایضاح نے لکھا کہ ''اس قراءت کے اعتبار سے بھی ترجمہ ثابت ہوگا کہ یہ قدر ومنزلت اور رعایت بھی صرف علم کی وجہ سے ہے'' (ص ۴۸ ج ۵) لیکن یہ قدر ومنزلت والی بات اگر صرف علم کی وجہ سے ہے اور بے عمل کے لئے بھی ہے تو حدیث دارمی میں **شر الشر شرار العلماء وخیر الخیر خیار العلماء** کا کیا مطلب ہے؟ جس کی شرح میں محدثین نے فرمایا کہ شرار العلماء وہ ہیں جو اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتے اور ان کے علم سے دوسروں کو نفع نہیں پہنچتا اور خیار العلماء وہ ہیں کہ خود بھی پوری طرح شریعت پر عامل ہیں اور دوسروں کو بھی عمل کی تلقین کرتے ہیں (مشکوۃ شریف)

سفیان[۱] راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کعب سے پوچھا۔ ارباب علم کون ہیں؟ کہا وہ جو اپنے علم پر عمل بھی کرتے ہیں۔

---

[۱] اس روایت میں سفیان سے مراد حضرت سفیان ثوری کوفی، مشہور تابعی محدث وفقیہ ہیں اور حضرت عمرؓ نے جن کعب سے سوال کیا وہ بھی مشہور تابعی ہیں جو توراۃ وغیرہ کتب سابقہ کے بہت بڑے عالم تھے، آپ نے آنحضرت ﷺ کو نہیں دیکھا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں اسلام لائے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الذین ضل سعیهم فی الحیوٰۃ الدنیا وهم یحسبون انهم یحسنون صنعا. اعاذنا الله من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا. پوچھا کہ کون سی چیز علم کو علماء کے دلوں سے نکال دے گی؟ کہا طمع (کتاب العلم مشکوۃ عن الدارمی)
شارحین نے لکھا کہ اس سے معلوم ہوا کہ عالم جب تک اپنے علم پر عمل نہ کرے گا وہ ارباب علم میں شمار نہ ہوگا بلکہ گدھے کی طرح ہوگا جس پر کتابیں لدی ہوں۔

یہاں طمع کا ذکر بھی آ گیا اور معلوم ہوا کہ طمع کی نحوست اتنی بڑی ہے کہ وہ علماء کے قلوب سے علم کی نورانیت وبرکات کو نکال پھینکتی ہے تو کیا مبتلائے طمع وحرص دنیا علماء کو بھی فضل وشرف علم سے نوازا جائے گا؟ فرض کرو۔ ایک عالم، شیخ طریقت بھی ہو، ایک علمی ادارے سے پانچ سو روپے سے زیادہ ماہوار تنخواہ بھی پاتا ہو اس کی سکنائی جائیداد اور تجارتی کاروبار کی آمدنی بھی ماہوار چار پانچ سو روپے سے کم نہ ہو وغیرہ پھر بھی اس کے وعظ کی فیس ایک سو روپیہ ہو، جس سے کم پر وہ بہت کم یا بادل نخواستہ جائے، کیا یہ طمع کا فرد کامل نہ ہوگا؟ اور کیا ہمارے اکابر نے بھی اسی طور وطریق سے علم ودین کی خدمت کی تھی؟

(۶) "من سلک طریقا یطلب به علما" پر حضرت محترم صاحب ایضاح نے فرمایا۔ یہاں بھی علم کے ساتھ عمل کا ذکر نہیں ہے معلوم ہوا کہ عمل کے بغیر بھی علم کا سیکھنا جنت کی راہ آسان کرتا ہے" (ص ۴۷)

گزارش ہے کہ عمل کے بغیر بھی اگر صرف علم حاصل کر لینا جنت کی راہ آسان کر دیتا ہے تو قیامت کے دن بے عمل علماء کے لئے سب لوگوں سے پہلے جہنم کی راہ کیوں آسان کی جائے گی؟ ہمارے نزدیک حضرت شاہؒ صاحب ودیگر اکابر کی تحقیق ہی صحیح ہے کہ علم صرف وہی شرف وکمال ہے اور باعث اجر وثواب جو رضائے خداوندی حاصل کرانے والے اعمال کے لئے سبب ووسیلہ بنے اور جو ایسا نہ ہو وہ ہرگز وجہ شرف وکمال نہیں۔

یہاں پہنچ کر ہمیں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی طرف سے جو نسبت اس سلسلہ میں کی گئی ہے اس میں کچھ تسامح ہوا ہے اور بات صرف اسی قدر ہے جس کا ذکر علامہ ابن منیر نے بھی کیا ہے اور حضرت شیخ الحدیث دام ظلہم نے بھی اس کو ملحوظ رکھا ہے کہ امام بخاری ایک مشہور ومسلم حقیقت کو مانتے ہوئے بھی کہ علم بے عمل کے...... بے ثمر ہے، لوگوں کو علم کی طرف رغبت دلانا چاہتے ہیں اور حسب تحقیق حضرت

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) حضرت عمرؓ نے ان سے ارباب علم کے بارے میں اسی لئے سوال کیا کہ آپ کتب سابقہ اور علوم اولین کے حذاق اہل علم سے تھے اور حضرت عمرؓ جیسی جلیل القدر شخصیت کا آپ سے کوئی بات دریافت کرنا ہی ان کی علمی عظمت پر شاہد ہے۔

علامہ طیبی نے لکھا مقصد سوال یہ تھا کہ تمہاری پہلی کتب سماویہ میں اصحاب علم کون سے سمجھے جاتے تھے؟ جو رسوخ علم کے سبب اس لقب کے مستحق تھے! حضرت کعب نے فرمایا جو علماء اپنے علم پر عمل بھی کرتے تھے وہ اس کے مستحق تھے (یعنی بے عمل علماء نہیں) علامہ طیبی نے لکھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کو خدا نے حکماء کے لقب سے نوازا ہے اور فرمایا" ومن یوء ت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیرا " کیونکہ حکیم وہی ہے جو دقائق اشیاء کا علم رکھتا ہو اور اپنے علم کی پختگی کے سبب ان کو محکم طریقہ پر بروئے کار لا سکتا ہو لہٰذا معلوم ہوا کہ عالم جب تک عامل نہ ہوگا اس کو ارباب علم میں شمار نہ کریں گے بلکہ وہ مثل حمار ہوگا جس پر کتابیں لدی ہوں۔
پھر فما اخرج العلم من قلوب العلماء؟ پر لکھا کہ یہاں علماء سے مراد وہی ہیں، جو عامل بھی ہیں کیونکہ اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ جو عامل نہیں وہ عالم کہلانے کا مستحق بھی نہیں، منشا سوال یہ ہے کہ جب ارباب علم وہ ہیں جو علم کے ساتھ عمل کے بھی جامع ہوں تو پھر کس طرح ایسے عالم باعمل حضرات علم یا عمل کی دولت سے محروم ہو سکتے ہیں؟ جواب دیا کہ علماء کے علم کے لئے دنیا اور مزخرفات دنیا کی طرف رغبت ومیلان ہی سم قاتل ہے اس میں پڑ کر وہ ریاء وسمعہ، شہرت ومدح پسندی وغیرہ میں مبتلا ہو جائیں گے جس کے سبب علم وعمل کا اخلاص رخصت ہو جائے گا جو روح علم وعمل ہے۔
معلوم ہوا کہ ورع وزہد برکات وانوار علم میں زیادتی کرتے ہیں اور طمع حرص دنیا ان کو دلوں سے نکالتی ہے پھر جو لوگ حب جاہ ومال کے خطرناک مرض میں مبتلا ہوتے ہیں، ان کو اس برائی ومرض کا احساس بھی نہیں رہتا۔ مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

شاہ صاحبؒ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ علم حاصل کرنے سے تو کسی حال بھی چارہ نہیں وہ تو بطور مقدمہ عقلیہ بھی عمل کے لئے ضروری ہے اور آیات وآثار سے بھی اس کی ضرورت وفضل مسلم ہے، لہٰذا محض اس احتمال بعید پر کہ بعض بدقسمت اہل علم بے عملی یا بدعملی کا شکار بھی ہوجاتے ہیں، علم سے بے رغبتی، یا اس کی تحصیل سے رک جانا صحیح نہیں، امام بخاریؒ کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ علم بے عمل بھی کوئی فضیلت ہوسکتا ہے، ورنہ شارحین حدیث میں سے کوئی تو اس بات کو صراحت سے لکھتا، یا کسی عالم سے تو اس کی تصریح ملتی، مگر ہم نے باوجود تلاش اس کو نہ پایا بلکہ جو کچھ پایا اس کے خلاف ہی پایا۔ اس لئے اہمیت دے کر یہاں تردید بھی کرنی پڑی، میں سمجھتا ہوں کہ صاحب ایضاح ایسے محقق محدث کو ایسی بات فرمانا اور پھر اس پر اس قدر زور دینا موزوں نہیں تھا، اول تو امام بخاری کی مراد متعین نہیں مختلف آراء ہیں جن کا ذکر ہوا جن حضرات نے قول مشہور کی تردید کو مقصد سمجھا، انہوں نے بھی اس طرح تعبیر نہیں کی، جس طرح ایضاح میں اختیار کی گئی ہے۔

کون سی تحقیق نمایاں ہونی چاہیے

اس کے علاوہ یہ کہ ہم جس تحقیق پر زور دیں کم از کم وہ اپنے اکابر وسلف سے صاف وواضح طور سے ملنے چاہیے، محض اشاروں سے کسی چیز کو اخذ کرنا، یا غیر مسلم حقائق کو حقیقت مسلمہ کے طور پر پیش کرنا ہمارے اکابر کا طریق کار نہیں رہا ہے۔

تمثالی ابوت والی تحقیق کا ذکر

جس طرح آنحضرت ﷺ کی تمثالی ابوت اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تمثالی بنوت کو علامہ نابلسی کے ایک اشارہ پر مبنی کر کے بطور حقیقت وادعاء شرعی پیش کر دیا گیا اور اس کو "اسلام اور مغربی تہذیب" کی جلد اول ودوم کی تقریباً چالیس ۴۰ صفحات میں پھیلا دیا گیا اور ہوائی تائیدات جمع کرنے کی سعی بے سود کی گئی۔

حالانکہ انجیل کی جس بسم اللہ کی تاویل علامہ نابلسی نے کی ہے، صاحب روح المعانی میں اس کا منزل من اللہ ہونا ہی مشکوک قرار دیا ہے پھر اس کی ایک توجیہ خود صاحب روح المعانی نے کی، اس کے بعد نابلسی کی توجیہ نقل کی ہے اور جو کچھ علامہ نابلسی نے لکھا وہ بھی مذکورہ ابوت وبنوت کے اثبات کے لئے ناکافی ہے اور اگر وہ کسی درجہ میں بھی خواہ تمثالی ہی لحاظ سے قابل قبول توجیہ ہوتی، تو علماء سلف وخلف کی ساری معتمد تالیفات اس سے یکسر خالی نہ ہوتیں۔

اس بارے میں مزید افسوس کے قابل یہ امر ہے کہ اس بے تحقیق نظریہ کی تائید اکابر اساتذہ دارالعلوم کی طرف سے کی گئی ہے اور یہ بھی لکھا گیا کہ اس نظریہ کے قائل بعض متقدمین بھی تھے، لیکن نہ ان کا نام بتلایا گیا اور نہ کسی کتاب کا حوالہ دیا گیا اور اس بے محل تائید کے سبب حضرت حکیم الاسلام دام ظلہم نے اپنے قابل قدر رجوع کو بھی بے قدر بنا دیا، ہمیشہ اہل حق اور ہمارے حضرات اکابر کا اسوہ بھی یہی رہا ہے کہ جب کوئی غلطی محسوس ہوئی اس سے نہایت ہی فراخدلی کے ساتھ رجوع فرما کر اعلان کر دیا (انعم اللہ علیھم و رضیھم) لیکن اس میں غالباً اب یہ ترمیم واصلاح ضروری سمجھی گئی کہ اپنی پوزیشن بچانے یا بنانے کے لئے رجوع کے الفاظ میں اینچ وپیچ یا دوسروں کی بے تحقیق تائید کو بھی داخل کیا جائے۔ **اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ**

اس دور کی ایک سب سے بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ علماء میں سے حق گوئی کا طرہ امتیاز ختم ہوتا جا رہا ہے اور خصوصیت سے وہ ایک دوسرے کے عیب کی پردہ پوشی اس لئے بھی کرتے ہیں کہ خود بھی کسی بڑے عیب میں مبتلاء ہوتے ہیں اور اسی لئے ایک دوسرے کی اصلاح

حال کی کوشش بھی نہیں کرتے یا نہیں کرسکتے، یہ صورت حال نہایت تشویشناک ہے اور سب سے زیادہ مضرت رساں یہ ہے کہ ہم "بے علم علماء" کی حوصلہ افزائی کریں اور ان کے لئے کسی طرح کا تائیدی مواد جمع کریں، حضرت تھانویؒ نے جو فیصلہ کن بات فرما دی ہے، بس اس سے آگے جانے کا جواز کسی طرح بھی نہیں ہے، لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ پہلے ہم اپنی اصلاح کریں، پھر دوسرے علماء کی اصلاح کی بحسن اسلوب سعی کریں۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو کم از کم برائی کو برائی محسوس کریں اور کرائیں، اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے، کہ بفحوائے حدیث علماء ہی خیار امت ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کی عزت خدا اور رسول خدا علیہ السلام کی نظر میں سب سے زیادہ ہے ان ہی کی برکت سے دنیا قائم ہے، مگر شرط اول یہی ہے کہ وہ علماء باعمل ہوں، مخلص ہوں، قوم و ملت کے دردمند ہوں، یعنی اپنی ذات سے زیادہ ان کو عام مسلمانوں، عام انسانوں، اور تمام مسکینوں کی دینی و دنیوی منفعت عزیز ہو۔

بات کچھ لمبی ہوگئی اور غالباً اس کی تلخی بھی بعض حضرات کو محسوس ہوگی، مگر تحقیق کا معیار جو روز بروز گرتا جارہا ہے اس کو کس طرح برداشت کیا جائے اور کیونکر محسوس کرایا جائے؟ مجھے اپنی کم علمی اور تقصیر بیانی کا اعتراف ہے مجھ سے بھی جو غلطی یا فروگذاشت ہوگی، اہل علم اس پر متنبہ کریں گے، آئندہ جلدوں میں اس کی تلافی کی جائے گی۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔

ترجمۃ الباب سے آیات و آثار کی مطابقت

صاحب ایضاح دامت فیوضہم نے جو یہ دعویٰ کیا کہ ترجمۃ الباب اور آیات و آثار میں انطباق جب ہی ہوسکتا ہے کہ امام بخاری کا مقصد علم بے عمل کی فضیلت و شرف ہی بیان کرنا سمجھا جائے۔ ورنہ دوسرے شارحین کے مختار پر ان دونوں کا انطباق نہیں ہوتا یہ دعویٰ نہایت بے وزن اور کمزور ہے کیونکہ آیات و آثار کا انطباق تو اس صورت میں بھی ہوجاتا ہے کہ ترجمۃ الباب کو سرے ہی سے بیان شرف علم ہی سے بے تعلق رکھا جائے جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے ہے، تو اس صورت میں کہ تقدم سے کوئی شرف بھی سمجھا جائے، بدرجہ اولی انطباق صحیح ہوگا۔ واللہ علم۔

امام بخاری نے اس باب میں صرف ترجمۃ الباب پر اکتفا کیا اور کوئی حدیث موصول ذکر نہیں کی اس کی کیا وجہ ہے؟ حافظ نے کہا کہ امام نے بیاض چھوڑی ہوگی۔ تاکہ کوئی حدیث ان کی شرط پر ملے تو لکھ دیں اور پھر نہ لکھ سکے یا عمداً ارادہ ہی حدیث لانے کا نہیں کیا، اس لئے کہ دوسری آیات و آثار کافی سمجھے۔

حضرت گنگوہی نے دوسری شق پسند فرمائی، علامہ کرمانی نے لکھا۔ اگر کہا جائے تو یہ تو نسب ترجمہ ہوا حدیث الباب کہاں ہے جس کا یہ ترجمہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ ارادہ کیا ہوگا، مگر حدیث نہ ملی، مگر یہ بتلایا کہ کوئی حدیث ترجمہ کے مطابق امام کی شرط پر ثابت نہیں ہوسکی یا مذکورہ ترجمہ آیات و آثار پر اکتفا کیا۔

آخری گذارش

امام بخاری تمام امت میں سے اس بارے میں منفرد ہیں کہ انہوں نے اعمال کو اجزاء ایمان ثابت کرنے کی انتہائی سعی کی ہے، حتیٰ کہ وہ اپنے اثبات مدعا کے لئے حد اعتدال سے بھی آگے بڑھ گئے غرض ساری کتاب الایمان میں وہ ایک ایک عمل کو ایمان کی حقیقت و ماہیت میں داخل بتلا کر کتاب العلم شروع کررہے ہیں، اب یہاں ان کے باب **العلم قبل القول و العمل** کے الفاظ سے یہ سمجھ لینا کہ اعمال کی کوئی اہمیت ان کے یہاں باقی نہیں رہی اور گو ایمان کا شرف تو ان کے نزدیک ایک مومن کو بغیر عمل کے مل نہیں سکتا، مگر علم کا شرف اس کے بغیر

بھی عالم کو حاصل ہو جائے گا، یہ عجیب سی بات ہے۔
کسی کی طرف کوئی بات منسوب کرنے سے قبل اس کے دوسرے رجحانات ونظریات کو بھی دیکھنا پڑتا ہے اور جہاں جو بات عقل و قیاس کی روشنی میں چپک سکتی ہو، وہیں چپکائی جاسکتی ہے، جو امام بخاری ایک معمولی درجہ کے جاہل جٹ کو بے عمل دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ کیسے گوارا کرسکتے ہیں کہ امت کی چوٹی کے افراد یعنی علماء کرام وارثین انبیاء علیہم السلام کو باوجود بے عملی کے فضل وشرف کا تمغہ عطا کریں، ایں خیال است و محال

پھر **العلم قبل العلم** کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ امام بخاریؒ ایمان کی طرح علم سے بھی عمل کو جدا کرنا نہیں چاہتے صرف آگے پیچھے کررہے ہیں، خواہ ان کا باہم تقدم وتاخر ذاتی ہو یا زمانی، شرفی ہو یا رتبی، یا بقول حضرت شاہؒ صاحب کے بطور مقدمہ عقلیہ ہی علم وعمل کا تعلق ثابت کرنا ہو، غرض کچھ بھی ہو مگر علم بغیر عمل کے وجود اور پھر اس کے شرف وفضل یا ذی مناقب وکمال ہونے کی صورت یہاں کون سے قانون وقاعدہ سے نکل آئی؟ اور امام بخاریؒ کے ذمہ لگا دی گئی اور وہ بھی ایسے جزم ویقین کے الفاظ کے ساتھ کہ ''(امام بخاری نے ان ارشادات کی نقل سے یہ بات ثابت کردی کہ علم خود ایک ذی مناقب ہے اور یہ خیال درست نہیں کہ علم کے ساتھ اگر عمل جمع نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں، بلکہ علم خود ایک فضیلت، ایک کمال اور ایک ذی فضیلت چیز ہے)'' بینوا تو جروا۔

امام بخاری نے علم بے عمل کی فضیلت کا دعویٰ کب کیا اور کس طرح ثابت کردیا؟ ان هم الا یظنون پھر بالفرض اگر امام بخاری نے یہ دعوی کیا بھی تھا، اور ثبوت میں آیات وآثار مذکورہ بالا پیش کردیئے تھے تو کیا ہمارے لیے بھی اس امر کی وجہ جواز مل گئی کہ ہر آیت حدیث، واثر سے علم بے عمل کی ہی فضیلت نکالتے چلے جائیں اور یہ بھی نہ دیکھیں کہ ان آیات وآثار کی تفسیر وشرح ہمارے اکابر وسلف نے کس طرح کی تھی، جن کی طرف ہم اشارات کرچکے ہیں ولیکن هذا آخر الکلام، سبحانک اللهم وبحمدک اشهد ان لا اله الا انت استغفرک واتوب الیه۔

بَابُ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُهُمْ بِالْمَوْعِظَةِ وَالْعِلْمِ كَيْ لَا يَنْفِرُوْا

(آنحضرت ﷺ وعظ وتعلیم کے معاملہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال وحوائج کی رعایت فرماتے تھے تاکہ ان کے شوق علم ونشاط میں کمی نہ ہو)

(۶۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَنَا سُفْيَانُ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ اَبِيْ وَآئِلٍ عَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْاَيَّامِ كَرَاهَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا۔

(۶۹) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ ثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبُو التَّيَّاحِ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا

ترجمہ (۶۸): حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ہمیں نصیحت فرمانے میں دنوں کا لحاظ فرماتے تھے تاکہ ہم روزانہ یا مسلسل تعلیم سے گھبرا نہ جائیں۔

ترجمہ (۶۹): حضرت انسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا آسانی کرو تنگی مت کرو خوش خبری دو نفرت دلانے کی بات مت کرو۔

تشریح: اسلام دین فطرت ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور ہر انسان کے لیے آیا ہے اس لیے یہ دین اپنے اندر ایسے اصول رکھتا ہے جو انسانی فطرت پر بار نہیں ہوسکتے قرآن وحدیث میں تہدید وتنبیہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کا بیان ہے اس لیے خاص طور پر رسول اللہ ﷺ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ دین کے کسی مسئلہ میں وہ پہلو نہ اختیار کرو جس سے لوگ کسی تنگی میں مبتلا ہو جائیں یا انہیں اس طرح پند ونصیحت نہ کرو جس سے انہیں خدا کی مغفرت ورحمت کی امید کی بجائے دین کی باتوں سے نفرت پیدا ہو جائے مقصد یہ ہے کہ دین وعلم دین کی سب چیزوں سے زیادہ ضرورت واہمیت فضیلت وشرف اور مطلوب دارین ہونے کے باوجود نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کے تمام اوقات وایام کو تعلیم دین میں مشغول نہیں فرماتے تھے بلکہ ان کی ضروریات دنیوی وحوائج طبعیہ کی رعایت فرماتے، اور ان کے نشاط وملال کا بھی خیال فرماتے تھے، اسی لئے تعلیم دین کے لئے ان کے اوقات فراغ ونشاط کو تلاش کرتے تھے، تاکہ وہ پوری رغبت وشوق کے ساتھ دین وعلم دین حاصل کریں اور اس سے کسی وقت اکتا نہ جائیں۔

پھر یہ بھی ارشاد فرماتے تھے کہ دین کی باتیں پہنچانے میں خوش خبری اور بشارتیں سنانے کا پہلو زیادہ مقدم ونمایاں رہے، حسب ضرورت خدا کے عذاب وعتاب سے بھی آگاہ کیا جائے اور ایسی باتوں سے تو نہایت احتراز واجتناب کیا جائے، جن سے کسی دینی معاملہ میں ہمت وحوصلہ پست ہو یا دین کی کسی بات سے نفرت پیدا ہو، یہ سب ہدایات تعلیم، تذکیر وتبلیغ دین کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔

دوسری حدیث کا یہ مقصد نہیں کہ صرف بشارتیں ہی سنائیں جائیں، انذار تخویف کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے بلکہ بقول حضرت شاہؒ صاحب درمیانی راہ اختیار کی جائے اور عام حالات میں چونکہ زیادہ فائدہ تبشیر ہی سے ہوتا ہے اس لئے اس پہلو کو نمایاں کیا اور ان لوگوں کو بھی روکنا ہے جو ہمیشہ وعیدیں ہی سنانے کے عادی بن جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں تبشیر وانداز ساتھ ساتھ بھی ہیں اور الگ الگ بھی، اب معلم ومبلغ مرشد وہادی کو دیکھنا، سمجھنا چاہیے کہ کس کے لئے یا کس وقت کونسا طریقہ زیادہ نافع ہوگا، یوں عام ہدایات عام حالات کے لئے یہی ہے کہ بشارت کا پہلو مقدم کیا جائے حتی الامکان دینی احکام کی ممکنہ وجائزہ سہولتیں، رعایتیں بتلا دی جائیں تاکہ لوگ دشواری وتنگی میں نہ پڑیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ دینی احکام میں کوئی کتر بیونت کی جائے، بغیر عذر شرعی تعمیل احکام کی شرع سے پہلو تہی اختیار کی جائے، ان سے بچنے کے لئے حیلے بہانے تراشے جائیں۔ واللہ علم۔

افادات انور: حدیث نمبر ۶۹ میں محمد بن بشار کی روایت حضرت یحییٰ بن سعید القطان سے ہے، اس مناسبت سے حضرت شاہ صاحبؒ نے یحییٰ القطانؒ کے علمی مناقب وکمالات کا تذکرہ فرمایا اور دوسرے اکابر اور محدثین کا بھی ذکر خیر کیا۔

آپ نے فرمایا کہ یہی قطان (جو امام بخاری کے شیوخ کبار میں ہے) فن جرح وتعدیل کے نہ صرف امام وحاذق بلکہ فن رجال کے سب سے پہلے مصنف بھی ہیں اور حافظ ذہبی نے لکھا کہ امام اعظمؒ کے مذہب پر فتوی دیا کرتے تھے، ان کے تلمیذ حدیث امام یحییٰ بن معین بھی فن رجال کے بہت بڑے عالم تھے اور وہ بھی حنفی تھے، ان کا بیان ہے کہ شیخ قطان سے امام اعظمؒ کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ وہ ثقہ تھے اور ہم نے ان سے بہتر رائے والا نہیں دیکھا۔

خود امام یحییٰ بن معین فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے کسی سے نہیں سنا کہ امام اعظمؒ پر کسی قسم کی جرح کرتا ہو اس کو ذکر کر کے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا ہے کہ ابن معین کے زمانہ تک امام صاحب پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا (امام یحییٰ بن معین کی وفات ۲۳۳ھ میں ہوئی ہے اور انکے مفصل حالات مقدمہ انوار الباری ص ۲۳۲ ج ۱ میں ہیں)

اس کے بعد امام احمد کے زمانے میں جب ''خلق قرآن'' کے مسئلہ پر اختلاف ہوا تو کئی قسم کے خیالات پھیل گئے، ورنہ اس سے قبل سلف میں سے بہت سے کبار محدثین امام صاحب ہی کے مذہب پر فتوی دیتے تھے۔

پھر فرمایا کہ ابن معین بہت بڑے شخص تھے، فن جرح وتعدیل کے جلیل القدر امام تھے، مگر میرے نزدیک ان سے امام ہمام محمد بن ادریس شافعی پر نقد وجرح کرنے میں غلطی ہوئی ہے، نہ ان کے لئے موزوں تھا۔ کہ ایسے بڑے جلیل القدر امام کے بارے میں تیز لسانی کریں اور اسی لئے شاید ان کو متعصب حنفی کہا گیا ہے۔

فرمایا دارقطنی نے اقرار کیا ہے کہ امام اعظم سب ائمہ میں سے بڑی عمر کے تھے اور یہ بھی کہا گیا کہ امام صاحب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ملے ہیں، البتہ روایت میں اختلاف ہے یہ بھی فرمایا کہ امام بیہقی نے باوجود متعصب ہونے کے امام اعظمؒ پر کوئی جرح نہیں کی، امام ابوداؤد امام صاحب کے مداح ومعتقد ہیں، امام مسلم کا حال معلوم نہیں، لیکن ان کے رفیق سفر محقق ابن جارود حنفی ہیں، جن کا علم ادب عربی امام مسلم سے بھی اونچا ہے اور امام مسلم نے ان سے بہت سی چیزوں میں مدد لی ہے امام ترمذی ساکت ہیں، اور ابن سید الناس ودمیاطی امام اعظم کی نہایت زیادہ اور دل سے عظمت کرتے ہیں۔ علامہ دمیاطی کے سامنے ایک سند حدیث پیش ہوئی جس میں امام اعظم بھی تھے تو اسے صحیح قرار دیا، علامہ عراقی کا حال معلوم نہیں، البتہ انکا سلسلہ تلمذ علامہ محدث ماردینی سے ملتا ہے، جو مشہور حنفی تھے۔ امام بخاری نے امام صاحب کی ہجو کی ہے اور حافظ ابن حجر نے بقدر استطاعت حنفیہ کو نقصان پہنچانے کی سعی کی ہے، حتی کہ امام طحاوی کے بارے میں جروح وطعون جمع کئے ہیں، حالانکہ امام طحاوی اتنے بڑے امام حدیث تھے کہ انکے زمانے کے محدثین میں سے جس جس کو بھی آپکی خبر ملی ہے وہ ضرور آپ کی خدمت میں مصر پہنچا ہے اور آپ کے حلقہ اصحاب میں بیٹھ کر شرف تلمذ حاصل کیا ہے۔

حافظ عینی حافظ ابن حجر سے عمر میں بڑے تھے اور حافظ ابن حجر نے ان سے ایک حدیث مسلم کی اور دو حدیثیں مسند احمد کی سنی ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ میرے علم میں اب تک کوئی محدث فقیہ یا فقیہ ایسا نہیں آیا۔ جس نے امام اعظم پر جرح کی ہو، ہاں ایسے حضرات نے جرح کی ہے جو صرف محدث تھے، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہاں ذکر حضرت یحییٰ القطان کا شروع ہوا تھا، جو حدیث الباب کے راویوں میں سے ہیں اور امام بخاریؒ کے شیخ الشیوخ ہیں وہ نہ صرف حنفی تھے بلکہ امام صاحبؒ کے مذہب پر فتوی دینے والے اور نہایت مداح تھے، اسی طرح ابن معین تھے۔ جو بلا واسطہ امام بخاریؒ کے شیخ ہیں اور ان سے بھی بخاری میں روایات ہیں، پھر ان دونوں کے اقوال امام بخاری اپنی کتب رجال وتاریخ میں بھی برابر نقل کرتے ہیں مگر امام اعظمؒ کے بارے میں ان دونوں کے اقوال کی کوئی قیمت نہیں سمجھی۔ واللہ المستعان۔ امام یحییٰ القطان کے حالات مقدمہ انوارالباری ص ۲۰۸ ج ۱ میں لکھے گئے تھے،

تذکرۃ الحفاظ ۲۹۸ ج ۱ میں ہے کہ ابن مدینی نے فرمایا کہ میں نے رجال کا عالم ان سے بڑا نہیں دیکھا، بندار نے کہا کہ وہ اپنے زمانے کے سب لوگوں کے امام تھے، امام احمد نے فرمایا کہ ان سے کم خطا کرنیوالا میں نے نہیں دیکھا، عجلی نے کہا کہ فقی الحدیث تھے، صرف ثقہ راویوں سے حدیث روایت کرتے تھے، بحوالہ تاریخ خطیب لکھا گیا ہے کہ خود امام قطان نے فرمایا کہ میں نے حدیث وفقہ میں امام اعظم کا تلمذ حاصل کیا، اور امام صاحب کے چہرہ مبارک سے علم ونور کا مشاہدہ کرتا تھا۔

بَابُ مَن جَعَلَ لِاَھْلِ الْعِلْمِ اَیَّامًا مَّعْلُوْمَۃً

(اہل علم کے لئے تعلیم کے دن مقرر کرنا)

(۷۰) حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ اَبِیْ شَیْبَۃَ قَالَ ثَنَا جَرِیْرٌ عَنْ مَّنْصُوْرٍ عَنْ اَبِیْ وَ آئِلٍ قَالَ کَانَ عَبْدُ اللّٰہِ یُذَکِّرُ النَّاسَ فِیْ کُلِّ خَمِیْسٍ فَقَالَ لَہٗ رَجُلٌ یَّا اَبَاعَبْدِالرَّحْمٰنِ لَوَدِدْتُّ اَنَّکَ ذَکَّرْتَنَا کُلَّ یَوْمٍ قَالَ اَمَا اِنَّہٗ یَمْنَعُنِیْ مِنْ ذٰلِکَ اَنِّیْ اَکْرَہُ اَنْ اُمِلَّکُمْ وَ اِنِّیْ اَتَخَوَّلُکُمْ بِالْمَوْعِظَۃِ کَمَا کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَتَخَوَّلُنَا بِھَا مَخَافَۃَ السَّاٰمَۃِ عَلَیْنَا۔

ترجمہ: ابووائل سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کے دن لوگوں کو وعظ سنایا کرتے تھے ایک آدمی نے ان سے کہا اے عبدالرحمٰن میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیں ہر روز وعظ سنایا کریں، انہوں نے فرمایا دیکھو! مجھے اس امر سے کوئی چیز اگر مانع ہے تو یہ کہ میں ایسی بات پسند نہیں کرتا، جس سے تم تنگ دل ہو جاؤ اور میں وعظ میں تمہاری فرصت وفرحت کا وقت تلاش کیا کرتا ہوں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اس خیال سے کہ ہم کبیدہ خاطر نہ ہو جائیں، وعظ کے لئے ہمارے اوقات فرصت کے متلاشی رہتے تھے۔

تشریح: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے عمل سے ثابت ہوا کہ لوگوں کو وعظ ونصیحت کرنے میں، ان کے حوائج ومشاغل کا لحاظ رکھنا چاہیے اور ان کی سہولت کے لئے تعلیم کے اوقات اور دن مقرر کردینے چاہئیں ہمہ وقت ان کو تعلیم دین کے لئے مشغول کرنا خلاف حکمت ہے کیونکہ اس سے ان کے اکتا کر بے توجہی کرنے کا ڈر ہے، لہٰذا نشاط وشوق کے ساتھ مقررہ دنوں میں تعلیم کا جاری رہنا زیادہ نافع ہے۔

ارشادات انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ کا مقصد اس ترجمۃ الباب سے یہ ہے کہ اس قسم کے تعینات بدعت میں شمار نہ ہوں گے، کیونکہ بدعت وہ ہے کہ جس کا ثبوت شریعت سے نہ ہو، پھر بھی اس کو اسی طرح التزام واہتمام سے تعیین کرکے ادا کیا جائے جیسے کسی دینی کام کو انجام دیتے ہیں، اسی لئے وہ رسوم بدعت کہلاتی ہیں جو مصائب کے وقت انجام دی جائیں کہ ان سے مقصود اجر وثواب ہوتا ہے اور جو رسوم خوشی کی، شادی نکاح وغیرہ کے مواقع میں ادا کی جاتی ہیں، ان میں نیت اجر وثواب کی نہیں ہوتی، لہٰذا پہلی قسم کی رسوم امور دین کے ساتھ مشتبہ اور ملی جلی ہونے کے سبب ممنوع ہوں گی اور اکثر وہ ہوتی بھی ہیں عبادات کی قسم سے۔ بخلاف رسوم شادی کے کہ وہ لہولعب سے مشابہ ہوتی ہیں، اس لئے وہ امور دین کے ساتھ مشابہ نہیں ہوتیں، نہ ان کو دیکھ کر کوئی شخص غیر دین کو دین سمجھنے کے مغالطہ میں مبتلا ہوگا۔

ردّ بدعت اور مولانا شہید

پھر فرمایا کہ رد بدعت میں حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ کی کتاب ''ایضاح الحق الصریح'' بہت بہتر ہے اس میں بہت اونچے درجے کے علمی مضامین ہیں، تقویۃ الایمان بھی اچھی ہے مگر اس میں شدت زیادہ ہے اور اسی وجہ سے اس سے نفع کم ہوا، بعض تعبیرات ایسی ہیں کہ اردو زبان کے محاورہ میں ان کو سمجھانا دشوار ہے، مثلاً ''امکان کذب'' کہ مقصد تو اس سے امکان ذاتی کا اثبات ہے، جو امتناع بالغیر کے ساتھ بھی جمع ہو جاتا ہے مگر اردو محاورہ میں جب کہیں گے کہ فلاں شخص جھوٹ بول سکتا ہے تو وہاں امکان ذاتی مراد نہیں ہوتا، بلکہ امکان وقوعی مراد ہوا کرتا ہے اور اردو محاورہ کے اس امکان وقوعی کو حق تعالیٰ کے لئے کوئی بھی ثابت نہیں کرسکتا، اسی لئے عوام اور بعض علماء کو بھی مغالطہ میں پڑنے اور بحثیں کرنے کا موقع مل گیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا مقصد یہ ہے کہ جو کتابیں عوام کی رہنمائی کے لئے لکھی جائیں، ان کی تعبیرات میں احتیاط اور محاورات میں

سہولت وسادگی ملحوظ ہونی چاہیے۔تا کہ بے وجہ مغالطوں اور مباحثوں کے دروازے نہ کھل جائیں۔واللہ علم وعلمہ اتم واحکم

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ان دونوں کتابوں میں جو مضامین ہیں وہ علامہ شاطبی کی کتاب الاعتصام میں بھی موجود ہیں

بَابُ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِى الدِّيْنِ

(حق تعالیٰ جس کسی کے ساتھ خیر و بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرمادیتے ہیں)

(۷۱) حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ ثَنَا ابْنُ وَهْبٍ عَنْ يُوْنُسَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ قَالَ حُمَيْدُ بْنُ عَبْدِالرَّحْمٰنِ سَمِعْتُ مُعَاوِيَةَ خَطِيْبًا يَّقُوْلُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِى الدِّيْنِ وَ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّ اللّٰهُ يُعْطِىْ وَلَنْ تَزَالَ هٰذِهِ الْاُمَّةُ قَائِمَةً عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِىَ اَمْرُ اللّٰهِ.

ترجمہ: حمید بن عبدالرحمٰن نے کہا کہ حضرت معاویہؓ نے خطبے کے دوران فرمایا کہ میں نے رسول اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ رکھتے ہیں اسے دین کی سمجھ عنایت فرمادیتے ہیں اور میں تو محض تقسیم کرنے والا ہوں، دینے والا تو اللہ ہی ہے اور یہ امت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی جو شخص ان کی مخالفت کرے گا نقصان نہیں پہنچا سکے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم (قیامت) آجائے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فقہ، فہم، فکر، علم، معرفت وتصدیق سب قریب المعنی الفاظ ہیں ان میں ترادف نہیں ہے کیونکہ ہر ایک کے معنی الگ الگ ہیں، فقہ یہ ہے کہ متکلم کی غرض صحیح طور سے سمجھی جائے فہم سمجھنا، فکر سوچنا، علم جاننا، معرفت پہچاننا، تصدیق یقین و باور کرنا یا کسی بات کو پوری طرح مان لینا غرض ان میں باریک فروق ہیں جن کو اہل علم ولغت جانتے ہیں۔

تفقہ کی اہمیت: حدیث میں دین کے علم وفقہ کو زیادہ اہمیت وفضیلت عطا کی گئی ہے اور اس کو گویا خیر عظیم فرمایا گیا ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی طرف خیر حاصل ہونے کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں پس یہاں خیراً میں تنوین کو تعظیم کے لئے سمجھنا زیادہ بہتر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب سمجھنا صحیح نہیں، کوئی شخص فقیہ ہو تو اس کو یہ دعویٰ کرنے کا بھی حق مل گیا کہ میرے ساتھ حق تعالیٰ نے خیر کا ارادہ فرمایا ہے کیونکہ اول تو سینکڑوں امور خیر ہیں اوران میں سے جس کو جتنے بھی امور خیر کی توفیق ملے وہ بھی اسی طرح کہہ سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے میرے ساتھ خیر کا ارادہ کیا، مثلاً حج، ادائیگی زکوٰۃ، نماز، جہاد، تبلیغ وغیرہ جس کی بھی توفیق ملے وہ سب ہی خدا کے ارادہ ومشیت کے تحت ہیں لیکن دعوے کے ساتھ یہ بات کہنا اس لئے پسندیدہ نہیں ہوسکتا کہ ہر عمل خیر کا خیر ہونا بھی اخلاص نیت پر موقوف ہے۔اور جب ہی وہ درجہ قبول کو پہنچ سکتا ہے، غرض قبول و عدم قبول کا فیصلہ چونکہ ہم نہیں کر سکتے اس لئے دعوائے خیر کا حق بھی ہمیں حاصل نہیں ہوسکتا۔

عطا وتقسیم: حدیث میں دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ حق تعالیٰ علوم شریعت عطا فرماتے ہیں اور میں ان کو تقسیم کرتا ہوں ظاہر ہے کہ سید الانبیاء علیہم السلام تمام علوم وکمالات کے جامع تھے اور آپ علیہ ہی کی وساطت سے تمام امور خیر اور علوم کمالات کی تقسیم عمل میں آئی، پھر تیسرے جملے میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو علوم نبوت میں تم کو دے کر جاؤں گا وہ اس امت میں قیام قیامت تک باقی رہیں گے جس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک ایسی جماعت حقہ ہمیشہ باقی رہے گی جو حق کی آواز بلند کرے گی، اس کا یہی شیوہ ہوگا اور ان کو اس راہ حق سے روکنے یا ہٹانے کی کوئی بڑی سے بڑی مخالفت بھی کامیاب نہیں ہوگی، یعنی جب تک مسلمان دنیا میں باقی رہیں گے۔ یہ جماعت بھی باقی رہے گی جو حق وصداقت کا علم بلند رکھے گی اور یہ بھی معلوم ہے کہ قیامت جب ہی قائم ہوگی کے دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی ایک فرد بھی مومن باقی نہ رہے گا۔

جماعت حقہ کون سی ہے؟

حدیث میں صرف یہ ارشاد ہے کہ ایک جماعت دین پر قائم رہے گی اور وہ بھی ایسی پختگی کے ساتھ کہ اس کو راہ حق سے کوئی طاقت نہ ہٹا سکے گی، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانہ میں کون کون لوگ اس کے مصداق ہیں، البتہ جو وصف ان کا بیان ہوا ہے اس سے ان کو پہچانا جا سکے گا، امام احمد نے فرمایا کہ وہ گروہ اہل سنت والجماعت کا ہے وہی مراد ہو سکتے ہیں۔　　　(قاضی عیاض الخ)

قاضی عیاض نے امام احمد سے اسی طرح نقل کیا، امام نووی نے فرمایا کہ ممکن ہے اس طائفہ سے مختلف انواع واقسام مومنین میں سے متفرق لوگ ہوں گے، مثلاً مجاہدین فقہا، محدثین، زہاد وغیرہ۔

امام بخاری کی مراد اس سے اہل علم ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث میں مجاہدین کی تصریح وارد ہوئی ہے، اس لئے امام احمد کی رائے مذکور پر مجھے حیرت تھی، پھر تاریخی مواد پر نظر کرنے سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ مجاہدین اور اہل سنت والجماعت دونوں کے مفہوم تو الگ الگ ہیں، مگر خارجی مصداق کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں، کیونکہ جہاد کا فریضہ ہمیشہ اہل سنت والجماعت نے ادا کیا ہے، دوسرے فرقوں کو جہاد کی توفیق نہیں ہوئی اور خصوصیت سے فرقہ روافض سے تو اکثر اسلامی سلطنتوں کو عظیم نقصانات پہنچے ہیں۔

جماعت حقہ اور غلبہ دین

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ''لاتزال'' سے مراد یہ ہے کہ کوئی زمانہ انکے وجود سے خالی نہ رہے گا۔ یہ مقصود نہیں کہ وہ ہر زمانہ میں بہ کثرت ہوں گے، یا یہ کہ وہ دوسروں پر غالب رہیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے وقت جو دین کو غلبہ حاصل ہوگا وہ بھی ساری دنیا کے لحاظ سے نہیں ہوگا، بلکہ ان کے ظہور کے مقام اور اردگرد کے ممالک میں ہوگا، ان ممالک کے علاوہ کے ذکر سے حدیث خاموش ہے، اس لئے اس کا مدلول ومراد نہیں قرار دے سکتے۔

افادات علمیہ:　حافظ عینی نے لکھا (۱) **انما انا قاسم** سے حصر مفہوم ہو رہا ہے کہ حضور علیہ السلام صرف قاسم تھے اور اوصاف ان میں نہیں تھے جو کسی طرح درست نہیں ہو سکتا، جواب یہ ہے کہ حصر بلحاظ اعتقاد سامع کی ہے، جو حضور ہی کو معطی بھی سمجھتے تھے اس کا ازالہ فرمایا گیا کہ معطی تو حق تعالیٰ ہیں، میں تو صرف قاسم ہوں، لہٰذا حصر وصف اعطاء کے اعتبار سے ہے، دوسرے اوصاف کے لحاظ سے نہیں ہے۔

(۲) علامہ تورپشتی نے تقسیم وحی وعلوم نبوت کی قرار دی، کہ آپ نے تمام صحابہ کو برابر کے درجہ میں بے تخصیص وبخل وغیرہ تبلیغ فرما دی۔ یہ امر آخر ہے کہ تفاوت فہم واستعداد کے سبب کسی نے کم فائدہ اٹھایا، کسی نے زیادہ اور یہ خدا کی دین اور عطا کے تحت ہے، جس کو بھی جس لائق اس نے بنا دیا، اسی لئے بعض صحابہ صرف حدیث کے ظاہری مفہوم کو سمجھتے تھے اور بعض اس سے دقیق مسائل کا استنباط بھی فرما لیتے تھے۔ (**وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء**)

(۳) شیخ قطب الدین نے اس حدیث کی شرح میں لکھا کہ قسمت سے مراد تقسیم اموال ومتاع دنیا ہے کہ حضور علیہ السلام کوئی چیز اپنے واسطے نہیں رکھتے تھے، سب کچھ دوسروں پر تقسیم فرما دیتے تھے، خود ارشاد فرمایا'' تمہارے مال غنیمت میں سے میرا صرف خمس ہے اور وہ بھی تمہاری ہی طرف لوٹ جاتا ہے'' اور **انما انا قاسم** اس لئے فرمایا کہ مصالح شرعیہ کے تحت کسی کو زیادہ بھی دینا پڑتا تھا تو اس کی وجہ سے کسی کو ناگواری نہ ہو فرمایا کہ مال خدا کا ہے بندے بھی اسی کے ہیں، میں تو صرف حکم خداوندی کے تحت تقسیم کرنیوالا ہوں۔

(۴) داودی نے کہا انما انا قاسم کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ جو کچھ عطا فرماتے ہیں وہ وحی الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔

(عمدۃ القاری ص ۱/۴۳۷)

اشکال وجواب: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے اس حدیث میں یہ اشکال ہوا کہ اگر بنظر معنوی وحقیقی دیکھا جائے تو نہ حضور اکرم علیہ معطی حقیقی ہیں نہ قاسم حقیقی، یہ سب کچھ خدا کے کام ہیں، وہیں سے اعطاء ہے اور وہیں سے قسمت بھی اور اگر بنظر صوری وظاہری دیکھا جائے تو آپ معطی بھی تھے اور قاسم بھی، پھر تقسیم کیوں فرمائی کہ میں قاسم ہوں، حق تعالیٰ معطی ہیں، پھر جواب یہ سمجھ میں آیا کہ آپ علیہ نے دونوں جملوں میں ظاہر ہی کی رعایت فرمائی ہے، کیونکہ حدیث میں اہل عرف کی رعایت ہوتی ہے اور وہ عطاو تقسیم وغیرہ میں فاعل حقیقی کا لحاظ نہیں رکھتے بلکہ ان کو لوگوں ہی کی طرف نسبت کیا کرتے ہیں لیکن یہاں حضور علیہ نے اعطاء کی نسبت اپنی طرف بوجہ ادب واحترام واجلال ذات خداوندی نہیں کی، کیونکہ معطی کا درجہ بہت اونچا، مستقل اور بڑا ہوا کرتا ہے۔

غرض آپ علیہ نے دونوں جملوں میں ادب کی رعایت فرمائی ہے، مسئلہ توحید افعال کی طرف اشارہ مقصود نہیں ہے، پھر میں نے حافظ ابن تیمیہ کی رائے پڑھی کہ انبیاء علیہ السلام کسی چیز کے مالک نہیں ہوتے، نہ اپنی دنیوی زندگی میں اور نہ بعد وفات، اور انہوں نے حدیث الباب سے استدلال کیا ہے اور لکھا کہ آپ صرف قاسم تھے مالک نہیں تھے، اس توجیہ سے حدیث میں کسی تاویل کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ واللہ علم۔

انما انا قاسم حضورؐ کی خاص شان ہے اسکو بطور مونوگرام استعمال کرنا غیر موزوں ہے

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ حدیث الباب میں نبی کریم علیہ کی ایک مخصوص شان بیان کی گئی ہے اس لئے اس کو بطور مونوگرام استعمال کرنا مناسب نہیں اور ہمیں نہیں معلوم کہ دارالعلوم دیوبند ایسے علمی مذہبی اور معیاری مرکز کے دفتری خطوط میں اس کو چھپوا کر استعمال کرنے کا رواج کس طرح اور کب سے ہوا؟ ایک محترم عالم دین سے اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی تو انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کا مقصد ''قاسمیت'' کی چھاپ کو مستحکم کرنا ہے تاکہ خاندان قاسمی کو کسی وقت دارالعلوم کے مادی منافع سے محروم نہ کیا جاسکے۔

سوانح قاسمی کی غیر محتاط عبارات

پھر انہوں نے سوانح قاسمی جلد اول و دوم کے وہ مقامات دکھائے جن میں کچھ غیر محتاط باتیں بھی درج ہوگئیں ہیں مثلاً ص ۱/۵۴ میں نانوتہ کی وجہ تسمیہ کے تحت کسی قسم کی دعوت کا نیا نبوتہ یا جدید پیغام تقسیم ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور ص ۱/۲۶۰ میں حضرت نانوتویؒ کی زندگی کے عملی پہلو کو حضرت عیسیٰؑ کی زندگی سے تشبیہ، ص ۲/۸۲ میں نانوتہ کی مشابہت مدینۃ النبی (زادہا اللہ شرفا) سے، حضرت نانوتویؒ کی آخری دس سالہ زندگی کو حضور اکرم علیہ کی مدنی زندگی کے دس سال سے تشبیہ اور ان کے ایک خاص قلبی حال اور اس کے ثقل کو ثقل وحی سے تشبیہ،

نور نبوت کے زیر سایہ تربیت خاص پانے والے خلفائے اربعہؓ میں سے حضرت نانوتویؒ کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو فاروق اعظمؓ سے، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشابہ بتلانا، پھر تکوینی طور پر عکس وظل کی بحث وغیرہ۔

ہمارے نزدیک اس قسم کی چیزیں لکھنا، اگرچہ کسی غلط مقصد کے لئے نہ ہو پھر بھی خلاف احتیاط ضروری ہے، کیونکہ ان باتوں سے

برے اثرات لئے جاسکتے ہیں، ہم دوسروں کے غیر محتاط اقوال پر گرفت کرتے ہیں اور خود اسی بیماری میں مبتلا ہیں، اتأمرون الناس بالبر و تنسون انفسکم کا مصداق ہمارے لئے موزوں نہیں، حقیقت یہ ہے کہ دار العلوم کے قیام کا اصل مقصد دین حق کی حمایت اور علم صحیح کی روشنی پھیلانا ہے، دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے کوئی ایسی بات جس سے لوگوں کو کسی قسم کی غلط فہمی ہو مناسب نہیں۔

تاسیس دارالعلوم اور بانیان کا ذکر خیر

حضرت نانوتویؒ کو ''بانی دار العلوم'' لکھنے سے بھی ایک قسم کی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور بہت سے لوگ اس پر تاریخی لحاظ سے بھی اعتراض کرتے ہیں، خود مولانا گیلانیؒ مولف سوانح قاسمی نے ص ۲/۲۴۸ میں لکھا:۔ سچی بات یہی ہے، یہی واقعہ ہے اور اسی کو واقعہ ہونا بھی چاہیے کہ ''جامعہ قاسمیہ'' یا دیوبند کے ''دارالعلوم'' کی جب بنیاد پڑی تھی تو سیدنا الامام الکبیر (حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ) اس وقت دیو بند میں موجود نہ تھے، اسی لئے قیام دارالعلوم کی ابتدائی داستان میرے دائرہ بحث سے پوچھئے تو خارج ہے''

ضروری وضاحت: اس کی وضاحت یہ ہے کہ محرم ۱۲۸۳ھ میں جب مدرسہ عالیہ دیو بند کی ابتداء ہوئی تو حضرت نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوبؒ میرٹھ میں قیام پذیر تھے اور یہ تجویز کہ دیو بند میں ایک مدرسہ قائم کیا جائے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب کی تھی، جس کے مطابق مدرسہ دیو بند کی بنیاد ڈال دی گئی تھی

(سوانح قاسمی مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ص ۳۹)

ماہ شعبان ۱۲۸۳ھ میں سب سے پہلا سالانہ امتحان حضرت نانوتویؒ و دیگر حضرات نے لیا تھا، حضرت حاجی صاحب موصوف نے ابتدائی چندہ فراہم کیا تھا، پھر حضرت نانوتویؒ کو خط لکھا کہ دیو بند کے مدرسہ میں پڑھانے کے لئے آپ تشریف لائیے!

حضرت مولانا قدس سرہٗ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ ''میں بہت خوش ہوا، خدا بہتر کرے، مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپے ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں، وہ پڑھائیں گے اور میں مدرسہ مذکور کے حق میں ساعی رہوں گا، چنانچہ ملا محمود صاحب آئے اور مسجد چھتہ میں عربی پڑھانا شروع کیا (سوانح قاسمی ص ۲/۲۵۲ بحوالہ تذکرۃ العابدین)

حضرت نانوتوی قدس سرہ کا قیام میرٹھ میں ۱۲۸۶ھ تک رہا (سوانح قاسمی ۱/۵۳۴) اس کے بعد وہاں مطبع مجتبائی میرٹھ سے قطع تعلق کر کے آپ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں مطبع مصطفائی میں کام کرنے لگے۔ اس کے بعد معلوم نہ ہوسکا کہ وہاں سے کب دیو بند تشریف لائے؟

حضرت نانوتوی اور دارالعلوم کا بیت المال

آپ جب دیو بند تشریف لے آئے تو اوّل میں اہل شوریٰ نے درخواست کی کہ آپ بھی اس مدرسہ کی مدرسی قبول فرمالیں اور اس کے عوض کسی قدر تنخواہ، مگر آپ نے قبول نہ فرمایا اور کبھی کسی طور یا ڈھنگ سے ایک حبہ تک کے مدرسہ سے روادار نہ ہوئے اور اگر کبھی ضرورت مدرسہ کے دوات وقلم سے کوئی اپنا خط لکھ لیتے تو فوراً ایک آنہ مدرسہ کے خزانے میں داخل کردیتے اور فرماتے کہ ''یہ بیت المال کی دوات ہے، ہم کو اس پر تصرف جائز نہیں ہے۔''

مزاج میں بہت حدت تھی اور موسم گرما میں سردمکان بہت مرغوب تھا لیکن ایک دن کے لئے یہ گوارا نہیں فرمایا کہ مدرسہ کے تہہ خانہ میں آرام فرمائیں، دارالعلوم کے اول مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین نے درخواست بھی کی تو فرمایا ''ہم کون جو اس میں آرام کریں وہ حق ہے طالب علموں کا'' (سوانح قاسمی ص ۱۵۳۶)

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

اکابر سے انتساب

ہمیں یقیناً اپنے ان اکابر کی سلفی زندگی پر فخر و ناز ہے اور ہر اس فرد کا جو حضرت نانوتویؒ قدس سرہٗ سے جسمانی یا روحانی علاقہ رکھتا ہے، فرض ہے کہ آپ کے ''اسوۂ حسنہ'' پر قائم ہونے کی پوری سعی کرے ورنہ ''پدرم سلطان بود'' سے کچھ حاصل نہیں !! حضرت نانوتویؒ کے حالات ہم نے مقدمہ ص ۲۱۸ / ۲ میں لکھے ہیں)

دارالعلوم کا اہتمام

غالباً مہتمم اول کی تنخواہ کچھ نہیں تھی، لیکن اب زمانہ بہت آگے بڑھ گیا، اس لئے ہمارے مہتمم صاحب کی تنخواہ چھ سو روپے سے زائد ہے، جبکہ خدا کے فضل و کرم سے وہ بہت بڑے دولت مند ہیں اور مدرسہ سے تنخواہ لینے کی ان کو کوئی ضرورت بظاہر نہیں ہے، خیر اس کو بھی نظر انداز کیجئے، مگر دارالعلوم پر خاندانی یا وراثتی قسم کا استحقاق قائم کرنے کے لئے تو کوئی بھی وجہ جواز ہمارے نزدیک نہیں ہے رہا یہ کہ موجودہ دور اہتمام کی ترقیات کا سلسلہ زمین سے آسمان تک ملا ہوا ہے، مگر ہمیں تو علمی انحطاط کی روز افزونی ہی کا گلہ ہے اور زیادہ اس لئے بھی کہ اہتمام کی توجہات علمی ترقی کی طرف سے ہٹی ہوئی ہیں، مدینہ یونیورسٹی کے لئے ہندو پاک کے بڑے بڑے مدارس سے طلبہ منتخب ہو کر پڑھنے کے لئے گئے ہیں، جن کو وہاں کی سعودی حکومت تین تین سو ریال ماہوار بطور تعلیمی وظیفہ کے دے رہی ہے ظاہر ہے کہ ہر مدرسہ کے مہتمم نے اپنے اپنے احساس فرض و ذمہ داری کے تحت اچھی سے اچھی قابلیت کے ہونہار فرزند بھیجے ہوں گے، ہمارے مہتمم صاحب دام ظلہم نے بھی اپنے ترقی یافتہ دور کی شاندار بلکہ علمی مثال قائم کرنے کے لئے، اور دارالعلوم کو جیسا کہ کہا جاتا ہے، سب سے اونچی علمی پوزیشن دینے کے لئے فضلاء دارالعلوم میں سے بہترین انتخاب کر کے بھیجا ہوگا، اب یہ تو مہتمم صاحب ہی اپنی سالانہ کارگزاریوں کی رودادوں میں بتلائیں گے کہ ان فضلائے دارالعلوم نے وہاں جا کر دارالعلوم کا کتنا نام روشن کیا۔

یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے اسی سال حج سے واپس ہو کر ایک اخباری بیان میں بتلایا کہ مدینہ یونیورسٹی کی پوزیشن ہمارے دارالعلوم، ندوۃ العلماء جیسی ہے اور اساتذہ بھی زیادہ اچھے ابھی تک میسر نہیں ہوئے ہیں، اگر ایسے ادارے میں پہنچ کر ہمارے دارالعلوم کے موجودہ دور کے فضلاء کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے تو اس سے دارالعلوم کے علمی معیار، ترقی اور اہتمام دار العلوم کے بارے میں دنیا کیا رائے قائم کرے گی۔

چونکہ بخاری کی کتاب العلم چل رہی ہے اس لئے علمی سلسلہ کے اور خصوصیت سے موجودہ دور کے نشیب و فراز علی الاخص اپنی مادر علمی کے حالات کا تذکرہ بغیر سابق ارادے کے بھی نوک قلم پر آ جاتا ہے ممکن ہے کہ اصلاح حال کی بھی کوئی صورت سامنے آ جائے۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز۔**

فائدہ: صاحب بہجۃ النفوس محدث محقق ابی جمرہ نے **لن تزال ھذہ الامۃ قائمۃ علی امر اللہ** پر لکھا کہ اس سے صوفیاء کرام کے اس قول کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ امر اللہ عام ہے، مگر مراد خاص ہے، مقصد یہ ہے کہ ہر امتی خدا کے احکام پر قائم رہے گا، تا آنکہ اس کی موت خیر پر ہی واقع ہو جائے گی اور اس کا دل خدا کے اچھے وعدوں کے لئے انشراح حاصل کر لے گا اور یہ امتی موت سے پہلے ہی موت کا انتظار کرتے ہیں کہ اس کے بعد فوراً ہی وہ حق تعالیٰ کی خوشنودی اور اپنے احباب و اعزہ کی ملاقات سے بہرور ہوں گے، اسی لئے وہ موت سے ایسے خوش ہوتے ہیں، جیسے کوئی شخص طویل سفر کے بعد اپنے وطن اور اپنے اہل و عیال کے قریب پہنچ کر خوش ہوتا ہے۔ (بہجۃ النفوس ص ۱۱۹ /۱)

جعلی وصیت نامہ

یہاں یہ ضروری بات لکھنی ہے کہ بہت کافی مدت سے یہ دیکھا جارہا ہے کہ ایک ہینڈ بل ''وصیت نامہ'' کے عنوان سے مسلمانوں میں بڑی کثرت سے شائع کیا جاتا ہے، جس میں سید احمد مجاور حرم نبوی کی طرف سے ایک خواب کا ذکر ہوتا ہے کہ نبی کریم علیہ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حضور علیہ نے فرمایا کہ ایک ہفتے میں اتنے لاکھ مسلمان بے ایمان مرے اور مسلمانوں کو متنبہ کردو کہ گناہوں سے توبہ کریں وغیرہ، پھر یہ ہدایت ہوتی ہے کہ ہر مسلمان اس کی نقلیں کر کے، یا چھپوا کر مسلمانوں میں اشاعت کرے اور اس کی نہایت ترغیب ہوتی ہے اور اس کی نقلیں کر کے، اشاعت نہ کرنے والوں کو مصائب ونقصانات سے ڈرایا جاتا ہے۔ اس قسم کے وصیت نامے یا خواب بالکل فرضی وجعلی ہیں۔ نہ کوئی مدینہ طیبہ میں اس نام کا شخص ہے جو ہمیشہ اس قسم کے خواب دیکھتا ہے۔ علماء کی رائے ہے کہ اس قسم کے ہینڈ بل عیسائی مشنری وغیرہ کی طرف سے شائع کئے جاتے ہیں، تاکہ مسلمانوں کے اسلام وایمان کمزور ہو جائیں اور وہ یہ سمجھیں کہ جب لاکھوں مسلمان بے ایمان مر رہے ہیں تو ہمارا ایمان واسلام کس کام کا، اس کے بعد ان کو دوسرے مذاہب اختیار کر لینا کچھ دشوار نہ ہوگا، خصوصاً جب کہ دوسرے مذاہب کے اختیار کرنے میں دنیوی منافع بھی بہت زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ حق کسی بڑے سے بڑے ولی یا عالم کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی کشف یا خواب کی بناء پر یہ اعلان کردے کہ اتنے مسلمان بے ایمان مرے ہیں جو اس قسم کی بات کہے وہ جھوٹا ہے، امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کے لئے خواہ وہ کیسا ہی فاسق وفاجر اور بدکار بھی ہو، یہی توقع ہے کہ اس کا خاتمہ خدا کے فضل وکرم اور نبی کریم علیہ کے صدقہ وطفیل میں ایمان ہی پر ہوگا اور کسی کے لئے بھی مایوس ہونے کا جواز نہیں ہے ہر مومن کا ایمان خوف ورجا کے درمیان ہونا چاہیے، مشہور ہے کہ حجاج جیسا ظالم وسفاک بھی آخر وقت تک حق تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوا۔ موت کے وقت اس کی والدہ رونے لگیں کہ اس کا حشر خراب ہوگا تو کہا کہ میں خدا کی بے پایاں رحمت سے مایوس نہیں ہوں، اور مرنے سے قبل حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض ومعروض کرتے ہوئے کہا:۔ بارالٰہی! ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ حجاج کی بخشش نہ کی جائے، میری نظریں تیری رحمت پر لگی ہوئی ہیں تو مجھے صرف اپنی رحمت سے بخش دے۔

اس قسم کے جعلی وصیت نامے جہاں کہیں بھی ملیں ان کو ضائع کر دینا چاہیے اور ان کی اشاعت کو سختی سے روک دینا چاہیے غالباً ۲۰، ۲۵ سال قبل حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحبؒ نے بھی اس قسم کے جعلی وصیت نامے کی تردید فرما کر مسلمانوں کو اس کی اشاعت روکنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ واللہ الموفق لما یحب و یرضی

بَابُ اَلُفَهُمِ فِیُ الُعِلُمِ

(علمی سمجھ کا بیان)

(۷۲) حَدَّثَنَا عَلِیُّ بُنُ عَبُدِاللّٰہِ قَالَ ثَنَا سُفُیَانُ قَالَ قَالَ لِیُ اِبُنُ اَبِیُ نَجِیُحٍ عَنُ مُجَاھِدٍ قَالَ صَحِبُتُ ابُنَ عُمَرَ اِلَی الُمَدِیُنَةِ فَلَمُ اَسُمَعُهُ یُحَدِّثُ عَنُ رَّسُوُلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِلَّا حَدِیُثًا وَّاحِدًا قَالَ کُنَّا عِنُدَ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم نَاتِیَ بِجُمَّارٍ فَقَالَ اِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَۃً مَّثَلُھَا کَمَثَلِ الُمُسُلِمِ فَاَرَدُتُّ اَنُ اَقُوُلَ ھِیَ النَّخُلَۃُ فَاِذَا اَنَا اَصُغَرُالُقَوُمِ فَسَکَتُّ فَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم ھِیَ النَّخُلَۃُ.

ترجمہ: حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ میں مدینہ طیبہ تک حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ رفیق سفر رہا مگر بجز ایک حدیث کے اور کوئی بات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہوئے نہیں سنی، انہوں نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخت کھجور کا گوند پیش کیا گیا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ درختوں میں سے ایک درخت ایسا ہے جس کی مثال مسلمان کی سی ہے، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا میرا ارادہ ہوا کہ عرض کردوں وہ کھجور کا درخت ہے، مگر میں حاضرین میں سب سے کم عمر تھا، (بڑوں کے ادب میں خاموش رہا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کھجور ہے۔

تشریح: اس حدیث کا مضمون پہلے گزر چکا ہے، یہاں دوسری چند چیزیں قابل ذکر ہیں:۔ اتنے طویل سفر میں صرف ایک حدیث سن سکے، اس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے اجتناب فرماتے تھے اور یہی طریقہ ان کے والد معظم حضرت عمرؓ کا بھی تھا، اس کی وجہ غایت ورع و احتیاط تھی کہ حدیث رسول بیان کرنے میں کہیں کوئی کمی و زیادتی نہ ہو جائے، تاہم حضرت ابن عمرؓ کو مکثرین حدیث میں شمار کیا گیا ہے، جن سے زیادہ احادیث مروی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود توحتی الوسع بیان حدیث سے بچنا چاہتے تھے مگر لوگ ان سے بکثرت سوال کرتے تھے اور جواب میں وہ مجبوراً احادیث بیان کرتے تھے اور پھر حسب ضرورت اچھی طرح اور زیادہ روایت فرماتے تھے سفر کے موقع پر سوال کرنے والے کم ملتے ہیں، دوسرے حالت سفر کی مشغولی یا عدم نشاط بھی مانع ہو جاتا ہے، اس لئے سارے سفر میں صرف ایک حدیث سن سکے، علامہ عینی نے یہی تفصیل کی ہے۔

جمار اور جامور درخت کھجور کے گوند کو کہتے ہیں جو چربی کی طرح سفید ہوتا ہے اور شاید اسی لئے اس کو شحم النخل بھی کہا گیا ہے (نہایت مقوی اور امراض مردانہ میں نافع ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہن درخت کھجور کے تمام عام وخاص فوائد و منافع کی طرف منتقل ہو گیا، اس لئے ارشاد ہوا کہ سب درختوں سے زیادہ منافع والے درخت کو مسلمان کے ساتھ ہی مشابہت دی جا سکتی ہے، کیونکہ مسلمان کا وجود بھی بہمہ وجوہ تمام مخلوقات کے لئے نفع محض ہوتا ہے اور اس کے ہر قول و عمل سے دوسروں کو فائدہ پہنچنا چاہیے، یہی اس کی زندگی کا مقصد و مشن ہے "دل بیار و دست بکار"، یعنی مومن کا دل ہر وقت خدا سے لگا ہوا اور ہاتھ پاؤں اپنے فرائض کی انجام دہی اور دوسروں کی خدمت گزاری میں مصروف ہوں۔

بعض تراجم بخاری میں ترجمہ اس طرح کیا گیا (کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں جمار ایک خاص درخت لایا گیا) گویا جمار کوئی اور

درخت ہے، جو نہ کھجور کا درخت ہے نہ اس کا گوند ہے، یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔

مقصد ترجمہ: فقہ فی الدین کے بعد علمی چیزوں کا فہم بھی ایک نعمت وفضیلت ہے، اس کو بیان کیا علامہ عینی نے کرمانی کا قول کہ علم وفہم ایک ہی ہے نقل کر کے تردید کی، پھر لکھا علم ادراک کلی سے عبارت ہے اور فہم جودت ذہن ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۱/۴۳۸)

حضرت مجاہد کا ذکر: اس حدیث کے رواۃ میں حضرت مجاہد بن جبر مخزومی بھی ہیں، جو مشہور تابعی فقہاء مکہ میں سے ہیں، جن کی جلالت قدر، امامت وتوثیق پر اتفاق ہے، اوران کو تفسیر، حدیث وفقہ کا امام تسلیم کیا گیا ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۱/۴۳۹)

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ امام طحاوی نے باسناد صحیح ذکر کیا ہے کہ یہ مجاہد حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں دس سال تک رہے ہیں، لیکن اس تمام مدت میں ان کو کبھی رفع یدین کرتے ہوئے نہیں دیکھا، حالانکہ رفع یدین کے مسئلہ میں سب سے پیش پیش ان ہی کو رکھا جاتا ہے۔

بَابُ الْاِغْتِبَاطِ فِی الْعِلْمِ وَالْحِکْمَةِ وَقَالَ عُمَرُ تَفَقَّهُوْا قَبْلَ اَنْ تُسَوَّدُوْا وَقَالَ اَبُوْ عَبْدِاللّٰهِ وَ بَعْدَ اَنْ تُسَوَّدُوْا وَقَدْ تَعَلَّمَ اَصْحَابُ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم بَعْدَ کِبَرِ سِنِّهِمْ.

(علم وحکمت کی تحصیل میں ریس کرنا، حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ سردار بننے سے پہلے علم حاصل کرو، امام بخاری نے فرمایا اور سردار بننے کے بعد بھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بڑی عمر میں بھی علم حاصل کیا ہے)

(۷۳) حَدَّثَنَا الْحُمَیْدِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْیَانُ قَالَ حَدَّثَنَا اِسْمٰعِیْلُ بْنُ اَبِیْ خَالِدٍ عَلٰی مَا حَدَّثَنَاهُ الزُّهْرِیُّ قَالَ سَمِعْتُ قَیْسَ بْنَ اَبِیْ حَازِمٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا حَسَدَ اِلَّا فِیْ اثْنَتَیْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَسَلَّطَهُ عَلٰی هَلَکَتِهٖ فِی الْحَقِّ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِکْمَةَ فَهُوَ یَقْضِیْ بِهَا وَ یُعَلِّمُهَا.

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حسد صرف دو باتوں میں جائز ہے، ایک تو اس شخص کے بارے میں جسے اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہو، اور اس دولت کو راہ حق میں خرچ کرنے پر اس کو مسلط بھی کر دیا ہو، اور ایک اس شخص کے بارے میں جسے اللہ نے حکمت (کی دولت) سے نوازا ہو وہ اس کے ذریعے سے فیصلہ کرتا ہو، اور (لوگوں کو) اس حکمت کی تعلیم دیتا ہو۔"

تشریح: کسی دوسرے کی صلاحیت یا شخصیت یا خوش حالی سے رنجیدہ ہو کر یہ خواہش کرنا کہ اس شخص کی یہ نعمت یا کیفیت ختم ہو جائے اس کا نام حسد ہے، لیکن کبھی کبھی حسد سے مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ آدمی دوسرے کو دیکھ کر یہ چاہے کہ کاش! میں بھی ایسا ہی ہوتا، مجھے بھی ایسی ہی نعمت مل جاتی، اس حالت کا نام رشک ہے ایک یہ کہ کسی کو بہتر حال میں دیکھ کر اس کی ریس کرے، یعنی اس جیسا بننے کا حریص ہو، یہ منافعت کہلاتی ہے جو یہاں مقصود ہے، اسی کے لئے امام بخاری نے غبطہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے غبطہ کا ترجمہ ریس کرنا ہی بتلایا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ رشک کا درجہ حسد وغبطہ کے درمیان ہے اور حسد ورشک میں کچھ بے عملی وتعطل کی شان ہے کہ کرے دھرے کچھ نہیں، صرف دوسرں کو اچھے حال میں دیکھ کر جلتا ہے یا سوچتا ہے کہ کاش! میں بھی ایسا ہوتا، غبطہ میں یہ صورت ہے کہ دوسرے کو اچھے حال میں دیکھ کر ریس کرتا ہے کہ میں بھی ایسا بن جاؤں اور ہاتھ پیر ہلاتا ہے، جہاں حسد ورشک میں دل کا کھوٹ اور عقل کا تعطل برا ہے، غبطہ میں دل کی سلامتی اور عمل کے میدان میں اولوالعزمی کا ثبوت ہے جو باحوصلہ لوگوں کا شیوہ ہے غرض کہ غبطہ محمود ہے اور اسی طرح منافست بھی کہ دوسرے کو کوئی اچھا بھلا کام کرتا دیکھے تو اس سے بڑھ کر خود کام کرنے کی سعی کرے

اسی لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وفی ذلک فلیتنا فس المتنافسون. کہ نیک کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنا نہ صرف محمود بلکہ مطلوب ہے، تاکہ آخرت کے اونچے سے اونچے درجات وطیبات حاصل ہوسکیں، حدیث میں اگر چہ حسد کا لفظ ہے، مگر مراد غطبہ ہی ہے، کیونکہ حسد کا جواز کسی صورت سے نہیں ہے۔ اسی لئے امام بخاریؒ نے ترجمہ میں اغتباط کا لفظ رکھا۔

مقصد ترجمہ ومعانی حکمت

مقصد ترجمہ یہ ہے کہ علم وحکمت قابل غطبہ چیز ہیں، علم ظاہر ہے، حکمت کا درجہ اس سے اوپر ہے، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ بحر محیط میں حکمت کے ۲۴ معانی بیان کئے گئے ہیں، علامہ دوانی نے شرح عقائد جلالی میں درست کاری اور راست کرداری کا ترجمہ کیا ہے، علامہ سیوطی نے بھی اتقان عمل سے یہی مراد لی ہے، تفسیر فتح العزیز میں احکام شرع کی حکمت بتلائی ہے، حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حکمت کا مصداق سنت صحیحہ کو قرار دیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے مذکورہ بالا معانی ذکر کر کے فرمایا کہ میرے نزدیک محقق امر یہ ہے کہ حکمت علوم نبوت ووحی کے علاوہ ہیں، جس کا تعلق اعلیٰ درجہ کی فہم وقوت تمیز یہ سے ہے، جس طرح ضرب الامثال کے طور پر بولے ہوئے کلمات نہایت مفید ہوتے ہیں اور کبھی غلط نہیں ہوتے، اسی طرح خدا کے جن زاہد ومتقی مقرب بندوں کے دلوں میں حکمت ودیعت کی جاتی ہے، ان کے کلمات بھی لوگوں کے لئے نہایت نافع ہوتے ہیں، لہٰذا حکمت کی باتوں سے بھی لوگ اپنے شبانہ روز کے اعمال اور فصل خصومات کے بارے میں اچھی طرح رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

تحصیل علم بعد سیادت

''بعد ان تسودوا'' امام بخاری نے یہ جملہ اس لئے بڑھایا کہ حضرت عمرؓ کے ارشاد سے کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ سیادت یا کبرسنی کے بعد علم حاصل نہ کرنا چاہیے۔ نہ یہ حضرت عمرؓ کا مقصود ہوسکتا ہے، اس لئے امام بخاریؒ نے یہ جملہ بڑھا کر بڑی عمر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علم حاصل کرنے کا ذکر فرمادیا۔

افادۂ انور: حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ امام بخاریؒ نے یہ جملہ بطور معارضہ کے نہیں فرمایا، بلکہ بطور تکمیل یا احتراس فرمایا ہے، پھر فرمایا کہ اس کا تعلق علم معانی وبیان سے ہے، شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اس فن میں عقود الجمان لکھی ہے، وہ اچھی کتاب ہے مگر مسائل کا استیعاب نہیں کرسکے۔ ''مطول'' بھی ایسی ہی ہے مجھے اپنے تتبع اور مطالعہ سے یہ واضح ہوا کہ اس فن کے بکثرت مسائل کشاف سے مستنبط ہوتے ہیں جو اس فن کی کسی کتاب میں نہیں ملتے، بلکہ میرا خیال ہے کہ نصف کے قریب ایسے مسائل ہیں، اس لئے کوئی محنت کر کے اس سے تمام مسائل نکال کر ایک جگہ جمع کردے تو بہت اچھا ہو۔

فرق فتویٰ وقضاء: ''یقضی بھا'' پر فرمایا کہ فتویٰ دینے کے لئے مسئلے کا علم کافی ہے خواہ وہ فرضی صورت ہو، مگر قضاء کے لئے علم مسئلہ کیساتھ علم واقعہ بھی ضروری ہے، کیونکہ قضاء صرف واقعات پر جاری ہوتی ہے۔

کمال علمی وعملی: حدیث میں کمال علمی اور کمال عملی دونوں کا ذکر ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہے کہ کمال علمی یا باطنی وہی قابل غبطہ ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچے، یہ اس کا بڑا فائدہ ہے اور کم سے کم فائدہ اس کا یہ ہے خود علم وحکمت کے فوائد سے نفع پذیر ہو ورنہ کمثل الحمار ہو جائے گا۔

اسی طرح کمال عملی یا خارجی کا بڑا مدار مال ودولت پر ہے، لیکن وہ بھی جب ہی قابل غبطہ ہے کہ اس مال ودولت کو حق کے راستوں میں

پوری فراخدلی سے صرف کردے، اگر بخل واسراف ہوا تو وہ بھی وبال ہے۔ واللہ اعلم۔

بَابُ مَا ذُكِرَ فِي ذَهَابِ مُوسٰى فِي الْبَحْرِ اِلَى الْخَضِرِ وَقَوْلِهٖ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِيْ الْاٰيَةَ

(حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کے پاس دریا میں جانا اور حسب ارشاد خداوندی ان سے کہنا کہ میں آپ کے ساتھ چلوں تا کہ آپ مجھے اپنے علم سے مستفید کریں)

(۷۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ غُرَيْرٍ الزُّهْرِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا يَعْقُوْبُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ ثَنَا اَبِيْ عَنْ صَالِحٍ يَعْنِيْ اِبْنَ كَيْسَانَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ حَدَّثَهٗ اَنَّ عُبَيْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ اَخْبَرَهٗ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّهٗ تَمَارٰى هُوَ وَالْحُرُّ بْنُ قَيْسِ بْنِ حِصْنٍ الْفَزَارِيُّ فِيْ صَاحِبِ مُوْسٰى قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍؓ هُوَ خَضِرٌ فَمَرَّ بِهِمَا اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ فَدَعَاهُ ابْنُ عَبَّاسٍؓ فَقَالَ اِنِّيْ تَمَارَيْتُ اَنَا وَصَاحِبِيْ هٰذَا فِيْ صَاحِبِ مُوْسٰى الَّذِيْ سَاَلَ مُوْسٰى السَّبِيْلَ اِلٰى لُقِيِّهٖ هَلْ سَمِعْتَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ شَاْنَهٗ قَالَ نَعَمْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بَيْنَمَا مُوْسٰى فِيْ مَلَاءٍ مِّنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اِذْ جَآءَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ اَحَدًا اَعْلَمَ مِنْكَ ؟ قَالَ مُوْسٰى لَا فَاَوْحَى اللّٰهُ اِلٰى مُوْسٰى بَلٰى عَبْدُنَا خَضِرٌ فَسَاَلَ مُوْسٰى السَّبِيْلَ اِلَيْهِ فَجَعَلَ اللّٰهُ لَهُ الْحُوْتَ اٰيَةً وَ قِيْلَ لَهٗ اِذَا فَقَدْتَّ الْحُوْتَ فَارْجِعْ فَاِنَّكَ ...... سَتَلْقَاهُ فَكَانَ يَتَّبِعُ اَثَرَ الْحُوْتِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ لِمُوْسٰى فَتَاهُ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَا اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَ مَا اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا فَوَجَدَا خَضِرًا فَكَانَ مِنْ شَاْنِهِمَا مَا قَصَّ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ كِتَابِهٖ.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ اور حر بن قیس حضرت موسیٰ کے بارے میں بحثے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ خضر تھے، پھر ان کے پاس سے ابن ابی کعبؓ گزرے تو عبداللہ ابن عباسؓ نے انہیں بلایا اور کہا کہ میں اور میرے یہ رفیق حضرت موسیٰؑ کے اس ساتھی کے بارے میں بحث کر رہے ہیں جس سے انہوں نے ملاقات کی سبیل چاہی تھی کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں کچھ ذکر سنا تھا، انہوں نے کہا، ہاں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں موجود تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں کوئی آپ سے بھی بڑھ کر عالم ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ ہاں! ہمارا بندہ خضر ہے (جس کا علم تم سے زیادہ ہے) تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا کہ خضر سے ملنے کی کیا صورت ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے ایک مچھلی کو ان سے ملنے کی علامت قرار دیا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ تم اس مچھلی کو گم کر دو تو واپس لوٹ جاؤ، تب خضر سے تمہاری ملاقات ہوگی پس حضرت موسیٰ علیہ السلام چلے اور دریا میں مچھلی کی علامت تلاش کرتے رہے، پھر ان کے ساتھی نے کہا جب ہم پتھر کے پاس تھے تو کیا آپ نے دیکھا تھا، میں اس وقت مچھلی کو کہنا بھول گیا تھا، اور شیطان ہی نے مجھے اس کا ذکر بھلا دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اسی

مقام کی تو ہمیں تلاش تھی تب وہ اپنے نشانات قدم پر (پچھلے پاؤں) لوٹے وہاں انہوں نے خضر علیہ السلام کو پایا، پھران کا وہی قصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن کریم میں بیان کیا ہے۔

تشریح: حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کی ملاقات کے جس قصہ کی طرف حدیث الباب میں اشارہ ہے، وہ سورہ کہف میں بیان ہوا ہے اس سے پہلے اس امر کا ذکر ہوا تھا کہ مغرور کافر مفلس مسلمانوں کو ذلیل وحقیر سمجھ کر آنحضرت ﷺ سے کہتے تھے کہ ان کو اپنے پاس نہ بٹھائیں، تب ہم آپ کے پاس آ کر بیٹھیں گے، اس پر حق تعالیٰ نے دو آدمیوں کی کہاوت سنائی، پھر دنیا کی مثال اور ابلیس کا کبر وغرور کے سبب تباہ و برباد ہونا بیان کیا، اس کے بعد حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا قصہ بھی اسی مناسبت سے ذکر فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے......اولوالعزم جلیل القدر پیغمبر سے بھی ایک اسی قسم کی ظاہری ومعمولی لغزش ہو چکی ہے، جس کے سبب حق تعالیٰ نے ان کی تادیب فرمائی، حدیث صحیح میں قصہ اس طرح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک روز اپنی قوم کے سامنے نہایت موثر وعظ فرما رہے تھے جس میں ان کے سامنے دنیا کے عروج وزوال کا نقشہ کھینچا اور حق تعالیٰ کی سنت بتلائی کہ کس موقع پر کیا طریقہ اختیار فرماتے ہیں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر فرمایا اور فرعون اور اس کے ظلم وعدوان، سطوت وجبروت، سے نجات اور ان کی جگہ بنی اسرائیل کو سلطنت وعروج حاصل ہونے کا ذکر، کتاب تورات (کتاب الٰہی) جیسی نعمت ملنے کا ذکر فرمایا اور ان کو نہایت بیش قیمت نصائح وحکم سنائے، پھر یہ بھی فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تمہارے نبی کو اپنے کلام سے مشرف کیا اور اس کو اول سے آخر تک طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا۔ اس کو تمام زمین والوں سے افضل ٹھہرایا غرض تمام نعمتیں ذکر کیں، جو خود ان پر اور ان کی قوم پر حق تعالیٰ کی طرف سے ہوئیں تھیں جیسا کہ تفسیر روح المعانی وغیرہ میں ہے اس نہایت موثر، وعظ وخطبہ کے بعد ایک شخص نے سوال کر لیا کہ اے رسول خدا! کیا آپ سے بھی زیادہ علم والا اس وقت بھی روئے زمین پر کوئی اور ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں! یہ جواب واقع میں بالکل صحیح تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے جلیل القدر رسول تھے ان کی تربیت حسب آیت قرآنی "ولتصنع علی عینی" (آپ کی تربیت اور خصوصی غور پرداخت ہماری نگرانی میں ہونی چاہیے، حق تعالیٰ کی خصوصی توجہات کے تحت ہوئی ہے اور یوں بھی ہر زمانے کا پیغمبر اپنے زمانے کا سب سے زیادہ علم والا ہوا کرتا ہے، مگر حق تعالیٰ کو ان کے الفاظ پسند نہ آئے، اس کی مرضی یہ تھی کہ جواب کو اس کے علم محیط پر محول کرتے، مثلاً کہتے کہ خدا نے ایک سے ایک کو زیادہ علم عطا فرمایا ہے وہی خوب جانتا ہے کہ اس وقت مجھ سے زیادہ علم والا بھی کوئی اور ہے یا نہیں؟

چنانچہ حسب تصریح صاحب روح المعانی حضرت جبریل وحی الٰہی لے کر آ گئے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ تمہیں کیا خبر کہ میرا علم کہاں کہاں تقسیم ہوا ہے؟ دیکھو ساحل بحر پر ہمارا ایک بندہ موجود ہے جس کا علم تم سے زیادہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی کہ مجھے اسکا پورا پتہ نشان بتا دیا جائے تا کہ میں اس سے مل کر علمی استفادہ کروں، حکم ہوا کہ اس کی تلاش میں نکلو تو ایک مچھلی تل کر ساتھ رکھ لینا، جہاں مچھلی گم ہو وہیں سمجھ لینا کہ وہ بندہ موجود ہے، گویا مجمع البحرین جو ایک وسیع قطعہ مراد ہو سکتا تھا اس کی تعیین کے لیے یہ علامت مقرر فرما دی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی ہدایت کے موافق اپنے خادم خاص حضرت یوشع[1] علیہ السلام کو ہمراہ لے کر سفر شروع کر دیا اور ان سے کہہ دیا کہ مچھلی کا خیال رکھنا میں برابر سفر کرتا رہوں گا حتیٰ کہ منزل مقصود پر پہنچ جاؤں خواہ اس میں کتنی ہی مدت لگ جائے بدوں حصول

---

[1] حضرت یوشع علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے پڑپوتے ہیں، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں خلعتِ نبوت سے سرفراز ہوئے اور انکے بعد انکے خلیفہ بھی ہوئے، روح المعانی ص۳۱۱ ج۱۵ میں یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف علیہ السلام درج ہے (مؤلف)

مقصد واپس نہ ہوں گا، اس کے بعد سفر شروع کر دیا گیا اور مجمع البحرین پر پہنچ کر ایک بڑے پتھر کے سایہ میں جس کے نیچے آب حیات کا چشمہ جاری تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سو رہے، حضرت یوشع نے دیکھا کہ بھنی ہوئی مچھلی خدا کے حکم سے زندہ ہو کر توشہ دان میں سے نکل پڑی اور عجیب سے طریقہ سے دریا میں سرنگ بناتی چلی گئی اور خدا کی قدرت اور مشیت کے تحت اس جگہ ایک طاق یا محراب سا کھلا رہ گیا، جس سے اس جگہ کی تعیین میں آسانی ہو۔

حضرت یوشعؑ یہ سب ماجرا دیکھ کر متحیر ہوئے ارادہ کیا حضرت موسیٰؑ کو بیداری کے بعد بتلائیں گے مگر چونکہ ابھی حضرت خضرؑ سے ملاقات میں دیر تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مزید تعب برداشت کرانا تھا۔ حضرت یوشع اس امر کا ذکر کرنا بھول گئے، دونوں کا سفر پھر جاری ہو گیا اور بقیہ دن اور پوری رات برابر چلتے رہے، صبح کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غیر معمولی تھکن اور بھوک محسوس کی، ناشتہ طلب فرمایا اس پر یوشعؑ کو خیال آیا کہ ناشتہ کی چیز (بھنی ہوئی مچھلی) تو عجیب طریقہ پر جا چکی تھی، پھر سارا قصہ عرض کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اسی جگہ کی تو ہمیں تلاش تھی اور دونوں الٹے پیروں اس جگہ کی طرف پھرے اور مچھلی گم ہونے کی جگہ پر حضرت خضر علیہ السلام کو پالیا۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس طاق یا محراب میں دور تک مچھلی کے چلنے کے ساتھ زمین خشک ہوتی چلی گئی تھی اور اس طرح حضرت موسیٰؑ آگے بڑھتے رہے تا آنکہ ایک جزیرہ پر پہنچ کر حضرت خضرؑ سے ملاقات ہوئی (یہ روایت تفسیر ابن کثیر ص ۹۵/۳ میں ہے) اس روایت کی تائید حافظ ابن حجر و حافظ ابن عینی کی ذکر کردہ روایت عبداللہ بن حمید عن ابی عالیہ سے بھی ہوتی ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے ایک جزیرہ میں ملے ہیں اور ظاہر ہے کہ جزیرہ تک پہنچنا بغیر بحری سفر کے نہیں ہو سکتا۔

نیز علامہ عینی و حافظ نے ایک دوسرا اثر بھی بہ طریق ربیع بن انس نقل کیا کہ مچھلی کی دریا میں گھسنے کی جگہ ایک موکھلا کھل گیا تھا، اسی میں حضرت موسیٰؑ گھستے چلے گئے، حتیٰ کہ حضرت خضر تک پہنچ گئے، پھر حافظ عینی اور حافظ ابن حجر دونوں نے لکھا کہ یہ دونوں اثر موقوف ثقہ راویوں کے ذریعہ منقول ہوئے ہیں۔

اس قول کو علامہ ابن رشید کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور علامہ موصوف نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ شاید یہی بات (جزیرہ کی ملاقات) امام بخاری کے نزدیک بھی ثابت شدہ ہوگی۔ (عمدۃ القاری ص ۴۴۵/۱، فتح الباری ص ۱۲۳/۱)

بحث ونظر: (۱) تحقیق مذکور کے لحاظ سے امام بخاریؒ کا ترجمہ زیادہ مطابق ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام سے ملنے کے لئے دریا میں جانا واضح ہے حافظ ابن حجر نے ایک توجیہ حذف مضاف الخضر سے پہلے مان کر الیٰ مقاصد الخضر ذکر کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضرؑ کے ساتھ بھی ایک دریائی سفر کیا جس میں کشتی کو توڑ کر عیب دار بنایا تھا مگر ظاہر ہے کہ یہ توجیہ راجح نہیں ہو سکتی، کیونکہ موسیٰؑ کا وہ سارا سفر اپنے ہی مقصد علمی استفادہ کے لئے تھا، اس کے کسی حصہ کو مقاصد خضر سے متعلق کرنا مناسب نہیں، حافظ عینی نے بھی حافظ ابن حجر کی توجیہ مذکور کو نقل کر کے لکھا کہ یہ توجیہ نہ مقامی اشکال کا جواب بن سکتی ہے اور نہ اس میں کوئی معقولیت ہے، اس کے بعد حافظ ابن حجر نے دو توجیہ اور لکھی ہیں، جو بظاہر ان کے نزدیک ثانوی درجہ رکھتی ہیں، ایک یہ کہ حذف مضاف البحر سے قبل ہو یعنی الی ساحل البحر مراد لیا جائے۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ سفر کے دو حصے تھے، بری اور بحری، فی البحر اس طرح کہا گیا جیسے کل پر جز کا اطلاق عام طور سے کر دیا کرتے ہیں، حافظ ابن حجر کی اس توجیہ کو قسطلانی نے پسند کیا ہے۔

علامہ ابن منیر نے الی الخضر میں الی کو بمعنی مع قرار دیا، جیسے آیت قرآنی لا تاکلوا اموالھم الی اموالکم میں ہے، یعنی کشتی والا

بحری سفر حضرت خضر کے ساتھ ہوا ہے۔

حضرت شیخ الہند نے الابواب والتراجم ص ۳۷ میں تحریر فرمایا "یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ **ذهاب موسیٰ فی البحر الی الخضر**، مشہور ومنقول کے خلاف ہے، حضرت موسیٰ خشکی میں سفر کر کے حضرت خضر سے ملے ہیں نہ بحر میں، شرح محققین نے اس کی متعدد تاویلیں فرمائی ہیں، مثلاً الی الخضر میں الی کو بمعنی مع فرمایا ہے، یا بحر سے ناحیۃ البحر اور طرف البحر مراد لیا ہے، مگر سہل یہ ہے کہ الی اور بحر کو اپنے ظاہر پر چھوڑ کر یہ کہا جائے کہ الی الخضر سے پہلے واؤ عاطفہ کو ذکر نہیں کیا کہ **اعتماداً الی فهم السامع واؤ عطف** کو بسا اوقات ذکر نہیں کرتے۔"

اس توجیہ پر بڑا اشکال یہ ہے کہ عبارت اس طرح بنتی ہے **ذهاب موسیٰ فی البحر والی الخضر** (حضرت موسیٰ کا بحر میں جانا اور خضر کی طرف جانا) حالانکہ ترتیب واقعہ برعکس ہے کہ پہلے خضر سے ملے پھر ان کے ساتھ بحری سفر ہوا، اس اشکال کو مخدوم ومحترم صاحب ایضاح البخاری دامت فیوضہم نے بھی تسلیم کیا ہے اور جواب دہی فرمائی ہے۔

لہٰذا تکلف سے خالی اور بے غبار اس توجیہ کو بھی نہیں کہہ سکتے، افسوس ہے کہ ابھی تک حضرت شاہ صاحبؒ کی فرمائی ہوئی کوئی توجیہ سامنے نہیں ہے، تاہم سب سے بہتر توجیہ ابن رشید والی معلوم ہوتی ہے اور آثار موقوفہ قویہ سے بھی وہی مؤید ہے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب لامع الدراری، دامت فیوضہم نے بھی اس کو ترجیح دی ہے (لامع ص ۱/۴۹) اس کے بعد ساحل بحر والی، پھر سفر بحر کو تغلیبی طور پر ملحوظ رکھنے کی توجیہ بھی غنیمت ہے۔ واللہ علم۔

(۲) **مقصد ترجمہ:** مقصد ترجمہ بظاہر طلب علم کی اہمیت، فضیلت اور سفر وحضر ہر صورت میں اس کی ضرورت کا اظہار ہے۔ مگر اشکال یہ ہے کہ امام بخاری آگے طلب علم کے لئے خروج کا باب مستقل لا رہے ہیں، پھر یہاں اس کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب ہوسکتا ہے کہ بحری سفر میں خطرات زیادہ پیش آتے ہیں۔ اس لئے اس کو مستقل عنوان سے بتلایا کہ علم کے لئے بحری پرخطر سفر بھی جائز بلکہ مستحسن ہے، مگر اس سے بہتر توجیہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی معلوم ہوتی ہے انہوں نے فرمایا کہ امام بخاری پہلے باب میں بتلا چکے ہیں کہ علم کی تحصیل چھوٹی عمر میں اور بڑی عمر میں سیادت سے قبل وبعد ہر طرح ضروری ہے، وہاں صحابہ کرام کے تامل سے استشہاد کیا تھا، یہاں ایک جلیل القدر پیغمبر کے واقعہ سے استشہاد فرمایا اور یہ بھی بتلا دیا کہ صحابہ کا نوعمری میں علم حاصل نہ کرنا تو اس لئے بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے سے ان کو علم میسر نہ تھا یا قبل اسلام علم کی طرف ایسی رغبت نہ تھی، لہٰذا بعد اسلام علم حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی مگر یہاں ایسی صورت ہے کہ ایک اولوالعزم پیغمبر جو علوم نبوت سے سرفراز ہو چکا ہے بظاہر اس کے علم میں کوئی کمی نہیں ہے اور یوں بھی روئے زمین پر اس سے زیادہ علم والا کوئی نہیں ہے، مگر ذرا سی زبانی لغزش پر یا مناقشہ لفظیہ کے تحت اس کو احساس کرایا جاتا ہے کہ کچھ علوم اور بھی دنیا والوں کو دیئے گئے ہیں، جو علوم شریعت کی طرح اہم وافضل نہ سہی مگر پھر بھی اسرار کونیہ ہونے کے سبب قابل اعتنا ہیں، ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی تحصیل کے غیر معمولی اشتیاق کے سبب ایک عظیم الشان سفر بری و بحری کر ڈالا، جس سے غیر ضروری علم کی فضیلت پر بھی روشنی پڑتی ہے، بلکہ بعض احادیث سے آنحضرت ﷺ کی تمنا بھی اس امر کی ثابت ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ اور صبر کر لیتے تو اچھا تھا، ہمیں مزید اسرار کونیہ کا علم حاصل ہو جاتا۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑے سے بڑے پیغمبر کا علم بھی خدا کے علم محیط کے مقابلے میں ہیچ در ہیچ ہے اور اسی لئے حضرت خضرؑ نے ایک چڑیا کو سمندر کے پانی سے چونچ بھرتے دیکھ کر حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ میرے تمہارے اور ساری خلائق کی نسبت حق تعالیٰ کے علم محیط کے مقابلے میں اتنی بھی نہیں، جتنی اس چڑیا کی چونچ کے پانی کو سارے سمندر کے پانی سے ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۳/۹۳)

علم خدا و غیر خدا کا فرق

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس مثال سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باوجود نبی مرسل و اعلم اہل الارض ہونے کے بھی معمولی جزئیات کے علم سے بے خبری اور نہ صرف بے خبری بلکہ اس پر بے صبری بھی، (حضرت خضرؑ کا فرمانا کہ تم میرے کاموں پر صبر کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام علم کی اس قسم سے نا آشنا ہیں نہ وہ اس کے لئے پیدا کئے گئے ہیں) نیز آنحضرت ﷺ کی تمنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر کرتے تو مزید علم اسرار حاصل کرتے، ان سب امور سے واضح ہے کہ حضرات انبیاءؑ خود بھی حق تعالیٰ کے علم کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے خود بھی فیصلہ فرمایا **وما او تیتم من العلم الا قلیلا** پھر کسی کا یہ خیال کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ کا علم غیب ذاتی و محیط اس کے سوا کسی اور کو بھی حاصل ہوا یا ہوسکتا ہے، غرض عبد تو عبد ہی ہے، خواہ وہ ترقی کرکے آسمانوں سے اوپر بھی پہنچ جائے۔ اور حق تعالیٰ شانہٗ وراء الوراء ہے، وہ احد ہے صمد ہے اور **لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوا احد** اس کی شان و **کل یوم هو فی شان**

(۳) سبب نزاع: حر بن قیس نے حضرت ابن عباسؓ سے جھگڑا اس لئے کیا کہ وہ عالم تورات تھے، پھر مسلمان ہوئے اور تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام و خضر علیہ السلام کا یہ واقعہ نہیں تھا، یہ حر تابعی ہیں، غزوہ تبوک سے واپسی کے وقت حضور ﷺ سے جو وفد ملے ہیں ان میں یہ بھی تھے، حضرت عمرؓ کے ہم نشینوں میں سے تھے (کذا افادنا الشیخ الانورؒ)

(۴) حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا علمی موازنہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام وظائف نبوت، امور شریعت اسرار الٰہیہ اور سیاست امور کے لحاظ سے اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم اہل الارض تھے، حضرت خضر علیہ السلام دوسرے علوم غیبیہ، علوم تکوینیہ، اسرار کونیہ وغیرہ کے سب سے بڑے عالم اہل الارض تھے، حضرت شاہ صاحب کے الفاظ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کمالات کا رخ حق سبحانہ وتعالیٰ کی جانب تھا اور حضرت خضر علیہ السلام کے کمالات کا رخ خلق خداوندی کی طرف تھا، اہل علم کے اکثر کشوف کا تعلق امور الٰہیہ سے رہا، مثلاً حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شیخ اکبرؒ کہ ان کے کشف مسائل صفات باری وغیرہ کے حل و تفہیم کے لئے ہوئے ہیں اور ان ہی کشوف کا مرتبہ سب سے اعلیٰ وارفع بھی ہے، پھر فرمایا کہ یہاں حضرت خضرؑ کو حق تعالیٰ نے زیادہ اعلم ظاہر فرمایا حالانکہ ان کا علم مفضول تھا بہ نسبت علم کلیم اللہ کے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب و مناقشہ کی صورت تھی، اگر معاملہ برعکس ہوتا تو اس وقت حضرت موسیٰؑ کی اعلمیت کا مظاہرہ فرمایا جاتا، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملے اور آپ کے علوم و کمالات سے واقف ہوئے تو بے ساختہ بول اٹھے۔ "اے موسیٰ علیہ السلام آپ نے میرے پاس آنے کی زحمت کیوں اٹھائی؟ آپ علیہ السلام کے پاس تو بڑا علم ہے، حق تعالیٰ جل ذکرہ کی جلیل القدر کتاب توراۃ آپ کے ہاتھ میں ہے اور وحی الٰہی آپ پر نازل ہوتی ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:۔ میرے رب علیم و حکیم کا حکم یہی ہوا کہ آپؑ کے پاس آؤں اور آپ کا اتباع کروں، اور آپ کے علوم سے استفادہ کروں۔ (روح المعانی ص ۱۵/۳۲۰)

(تفسیر ابن کثیر ص ۳/۹۳ میں ایک روایت ہے کہ حضرت خضرؑ نے اس پر فرمایا:۔ اے موسیٰ علیہ السلام میرا علم اور آپ کا علم الگ الگ ہے، مجھے جن امور کا علم حق تعالیٰ نے عطاء فرمایا ہے وہ آپ کو نہیں دیا، اور آپ کو جو علوم عطا فرمائے ہیں وہ مجھے نہیں دیئے، اس لئے ہمارا اور آپ کا ساتھ نہ نبھ سکے گا۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔ "آپ مجھے ان شاء اللہ صابر و ضابط پائیں گے، اور میں آپ کے حکم کے خلاف نہیں کروں گا"۔

حضرت شاہ صاحب نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ کشوف زیادہ کمال کی چیز نہیں ہے کیونکہ ان کا علم جزوی ہے مطرد اور کلی نہیں ہے،

حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی افضل ہیں کہ ان کے پاس ظاہر شریعت کا علم ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کے پاس کشوف کونیہ کا علم ہے
راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جس طرح علوم میں سے وہ علم زیادہ موجب کمال وفضل ہے جو مطرد وکلی ہیں اس طرح مذاہب اربعہ کی فقہوں میں سے وہ فقہ زیادہ برتر وافضل ہوگی، جس میں اصولیت، کلیت اور اصول سے جزئیات کا انطباق زیادہ ہوگا اور یہ خصوصی امتیاز فقہ حنفی کا ہے، جیسا کہ خود حافظ ابن حجرؒ نے بھی اعتراف کیا اور اس کی وجہ سے ان کو حنفیت کی طرف میلان بھی تھا، جس کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔
واللہ اعلم وعلمہ اتم.

(۵) حضرت موسیٰؑ سے مناقشہ لفظیہ

حضرت موسیٰؑ سے جس قسم کی لغزش ہوئی اور رب العزت کی طرف سے اس پر عتاب ہوا، اس کو حضرت شاہ صاحبؒ مناقشہ لفظیہ سے تعبیر فرمایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ انبیاءؑ کی زیادہ تر لغزشیں اسی نوع کی ہیں، یعنی حقیقی ومعنوی لحاظ سے کسی پیغمبر سے بھی کوئی نافرمانی سرزد نہیں ہوئی، جو کچھ پیش آیا وہ ظاہری طور سے کوئی لغزش یا مناقشہ لفظیہ کی صورت۔

(۲) پھر یہ بھی فرمایا کہ خیر علماء اہل تصوف کے اکثر کشف بھی امور تکوینیہ سے متعلق ہوئے ہیں اور ان میں سے ہوئی ہے، اور عتاب کی غرض نبی کی تادیب اور دوسروں کی تنبیہ ہوتی ہے، چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے اس سفر زیر بحث میں قدم قدم یہی تعلیم ہے کہ **لا ادری** کہیں، نہ جہت سفر بتلائی، نہ مقام ملاقات خضر کو متعین فرمایا، نہ وقت ملاقات کی تعین کی، نہ مچھلی کے دریا میں جانے کا علم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے خادم کو ہوسکا، آگے چلا رہے ہیں پھر تھکا بھی دیتے ہیں تاکہ بہت زیادہ آگے نہ بڑھ جائیں اور وقت ضائع ہو (روایت میں آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو مچھلی کے گم ہونے کی جگہ تک پہنچنے میں کوئی تھکن اور بھوک کی تکلیف نہ ہوئی تھی۔ آگے بڑھے تو باقی دن اور ایک رات ہی سفر کر کے تھک گئے، بھوک بھی لگ پڑی، یہ بھی منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ حق تعالیٰ کے مناجات میں چالیس روز صرف کئے، اور اس پوری مدت میں کھانے کا خیال بھی نہ کیا اور ایک بشر کی ملاقات ومناجات کے لئے نکلے تو چند ساعات ہی میں بھوک کا احساس ہوگیا۔) یہ سب صرف اس لئے کرایا گیا کہ اپنی خطا کا زیادہ سے زیادہ احساس فرمائیں، ''مقرباں رابیش بود حیرانی'' جن کے ساتھ تعلق ومحبت زیادہ ہوا کرتی ہے ان کا امتحان آزمائش بھی بات بات پر ہوا کرتی ہے اور معمولی لغزشوں پر عتاب بھی ضرور ہوا کرتا ہے کیونکہ عتاب محبت کی بہت بڑی علامت ہے'' **ویبقی الود مابقی العتاب** '' (عتاب کا ہونا محبت وتعلق قلبی کے وجود پر دال ہے) یہاں سے عتاب اور سخط وناراضگی کا لفظ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

(۶) نوعیت نزاع: حضرت ابن عباسؓ اور حضرت حر بن قیسؓ میں نزاع یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جن سے ملنے اور علمی استفادہ کے لئے گئے ہیں، وہ خضر ہی ہیں یا کوئی اور؟ حضرت ابن عباسؓ کی رائے یہی تھی کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام ہیں؟ حر بن قیس کی رائے دوسری تھی جس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اس کے علاوہ علامہ کرمانی نے ایک دوسرا نزاع بھی نقل کیا ہے کہ موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰؑ (ابن عمران) نبی بنی اسرائیل ہیں، یا موسیٰ بن میشا ہیں؟ اس اختلاف کو علامہ کرمانی نے حضرت ابن عباسؓ اور نوف البکالی کے درمیان بتلایا، اس پر محقق عینی نے تنبیہ فرمائی کہ یہ کرمانی کی غلطی ہے۔ کیونکہ وہ دوسرا نزاع بکالی کا حضرت سعد بن جبیر سے ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے نہیں ہے، جس کا حال کتاب التفسیر میں آئے گا۔ (عمدۃ القاری ص۴۵۱)

(۷) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ونسب وغیرہ

حافظ عینی نے لکھا کہ حضرت موسیٰؑ حضرت یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیم علیہ السلام کی پانچویں پشت میں ہیں، جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت مبارکہ ہوئی، آپ کے والد ماجد عمران کی عمر ۷۰ سال کی تھی اور عمران کی عمر کل ۱۳۷ سال کی ہوئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کل عمر ۱۲۰ یا بقول فربری ۱۶۰ سال ہوئی ہے اور آپ کی وفات وادی تیہ میں ۷ اِذار ۱۶۲۰ھ (من الطوفان) میں ہوئی ہے اور بنی اسرائیل کو مصر سے ساتھ لے کر جب نکلے ہیں تو آپ کی عمر اس وقت ۸۰ (اسی سال) تھی وادی تیہ میں چالیس سال رہے ہیں پھر حافظ عینی نے حضرت یوسفؑ کے زمانہ تک سے حضرت موسیٰؑ کے زمانے کی تاریخ بادشاہت مصر بھی ذکر کی اور لکھا کہ ملک مصر ریان بن الولید نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی مملکت کا وزیر خزانہ بنایا تھا، اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام بھی لے آیا تھا، اس کے بعد قابوس بن مصعب بن ریان، تخت مصر پر بیٹھا، حضرت یوسفؑ نے اس کو بھی دعوت اسلام دی، مگر اس نے انکار کیا وہ بہت جابر وظالم تھا، اسی کے زمانے میں حضرت یوسفؑ کی وفات ہوئی، مدت دراز تک حکومت کر کے مرا تو اس کے بعد اس کا بھائی ولید بن مصعب تخت کا مالک ہوا جو قابوس سے بھی زیادہ سرکش وظالم تھا، اس نے بھی مدت دراز تک حکومت کی، اس کے بعد فرعون بادشاہ مصر ہوا، جو فرعون موسیٰ کہلایا، اس سے زیادہ سرکش وظالم فراعنہ میں کوئی نہیں ہوا اس کی عمر بھی سب سے زیادہ ہوئی، یعنی چار سو سال (۴۰۰)، اور زمانہ حکومت بھی سب سے زیادہ پایا۔ (عمدۃ القاری ص ۱/۴۴۶)

(۸) حضرت یوشعؑ کی بھوک کیسی تھی؟

محدثین ومفسرین نے لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ مچھلی کا خیال رکھنا اور جہاں وہ گم ہو مجھے بتا دینا، بس تمہارا کام اتنا ہی ہے تو اس وقت حضرت یوشعؑ نے کہا یہ آپ نے کون سا بڑا کام سونپا ہے (ضرور تعمیل ارشاد کروں گا) تو حضرت یوشع کی یہ بات بھی اوعانی پہلو لئے ہوئے تھی، کہ اپنے بھروسے پر تعمیل ارشاد کا وعدہ کر بیٹھے، ان کو بھی چاہیے تھا کہ خدا کی مدد، مشیت اور بھروسہ پر وعدہ کرتے، اس لئے ان کو تنبیہ وتادیب کے طور پر ایسی اہم اور نہ بھلا دینے والی بات بھلا دی گئی، اور اس میں حضرت موسیٰؑ کو بھی تادیب ہے کہ بظاہر حضرت یوشعؑ کے علم واخبار پر بھروسہ کر بیٹھے۔

دوسری وجہ صاحب روح المعانی نے یہ لکھی کہ حضرت یوشع، حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں رہ کر بارہا بڑے سے بڑے معجزات قاہرات دیکھ چکے تھے، اس لئے اس عجیب واقعہ کی کوئی اہمیت ان کے دل میں نہ ہوئی، اور بھلا دیا، ورنہ ایسی عجیب بات بھول جانے کے لائق نہ تھی۔

تیسری وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ حضرت یوشع کو شیطان نے ان کے اہل وعیال اور ان کے وطن کی مفارقت وغیرہ کے متعلق ایسے وساوس اور خیالات میں مبتلا کر دیا کہ ایسی اہم بات ان کے دل سے اوجھل ہو گئی اس لئے شیطان چونکہ تقدیر الٰہی کے تحت اس طرح سبب نسیان بن گیا تو اس کی طرف نسبت کر دی گئی۔

اس قسم کے وساوس حضرت یوشعؑ کے مقام ومرتبہ رفیع پر اثر انداز نہیں ہو سکتے، اگرچہ ان کو اس قصہ کے وقت نبی بھی مان لیا جائے، چوتھی وجہ بعض محققین سے یہ نقل کی ہے کہ حضرت یوشعؑ پر حق تعالیٰ کی آیات باہرہ دیکھ کر استغراقی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اور وہ اس وقت پوری طرح سے حق تعالیٰ کے جناب قدس میں منجذب ہو گئے تھے۔ اس لئے اس عجیب واقعہ پر دھیان نہ دے سکے، لیکن اس توجیہ پر یہ اشکال ہوگا کہ

یہاں تو بھلا نیکی نسبت حق تعالیٰ کی طرف بطور حقیقت و استغراق کی طرف بطور مجاز بے تکلف ہو سکتی تھی، پھر دونوں کو چھوڑ کر شیطان کی طرف کیوں گئی ہے؟ جواب یہ کہ ایسا بطور تواضع و انکسار عمل میں آیا، چونکہ وعدہ پورا کرنے اور ایسی اہم ڈیوٹی انجام دینے میں غفلت ہوگئی، اس لئے استغراق وانجذاب مذکورہ کو بمنزلہ وساوس شیطان قرار دے دیا گویا بطور استعارہ مطلق مشغول کرنے والی بات کو شیطان کا اثر و عمل قرار دے دیا گیا، اسی لئے حدیث میں آتا ہے "وانہ لیغان وعلیٰ قلبی، فستغفر اللہ تعالیٰ فی الیوم سبعین مرۃ" (میرے دل پر کچھ میل کی کیفیت آجایا کرتی ہے جس کے سبب میں حق تعالیٰ سے ایک ایک دن میں ستر بار مغفرت طلب کرتا ہوں) (روح المعانی ص ۳۱۸/۱۵)

حضرت شاہ صاحب کی رائے یہ ہے کہ یہاں شیطان کی نسبت ایسی ہی ہے جیسے تثاؤب (جمائی لینی کی نسبت بھی شیطان کی طرف کی گئی ہے، بس ایسے امور طبعیہ شیطان کی طرف محض اس لئے منسوب ہوتے ہیں کہ ان میں اور شیطان میں خصوصی مناسبت ہے۔

(۹) ہر نسیان منافی نبوت نہیں

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ نبوت کے منافی صرف وہی نسیان جو شیطان کے غلبہ وتسلط کے سبب ہو، ہر نسیان خصوصاً وہ جو امور طبعیہ میں سے ہے، منافی نبوت نہیں ہے چنانچہ پانچ چار بار نسیان حضور اکرم ﷺ کو بھی پیش آیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نسیان ہمیشہ شیطان کے غلبہ وتسلط سے نہیں ہوتا۔

رہا یہ کہ نسیان تو حضرت یوشعؑ سے ہوا تھا، پھر آیت کریمہ میں دونوں کیطرف کیوں منسوب ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بھول ہوگئی کہ وہ یہ دیکھنا بھول گئے کہ مچھلی توشہ دان میں موجود ہے یا نہیں (اور وہ شاید ایسے اہم مقامات پر دیکھا کرتے ہوں گے، یا حضرت یوشعؑ سے معلوم کرتے ہوں گے، جہاں پڑاؤ کریں ٹھہریں یا آرام کریں)

صحیحین وغیرہما کی حدیث میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ حضرت یوشع سے فرما چکے تھے کہ بے جان مچھلی ساتھ لے لو جس جگہ اس میں روح پڑے گی مجھے اس کی خبر دینا، تمہارا کام اتنا ہی ہے، پھر ایسا ہوا کہ جس وقت مچھلی کے اندر روح پڑی اور وہ دریا میں سٹک گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سو رہے تھے، حضرت یوشعؑ نے آپکو بیدار کر کے بتلانا مناسب نہ سمجھا، پھر جب اٹھے تو آگے چل پڑے، اور حضرت یوشع کو وہ بات بتلانے کا خیال بالکل ہی نہ آیا، مسلم کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ ایک مچھلی نمک لگی ناشتہ میں لے لو، جہاں وہ گم ہو جائے گی وہی جگہ تمہاری منزل مقصود ہے۔ (روح المعانی ص ۳۱۴/۱۵)

اس مچھلی کی نسل موجود ہے یا نہیں؟

صاحب روح المعانی نے علامہ دمیری سے نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے لئے جو مچھلی نشان بنی تھی اس کی نسل سبتہ شہر کی قریب دیکھی گئی، جس کا طول ایک ذراع اور چوڑائی ایک بالشت تھی، اس کی ایک آنکھ اور آدھا سر تھا، جیسے ایک طرف سی کھائی ہوئی ہو اس میں کانٹے اور ہڈی بھی تھی، لوگ اس کو تبرکاً دور دور مقامات کو بھیجتے تھے، طبری کی کتاب میں نقل ہوا کہ اس کے کانٹے نہ تھے، اور ابوشجاع نے کہا کہ میں نے اس نسل کی بہت تلاش کی، اور دریائی سفر کرنے والوں اور عجائب عالم کی تلاش کرنے والوں سے بہت تحقیق کی تو کسی نے اس کو دیکھنے کا ذکر نہیں کیا، شاید وہ بعد کو معدوم ہوگئی ہو۔ واللہ علم (روح المعانی ص ۳۱۵/۱۵)

(۱۰) مجمع البحرین کہاں ہے؟

حافظ عینی نے لکھا کہ اس بارے میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ وہ مشرق کی طرف بحر روم وفارس کے ملنے کی جگہ ہے، بعض نے کہا

کہ طنجہ کا مقام ہے، بعض نے کہا کہ بحر افریقہ ہے، سہیلی نے کہا بحر اردن اور بحر قلزم کے ملنے کا مقام ہے، کسی نے کہا کہ بحر مغرب و بحر زقاق کا ملتقی ہے، (پھر حافظ عینی نے دنیا کے ان تمام سمندروں کی تعیین مقام کی ہے) (عمدۃ القاری ص ۱/۴۴۶)

(۲) صاحب روح المعانی نے لکھا کہ بحرین سے مراد بحر فارس و روم ہے، جیسا کہ حضرت مجاہد و قتادہ وغیرہ سے مروی ہے، ان کا ملتقی مشرق کی جانب سے مراد ہے اور شاید مراد وہ مقام ہے، جس میں ان دونوں کا التقاء قریب ہو جاتا ہے، کیونکہ ان کا حقیقی التقاء صرف بحر محیط میں ہے کہ یہ دونوں اس کی شاخ ہیں، ابوحیان نے کہا کہ مجمع البحرین وہ حصہ ہے جو شام سے متصل ہے، جیسا کہ ابن عطاء کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے ایک فرقہ نے کہا جن میں محمد بن کعب قرظی بھی ہیں کہ وہ طنجہ کے قریب ہے جہاں بحر محیط اور دوسرا دریا ملتے ہیں، ابی سے منقول ہے کہ وہ افریقہ میں ہے، سدی نے کہا کہ وہ دونوں بحر کر اور رس ہیں آرمینیہ میں، کسی نے بحر قلزم اور بحر ازرق بتلائے، کسی نے بحر ملح و بحر عذب (کڑوے اور میٹھے سمندر) قرار دیئے جن کا ملتقی مغرب کی سمت جزیرۂ خضراء میں ہے۔

بعض کی رائے یہ بھی ہے کہ بحرین کنایہ ہے حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام سے، کیونکہ وہ دونوں علم کے بحر و دریا ہیں اور مجمع البحرین ان دونوں کے ملنے کی جگہ ہے، علامہ آلوسی نے لکھا کہ یہ آخری قول صوفی منش حضرات کا ہے جس کی سیاق قرآنی سے کوئی تائید نہیں ملتی اور حتی ابلغ اس کے مناسب نہیں کیونکہ اس سے مقام وجگہ پر پہنچنا ہی سمجھ میں آتا ہے ورنہ حتی یجتمع البحران فرماتے، (روح المعانی ص ۱۵/۳۱۲)

حضرت شاہ صاحب کی رائے

آپ نے فرمایا کہ عام تفاسیر میں جو حضرت موسیٰ وخضر کے ملنے کی جگہ وہ مقام قرار دیا ہے جہاں دجلہ وفرات خلیج وفارس (عراق) میں گرتے ہیں، صحیح نہیں ہے اور صحیح یہ ہے کہ وہ دونوں ایلہ کے قریب ملے ہیں، جس کو آج کل عقبہ کہتے ہیں، (ایلہ خلیج عقبہ کے قریب ہے، اور رقیم شہر بھی اسی کے قریب تھا جس کا ذکر اصحاب کہف ورقیم کے سلسلہ میں آیا ہے) وہ شام کی غربی جانب میں ہے، بعض لوگوں نے اس ایلہ کو اُبُلَّہ لکھ دیا ہے وہ بھی غلط ہے کیونکہ وہ تو بصرہ کے قریب ایک گاؤں ہے، حضرت موسیٰ اس وقت جزیرہ سینا میں مقیم تھے، اور وہیں سے چل کر عبور بحر کے بعد حضرت خضرؑ سے ملے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی اس تشریح سے امام بخاری کا ذهاب موسیٰ فی البحر الی الخضر لکھنا بھی زیادہ صحیح ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کسی تاویل وتکلف کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ واللہ علم۔

ترجمان القرآن کا ذکر

ہم نے اس مقام میں بڑے اشتیاق کے ساتھ مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن جلد دوم دیکھی، کیونکہ مولانا نے تاریخی مقامات و واقعات پر اچھی توجہ کی ہے، اگرچہ بہت جگہ غلطی بھی کی ہے، جیسا حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے بھی قصص القرآن میں ان کی اغلاط کی نشاندہی کی ہے، مثلاً اصحاب کہف کے واقعہ کو جن آیات میں بیان کیا گیا ہے، ان کی تفسیر مولانا آزاد نے جمہور مفسرین کے خلاف کی ہے، جس کی رد میں مولانا حفظ الرحمٰن نے کافی لکھا اور دلائل کے ساتھ لکھا، پھر آخر میں یہ فیصلہ فرمایا:۔

"مگر اس پوری تفصیل کے مطالعہ سے بہ آسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آیات زیر بحث کی تفسیر میں مفسرین قدیم کو تو کوئی حیرانی پیش نہیں آئی، البتہ خود مولانائے موصوف کو اپنی اختیار کردہ تفسیر کی وضاحت میں ضرور تکلفات بارده اختیار کرنے پڑے ہیں اور سچ پوچھیے تو اس مقام پر ان کی تفسیر تاویل ہو کر رہ گئی ہے (قصص القرآن ص ۳/۲۵۹)

مسئلہ خروج یاجوج ماجوج کی تفصیل وتحقیق کرتے ہوئے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے لکھا۔

''اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں اور دوسرے بعض علماء نے کتب سیرت میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ سورہ انبیاء کی ان آیات کا مصداق، جن میں یاجوج ماجوج کے موعود خروج کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی **حتی اذا فتحت یاجوج ماجوج وھم من کل حدب ینسلون**، فتنہ تاتار کو بنا کر یہیں قصہ ختم کر دیں، اور اس بات کا امارت ساعت وعلامت قیامت سے کوئی تعلق باقی نہ رہنے دیں، مگر ہمارے نزدیک قرآن عزیز کا سیاق سباق ان کی اس تفسیر وتوجیہ کا قطعاً اباء اور انکار کرتا ہے۔ الخ قصص القرآن ۲۲۰ ج ۳ وغیرہ

یہاں عرض کرنا یہ تھا کہ مولانا آزاد نے نہ معلوم کن وجوہ سے حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعہ کی تفصیلات وتحقیق مقامات وغیرہا سے بالکلیہ کنارہ کشی اختیار کی، بلکہ صرف اتنا لکھا کہ اس بارے میں بہت سی روایتیں مفسرین نے نقل کر دی ہیں، جن کی صحت محل نظر ہے اور تصریحات متناقض اور زیادہ تر اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔'' (ترجمان القرآن ۳۶۶ ج ۲)

مولانا آزاد نے اسی مقام پر اصحاب کہف کے بارے میں اچھی تفصیل سے نوٹ لکھے، اور پھر ذوالقرنین کے سلسلہ خوب خوب داد تحقیق کی، لیکن درمیانی واقعہ ملاقات موسیٰ وخضر علیہما السلام کی تشریح وتحقیق کو نظر انداز کر دیا۔

آپ نے دیکھا کہ تمام کبار محدثین ومفسرین نے اس واقعہ کی تفصیل وتحقیق کے لیے کتنی کاوش کی ہے اور اس واقعہ کی علم وعمل کے لحاظ سے بھی کس قدر اہمیت ہے، اس بارے میں جو روایات اصحاب صحاح ستہ، حافظ ابن حجر، حافظ عینی، حافظ ابن کثیر، صاحب روح المعانی وغیرہم نے ذکر کی ہیں کیا وہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں؟ کیسی مغالطہ آمیز بات کہی گئی ہے اور پھر وہ بھی ایسے محل میں کہ جہاں حضرت ابن عباسؓ اور حر بن قیس نزاع ہی صرف اس لیے ہوا کہ توراۃ میں اس واقعہ کی تفصیلات نہیں تھیں، اور حر بن قیس کی غلط فہمی کا ازالہ بھی احادیث صحیحہ کی روشنی میں کیا گیا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ میں بہت سی باتیں بطور خرق عادت پیش آئی ہیں، اور ایسے مواقع میں مولانا آزاد صاحب جب ہی کچھ کہتے ہیں کہ وہ اپنے نزدیک ان کی کوئی معقول یا منقول توجیہ نکال سکیں اور یہاں ایسا نہ ہوسکا ہوگا، یا مستشرقین کی اس بارے میں تحقیقات عالیہ نہ ملی ہوگی اس لیے تحقیقی کلام کا موقع نہ پایا۔ واللہ اعلم بمراد عبادہ۔

(۱۲) شرف علم وجواز رکوب بحر

حافظ عینی نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے ترجمہ میں قولہ تعالیٰ ھل اتبعک الایۃ سے علم کے شرف وفضل کی طرف اشارہ کیا، اور بتلایا کہ طلب علم کے لیے بحری سفر اور اس کے خطرات ومصائب برداشت کرنا بھی درست ہے، بخلاف سفر بغرض طلب دنیا کے کہ اس کو علماء کی ایک جماعت نے مکروہ قرار دیا ہے نیز بتلایا کہ علماء کا اتباع تحصیل علوم کے لیے ضروری ہے جبکہ وہ علوم صرف ان ہی علماء کے پاس ہوں، اور دوسروں سے حاصل نہ ہوسکیں، جیسے موسیٰؑ نے ایک مخصوص علم کے لیے حضرت خضرؑ کا اتباع کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ملاقات سے قبل کہاں تھے؟

صاحب روح المعانی نے لکھا کہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ کی روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس وقت کہاں تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصر میں تھے، ابن جریر وابن ابی حاتم نے بطریق عوفی حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت اس کی نقل کی ہے لیکن ابن عطیہ نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کے علاوہ کہیں سے یہ بات نہیں ملتی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو مصر میں اتارا تھا، اور بظاہر یہ بات

صحیح بھی نہیں ہے بلکہ قوی طریقوں سے یہی ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات دیار جبارین کی فتح سے قبل ہی ارض تیہ میں ہوگئی تھی۔
علامہ آلوسی نے لکھا کہ میرے نزدیک بھی ابن عطیہ کی رائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ پھر مصر میں داخل نہیں ہوئے، زیادہ قوی ہے، اگرچہ اس پر خفاجی نے فیہ نظر کہہ کر نقد کیا ہے۔ (روح المعانی ص۳۱۳/۱۵)
پہلے ذکر ہوا کہ حضرت شاہ صاحب کی بھی وہی رائے ہے جو ابن عطیہ اور علامہ آلوسی کی ہے، واللہ علم

(۱۴) حضرت خضرؑ نبی ہیں یا نہیں

صاحب روح المعانی نے آیت آتیناہ رحمتہ من عندنا کے تحت لکھا کہ رحمت سے مراد بعض کے نزدیک حلال رزق اور تنعم کی زندگی ہے، بعض نے کہا کہ لوگوں سے یکسوئی اور ان سے بے غرضی و استغناء کہ یہ امور بھی خصوصیت سے اہل علم کے لئے نہایت گرانقدر نعمتیں ہیں کسی نے کہا کہ طویل زندگی مع عمدہ صحت وسلامتی اعضاء علامہ قشیری وغیرہ نے کہا کہ وہ ولی تھے نبی و رسول نہیں لیکن جمہور علماء امت کی رائے یہ ہے کہ رحمت سے مراد وحی و نبوت ہے اور اس پر رحمت کا اطلاق قرآن مجید میں دوسرے مواضع میں بھی ہوا ہے، ابن ابی حاتم نے حضرت عباس سے بھی اسی کو نقل کیا ہے۔
حضرت خضرؑ کو نبی ماننے والوں میں سے اکثر کی رائے یہ ہے کہ وہ نبی تھے رسول نہیں تھے۔ اور بعض نے کہا کہ وہ رسول بھی تھے، مذہب منصور جمہور ہی کا ہے اور اس سے دلائل و شواہد آیات و حدیث میں بہ کثرت موجود ہیں جن کے مجموعہ سے ان کی نبوت کا ثبوت قریب بدرجہ یقین ہو جاتا ہے۔ (روح المعانی ص۳۲۰ / ۱۵)
حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ "میرا گمان ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام پیغمبر ہی ہوں گے"

(۱۵) حضرت خضرؑ زندہ ہیں یا نہیں

حافظ ابن حجر نے لکھا: "ابن اصلاح نے کہا کہ جمور علماء کی رائے میں خضرت خضرؑ زندہ ہیں اور رائے عامہ بھی ان ہی کے ساتھ ہے، صرف بعض محدثین نے اس سے انکار کیا ہے، امام نووی نے بھی ابن صلاح کا اتباع کیا ہے، بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ حیات خضر کا مسئلہ صوفیاء واہل صلاح میں متفق علیھا ہے اور ان کے دیکھنے اور ملاقاتوں کے واقعات غیر محصور ہیں، جن حضرات نے ان کی موجودہ زندگی سے انکار کیا ہے، وہ امام بخاری، ابراہیم حربی، ابوجعفر بن المتاوی، ابویعلی بن الفراء، ابوطاہر العبادی، ابوبکر بن العربی وغیرہ ہیں، ان کا استدلال حدیث مشہور سے ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی آخری حیات میں فرمایا کہ اب سے ایک سو سال کے بعد کوئی بھی جو آج موجود ہے زندہ باقی نہ رہے گا۔
راوی حدیث حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا قرن ایک سو سال میں ختم ہو جائے گا، قائلین حیات نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حضور ﷺ کی مراد زمین پر رہنے والوں سے ہے اور حضرت خضر اس وقت بحر پر تھے، یا وہ اس سے مخصوص و مستثنیٰ ہیں، جیسے کہ ابلیس کہ وہ بالاتفاق مستثنیٰ ہے۔
دوسری دلیل آیت " وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد " ہے، تیسری دلیل حدیث ابن عباس ہے کہ ہر نبی سے عہد لیا جاتا تھا کہ اگر اس کی زندگی میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی تو وہ ان پر ایمان لائے گا اور مدد کرے گا (رواہ البخاری) اور کسی خبر صحیح سے ثابت نہیں ہوا کہ حضرت خضر آپ ﷺ کے پاس آئے ہوں اور آپ کے ساتھ ہو کر دشمنان اسلام سے قتال کیا ہو، چوتھی دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ

نے بدر کے موقع پر حق تعالیٰ سے عرض کیا'' اگر یہ جماعت فنا ہوگئی تو آپ کی عبادت روئے زمین پر نہ ہو سکے گی۔'' اگر حضرت خضر موجود ہوتے تو یہ عام ومطلق نفی صحیح نہ ہوتی، پانچویں دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم علیہ نے تمنا فرمائی، کاش حضرت موسیٰ صبر کرتے اور ہمیں مزید اسرار کونیہ کا علم ہو جاتا، پس اگر حضرت خضر موجود ہوتے تو آپ ان کو بلا کر بہت سی باتیں معلوم کر لیتے تمنا کی ضرورت نہ ہوتی، پھر ان کے عجائب وغرائب قصوں کے سبب بہت سے کثر قسم کے کافر ومشرک بھی خصوصاً اہل کتاب اسلام لے آتے، اور آپ علیہ کے ساتھ حضرت خضر علیہ السلام کے اجتماع کی حدیث ضعیف ہے، پھر حافظ نے وہ آثار وروایات ذکر کی ہیں، جن سے حیات خضر کا ثبوت ہوسکتا ہے، اور ان سب کی تضعیف کی ہے، بجز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اثر کے کہ آپ نے فرمایا خضرؑ مجھ سے ملے اور بشارت دی کہ میں والی بنوں گا اور عدل کروں گا '' حافظ نے لکھا کہ اس روایت کے رجال اچھے ہیں اور مجھے ابھی تک کوئی خبر یا اثر اس کے سوا سند جید کے ساتھ نہیں ملی، اور یہ اثر ایک سو سال والی حدیث کے معارض نہیں، کیونکہ یہ بات ایک سو سال کے اندر کی ہے۔ (فتح الباری ص ۶/۲۷۵)

حافظ عینی نے لکھا:۔ جمہور خصوصاً مشائخ طریقت وحقیقت اور ارباب مجاہدات ومکاشفات کی رائے یہی ہے کہ حضرت خضرؑ زندہ ہیں، ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں، اور ان کو صحراؤں میں دیکھا گیا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز، ابراہیم بن ادھم، بشر حافی، معروف کرخی، سری سقطی، جنید، ابراہیم خواص وغیرہم نے ان کو دیکھا ہے، اور بہت سے دلائل وحجج ان کی زندگی پر شاہد ہیں، جن کو ہم نے اپنی'' تاریخ کبیر'' میں ذکر کیا ہے۔

امام بخاری، ابن حربی، ابن جوزی، ابوالحسین مناوی کی رائے ہے کہ وہ مر چکے، ان کا استدلال آیت'' **وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد** '' اور حدیث ایک سو سال پر قرن ختم ہونے سے ہے، جمہور نے آیت کا یہ جواب دیا کہ ہم بھی حضرت خضرؑ کے لئے دائمی حیات نہیں مانتے، کہ خلود لازم آئے، صرف یہ کہتے ہیں کہ وہ ختم دنیا تک رہیں گے اور نفخ صور قیامت پر وفات پا جائیں گے، حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس کا ظاہر مراد نہیں ہے، کیونکہ بہت سے صحابہ کا انتقال ایک سو سال کے بعد ہوا ہے، حکیم بن حزام کی عمر ایک سو بیس سال ہوئی اور سلیمان فارسی کی تو تین سو سال تک کہی گئی ہے، بعض نے جواب دیا کہ اس وقت حضرت خضر بحر کے علاقہ میں تھے زمین پر نہ تھے، بعض نے کہا کہ وہ مستثنیٰ ہیں جیسے ابلیس مستثنیٰ ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۱۵/۳۰۰ طبع منیریہ)

صاحب روح المعانی نے اس مسئلہ پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے اور طرفین کی دلائل وجوابات جمع کئے ہیں اور حافظ ابن تیمیہ کو بھی منکرین حیات میں لکھا، نقل کیا کہ ان سے پوچھا گیا تو فرمایا:۔ اگر خضر زندہ ہوتے تو ضروری تھا کہ حضور علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے، آپ سے استفادہ کرتے اور آپ علیہ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے، اور حضور علیہ کے ساتھ غزوہ بدر کے موقع پر ۳۱۳ نفر تھے۔ جن کے نام ونسب سب ذکر کئے گئے ہیں، اس وقت حضرت خضرؑ کہاں تھے؟

علامہ آلوسی نے اور جوابات کے ساتھ حافظ موصوف کے استدلال کے بھی جوابات نقل کئے ہیں مثلاً لکھا کہ حضور علیہ کی خدمت میں واجب وضروری طور پر آنے کا حکم صحیح نہیں کیونکہ بہت سے مومن حضور اکرم علیہ کے زمانہ میں تھے جو آپ علیہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے، نہ آپ علیہ سے براہ راست استفادہ کیا، اور نہ آپ علیہ کے ساتھ جہاد میں شرکت کی، مثلاً خیر التابعین حضرت اویس قرنیؒ یا نجاشیؒ وغیرہ۔

دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت خضرؑ آپ علیہ کے پاس خفیہ طور سے آتے ہوں، اور ان کو کسی حکمت ومصلحت کے تحت حکم خداوندی ملا ہو کہ علانیہ نہ آئیں اور شرکت جہاد کی تو روایت بھی موجود ہے (علامہ آلوسی نے اس کو ذکر بھی کیا ہے)

غزوہ بدر والی دلیل کا یہ جواب دیا گیا کہ حضور علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ غلبہ وظہور کے ساتھ عبادت نہ ہو سکے گی، یہ مطلب نہیں تھا کہ بالکل ہی کوئی عبادت کرنے والا باقی نہ رہے گا، کیونکہ ظاہر ہے بہت سے مسلمان مدینہ طیبہ میں بھی اس وقت موجود تھے، جو غزوہ بدر میں اس وقت شریک نہیں ہوئے، دوسرے یہ کہ عدم ذکر سے ذکر عدم لازم نہیں آتا، لیلۃ المعراج میں حضور علیہ السلام کی اقتداء تمام انبیاء نے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت خضرؑ کے وہاں حاضر نہ ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہوسکتی مگر وہاں بھی ان کی موجودگی کا ذکر کہیں نہیں آیا تو کیا یہ انصاف کی بات ہوگی کہ وہاں بھی ان کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔

خلود والی آیت کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ قائلین حیات بھی حضرت خضرؑ کے لئے خلود نہیں مانتی، بعض کی رائے ہے کہ وہ قتال دجال کے بعد وفات پا جائیں گے، بعض نے کہا کہ رفع قرآن کے زمانہ میں انتقال فرمائیں گے، بعض نے کہا کہ آخر زمانہ میں وفات ہوگی۔

(روح المعانی ص ۳۲۳ /۱۵)

اگرچہ علامہ آلوسی کا خود اپنا رجحان عدم حیات ہی کی طرف ہے مگر انہوں نے دلائل طرفین کے خوب تفصیل سے لکھے ہیں واللہ علم بالصواب، کسی دوسری فرصت میں اس مسئلہ کی مزید تحقیق کی جائے گی، انشاء اللہ تعالےٰ

(۱۶) ان شاء اللہ کہنے کا طریقہ:

حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ان شاء اللہ کہنے کا ادب وطریقۂ مرضیہ یہ ہے کہ کلام کے آخر میں کہا جائے، شروع یا درمیان میں نہیں، حضرتؒ کے ارشاد کی تائید کتب تفسیر وغیرہ میں بھی کئی جگہ نظر سے گزری ہے، مثلاً قاضی ابوبکر بن العربی نے احکام القرآن ص ۲/۵۴ میں آیت "ستجدنی ان شاء اللہ صابر او لااعصی لک امرا" کے تحت لکھا کہ ہمارے علماء نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ نے صبر کے بارے میں انشاء اللہ کہا تھا، اس میں پورے اترے، خدا نے مدد فرمائی، اور امتثال امر کے لئے انشاء اللہ نہیں کہا تھا تو وہ نہ کر سکے، چنانچہ جب حضرت خضرؑ نے خرق سفینہ کیا، یا قتل وغیرہ کا ارتکاب کیا تو صابر رہے، ضبط کیا، ورنہ حضرت خضرؑ کا ہاتھ پکڑ لیتے، وہ کام کرنے ہی نہ دیتے جو ان کی نظر میں شریعت ظاہرہ کے تحت خلاف تھا، آگے امتثال میں کامیاب نہ ہوئے کہ اعتراض کر بیٹھے اور سوال بھی کیا۔ واللہ علم۔

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ

(اے اللہ! اسے علم کتاب عطا فرمادے)

(۷۵) حَدَّثَنَا اَبُوْمَعْمَرٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُالْوَارِثِ قَالَ ثَنَا خَالِدٌ عَنْ عِكْرَمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ ضَمَّنِیْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ اللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ علیہ السلام نے مجھے سینہ سے لپٹالیا اور فرمایا کہ "اے اللہ! اسے علم کتاب (قرآن) عطا فرما"

تشریح: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:۔ رسول اکرم علیہ السلام نے مجھے اپنے سینہ مبارک سے لگا کر دعا دی کہ اس کو کتاب کا علم عطا فرمادے! یہ سینہ سے لگانا بظاہر اسی طرح ہے جس طرح حضرت جبرائیلؑ نے آنحضرت علیہ السلام کو اپنے سینہ سے لگا کر افاضہ علوم کیا تھا...... فرق اتنا ہے کہ وہاں خوب دبانے اور بھینچنے کا ذکر بھی آیا ہے، یہاں نہیں، اور سینہ سے لگانے کا اگرچہ یہاں ذکر نہیں، مگر حافظ عینی نے لکھا کہ دوسری روایت

مسدد عن عبدالوارث میں اس کی تصریح موجود ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کے لئے حضور اکرم ﷺ کی خصوصی شفقت اور دعا فرمانے کا حافظ عینی و حافظ ابن حجر وغیرہ نے یہ لکھا ہے کہ بخاری ومسلم وغیرہ کی روایت میں ہے، خود حضرت ابن عباسؓ نے بیان کیا، حضور اکرم ﷺ قضائے حاجات کے لئے تشریف لے گئے تھے، میں نے آپ ﷺ کے لئے وضو کا پانی رکھ دیا، آپ ﷺ واپس تشریف لائے پانی رکھا ہوا دیکھا، دریافت فرمایا کس نے رکھا ہے؟ کہا گیا ابن عباس نے، آپ ﷺ نے میرے لئے دعا فرمائی، غالباً یہ دعا خوش ہو کر اور حضرت ابن عباسؓ کی خدمت اور صحیح سمجھ وفہم سے متاثر ہو کر فرمائی، ایک روایت میں ہے کہ حضرت کے سوال پر حضرت میمونہؓ نے بتلایا کہ ابن عباس نے پانی رکھا ہے ممکن ہے کہ یہ اسی واقعہ کا جز ہو جس میں آتا ہے کہ ابن عباسؓ اپنی خالہ حضرت میمونہؓ کے پاس رہے تاکہ آنحضرت ﷺ کی رات کی نماز ومعمولات کا مشاہدہ کریں، اس میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز تہجد پڑھی تو حضرت ابن عباسؓ بھی مقتدی بن کر پیچھے کھڑے ہو گئے، آپ ﷺ نے ان کو داہنی طرف برابر کھڑا کر دیا تو پھر پیچھے ہو گئے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہے، میں تمہیں برابر کھڑا کرتا ہوں مگر تم پیچھے چلے جاتے ہو؟

ابن عباسؓ نے عرض کیا حضور! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص آپ ﷺ کے برابر کھڑا ہو، جبکہ آپ ﷺ خدا کے رسول ہیں، ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ سن کر میرے لئے علم وفہم کی زیادتی کے لئے دعا فرمائی۔

معلوم ہوا کہ استاد ومعلم کا ادب واحترام ضروری ہے، اور اس کے سامنے علم وفہم کی باتیں خوب خیال ودھیان رکھ کر کرنی چاہئیں تاکہ وہ خوش ہو کر دعا دے، اور علم وفہم میں ترقی کا ذریعہ جہاں اپنی کوشش وسعی اور تحصیل علم کی راہ ہیں، ہر پریشانی ومصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنا ہے، اسی طرح اساتذہ وبزرگوں کی دعائیں اور خصوصی توجہات بھی ہیں، جن کے سبب حق تعالیٰ کی خصوصی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔

بحث ونظر: ترجمۃ الباب میں علمہ کی ضمیر کا مرجع مذکور نہیں ہے، اس کے متعلق حافظ ابن حجر نے لکھا کہ شاید امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ دعا دوسروں کے لئے بھی جائز ہو سکتی ہے، لہٰذا مرجع غیر مذکور ہوگا۔

دوسری صورت یہ کہ مرجع حضرت ابن عباسؓ ہیں جن کا ذکر سابق باب کی حدیث میں حر بن قیس سے اختلاف کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

حافظ ابن حجر نے یہ بھی لکھا کہ اس صورت میں اس امر کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کو حر بن قیس کے مقابلہ میں کامیابی وغلبہ حضور ﷺ کی دعا ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔

ہمارے نزدیک اس قسم کا دعویٰ بغیر دلیل وثبوت مناسب نہیں، اور ایضاح البخاری کا یہ حوالہ درست نہیں کہ حافظ عینی نے بھی قریب قریب یہی فرمایا ہے اور جس عبارت سے ایسا سمجھا گیا ہے اس میں غلط فہمی ہوئی ہے۔

ہماری عرض یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جن حضرات کے لئے دعائیں کیں، یا کلمات مدح فرمائیں ہیں، ان کو سند بنا کر ان اشخاص کے ہر ہر قول وعمل کی توثیق وتصویب نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ یہ کہ مناسب بھی نہیں۔ اہل علم اس اصولی نکتہ کی قدر وقیمت سمجھ سکتے ہیں۔

کتاب سے کیا مراد ہے؟

حافظ عینی نے لکھا کہ قرآن مجید ہے کیونکہ جنس مطلق کا اطلاق فرد کامل پر ہوا کرتا ہے، اور عرف شرعی بھی یہی ہے، مسدد کی روایت میں کتاب کی جگہ حکمت کا لفظ ہے تو اس سے بھی قرآن مجید مراد ہو سکتا ہے کیونکہ حکمت سے مراد سنت اور کتاب اللہ دونوں ہوتے ہیں، کتاب اس لئے کہ اس میں بندوں کے لئے حلال وحرام، امر ونہی کو محکم طریقہ پر بیان کیا گیا ہے، اور سنت اس لئے کہ وہ بھی سرتاسر حکمت ہے، جس کے

ذریعہ حق و باطل کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

فوائد مہمہ: حافظ عینی نے حدیث الباب سے مندرجہ ذیل امور کا استنباط کیا

(۱) حضور اکرم ﷺ کی دعا کی برکت و اجابت

(۲) علم کی فضیلت، تحصیل علم و حفظ قرآن مجید کی ترغیب اور اس کی دعاء دینے کا استحسان

(۳) بچہ کو سینہ سے ملانے کا استحباب، جس طرح حضور اکرم ﷺ نے کیا، اس کے علاوہ نو وارد مہمان سے بھی معانقہ مستحب ہے، ان دونوں کے علاوہ بغوی کے نزدیک تو مکروہ ہے، مگر مختار جواز ہے، بشرطیکہ تحریک شہوت کی صورت نہ ہو۔ یہی مذہب امام اعظم اور امام شافعی کا ہے۔ امام ابومنصور ماتریدی نے بھی کہا کہ مکروہ وہ معانقہ وہ ہے جو بطریق شہوت ہو، اور جو نیکی و اکرام کے خیال سے ہو وہ جائز ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۴۵۶/۱)

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ کے اس واقعہ میں جو پانی حضور اکرم ﷺ کے لئے رکھا گیا تھا، وہ وضو کے لئے تھا جیسا کہ ہم نے لکھا ہے، ایضاح البخاری میں اس کو استنجا کے لئے قرار دے کر تین صورتیں بتلائیں گئیں، بیت الخلاء کے اندر پانی پہنچانا، بیت الخلاء کے باہر پانی رکھنا وغیرہ، ان صورتوں کا واقعہ سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوا، البتہ حضرت انسؓ خادم خاص رسول اللہ ﷺ کے واقعات میں ضرور یہ ملتا ہے کہ میں اور ایک دوسرا لڑکا حضور ﷺ کے استنجا کے لئے پانی لے کر جایا کرتے تھے، اور حضرت ابوہریرہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ میں ایک کروہ استنجا کے لئے آپ ﷺ کے پاس لے جاتا تھا، پھر دوسرا وضو کے لئے پیش کرتا تھا۔ واللہ علم۔

بَابٌ مَتىٰ يَصِحُّ سَمَاعُ الصَّغِيرِ

(بچے کا حدیث سننا کس عمر میں صحیح ہے؟)

(۷۶) حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ قَالَ حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللهِ ابْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ عُتْبَةَ عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلٰى حِمَارٍ اَتَانٍ وَاَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الْاِحْتِلَامَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ بِمِنًى اِلٰى غَيْرِ جِدَارٍ فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيْ بَعْضِ الصَّفِّ وَاَرْسَلْتُ الْاَتَانَ تَرْتَعُ وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ وَلَمْ يُنْكَرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ گدھی پر سوار ہو کر چلا اس زمانے میں بلوغ کے قریب تھا رسول اللہ ﷺ منیٰ میں نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سامنے دیواروں کی آڑ نہ تھی تو میں بعض صفوں کے سامنے سے گزرا اور گدھی کو چھوڑ دیا، وہ چرنے لگی میں صف میں شریک ہو گیا مگر کسی نے مجھ پر اعتراض نہیں کیا یا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔

تشریح: گذشتہ باب میں معلوم ہوا تھا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بچپن میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعائیں حاصل کیں اور بڑے ہو کر ان واقعات کو نقل کیا اسی طرح اس حدیث الباب میں بھی بلوغ سے قبل کی روایت بیان کی اور اس کو سب نے معتبر سمجھا، اس سے اور ان کی دوسری روایت سے مسائل استخراج کئے گئے، اور ان کے مطابق عمل درآمد ہوا اور ہوتا رہے گا، اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ تحمل کے وقت بلوغ کی قید نہیں، جو ادائے حدیث کے وقت سب محدثین کے نزدیک بالاتفاق ضروری ہے۔

اس کے بعد اس امر میں محدثین کی رائے مختلف ہیں کہ تحمل کے وقت کم سے کم عمر کتنی ہونی چاہیے، حضرت یحییٰ بن معین ۱۵ سال بتلاتے تھے، بعض نے نو سال کسی نے پانچ سال قرار دی۔ حافظ حدیث موسیٰ بن ہارون نے کہا کہ جب گائے اور دوسرے چوپایوں میں تمیز کرسکے قابل تحمل ہے، امام احمد نے فرمایا کہ جب بات سمجھنے اور ضبط کرنے لگے تو قابل تحمل ہوگیا، قاضی عیاض نے محمود بن الربیع کی عمر کو کم سے کم تحمل کی عمر لکھا جن کا واقعہ اگلی حدیث بخاری میں آرہا ہے، ان کی عمر ایک روایت سے پانچ سال اور دوسری روایت سے چار سال ثابت ہوتی ہے، ابن صلاح نے لکھا کہ پانچ سال کی عمر پر محدثین ومتاخرین کی رائے ٹھہر گئی، اس لئے وہ پانچ سال یا زیادہ عمر والے کے لئے سمع کا لفظ لکھتے ہیں، اور کم کے لئے حضر یا احضر لکھتے ہیں، اور پکی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں اعتبار تمیز کا ہونا چاہیے، اگر خطاب وجواب کی سمجھ رکھتا ہے تو ممیّز یا صحیح السماع ہے، اگر پانچ سال سے بھی کم عمر کا ہو اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا سماع قابل قبول نہیں ہوگا، خواہ پچاس سال کا بھی ہو، دوسرے یہ کہ تحدید عمر اس لئے بھی درست نہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت ابن عباسؓ، حضرت زبیرؓ، نعمان بن بشیرؓ، انسؓ وغیرہ، چھوٹی عمر کے صحابہ کی روایات کو بلا کسی پس وپیش، تردد یا تحقیق عمر کے قبول کیا ہے، امام بخاری بھی تحدید کو پسند نہیں کرتے بلکہ عقل وسمجھ کو مدار بنا رہے ہیں، پس اگر تحمل روایت کے وقت آنحضرت ﷺ کے قول وفعل کو اچھی طرح سمجھ کر اداء کے وقت تک یاد رکھتا ہے تو اس کی روایت ضرور قبول ہونی چاہیے۔ جیسے حضرت ابن عباسؓ کی روایت مذکورہ کو قبول کر کے اس سے سترہ کے بہت سے مسائل اخذ کئے گئے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ ۱۰ھ کا حجۃ الوداع کا ہے کہ منیٰ کے مقام پر حضور اکرم ﷺ جماعت کے ساتھ نماز پڑھا رہے تھے، یہ اپنی گدھیا پر سوار آتے ہیں، سب صفوں کے سامنے سے گزر کے ایک صف میں شریک ہو جاتے ہیں، گدھیا کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں، نماز کے بعد کوئی بھی ان کی کسی حرکت پر اعتراض نہیں کرتا، معلوم ہوا کہ جنگل میں دیوار کے علاوہ کسی چیز کا سترہ امام کے سامنے ہو تو وہ بھی کافی ہے اور صرف امام کے سامنے سترہ ہونا چاہیے، گدھیا کی سواری جائز ہے، اور اس پر سوار ہو کر امام کے سامنے سترہ ہو تو نمازیوں کے سامنے سے گزرنا بھی جائز ہے، اس سے کسی کی نماز خراب نہیں ہوتی وغیرہ۔

ابراہیم بن سعد الجوہری کہتے ہیں کہ میں نے ایک بچہ چار سال کا دیکھا، جو خلیفہ مامون رشید عباسی کے دربار میں لایا گیا، وہ تمام قرآن مجید بے تکلف پڑھ دیتا تھا، اس نے سب کو سنایا، مگر جب بھوک لگتی تو رونے لگتا اور کہتا تھا کہ مجھے بھوک لگی ہے اور ابو محمد عبداللہ بن محمد اصبہانی نے پانچ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔

ابوبکر مقری نے اس کا امتحان لیا اور چار سال میں اس کو سماع کے قابل ہونے سے سند دے دی، لہٰذا محمود بن الربیع والی حدیث سے عمر کی تحدید نہیں ہوسکتی کہ اس سے کم عمر والے کو قابل تحمل نہ سمجھا جائے یہ سب تفصیل علامہ عینی نے عمدۃ القاری ص ۵۵۶ /۱ میں بیان کی ہے۔

محترم حضرت شاہ صاحب کے ارشادات گرامی

فرمایا کہ علماء کے بکثرت واقعات بچپن کے حفظ وفہم کے مشہور ہیں، جو ان کے غیر معمولی حفظ وضبط پر دلالت کرتے ہیں، پھر آپ نے چند واقعات سنا کر فرمایا کہ مجھے بھی اپنی دو سال کی زندگی کے متعدد واقعات اس طرح یاد ہیں، جیسے آج پیش آئے ہوں، مثلاً ایک روز میری والدہ صاحبہ نے کہا ''گائے بیٹھ گئی ہے'' (یعنی دودھ نہیں دیتی) کشمیر میں یہ محاورہ دودھ سے بھاگ جانے کے لئے ہے میں نے کہا ''چلو اماں! میں اٹھا دوں'' اسی زمانے میں ایک فقیر سے گفتگو ہوئی، وہ بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

غیر کا استعمال: الی غیر جدار کے لفظ پر ترجمہ رکھنے میں امام بخاری اور بیہقی نے جدا جدا طریقہ رکھا۔ امام بخاری نے تو اس سے

سترہ ثابت کیا، جیسا کہ سترہ کے باب میں آئے گا۔ اور امام بیہقی نے نفی سترہ کا عنوان قائم کیا۔

اس اختلاف کی بنیاد غیر کے معانی میں غور کرنے کے بعد سمجھ میں آسکتی ہے، علامہ محقق حافظ عینی نے فرمایا غیر لغت عربیہ میں کبھی تو نعت وصفت کے لئے ہوتا ہے، اس وقت اس کے لئے منعوت کو مقدر مانتی ہے، پس جب الی غیر جدار کی تقدیر الی شئی غیر جدار ہوگی، جیسے علی درہم غیر دانق میں اور مقصود یہ بتلانا ہے کہ بعد کی چیز پہلی چیز سے مغائر اور الگ ہے، غیر کا دوسرا استعمال بطور استثنا ہوتا ہے جیسے جاء نی القوم غیر زید میں، اس میں مغایرت کو بتلانا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ مابعد کو ماقبل کے حکم سے خارج کرنا ہوتا ہے، زید کا قوم کے ساتھ نہ آنا بتلایا جارہا ہے، خواہ وہ فی الواقع قوم سے الگ اور غیر بھی ہو یا نہ ہو، اس سے تعرض نہیں کیا جاتا۔ اور اگر جاء نی رجل غیرک کہیں گے تو مقصد بیان مغائرت ہوگا، یعنی جو شخص میرے پاس آیا تھا، وہ تم نہیں تھے بلکہ دوسرا آدمی تھا۔

لو کان فیھما آلھۃ کا مقصد:

اسی لئے کلمہ الاَّ کو ''لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا ''میں بمعنی غیر کہا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ جل ذکرہ نہ ہوتے تو خواہ ان کے علاوہ کوئی ایک خدا ہوتا یا ایک ہزار، ہر صورت میں زمین وآسمان اس طرح باقی نہ رہتے، وہی حق تعالیٰ ان کو اپنی عظیم قدرت ومشیت کے تحت ٹوٹ پھوٹ اور فساد سے روکے ہوئے ہے، جن لوگوں نے اس معنی سے غفلت کی وہ یہی سمجھتے رہے کہ آیت مذکورہ بالا میں صرف تعداد آلھہ کا ابطال مقصود ہے۔

غرض تحقیقی بات یہی ہے کہ آیت کا مقصد بہ تقدیر فرض وجود غیر باری تعالیٰ فساد عالمین کا بیان ہے کہ خدا کے سوا بالفرض کوئی ایک بھی خدا ہوتا تو فساد ضروری تھا، چہ جائیکہ بہت سے ہوتے۔

امام بخاری وامام شافعی کا اختلاف

اس تفصیل کے بعد سمجھنا چاہیے کہ امام بخاریؒ نے یہاں غیر کو نعت کے لئے لیا ہے، یعنی حضور اکرم ﷺ اس وقت منی میں دیوار کے سوا دوسری کسی چیز کو سترہ بنا کر نماز پڑھا رہے تھے، لہٰذا سترہ ثابت ہوگیا۔

امام شافعی وبیہقی نے سمجھا کہ یہاں غیر بمعنی نفی محض ہے، یعنی حضور ﷺ اس طرح نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ ﷺ کے سامنے دیوار وغیرہ کوئی چیز نہ تھی، اسی طرح سترہ کی بالکل نفی ہوگئی، پھر اگرچہ یہ بھی تسلیم ہے کہ حسب تصریح علامہ تفتازانی لفظ غیر کا استعمال بھی بعض اوقات نفی محض کے لئے ہوتا ہے، خصوصاً جبکہ اس سے پہلے حرف جار من، الی وغیرہ ہوں اور اس قاعدہ سے امام بیہقی کی توجیہ یہاں چل سکتی ہے۔ مگر اس مقام میں یہاں اس طرح معارضہ ہوگا کہ اگر اس موقع پر کوئی سترہ تھا ہی نہیں نہ دیوار تھی نہ دوسری کوئی چیز تو پھر توالی غیر شیء کہنا چاہیے تھا، الی غیر جدار کی کیا ضرورت تھی، جدار کا ذکر لغو محض ہوا۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ رائے بہرحال امام بخاری ہی کی صحیح ہے نہ کہ امام بیہقی کی۔

''فارسلت الاتان ''پر فرمایا کہ بعض طرق میں یہ بھی ذکر ہے کہ صفوں کے سامنے سوار ہوکر گزرے پھر بعض شروح میں یہ بھی مسئلہ دیکھا کہ کوئی شخص امام کے سامنے سے پیدل گزرے تو گنہگار ہوگا، سوار ہو تو نہیں مگر یہ مسئلہ ہمارے حنفی مذہب کے لحاظ سے صحیح نہیں۔ کیونکہ ہمارے یہاں اعتبار محاذاۃ کا ہے، اگر گزرنے والے کے اعضاء کا کچھ حصہ بھی، نماز پڑھنے والے کے کسی عضو کی محاذاۃ میں سے گذر گیا تو گناہ گار ہوگا اس میں رکوب وغیر رکوب کی تفصیل نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ امام مالک کے نزدیک سترہ آگے کی چیز ہے اسی لئے امام کے لئے تو لکڑی، نیزہ، دیوار وغیرہ جو اس کے سامنے ہوگی وہ اس کا سترہ ہے، اور قوم کے آگے چونکہ امام ہے، اسی لئے وہ خود قوم کے لئے سترہ بنے گا، اسی لئے اگر کوئی شخص امام اور سترہ کے درمیان سے گزرے تو اس کو مالکیہ کے مسلک پر صرف امام کے سامنے سے گزرنے کا گناہ ہوگا، قوم کے سامنے سے گزرنے کا نہ ہوگا، کیونکہ قوم کا سترہ امام ہے، لیکن حنفیہ کے یہاں امام کا سترہ[1] ہی قوم کا بھی سترہ ہے اور خود امام قوم کے لئے سترہ نہیں ہے، اس لئے سترہ کے اندر جہاں سے بھی گزرے گا، سب کے سامنے سے گزرنے کا گناہ ہوگا

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جو رائے یہاں امام بیہقی کی ذکر ہوئی، وہ امام شافعیؒ سے منقول ہے جیسا کہ حافظ نے تصریح کی، اور لکھا کہ سیاق کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس لئے کہ ابن عباسؓ اس کو اس امر پر استدلال کرنے کے لئے لائے ہیں کہ نمازی کے سامنے گزرنے سے اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔

سترہ اور مذاہب اربعہ: شوافع کا مسلک سترہ کے باب میں یہ ہے کہ نمازی کے قدم سے تین ہاتھ کے اندر گزرنا حرام ہے (خواہ سترہ ہو یا نہ ہو)، اس سے زیادہ فاصلہ سے گزر سکتا ہے حنابلہ کہتے ہیں اگر نمازی نے سترہ قائم کیا تو اس کے اندر سے گزرنا حرام ہے، خواہ وہ سترہ نمازی سے کتنے ہی فاصلے پر ہو اور اگر سترہ نہیں قائم کیا تو قدم مصلی سے تین ہاتھ کے اندر نہ گزرے۔

مالکیہ کا مسلک یہ ہے کہ نمازی سترہ بنائے تو اس کے اندر سے گزرنا حرام ہے،، ورنہ صرف رکوع وسجود کی جگہ سے گزرنا حرام ہے آگے سے نہیں۔

حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر بڑی مسجد یا جنگل میں نماز پڑھ رہا ہے تو اس کے موضع قدم سے موضع سجود کے اندر سے گزرنا حرام ہے اگر چھوٹی مسجد میں ہے تو موضع قدمین سے دیوار قبلہ تک گزرنا حرام ہوگا، چھوٹی مسجد کا اندازہ چالیس ہاتھ کیا گیا ہے۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ص ۱/۱۹۳)

(۷۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ مُسْهِرٍ قَالَ حَدَّثَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنِي الزُّبَيْدِيُّ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ قَالَ عَقَلْتُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَجَّةً مَجَّهَا فِيْ وَجْهِيْ وَاَنَا ابْنُ خَمْسِ سِنِيْنَ مِنْ دَلْوٍ.

ترجمہ: حضرت محمود بن الربیع نے فرمایا کہ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ڈول سے منہ میں پانی لے کر میرے چہرہ میں کلی فرمائی، اور اسوقت میں پانچ سال کا تھا۔

تشریح: حافظ عینیؒ نے لکھا کہ حدیث الباب سے بہت سے فوائد واحکام حاصل ہوئے:۔

(۱) حضور اکرم ﷺ کی برکت کا ثبوت، جیسے کہ احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ بچوں کی تحنیک کرتے تھے (یعنی کھجور اپنے دہن مبارک میں چبا کر نرم فرما کر بچہ کے منہ میں ڈالتے اور انگلی سے ہلا دیتے تھے کہ حلق میں اتر جائے) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین برکت کے خیال سے اپنے بچوں کو حضور ﷺ کے پاس حاضر کرتے اور تحنیک کراتے، اس کے لئے ایک دوسرے کو ترغیب دیتے تھے،

---

[1] علامہ عینی نے لکھا کہ ابن بطال اور ابو عمرو والقاضی عیاض نے کہا کہ حدیث الباب میں اس امر کی دلیل ہے کہ امام کا سترہ مقتدیوں کے لئے کافی ہے۔ اور ایسا ہی بخاری نے بھی باب باندھا ہے اور ابن بطال وقاضی عیاض نے اس امر پر اجماع بھی نقل کیا ہے (عمدۃ القاری ۴۵۹ ج ۱)

کیونکہ وہ آپ ﷺ کی برکات دوسری محسوسات میں بھی مشاہدہ کرتے رہتے تھے۔

(۲) اس سے بچہ کا حضور ﷺ کے قول وفعل کوسننا دیکھنا اور اس کو یادرکھ کر دوسروں کو پہنچانے کا بھی ثبوت ہوا۔

(۳) تیمی نے کہا کہ اس سے بچوں کے ساتھ خوش طبعی کرنے کا بھی جواز نکلا، کیونکہ حضور ﷺ نے بطور خوش طبعی محمود بن ربیع کے منہ پر کلی ماری تھی۔ (عمدۃ القاری ص ۱/۴۶۱)

بحث ونظر: حافظ عینیؒ نے لکھا: مہلب بن ابی صفرہ نے امام بخاریؒ پر اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے محمود بن ربیع کی روایت تو یہاں ذکر کی، اور عبداللہ بن زبیر ؓ والی روایت ذکر نہ کی، حالانکہ وہ ان کی تین یا چار سال کی عمر کی روایت ہے تو وہ محمود سے چھوٹے تھے، پھر یہ کہ محمود نے کوئی چیز حضور ﷺ سے سن کر روایت بھی نہیں کی صرف کلی کا ذکر کیا ہے اور عبداللہ زبیر نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اپنے والد حضرت زبیر ؓ کو دیکھا تھا کہ غزوہ خندق کے دنوں میں وہ بنی قریظہ کی طرف آتے جاتے اور ان کی خبریں لاتے تھے اس روایت میں سماع بھی موجود ہے، اس لئے اس کا ذکر اس مقام کے لئے زیادہ موزوں تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امام بخاریؒ کا مقصد سنن نبویہ کو نقل کرنا ہے، دوسرے احوال وواقعات کا ذکر مقصود نہیں ہے، محمود نے وہ بات نقل کی جس سے حضور ﷺ کی سنت اور اس کی برکت ثابت ہوئی بلکہ حضور ﷺ کا دیدار مبارک ہی بڑی نعمت و برکت تھا، جس سے صحابیت کا ثبوت ہو جاتا ہے، ان کی روایت سے تینوں چیزیں معلوم ہوئیں جبکہ حضرت ابن زبیر ؓ کی روایت سے حضور ﷺ کی کوئی سنت بھی حاصل نہ ہوسکتی۔ (یہ جواب ابن منیر کا ہے)

حافظ عینی نے لکھا کہ اعتراض مذکور کے جواب میں بدرزرکشی کی یہ تنقیح کارآمد نہیں ہوسکتی کہ پہلے مہلب یہ تو ثابت کریں کہ روایت ابن زبیر امام بخاریؒ کی شرط پر پوری اترتی بھی ہے اگر نہیں تو اعتراض ہی بے محل ہے، کیونکہ حضرت ابن زبیر ؓ کی مذکورہ بالا روایت کو خود امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں ''مناقب زبیر'' میں ذکر کیا ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۱/۴۶۲)

حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں بدرزرکشی کی تنقیح مذکور کو ان کی غفلت قرار دیا اور پھر یہ بھی لکھا کہ ''عجیب بات ہے کہ لوگ کسی کتاب پر نقد وکلام کرتے ہیں اور پھر بھی اس کے کھلے واضح مقامات سے غافل ہوتے ہیں، اور ان کو معدوم فرض کر کے اعتراض کر دیتے ہیں۔''

(فتح الباری ص ۱/۱۲۷)

ایک اہم تاریخی فائدہ:

حضرت عبداللہ بن زبیر کے جس واقعہ کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہ بخاری وشرح بخاری میں اس طرح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے غزوہ احزاب یا غزوہ خندق (دونوں ایک ہی ہیں) کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا، کون بنی قریظہ میں جا کر ان کی خبر میرے پاس لائے گا؟ حضرت زبیر ؓ فرماتے ہیں کہ میں وہاں گیا اور حالات معلوم کر کے آیا آپ ﷺ کو مطلع کیا تو حضور ﷺ نے میرے لئے اپنے والدین کو جمع کیا، یعنی فداک ابی وامی فرمایا، ظاہر ہے کہ یہ نہایت ہی بڑی منقبت ہے جو حضرت زبیر ؓ کو حاصل ہوئی، اور یہ صرف اس لئے حاصل ہوئی کہ وہ بڑے مستعدی، بے جگری، جراءت وہوشیاری سے وہاں گئے اور روایت میں آتا ہے کہ ۲۔۳ بار آئے گئے، اور ان کے حالات سے آپ ﷺ کو خبردار کیا، گویا جانا بطور جاسوسی معلوم ہوتا ہے، جس کے لئے مندرجہ بالا اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن بعض تقاریر درس بخاری شریف میں کہا گیا کہ ''حضرت زبیر ؓ غزوہ احزاب میں بڑھ بڑھ کر بنوقریظہ کی طرف جارہے تھے'' یہ تعبیر موہم ہے کہ جیسے حضرت زبیر میدان

کارزار میں بڑھ بڑھ کر حصہ لے رہے تھے اور اسی طرح داد شجاعت دے رہے تھے، یہ نوعیت سابق ذکر شدہ نوعیت سے بالکل الگ ہے۔

اور یہ تعبیر اس لئے بھی کھٹکی کہ غزوہ احزاب میں دوبدو کوئی لڑائی نہیں ہوئی، کفار مکہ نے ۵ھ میں مدینہ پر چڑھائی کی، ان کا لشکر دس ہزار کا تھا، پوری تیاری سے آئے تھے کہ مدینہ طیبہ کی خدانخواستہ اینٹ سے اینٹ بجا کر واپس ہوں گے، سب اگلے پچھلے بدلے چکا ئیں گے مگر یہاں حضور اکرم ﷺ نے مدینہ طیبہ کے گرد کوہ سلع کی طرف خوب چوڑی گہری خندق کھدوادی، جس کی وجہ سے کفار کا سارا لشکر دوسرے کنارے پر پڑا رہا، اور خندق کو پار کرنے کی جراءت نہ ہوسکی، البتہ دونوں طرف سے تیر اور پتھر برسائے گئے، جس سے چھ مسلمان شہید اور تین کافر قتل ہوئے، نیز کفار قریش میں ایک نہایت مشہور بہادر پہلوان عمر بن عبد جو تنہا پچاس جانباز ڈاکوؤں پر بھاری ہوتا تھا وہ چند نوجوان سور ماؤں کو ساتھ لے کر خندق پار کرنے میں کامیاب ہوا، اس عمر کے مقابلے میں حضرت علی ؓ نکلے اور تھوڑی دیر کے سخت مقابلے کے بعد حضرت علی ؓ نے اس کو اپنی تلوار سے قتل کر دیا اس کا انجام دیکھ کر اس کے ساتھی بھاگ گئے۔

غرض غزوہ احزاب میں اس ایک خاص انفرادی مقابلے کے علاوہ عام جدال وقتال یا دوبدو لڑائی کی نوبت نہیں آئی، جس کے لئے کہا جائے کہ حضرت زبیر ؓ بڑھ بڑھ کر اقدام کر رہے تھے، پھر یہ کہ بنو قریظہ تو مدینہ ہی کے باشندے تھے، انہوں نے غداری ضرور کی کہ اندرونی طور پر کفار مکہ سے مل گئے، مگر کھل کر مسلمانوں کے مقابلے میں نہیں آئے اسی لئے آنحضرت ﷺ کو ان کی طرف سے خطرہ تھا کہ نہ معلوم ان کا یہ ساز باز کیا گل کھلائے اور آپ ﷺ چاہتے تھے کہ ان کے حالات وعزائم کا پتہ لگتا رہے، جس کے لئے حضرت زبیر ؓ نے اپنی خدمات پیش کیں، کئی بار ان کی طرف گئے اور خبریں لائے، حضور کو سنا کر خوش کیا۔

غزوہ احزاب کے بعد ہی یہودی بنی قریظہ سے جنگ ہوئی، جس سے ان کا استحصال کیا گیا یہ سب تفصیلات مغازی میں آئیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

بَابُ الْخُرُوْجِ فِیْ طَلَبِ الْعِلْمِ وَرَحَلَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ مَسِیْرَةَ شَهْرٍاِلٰی عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اُنَیْسٍ فِیْ حَدِیْثٍ وَّاحِدٍ

تحصیل علم کے لیے سفر کرنا حضرت جابر بن عبداللہ ایک حدیث حاصل کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن انیس کے پاس ایک ماہ کی مسافت طے کر کے پہنچے۔

(۷۸) حَدَّثَنَا اَبُوْ الْقَاسِمِ خَالِدُ بْنُ خَلِيّ قَاضِيَ حِمْصَ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ الْاَوْزَاعِيُّ اَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ ابْنُ عَبْدِاللّٰهِ بْنُ عُتْبَةَ بْنُ مَسْعُوْدٍ عَنْ اِبْنُ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ تَمَارٰى هُوَ وَالْحُرُّبُنُ قَيْسٍ بْنُ حِصْنَ الْفَزَارِيُّ فِيْ صَاحِبِ مُوْسٰى فَمَرَّ بِهِمَا اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ فَدَعَاهُ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ اِنِّيْ تَمَارَيْتُ اَنَا وَصَاحِبِيْ مُوْسٰى الَّذِيْ سَأَلَ السَّبِيْلَ اِلٰى لُقِيِّهٖ هَلْ سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ شَاْنَهٗ فَقَالَ اُبَيُّ نَعَمْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ شَاْنَهٗ يَقُوْلُ بَيْنَمَا مُوْسٰى فِيْ مَلَاءٍ مِّنْ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ اِذْ جَآئَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ اَحَدًا اَعْلَمُ مِنْكَ قَالَ مُوْسٰى لَا فَاَوْحَى اللّٰهُ اِلٰى مُوْسٰى بَلٰى عَبْدُنَا خَضِرٌ فَسَأَلَ السَّبِيْلَ اِلٰى لُقِيِّهٖ فَجَعَلَ اللّٰهُ لَهُ الْحُوْتَ اٰيَةً وَقِيْلَ لَهٗ اِذَا فَقَدْتَّ الْحُوْتَ فَارْجِعْ فَاِنَّكَ سَتَلْقَاهُ فَكَانَ

مُوْسٰی یَتَّبِعُ اَثَرَ الْحُوْتِ فِی الْبَحْرِ فَقَالَ فَتٰی مُوْسٰی لِمُوْسٰی اَرَاَیْتَ اِذْ اَوَیْنَا اِلَی الصَّخْرَةِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَا اَنْسٰنِیْهُ اِلَّاالشَّیْطَانُ اِنْ اَذْکُرَهٗ قَالَ مُوْسٰی ذٰلِکَ مَاکُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّ عَلٰی اٰثَارِ هِمَا قَصَصًا فَوَجَدَاخَضِرًا فَکَانَ مِنْ شَأْنِهِمَا مَاقَصَّ اللّٰهُ فِیْ کِتَابِهٖ.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ اور حربن قیس بن حصن الفزاری حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کے بارے میں جھگڑے (اس دوران میں ان کے قریب سے ابی بن کعب گزرے تو ابن عباسؓ نے انہیں بلایا اور کہا کہ میں اور میرے یہ ساتھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کے بارے میں بحث رہے ہیں جس سے ملنے کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سبیل چاہی تھی کیا آپ نے رسول اکرم ﷺ کو کچھ ان کا تذکرہ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا ہاں! میں نے رسول اللہ ﷺ کو ان کا حال بیان فرماتے ہوئے سنا ہے آپ فرما رہے تھے کہ ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا: آپ جانتے ہیں کہ آپ سے بھی بڑھ کر کوئی عالم ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نہیں تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر وحی نازل کی کہ ہاں! ہمارا بندہ خضر (علم میں تم سے بڑھ کر ہے) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے ملنے کی سبیل دریافت کی اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان سے ملاقات کے لیے مچھلی کو علامت قرار دیا اور ان سے کہہ دیا کہ جب تم مچھلی کو نہ پاؤ لوٹ جاؤ تب تم خضر سے ملاقات کرلو گے حضرت موسیٰ علیہ السلام دریا میں مچھلی کا انتظار کرتے رہے تب ان کے خادم نے ان سے کہا کیا آپ نے دیکھا تھا کہ جب ہم پتھر کے پاس تھے میں وہاں مچھلی بھول گیا اور مجھے شیطان ہی نے غافل کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہم اسی مقام کی تلاش میں تھے تب وہ اپنے قدموں کے نشان پر تلاش کرتے ہوئے واپس لوٹے وہاں خضر کو انہوں نے پایا، پھر اس کے بعد ان کا قصہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔

تشریح: حافظ محقق عینیؒ نے لکھا کہ ترجمہ سے حدیث کی مطابقت تو ظاہر ہے دوسری بات یہ کہ امام بخاری نے اسی ایک حدیث الباب پر دو ترجمے قائم کئے پہلے ایک مرتبہ ذہاب موسیٰ الی الخضر کا ترجمہ قائم کیا تھا جس کی پوری تفصیل گزر چکی، اب یہاں دوسرا ترجمہ خروج فی الطلب العلم کا ترجمہ کیا اور یہاں بھی وہی حدیث سابق ملاقات واستفادۂ علوم خضر والی ذکر کی فرق صرف بعض روایت کا ہے اور چند الفاظ کی تفاوت بھی ہے، حافظ عینیؒ نے ان دونوں فروق کو بھی تفصیل سے بتلایا ہے یہاں رواۃ میں چونکہ امام اوزاعی بھی ہیں، حافظ عینیؒ نے ان کا مکمل تذکرہ لکھا اور لکھا کہ آپ نے تیرہ سال کی عمر سے فتوی دینا شروع کر دیا تھا اور پوری عمر میں اسی ہزار (۸۰٬۰۰۰) مسائل بتلائے، یہ وہی امام اوزاعی جلیل القدر محدث شام ہیں کہ امام اعظم سے پہلے بدظن تھے پھر مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی اور علمی مذاکرات کئے تو نہایت مداح ہوگئے اور اپنی پہلی بدگمانیوں پر سخت نادم ہوئے تھے، حافظ عینیؒ نے یہ بھی مزید افادہ کیا کہ کل اہل شام واہل مغرب مالکی مذہب قبول کرنے سے قبل امام اوزاعیؒ ہی کے مذہب پر تھے اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ امام اوزاعیؒ کا مذہب کیوں جلد ختم ہوگیا، یعنی مذاہب اربعہ کی جامعیت ومقبولیت عنداللہ کے تحت ہی ان کی امت میں تلقی بالقبول ہوئی، پھر جس مذہب نے زیادہ اصول شرع سے مطابقت و جامعیت تھی اس کو نشو ونما اور بقا بھی زیادہ حاصل ہوا، حسب اعتراف حافظ ابن حجر چونکہ مذہب حنفی میں اصولیت و جامعیت زیادہ تھی تو اس کی تلقی بالقبول بھی دوسرے مذاہب سے زیادہ ہوئی اس کے علاوہ دوسرے اسباب بھی تھے مثلاً اس کی شورائی حیثیت، مدنی، معاشی، اقتصادی وسیاسی معاملات میں اعلیٰ قدر رہنمائی وغیرہ جن کی تفصیل علامہ کوثری نے کی ہے ہم نے امام اوزاعیؒ کے حالات مقدمہ جلد اول ص ۲۱۶ میں درج کئے ہیں۔

مقصد امام بخاری: امام بخاریؒ نے علم کی فضیلت اہمیت وضرورت ثابت کرنے کے بعد یہ بتلانا چاہا ہے کہ ایسی اہم ضروری چیز اگر اپنے اہل وعیال یا اپنے ملک کے قریب وبعید کے شہروں میں حاصل نہ ہو سکے تو اس کے لیے دوسرے ممالک کا سفر بھی اختیار کرنا چاہیے اور اگرچہ صحابہ کرامؓ مراکز علم میں سکونت پذیر ہونے کے باعث بیرونی ممالک کی سفر کی ضرورت تحصیل علم کے لیے عام طور سے پیش نہیں آئی تاہم ایسے واقعات صحابہ کی زندگی میں پیش آئے ہیں کہ انہوں نے دور دراز ممالک کے سفر ایک ایک حدیث کا علم حاصل کرنے کے غرض سے کئے ہیں مثلاً

ایک حدیث کے لیے ایک ماہ کا سفر

(۱) حضرت جابر بن عبداللہ ؓ نے ایک حدیث رسول ﷺ حضرت عبداللہ بن انیس ؓ سے بالواسطہ مدینہ طیبہ میں رہتے ہوئے سنی، تو ان کو اشتیاق ہوا کہ موصوف کے پاس شام جا کر ان سے بالمشافہ اور بلاواسطہ بھی سنیں چنانچہ مسند احمد میں ہے کہ انہوں نے سفر شام کے لیے ایک اونٹ خریدا سفر کی تیاری کر کے روانہ ہو گئے ایک ماہ کی مسافت طے کر کے حضرت عبداللہ بن انیس کے مکان کا پتہ پوچھتے پوچھتے ان کے گھر پر پہنچ گئے۔

حضرت عبداللہ بن انیس باہر تشریف لا کر ملاقات معانقہ کرتے ہیں قیام کے لیے اصرار کرتے ہیں مگر حضرت جابر حدیث سن کر اسی وقت واپس ہو جاتے ہیں جس حدیث کے لیے یہ اتنا بڑا سفر کیا ایک صحابی مدینۃ الرسول ﷺ سے ملک شام تک کرتے ہیں اور اس کی تعین میں کچھ اختلاف ہے جس کی تفصیل حافظ عینیؒ و حافظ ابن حجرؒ نے لکھی ہے اور اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے جو امام بخاریؒ نے آخر کتاب الرد علے الجہمیہ میں روایت کی ہے۔

یحشر اللہ العباد فینادیھم بصوت یسمعه من بعد کما یسمعه من قرب انا الملک انا الدیان مسند احمد و مسند ابی یعلی میں یہ حدیث اس طرح ہے **یحشر اللہ الناس یوم القیامة عراة غرلا بھما فینادیھم بصوت یسمعه من بعد کما یسمعه من قرب انا الملک اناالدیان لا ینبغی لا ھل الجنة ان یدخل الجنة واحد من اھل النار یطلبه بمنظلة حتی یقتصه منه حتی اللطمة قال و کیف وانما ناتی عراة عزلاً؟ قال بالحسنات والسیئات.** (عمدۃ القاری ج۱ص۴۶۳)

قیامت کے دن حق تعالیٰ لوگوں کو جمع فرما کر ایسی آواز سے اعلان فرمائیں گے جس کو قریب و بعید والے سب ہی سن لیں گے کہ میں بادشاہ ہوں میں بدلہ دینے والا ہوں' مسند احمد وغیرہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ سب لوگوں کو مادر زاد برہنہ اٹھایا جائے گا' پھر فرمائے گا میں شہنشاہ ہوں، بدلہ دینے والا ہوں، کسی اہل جنت کو یہ حق نہیں کہ ایسی حالت میں داخل جنت ہو جائے کہ اہل جہنم کا کوئی حق اس کے ذمہ باقی ہو لہٰذا پہلے اس کو بدلہ دیا جائے گا حتی کہ ایک تھپڑ کسی دوسرے کو ناحق مارا ہوگا تو اس کا بھی بدلہ دیا جائے گا صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا بدلہ کس طرح دیں گے؟ جبکہ ہم سب مادر زاد ننگے ہوں گے (یعنی کوئی مال و دولت ہمارے پاس نہ ہوگی کہ اس کو دیکر حق ادا کریں) فرمایا وہاں نیکیوں اور برائیوں کے لین دین سے حقوق ادا کرا دیئے جائیں گے۔

حضرت ابو یوب کا طلب حدیث کے لیے سفر

آپ نے مدینہ طیبہ سے مصر کا سفر کیا اور ایک ماہ کی مسافت طے کر کے حضرت عقبۃ بن عامر سے یہ حدیث سنی: **من ستر مومناً فی الدنیا علی عورة ستره اللہ یوم القیامة** (جو شخص کسی مومن کے عیب و برائی کو دنیا میں چھپالے گا حق تعالیٰ اس شخص کے عیب روز قیامت میں چھپا دیں گے۔

حضرت عبیداللہ بن عدی کا سفر عراق

آپ نے مدینہ منورہ (زادھا اللہ شرفا ورفعۃ) سے سفر کر کے ایک ماہ کی مسافت طے کر کے عراق پہنچ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل کی۔

حضرت ابوالعالیہ کا قول

فرمایا ہم لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سنی ہوئی بالواسطہ اپنے وطنوں میں سنا کرتے تھے تو ہمیں یہ بات زیادہ خوش نہ کرتی تھی تا آنکہ ہم اپنے وطنوں سے سفر کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے بلاواسطہ سنتے تھے۔

حضرت امام شعبی کا ارشاد

کسی مسئلہ کی تحقیق فرما کر کہا کہ پہلے تو اس سے پہلے کے کم درجہ کے مسئلہ کی تحقیق کے لیے ایک شخص مدینہ طیبہ زادھا اللہ شرفا ورفعۃ) کا سفر کیا کرتا تھا۔

حضرت سعید بن المسیب (تابعی) کا ارشاد

آپ کا قول امام مالک نے نقل کیا کہ میں ایک ایک حدیث کی طلب وتلاش میں بہت سے دن رات کا سفر کیا کرتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا ارشاد: آپ کا یہ ارشاد کتاب فضائل قرآن میں نقل ہوا ''اگر مجھے علم ہو جائے کہ مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھنے والا کسی جگہ موجود ہے تو میں ضرور اس کے پاس سفر کر کے جاؤں گا۔

امام احمد کا ارشاد: امام احمد سے کسی نے پوچھا کہ ایک شخص اپنے شہر کے بڑے عالم سے علم حاصل کرے یا سفر کر کے دوسری جگہ جائے؟ آپ نے فرمایا کہ اسے سفر کرنا چاہیے تا کہ دوسرے شہروں کے علماء کے افادات قلم بند کر سکے مختلف لوگوں سے ملے اور جہاں سے بھی علم کی روشنی ملے اس کو ضرور حاصل کرے۔ (فتح الباری ج ۱ص ۱۲۸)

حافظ نے لکھا کہ اس سے حضرات صحابہ کرام وغیرہم کی غیر معمولی حرص ورغبت سنن نبویہ کی تحصیل کے لئے معلوم ہوتی ہے اور اس سے نو وارد مہمان کے معانقہ کا بھی جواز نکلتا ہے، بشرطیکہ کہ کوئی دوسری خرابی یا مظنہ تہمت وبدگمانی نہ ہو۔

طلب علم کے لئے بحری سفر

امام بخاری نے جہاں علم کی فضیلت بتلائی پھر اس کی ضرورت واہمیت کے تحت اس کے لئے سفر کی ترغیب دلائی تا کہ تکالیف ومشاق سفر کو برداشت کیا جائے اس کے ساتھ ان خیالات کا دفعیہ بھی مقصود ہو سکتا ہے، جن کے سبب سفر سے شرعی رکاوٹ سمجھی جاسکتی ہے مثلاً حدیث صحیح میں ہے کہ ''سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے، جو کھانا، پینا، نیند حرام کر دیتا ہے، اس لئے جب بھی کوئی اپنی ضرورت پوری کر چکے تو فوراً اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹ آئے (بخاری ص ۲۴۲ باب السفر قطعۃ من العذاب) اس حدیث سے سفر کی ناپسندیدگی معلوم ہو رہی ہے۔

پھر خصوصیت سے بحری سفر کے لئے یہ الفاظ مروی ہیں کہ سمندر کا سفر بجز ضرورت حج، عمرہ یا جہاد اختیار نہ کیا جائے۔ (ابوداؤد) ترمذی کی ایک حدیث ہے:۔ ''سمندر کے نیچے نار ہے۔'' (آگ یا دوزخ) اس کی تشریح وتحقیق اپنے موقع پر آئے گی۔

امام بخاریؒ نے ان خیالات کے دفعیہ کے لئے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علمی اسفار کی طرف اشارہ فرمایا اور بحری سفر کا جواز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت کیا، اور غالباً اسی اہم ضرورت کے پیش نظر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تھوڑے ہی فصل سے پھر

دہرایا تاکہ تحصیل علم دین کے لئے بری و بحری ہر دو سفر کے بارے میں کوئی عقلی وشرعی رکاوٹ باقی نہ رہے، اور جب ان زمانوں میں علم کی معمولی اور چھوٹی ضرورتوں کے لئے بھی ایسے دشوار گزار سفر کئے گئے، جبکہ معمولی دنیاوی ضرورتوں کے لئے ایسے سفر مروج نہ تھے، تو اب جبکہ دنیا کی معمولی ضرورتوں یا دنیوی علوم کے لئے بڑے بڑے بری، بحری و جوی سفر عام طور سے کئے جانے لگے ہیں تو علم دین یا دوسری دینی اغراض کے لئے کتنے بڑے بڑے سفروں میں ہمیں رغبت کرنی چاہیے؟!

علمی و دینی اغراض کے لئے سفر

مثلاً ہم دینی و علمی اغراض کے تحت حرمین شریفین کے سفر کریں، خالص علمی و دینی تحقیقات کے لئے، حرمین، مصر، شام، و ترکی کے سفر کرکے وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کریں، ان سب مقامات پر علاوہ مطبوعات کے نادر ترین مخطوطات کے بیش بہا ذخیرے موجود ہیں، جن کا تصور بھی ہم یہاں بیٹھ کر نہیں کر سکتے، خصوصاً ترکی میں اسلامی علوم کی مخطوطات کے تقریباً چالیس کتب خانے ہیں، جن میں دنیا کے بے نظیر مخطوطات موجود ہیں۔

ذکر سفر استنبول: ۳۸ھ میں جب ہمارا قیام "نصب الرایہ" اور "فیض الباری" کی طباعت کے لئے مصر میں تھا تو چند روز کے لئے رفیق محترم مولانا العلام سید محمد یوسف صاحب بنوری دامت فیوضہم کے ساتھ استنبول کا سفر بھی محض وہاں کے کتب خانوں کی زیارت اور تحقیق نوادر کی غرض سے ہوا تھا۔

کاش! انوارالباری کی تالیف کے دوران ایک بار ممالک اسلامیہ کا سفر مقدر ہوتا تاکہ اس سلسلہ میں جدید استفادات وہاں کی نوادر کتب اور اہل علم سے حاصل ہو کر جزو کتاب ہوں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

ترکی میں دینی انقلاب

جس زمانہ میں ہمارا سفر استنبول ہوا تھا، وہ دور مذہبی نقطہ نظر سے وہاں کا تاریک ترین دور تھا، مصطفیٰ کمال نے پورے ملک میں بچوں کے لئے مذہبی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا تھا، عورتوں کے برقعوں کا استعمال قانوناً جرم تھا، مردوں کو ہیٹ کا استعمال لازمی تھا،، حج کا سفر ممنوع تھا، اذان و خطبہ جمعہ ترکی زبان میں ہو گیا تھا، مساجد نمازیوں سے خالی ہو گئیں تھیں، خدا کا ہزاراں ہزار شکر ہے کہ اب دو تین سال سے ان حالات کا ردعمل شروع ہوا اور رفتہ رفتہ وہاں کے لوگ دینی رجحانات کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

بَابُ فَضْلِ مَنْ عَلِمَ وَ عَلَّمَ

(باب اس شخص کی فضیلت میں جس نے علم سیکھا اور سکھایا)

(۷۹) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَآءِ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ اُسَامَةَ عَنْ بُرَيْدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِی اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰی وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَكَانَ مِنْهَا نَقِيَّةٌ قَبِلَتِ الْمَآءَ فَاَنْبَتَتِ الْكَلَاَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ وَكَانَتْ مِنْهَا اَجَادِبُ اَمْسَكَتِ الْمَآءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا وَاَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً اُخْرٰی اِنَّمَا هِیَ قِيْعَانٌ لَّا يُمْسِكُ مَآءً وَّ لَا تُنْبِتُ كَلَاً فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِیْ دِيْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهٗ بِمَا بَعَثَنِیَ اللّٰهُ بِهٖ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ وَ مَثَلُ مَنْ لَّمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَاْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَی اللّٰهِ الَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ اِسْحٰقُ عَنْ اَبِیْ اُسَامَةَ وَكَانَ مِنْهَا طَائِفَةٌ قَيَّلَتِ الْمَآءَ قَاعٌ يَعْلُوْهُ الْمَآءُ وَالصَّفْصَفُ الْمُسْتَوِیْ مِنَ الْاَرْضِ.

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے جس علم وہدایت کے ساتھ بھیجا ہے، اس کی مثال زبردست بارش کی سی ہے جو زمین پر خوب برسے، بعض زمین جو صاف ہوتی ہے وہ پانی کو پی لیتی ہے اور بہت بہت سبزہ اور گھاس اگاتی ہے، اور بعض زمین جو سخت ہوتی ہے وہ پانی کو روک لیتی ہے اس سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے اور وہ اس سے سیراب ہوتے ہیں اور سیراب کرتے ہیں اور کچھ زمین کے بعض خطوں پر پانی پڑا، وہ بالکل چٹیل میدان ہی تھے نہ پانی کو روکتے ہیں نہ سبزہ اگاتے ہیں، تو یہ مثال اس شخص کی ہے جو دین میں سمجھ پیدا کرے، اور نفع دیا اس کو اللہ تعالیٰ نے اس چیز سے جس کے ساتھ میں مبعوث کیا گیا ہوں، اور جو اس نے علم دین سیکھا اور سکھایا، اور اس شخص کی جس نے سر نہیں اٹھایا (یعنی توجہ نہیں کی) اور جو ہدایت دے کر میں بھیجا گیا ہوں اسے قبول نہیں کیا اور بخاریؒ کہتے ہیں کہ ابن اسحاق نے ابواسامہ کی روایت سے "قیلت الماء" (یعنی خوب پانی پیا) کا لفظ نقل کیا ہے، قاع زمین کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس پر پانی چڑھ جائے (مگر ٹھہرے نہیں) اور صفصف ہموار زمین کو کہتے ہیں۔

تشریح: رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو علم وحکمت عطا فرمایا، اس کو آپ نے بڑی اچھی مثال سے واضح فرمایا، زمین یا تو نہایت باصلاحیت ہوتی ہے، پانی خوب پیتی ہے، اور اس پانی سے اس میں نہایت اچھی پیداوار ہوتی ہے یا ایک زمین نشیبی ہوتی ہے کہ بارش کا پانی اس میں جمع ہو جاتا ہے اس سے اگرچہ زمین میں کوئی عمدگی اور زرخیزی پیدا نہیں ہوتی، مگر اس جمع شدہ پانی سے آدمی اور جانور سیراب ہوتے ہیں ایک زمین سنگلاخ اور تپڑ ہوتی ہے بارش سے نہ اس میں پیداوار کی صلاحیت آتی ہے اور نہ پانی اس میں ٹھہرتا ہے کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں اسی طرح لوگوں میں سے ایک طبقہ تو ایسا ہے جس نے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی پہنچایا۔ ایک ایسا ہے جس نے خود تو فائدہ نہیں اٹھایا مگر دوسرے اس سے مستفیض ہوئے، یہ دونوں جماعتیں بہرحال بہتر ہیں اور پہلی کو دوسری پر فضیلت حاصل ہے لیکن تیسری جماعت وہ ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر کان نہیں دھرا وہ سب سے بدتر جماعت ہے۔

مسند احمد کی روایت میں فذلک مثل، من فقه فی دین الله عزوجل ونفعهٗ الله عز وجل بما بعثنی به و نفع به فعلم وعلم اس سے "فعلم و علم" کا انطباق زیادہ واضح ہوجاتا ہے کہ جس نے خدا کے فضل وکرم خاص کے سبب علوم نبوت سے فیض حاصل کیا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا پس علم سیکھا بھی اور سکھایا بھی۔ (الفتح الربانی بترتیب مسند الامام احمد الشیبانی ص ۱۴۶ ج ۱)

بحث ونظر: گذشتہ باب میں ہم نے فضیلت علم کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ علم حاصل کرنیکے لیے ہمیں دنیوی اغراض کے موجودہ دور کے اسفار سے زیادہ مشقتوں کے سفر اختیار کرنے چاہئیں تا کہ علم دین کی برتری وسربلندی کا خود بھی احساس کریں اور دوسروں کو بھی کرائیں اس باب میں امام بخاریؒ نے علم کیساتھ عَلَّمَ کی بھی اہمیت وفضیلت بتلائی ہے لہٰذا علم دین کو پوری تحقیق وکاوش کے ساتھ اسلامی مراکز سے حاصل کر کے اس کو پوری دنیا میں پہنچانیکی سعی کرنا بھی ہمارا اسلامی ودینی فریضہ ہے جس کی طرف بہت کم توجہ کی جارہی ہے ساری دنیا کو اسلامی علوم سے روشناس کرانے کا بہترین واحد ذریعہ اس وقت اردو کے بعد انگریزی زبان ہے۔ اگر ہم معیاری لٹریچر کو انگریزی میں صحیح طور سے منتقل کر دیں تو یقیناً عَلِمَ وَ عَلَّمَ پر پوری طرح عمل ہوسکتا ہے، ہمیں افریقہ کے چند دوستوں نے لکھا کہ اگر "انوارالباری کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ساتھ شائع کرنے کا انتظام ہوسکے تو نہایت اچھا ہو اور کم سے کم پانچ ہزار نسخوں کی اشاعت صرف افریقہ ہی میں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ وہاں انگریزی ہی کو سہولت سے سمجھ سکتے ہیں یہی حال امریکہ یورپ اور ایشیا کے بہت سے ممالک کا ہے کہ نہ صرف وہاں انگریزی لٹریچر سے استفادہ کرنے والے بلکہ مذہبی ودینی رجحان رکھنے والے بھی نہایت بڑی تعداد میں لوگ موجود ہیں۔

لہٰذا علم دین کی نشر واشاعت کے لیے ہر قسم کے اسفار بھی دنیوی اغراض کے اسفار سے زیادہ شوق ورغبت کے ساتھ اختیار کرنیکی ضرورت ہے۔

تبلیغی سفر اور موجودہ تبلیغی تحریک کے سلسلے میں چند گذارشات:

فریضہ حج وزیارت طیبہ کے بعد دینی نقطہ نظر سے جس سفر کی سب سے زیادہ اہمیت وضرورت ہے وہ تبلیغی سفر ہے اور اس سلسلہ میں جو کچھ کام حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی قائم کردہ مرکزی جماعت بستی نظام الدین نے اب تک انجام دیا ہے اور بحمد اللہ وہ برابر پوری سرگرمی سے ہورہا ہے اور وسعت پذیر بھی ہے، یقیناً وہ ہر طرح قابل ستائش ولائق اتباع ہے لیکن اس سلسلہ میں ہماری چند گذارشات ہیں "آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند"

جیسا کہ اوپر کی حدیث سے مفہوم ہوتا ہے تبلیغ دین اور تعلیم شریعت کا منصب اہل علم کا ہے اسی لیے امام بخاری نے عنوان میں عَلِمَ وَ عَلَّمَ فرمایا کہ پہلے علم حاصل کیا پھر دوسروں کو تعلیم دی اور حدیث الباب میں حضور اکرم ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت وعلم نبوت کو دوسروں تک پہنچانے میں بھی علم کو مقدم رکھا گیا ہے اس کے بعد تربیت واصلاح کا کام ہے وہ بھی اسی طرح چلتا ہے کہ پہلے آدمی خود تربیت واصلاح اپنے نفس کی کرالے پھر دوسروں کی تربیت کرے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اصلاح وتربیت کا کام معمولی نہیں کہ چند گھنٹوں یا دنوں میں پورا ہوجائے۔

اس لیے سب سے پہلا قدم تبلیغی کام کی غرض سے نکلنے والوں کے لیے یہ ہونا چاہیے کہ وہ مقامی طور پر یا مرکز میں رہ کر تعلیم وتربیت سے بہرہ ور ہوں۔ اور پھر ان کو حسب صلاحیت وقابلیت قریب وبعید میں تبلیغ کے لئے بھیجا جائے۔ جس طرح ہر عامی وجاہل کو چلہ کی ترغیب دلا کر مرکز کی دعوت دی جاتی ہے۔ اور وہاں ایک رات رہ کر وہ تمام مدارج اصلاح، تعلیم وتربیت کے پورے کر کے دور دراز شہروں کو تبلیغ کے لئے روانہ ہوجاتے ہیں۔ اس سے یقیناً یہ تو فائدہ ضرور ہے کہ جہاں وہ پہنچتے ہیں ایک دینی حرکت پیدا ہوجاتی ہے چند نمازی بھی عارضی طور پر بڑھ جاتے ہیں۔ مگر معاف کیا جائے اس سے کوئی مستقل فائدہ نہیں ہوتا۔ یا دوسرے الفاظ میں کہنا چاہئے کہ جتنا زیادہ نفع ہونا چاہئے نہیں ہوتا۔ اس کی جگہ اگر یہ انتظام ہو کہ مرکز پہنچ کر پہلے ہر ایک کو خود اپنی اصلاح اور تربیت وتعلیم کا موقع ملے اور پھر جو تبلیغ واصلاح کا واقعی اہل سمجھا

جائے اس کو آگے بڑھایا جائے۔ ورنہ وطن واپس کر دیا جائے اور اس کو ترغیب دی جائے کہ اپنے یہاں مقامی طور سے یا کسی قریبی مقام پر جا کر اپنی اصلاح، تعلیم و تربیت کرائے پھر اس کے بعد چلہ دے تو زیادہ بہتر ہے۔

(۲) تبلیغی مرکز سے صرف اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ "چلہ دو"، حالانکہ ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ اس طویل مدت میں جتنے لوگوں نے چلے دیئے ہیں وہ تربیت واصلاح سے فارغ بھی ہو چکے ہیں اور تبلیغ کا تجربہ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ان پر زور دیا جائے کہ وہ مقامی کام کریں پہلے اپنے شہر وقریہ کی مسجدوں کو معمور کریں۔ دینی تعلیم روزانہ یا ہفت واری گشت اور اجتماع پر زور دیں۔ اس طرح جو لوگ آئندہ چلہ دیں گے وہ زیادہ تعلیم یافتہ اور تبلیغ کے لئے اہل و مفید ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ مرکز کے سامنے بھی اس وقت یہ سوال ہے کہ اس کثرت سے لوگ ہر طرف سے آ رہے ہیں کہ ہر جماعت کے ساتھ کسی ایک عالم کو تو کجا کسی اچھے پڑھے لکھے کو بھی امیر بنا کر بھیجنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ اس مشکل کا حل بھی یہی ہے کہ مرکز کی طرف سے پہلا زور ہر جگہ کی مقامی تعلیم و تبلیغ پر دیا جائے۔ اور پھر مقامی کام کرنے والوں میں سے باصلاحیت منتخب ہو کر باہر نکلا کریں۔ اس طرح یہ کام بہت جلد آگے بڑھ سکتا ہے۔ اور جو کامیابی اب تک تیس سال میں نہیں ہوئی وہ آئندہ دس سال میں ہو سکتی ہے۔

غرض ہمارے خیال میں پہلا کام عام لوگوں کی دینی تعلیم کا ہے۔ کہ نماز کی ترغیب دے کر ہر جگہ کی مساجد پوری طرح معمور ہو جائیں۔ اور روزانہ کسی نماز کے بعد ۱۵، ۲۰ منٹ ان کی دینی تعلیم ہو۔ اس کے بعد ان کی اصلاح و تربیت کا مرحلہ ہے۔ جس کے لئے مقامی انتظام ہو۔ یا مرکز (بستی نظام الدین) میں تیسرا قدم یہ ہو کہ وہ اپنے یہاں یا باہر جا کر تبلیغ کریں اگر کام کی یہ ترتیب ہوتی جو شرع وسنت سے بھی ثابت ہے تو اتنے طویل عرصہ تک تبلیغی تحریک قائم رہنے کے بعد آج یہ سوال نہ ہوتا کہ جماعتوں کے ساتھ بھیجنے کے لئے عالم یا واقف دین نہیں ملتے۔

تعلیم دین کی اشاعت اور اصلاح و تربیت کی ترقی کے ساتھ ہی عوام میں دین سے واقف لوگوں کی تعداد بڑھتی رہتی۔ اور تبلیغی کام میں کہیں زیادہ پیش رفت ہوتی۔ اس لئے جو طریق کار برسوں سے اب تک چلایا گیا ہے کہ ہر جگہ کے لوگوں سے پہلا مطالبہ چلہ کا ہوتا ہے اور ان کو بغیر دینی تعلیم و تربیت ہی کے بمبئی، کلکتہ، مدراس وغیرہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ جہاد فی سبیل اللہ کا ثواب حاصل کر کے اپنے وطن میں اگر فارغ و مطمئن بیٹھ جاتے ہیں جیسے حج کے سفر سے واپس ہو کر لوگ اپنے کو فارغ البال سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے جزوی وعارضی فائدہ کا انکار نہیں لیکن جتنے زیادہ اور عظیم فائدے حاصل ہو سکتے تھے وہ حاصل نہیں ہو سکے۔

بہرحال ہماری رائے یہی ہے کہ ہر جگہ کے مقامی کام پر ہی سب سے پہلی توجہ مرکوز ہو۔ مرکز سے بھی سب سے پہلا مطالبہ یہی ہو، تبلیغی جماعتیں بھی ہر جگہ پہنچ کر اسی امر کا جائزہ لیں کہ مقامی کام کتنا ہو رہا ہے۔ اور دیندار لوگوں کو اس کے لئے ترغیب دیں۔ ذمہ دار بنائیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف دامت فیوضہم بھی ہر ضلع میں تشریف لے جا کر ضلع کا ایک اجتماع کرائیں اور تبلیغی کاموں کے لئے ایک ترتیب سمجھائیں۔ باثر لوگوں کو مقامی کام کے لئے آمادہ کریں تربیت واصلاح کے لئے ممکن ہو تو مقامی طور پر انتظام فرما دیں ورنہ مرکز کی دعوت دیں اور تیسرے نمبر پر چلہ کا مطالبہ کریں اور اس کے لئے ان لوگوں کو ترجیح دیں جو دینی تعلیم و تربیت اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کے لحاظ سے بھی تبلیغ دین جیسے اہم و عظیم الشان کام کے لئے زیادہ اہل ہوں۔

(۳) تبلیغی جماعتوں کے جو لوگ ہر جگہ پہنچ رہے ہیں۔ وہ اکثر دین و علم سے کم واقف ہوتے ہیں اور وہ لوگ تبلیغ کے فضائل یا شرعی مسائل غلط طور سے پیش کرتے ہیں۔ جس سے نہ صرف یہ کہ ٹھوس علمی و دینی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بہت سے مضر اثرات بھی پڑتے ہیں۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ تبلیغی جماعتوں کے بعض لوگوں نے نماز کی ترغیب اس طرح دلائی کہ بہت سے لوگوں کو بے وضو ہی نماز پڑھوا دی، اول تو یہ شرعاً ناجائز،

پھر اگر اس کا کوئی عادی ہو گیا کہ وقت بے وقت بے وضو بھی نماز پڑھنے لگے تو اس گناہ عظیم کے ذمہ دار کون کون لوگ ہوں گے؟ اسی طرح اور بہت سی غلطیاں کرتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ تبلیغ کے فضائل بے شمار ہیں لیکن ہر چھوٹے بڑے تبلیغی سفر کو جہاد فی سبیل اللہ کے برابر قرار دیدینا اور جہاد فی سبیل اللہ کے سارے فضائل ماثورہ کو تبلیغی سفر پر منطبق کر دینا بھی ہمارے نزدیک ایک بڑی بے احتیاطی ہے۔ جس میں بہت سے اہل علم بھی مبتلا ہیں۔ ہمارے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ کے مثل اگر ہو بھی سکتا ہے تو اس شخص کا تبلیغی سفر ہو سکتا ہے۔ جو مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح نفس ونفیس کو قربان کر کے گھر بار کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اپنی پوری زندگی کو تبلیغ دین کے لئے وقف کر دے۔ ورنہ چندروز کے لئے عارضی طور سے ترک وطن کرنا خواہ تبلیغ جیسی اہم خدمت ہی کے لئے ہو جہاد فی سبیل اللہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ان گذارشات کا مقصد یہ ہے کہ تبلیغ دین ایسے اہم وعظیم الشان کام کی ترقی وکامیابی کے لئے کچھ ضروری اصلاحات بھی پیش نظر ہوں تا کہ موجودہ منفعت سے سہ گنی چہار گنی منفعت حاصل ہو۔ خدانخواستہ یہ مطلب نہیں کہ اتنے بڑے کام کی ضرورت واہمیت وافادیت سے انکار ہے۔

(۴) یورپ امریکہ وغیرہ کے ممالک میں جو لوگ تبلیغ اسلام کے لئے پہنچ رہے ہیں۔ ان کے بارے میں سنا گیا ہے کہ وہ اسلام کی پوری ترجمانی کرنے سے قاصر رہتے ہیں حالانکہ وہاں اس امر کی نہایت ضرورت ہے کہ دین اسلام کی پوری اور صحیح تفسیر وتشریح ان ممالک کی زبان میں کی جائے۔ اور موجودہ دور کے تمام شکوک وشبہات کو بھی بوجہ احسن نقلی وعقلی دلائل سے رفع کیا جائے۔ ورنہ تبلیغ ناقص ہوگی۔ اور اس کے اثرات بہت اچھے نہ ہوں گے، جیسا کہ اس امر کا احساس موجودہ طریق کار سے اب تک کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

(۵) دینی تعلیم کے سلسلہ میں ہر جگہ کے علماء دین کا تعاون بھی زیادہ سے زیادہ حاصل ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے۔ اصلاح وتربیت کے لئے کم از کم ہفتہ عشرہ کے لئے مرکز (بستی نظام الدین) کی حاضری ضروری قرار دیدی جائے تو بہتر ہے۔ تیسرے درجہ پر چلہ کا مطالبہ آ جانا چاہئے۔ اور چلے صرف باصلاحیت لوگوں کے قبول کئے جائیں۔ تا کہ کام زیادہ بہتر اور قابل اعتماد ہو۔ جو کچھ اپنی ناقص اور قاصر فہم میں آیا۔ عرض کر دیا گیا۔ آگے رموز مملکت خویش خسرواں دانند

حدیث میں تقسیم ثنائی ہے یا ثلاثی: ایک اہم بحث حدیث الباب کے بارے میں یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی لائی ہوئی ہدایت و علم کو زوردار بارش سے تشبیہ دی ہے۔ اور جس طرح قدرت کی بھیجی ہوئی باران رحمت سے زمین کو فائدہ پہنچنے یا نہ پہنچنے کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح فرمایا کہ خدا کی ہدایت وعلم سے بھی لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، کچھ کو نہیں لیکن بظاہر مثال میں تین قسم کی آراضی کا ذکر ہے۔ اور ممثل لۂ میں صرف دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ اس لئے اشکال ہوا کہ مثال اور ممثل لۂ میں مطابقت نہیں ہے۔

اسکا جواب کچھ حضرات نے اس طرح دیا کہ ممثل لۂ میں بھی تقسیم ثنائی قرار دی۔ مثلاً علامہ خطابی، علامہ طیبی، علامہ مظہری، علامہ سندھی رحمہم اللہ تعالیٰ نے، دوسرے حضرات نے مثال میں بھی تقسیم ثلاثی ثابت کی۔ جیسے علامہ کرمانی، علامہ نووی، حضرت گنگوہی نے رحمہم اللہ تعالیٰ۔

مثال میں تقسیم ثنائی بنانے کی صورت یہ ہے کہ ایک قسم زمین کی وہ ہے جو نفع بخش ہوتی ہے دوسری بنجر نا قابل نفع۔ پھر نفع بخش زمین کی تقسیم در تقسیم بھی ہو سکتی ہے۔ جس طرح نفع بخش انسانوں میں ہو سکتی ہے۔ مگر علامہ طیبی نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ کا مقصد صرف اعلیٰ مرتبہ ہدایت اور سب سے بڑے درجہ ضلالت کو بتلانا ہے۔ یعنی اعلیٰ درجہ کا ہدایت یافتہ اور علوم نبوت سے فیض یاب وہ خوش قسمت انسان ہے جو علم و ہدایت حاصل کر کے خود بھی اس کے مطابق عمل کر کے بہرہ ور ہوا اور دوسروں کو بھی ہدایت وعمل کا راستہ بتائے۔ اور انتہا درجہ کا گمراہ اور علوم نبوت وہدایت سے بے بہرہ وہ ہوگا جو اپنے غرور وگھمنڈ کے سبب اس طرف سر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرے گا۔

(۱) علامہ طیبی کی رائے ہے کہ کم درجہ کی اقسام کونظر انداز کر دیا گیا۔ یا مقصود بالذات نہیں بنایا گیا۔ کہ وہ خود ہی سمجھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جنہوں نے اپنے علم سے صرف خود فائدہ اٹھایا، دوسروں کو نفع نہیں پہنچایا، دوسرے وہ جنہوں نے خود تو اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھایا مگر دوسروں کو ان کے علم سے فائدہ پہنچ گیا، علامہ موصوف کی رائے ہے کہ حدیث الباب میں صرف تقسیم ثنائی ہی ہوسکتی ہے۔

(۲) علامہ خطابی نے بھی یہی لکھا کہ حدیث میں ایک تو اس شخص کا حال ذکر ہوا جس نے ہدایت قبول کی علم حاصل کیا پھر دوسروں کو تعلیم دی۔ اس طرح اس کو بھی خدا نے فائدہ پہنچایا اور اس سے دوسروں کو بھی، دوسرے وہ لوگ ہوئے جنہوں نے نہ خود ہدایت وعلم سے نفع اٹھایا نہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔

(۳) علامہ مظہری نے ''شرح المصابیح'' میں لکھا کہ زمین کی قسم اول وثانی حقیقۃ دونوں ایک ہی ہیں۔ اس لحاظ سے کہ ان دونوں سے نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا زمین کی دو قسم ذکر ہوئیں۔ اس طرح لوگوں کی بھی دو ہی قسم ذکر کیں، قبول ہدایت کرنے والے اور نہ قبول کرنے والے۔ ایک سے نفع حاصل ہوا دوسرے سے نہیں۔

(۴) علامہ سندھی حاشیہ بخاری شریف میں لکھا کہ زمین دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو باران رحمت کے بعد قابل انتفاع ہو۔ (جن کی دو قسم ہیں) دوسری جو نا قابل انتفاع ہوں۔

علماء میں بھی قابل انتفاع حضرات میں سے دو قسم ہیں، فقہاء امت ومحدثین (رواۃ وناقلین حدیث) فقہا وہ جنہوں نے قرآن وحدیث کے الفاظ کو بھی محفوظ کیا اور ان کے معانی اور دقائق تک بھی رسائی حاصل کی۔ جس کو علم سے پورا انتفاع حاصل کرنا کہتے ہیں۔ پھر اپنے استنباطات وفقہی افادات سے دوسروں کو بھی نفع پہنچایا۔ محدثین ورواۃ حدیث نے الفاظ کی حفاظت کی اور دوسروں تک ان کو روایت کے ذریعہ پہنچا کر مستفید کیا امام نووی نے بھی فقہا اور مجتہدین اور اہل حفظ وروایت کو الگ الگ اس حدیث کا مصداق بنایا۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔

یہ چاروں اقوال مذکورہ بالا تقسیم ثنائی والوں کے ہیں۔ جن کی تفصیل عمدۃ القاری سے یہاں درج کی گئی ہے۔ اس کے بعد تقسیم ثلاثی والوں کے ارشادات ملاحظہ کیجئے۔

(۱) علامہ کرمانی نے فرمایا کہ حدیث الباب میں زمینوں کی طرح لوگوں کی تقسیم بھی ثلاثی ہے۔ ایک وہ جنہوں نے علم وہدایت کا صرف اتنا ہی حصہ حاصل کیا جس سے خود اپنا ہی عمل درست کر لیا، دوسرے وہ جنہوں نے زیادہ حصہ حاصل کر کے دوسروں کو بھی تبلیغ کی تیسرے وہ جنہوں نے سرے سے علم وہدایت کو قبول ہی نہ کیا۔ فقیہہ سے مراد عالم بالفقہ ہے۔ یہ اراضی اجادب کے مقابلہ میں ہوا۔ اور عالم نافع بمقابلہ ارض نقیہ ہوا اور یہاں لف ونشر غیر مرتب ہے۔ من لم یرفع بمقابلہ اراضی قیعان ہے۔

(۲) امام نووی نے فرمایا کہ حدیث کی تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ اراضی تین قسم کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح لوگوں کی بھی تین قسمیں ہیں۔ زمین کی پہلی قسم وہ ہے جو بارش سے منتفع ہو۔ گویا وہ مردہ تھی زندہ ہوگئی۔ اس سے غلہ گھاس پھل پھول اگے۔ لوگوں کو، ان کے مویشیوں کو، اور تمام چرند پرند کو اس سے فائدہ پہنچا۔ اسی طرح لوگوں کی وہ قسم ہے جس کو ہدایت وعلوم نبوت ملے ان کو محفوظ کر کے اپنے قلوب کو زندہ کیا ان کے مطابق عمل کیا اور دوسروں کو بھی تعلیم وتبلیغ کی۔ غرض خود بھی پورا نفع اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا۔

دوسری قسم وہ ہے جو خود تو بارش کے پانی سے نفع اندوز نہیں ہوتی نہ پانی کو جذب کرتی ہے۔ البتہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ پانی اس میں جمع ہو جائے اور باقی رہے۔ جس سے لوگوں کو اور ان کے جانوروں کو نفع پہنچتا ہے۔ اسی طرح لوگوں کی بھی دوسری قسم ہے جس کو حق تعالیٰ

نے بہترین اعلیٰ قسم کی حافظہ کی قوتیں عطا فرمائیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے قرآن وحدیث کے الفاظ کو خوب اچھی طرح یاد کیا۔ لیکن ان کے پاس ایسے تیز دوررس دقیقہ سنج ذہن نہیں تھے اور نہ علم کی پختگی، جس سے وہ معانی واحکام کا استنباط کرتے، نہ اجتہادی قوت کہ اس کے ذریعے دوسروں کو عمل بالعلم کی راہیں دکھاتے۔ اس لحاظ سے انہوں نے اپنے علم سے پورا فائدہ نہ اٹھایا۔ لیکن ان کے علم وحافظہ کی صلاحیتوں سے دوسرے اہل علم کو نفع عظیم پہنچ گیا۔ جن کے پاس اجتہاد واستنباط کی صلاحیتیں تھیں۔ انہوں نے ان حفاظ ومحدثین کے علم وحفظ سے فائدہ اٹھا کر دوسروں کو نفع پہنچایا۔

تیسری قسم زمین کی وہ ہے۔ جو بنجر وسنگلاخ ہے۔ جو نہ پانی کو اپنے اندر جذب کر کے گھاس، غلہ وغیرہ اگائے نہ پانی کو اپنے اندر روک سکے۔ اسی طرح لوگوں میں سے وہ ہیں جن کے پاس نہ حفظ وضبط کے لائق قلوب ہیں۔ نہ استنباط واستخراج کی قوت رکھنے والے اذہان وافہام ہیں۔ وہ اگر علم کی باتیں سنتے بھی ہیں تو اس سے نہ خود فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نہ دوسروں کے نفع کے لئے اس کو محفوظ رکھتے ہیں۔ قسم اول منتفع نافع ہے۔ دوسرے نافع غیر منتفع اور تیسرے غیر نافع غیر منتفع۔ اول سے اشارہ علماء کی طرف ہے دوسری سے ناقلین ورواۃ کی طرف تیسری سے ان کی طرف جو علم ونقل دونوں سے بے بہرہ ہیں۔

علامہ عینی کی رائے

علامہ عینی نے امام نووی کی مذکورہ بالا رائے نقل کر کے فرمایا کہ میرے نزدیک علامہ طیبی کی رائے سب سے بہتر ہے۔ کیونکہ زمین کی اگرچہ حدیث میں تین قسمیں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ دو ہی قسم ہیں۔ پہلی دونوں قسمیں محمود ہیں اور تیسری قسم مذموم ہے۔ اسی طرح لوگوں کی ایک قسم ممدوح اور دوسری مذموم ہے۔ پھر علامہ عینی نے کرمانی کے استدلال کو بے محل قرار دیا۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۴۶۹ جلد۱)

علامہ ابن حجر کی رائے: حافظ ابن حجر کی رائے سب سے الگ ہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر نوع دو دو قسم کو شامل ہیں۔ گویا ان کے قول پر تقسیم رباعی بن جاتی ہے۔ چار قسم کی زمین اور چار ہی قسم کے لوگ ہوئے اول کی دو قسم اس طرح ہیں۔

(۱) عالم باعمل معلم، جو بمنزلہ پاکیزہ زمین کے ہے، جو پانی سے خوب سیراب ہو، خود بھی نفع اندوز ہوئی پھر خوب پھل پھول اگائے جس سے دوسروں کو بھی نفع ہوا۔

(۲) جو معلومات جمع کرنے کا دھنی رات ودن علم کی تلاش ولگن میں گزارنے والے، ایک استغراق کا عالم ہے کہ دوسری کسی بات کا دھیان نہیں رکھتا فرائض ادا کئے اور پھر علمی مطالعہ سے کام، حتیٰ کہ نوافل کی طرف بھی توجہ نہیں، یا معلومات بکثرت مگر تفقہ سے بے بہرہ البتہ دوسرے اس کی نقل کردہ چیزوں سے فقہیہ احکام نکال رہے ہیں، یہ بمنزلہ اس زمین کے ہوگا جس میں پانی جمع ہو جائے اور دوسرے اس سے فیض حاصل کریں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ **نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فاداھا کما سمعھا** (حق تعالیٰ تروتازہ (سدابہار) رکھے اس شخص کو جو میری بات سنے پھر ذمہ داری کے ساتھ اسی طرح نقل کردے جیسی اس نے سنی ہے)

اسی طرح دوسری نوع کی بھی دو قسم ہیں

(۱) دین میں تو داخل ہو گیا مگر دین کا علم حاصل نہ کیا یا دین کے احکام سن کر بھی ان پر عمل نہ کیا، تو وہ بمنزلہ اس شور زمین کے ہے جس میں پانی پڑ کر ضائع ہو جاتا ہے کوئی چیز اس میں نہیں آگ سکتی اس کی طرف حدیث میں "**من لم یرفع لذلک راسا**" سے اشارہ ہے، یعنی علم وہدایت سے اعراض کیا نہ خود نفع اٹھایا نہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔

(۲) دین میں داخل ہی نہ ہوا بلکہ دین کی باتیں پہنچیں تو کفر کیا، اس کی مثال اس سخت چکنی ہموار زمین کی سی ہے۔ جس پر سے پانی بہہ گیا اوراس کو کچھ بھی فائدہ اس سے حاصل نہ ہوا۔ جس کی طرف و لم یقبل ھدی اللہ الذی بعثت بہ سے اشارہ کیا گیا۔

علامہ طیبی پر حافظ کا نقد

حافظ ابن حجر نے علامہ طیبی کے اس نظریہ پر نقد کیا ہے کہ حدیث میں صرف ایک جہت اعلیٰ بتلائی گئی ہے اور دو قسموں کو چھوڑ دیا گیا ہے، یعنی ایک وہ جس نے علم سے خود نفع حاصل کیا مگر دوسرے کو فائدہ نہ پہنچایا، دوسری صورت برعکس کہ خود تو اس علم سے نفع نہ اٹھایا مگر دوسروں کو فائدہ پہنچایا، حافظ نے لکھا کہ یہ دونوں صورتیں ترک نہیں کی گئیں۔ کیونکہ پہلی صورت تو قسم اول میں داخل ہے کیونکہ فی الجملہ نفع تو حاصل ہو ہی گیا، اگرچہ اس کے مراتب میں تفاوت ہے، اوراسی طرح اس زمین کا بھی جو اگاتی ہے کہ اس کی بعض پیداوار سے لوگوں کو نفع ہوتا ہے اور بعض سے نہیں جیسے خشک گھاس اور دوسری صورت میں اگر اس شخص نے فرائض کا ترک نہیں کیا صرف نوافل سے پہلوتہی کی ہے تو وہ دوسری قسم میں داخل ہے، اگر ترک فرائض کا بھی مرتکب ہوا تو وہ فاسق ہے۔ جس سے علم حاصل کرنا بھی جائز نہیں۔ اور عجب نہیں کہ اس کو من لم یرفع بذلک راسا کے عموم میں داخل مانا جائے، واللہ اعلم۔ (فتح الباری ص ۱۳۰ ج ۱)

حضرت شاہ صاحب کے ارشادات

فقہ کیا ہے؟ حضرت مولانا محمد چراغ صاحب مراتب ''العرف الشذی'' کی تقریر درس بخاری (غیر مطبوعہ) میں ہے۔ کہ حضرت نے فرمایا فقہ روایت حدیث وحفظ قرآن سے الگ چیز ہے۔ کیونکہ فقہ خواص مجتہدین سے ہے فقیہ وہ ہے جس کو ملکۂ اجتہاد حاصل ہو۔ اس لئے مجتہد کے مقلد اور فقہاء کی عبارات نقل کرنے والے کو فقیہ نہیں کہیں گے۔ (کما صرح بہ فی اوائل البحر) حضرت شاہ صاحب نے یہاں امام شافعیؒ کا مشہور واقعہ نقل کیا جس کو ہم نے کسی دوسری جگہ بھی لکھا ہے کہ ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا گیا۔ جواب دیا اس پر سائل نے کہا کہ فقہاء تو ایسا کہتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ''کیا تم نے کسی فقیہ کو دیکھا ہے؟ ہاں امام محمد بن الحسن شیبانی کو دیکھا ہو تو ہو سکتا ہے کیونکہ وہ قلب ونظر دونوں کو سیراب کرتے تھے'' حضرت حسن بصریؒ سے نقل ہے کہ اپنے مخاطب کو فرمایا کہ فقیہ وہ ہے جو دنیا سے بے رغبت اور آخرت کی طرف راغب ہو۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ سے فقہ کی تعریف'' معرفۃ النفس ما لھا و ما علیھا ''منقول ہے جو سب سے زیادہ اتم واکمل ہے۔

امام بخاری کی عادت

قاع کی تفسیر جو امام بخاری نے کی ہے اس پر فرمایا کہ امام بخاریؒ کی عادت ہے وہ حسب مناسبت مقام مفردات قرآن کے معانی بیان کیا کرتے ہیں۔ اوراس سلسلہ میں ان کا اکثر اعتماد قاضی ابوعبید کی ''مجاز القرآن'' پر ہے۔

حدیث ولغت: حضرت شیخ الہندؒ کا قول نقل فرمایا کہ محدث کو علوم لغت سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ پھر نقل کیا کہ حافظ ابن تیمیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ انہوں نے حافظ ابوالحجاج مزی شافعی کو بخاری شریف سنائی جب حدیث مصراۃ پر پہنچے (مطبوعہ بخاری صفحہ ۲۸۸) تو لا تصرو الابل و الغنم پڑھا باب نصر سے ابوالحجاج نے فوراً ٹوکا اور کہا لاتصرو (باب تفعیل سے پڑھو) اس پر جانبین سے استدلال و استشہاد کے طور پر بہت سے اشعار پڑھے گئے یہ بھی فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ نے متعدد مرتبہ بخاری شریف پڑھی ہے۔

مصراۃ کے بارے میں اہل لغت ومحدثین کے مختلف اقوال ہیں یعنی اس کے احکام میں تو حنفیہ وشافعیہ کا مشہور اختلاف ہے ہی۔ اہل لغت بھی اس میں مختلف ہیں کہ صَرٌّ سے مشتق ہے یا صری سے، امام شافعیؒ صر سے کہتے ہیں اور غالباً اس کو حافظ ابن تیمیہؒ نے اختیار کیا اور عجیب

بات ہے کہ ابوالحجاج شافعی نے اس پر ٹوک دیا۔ غالباً انہوں نے امام شافعیؒ کی تحقیق سے اختلاف کیا ہے اور امام ابوعبید نے بھی صر سے اشتقاق کو رد کیا ہے۔ جس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے ابوعبید کی تحقیق کو حسن اور امام شافعی کے قول کو صحیح قرار دیا اور صحت کی وجہ بیان کی۔ مکمل بحث حدیث مصراۃ کتاب البیوع میں آئے گی۔ جس سے حضرت شاہ صاحب کی حدیث ولغت دونوں میں فضل وکمال کی خاص علمی شان معلوم ہوگی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)

حدیث الباب میں عشب وکلأ کا ذکر ہوا ہے۔ عشبٌ کے معنی تر گھاس کے ہیں جس کے مقابل حشیش ہے۔ خشک گھاس کے لئے بولا جاتا ہے۔ کلأ عام ہے۔ تر وخشک دونوں قسم کی گھاس کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ اس کی جمع اَکْلَاءٌ آتی ہے، عشب کی جمع اعشاب ہے۔ حشیش کا واحد حشیشۃ ہے اور حشیشۃ بھنگ کو بھی کہتے ہیں

کلا کے لفظ پر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ کلا (الف کے بعد ہمزہ) لکھنا غلط ہے۔ اور فرمایا کہ لغت عرب میں ہمزہ نہیں تھی۔ خلیل نحوی نے اس کو شامل کیا۔

بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُوْرِ الْجَهْلِ وَقَالَ رَبِيْعَةُ لَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ شَيْءٌ مِّنَ الْعِلْمِ اَنْ يُّضَيِّعَ نَفْسَهٗ،

(علم کا زوال اور جہالت کا ظہور، حضرت ربیعۃ الرائے نے فرمایا، کسی اہل علم کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ضائع کر دے۔)

(۸۰) حَدَّثَنَا عِمْرَانُ بْنُ مَيْسَرَةَ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ اَبِي التَّيَّاحِ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يُّرْفَعَ الْعِلْمُ وَ يَثْبُتَ الْجَهْلُ وَ يُشْرَبَ الْخَمْرُ وَ يَظْهَرَ الزِّنَا۔

(۸۱) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَاُحَدِّثَنَّكُمْ حَدِيْثًا لَا يُحَدِّثُكُمْ بَعْدِيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يَّقِلَّ الْعِلْمُ وَ يَظْهَرَ الْجَهْلُ وَيَظْهَرَ الزِّنَاءُ وَ تَكْثُرَ النِّسَآءُ وَ يَقِلَّ الرِّجَالُ حَتّٰى يَكُوْنَ لِخَمْسِيْنَ امْرَاَةً الْقَيِّمُ الْوَاحِدُ۔

ترجمہ ۸۰: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ علامات قیامت میں سے یہ ہے کہ علم اٹھ جائیگا اور جہل اس کی جگہ لے گا۔ (علانیہ) شراب پی جائے گی۔ اور زنا پھیل جائے گا۔

ترجمہ ۸۱: حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں تم سے ایک ایسی حدیث بیان کرتا ہوں جو میرے بعد تم سے کوئی نہیں بیان کرے گا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ علامات قیامت میں سے یہ ہے کہ علم کم ہو جائے گا جہل پھیل جائے گا زنا بکثرت ہوگا، عورتوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور مرد کم ہو جائیں گے۔ حتیٰ کہ اوسطاً پچاس عورتوں پر (مضبوط کریکٹر کا) نگران مرد صرف ایک مل سکے گا۔

تشریح: امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب کے تحت دو حدیثیں ذکر کی جن میں علم کا زوال دنیا سے اس کا اٹھ جانا یا کم ہو جانا بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی کے ساتھ جہالت و دین سے لاعلمی کا دور دورہ ہونا ذکر کیا ہے۔ اور چونکہ اس کو دوسری علامات قیامت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دوسری برائیوں کے ساتھ ایک برائی یہ بھی ہے۔ لہٰذا علم کی فضیلت اس کو حاصل کرنے اور دوسروں کو تعلیم دینے کی فضیلت بھی معلوم ہوئی جو پہلے ترجمۃ الباب فضل من علم و علم کے بعد بہت مناسب ہے، اور اگرچہ دونوں حدیث میں زوال علم وکثرت جہل

کے علاوہ دوسری چیزیں بھی بیان ہوئی ہیں، مگر چونکہ سب سے بڑی برائی بلکہ برائیوں کی جڑ دین سے لاعلمی ہے۔ اور علوم نبوت سے دوری و بے تعلقی اس لئے اس کی زیادہ اہمیت کے سبب صرف اسی کا عنوان قائم فرمایا۔ دونوں حدیثوں کا مطلب یہ ہے کہ علم سیکھنے اور علم سکھانے کی فضیلت زیادہ آشکارا ہو جائے۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ جو چیزیں علامات و آثار قیامت میں سے ہیں ان کو دفع کرنے کی فرضیت بتلائی جائے۔ کیونکہ اچھی باتوں پر کاربند ہونا اور برائیوں سے بچنا ہر صورت شرعاً مطلوب ہے اور علم کی ضرورت و اہمیت تو اس لئے بھی واضح ہے کہ وہ عمل کا ذریعہ و مقدمہ ہے۔ جس کو امام بخاری العلم قبل العمل سے بھی بتلا چکے ہیں اس کے علاوہ یہ کہ قرب قیامت میں سے بہت سی وہ باتیں بھی ظاہر ہوں گی جو شرعاً محمود ہیں۔ مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول، حضرت مہدی علیہ السلام کا ظہور اور اس وقت اسلام اور اسلامیات کا شیوع وغیرہ تو اگر یہ اصول فرض کرلیا جائے کہ علامات قیامت کا دفیعہ بقدر طاقت ہر عالم کا فرض ہے تو جو اچھی علامات قرب قیامت کی احادیث و آثار سے ثابت ہوئیں ہیں، خدانہ کردہ ان کا دفیعہ بھی مطلوب ہونا چاہئے حالانکہ ایسا نہیں ہے ہر برائی کو روکنا ہمیشہ سے فرض ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ قرب قیامت کی علامت بننے کی وجہ سے کسی برائی کو روکنے میں مزید شدت کا ثبوت نہیں ہے کہ اگر ہم ایسی علامات کو سختی سے نہ روکیں گے تو ہم قیامت لانے کا سبب بن جائیں گے یا اس وقت تبلیغ و تعلیم کی کوتاہی قیامت کو دعوت دینے کے مترادف ہو جائے گی اور اس کا گناہ و عذاب ڈبل ہو جائے گا۔ علم کی کمی اور جہالت کی زیادتی جب بھی ہوگی اس کے دفیعہ کی سعی کرنا لازمی اور ضروری ہوگا کیونکہ اس کے سبب خدا کی یاد سے غفلت و بے تعلقی اور بے عملی و بدکرداری بڑھے گی۔

بحث و نظر

قول ربیعہ کا مطلب

حضرت ربیعہ نے فرمایا کہ جس کے پاس کچھ حصہ بھی علم کا ہو وہ اپنے نفس کی قیمت سمجھے اس کو کارآمد بنائے اور ضائع نہ کرے۔ شیء من العلم سے مراد فہم علم بھی لی گئی ہے کہ جس کو خدا نے اچھی فہم و عقل دی ہو وہ اس کو کارآمد بنائے۔ علم سیکھے اور سکھائے۔ فہم کی نعمت اسی قابل ہے کہ اس کو علم جیسی قیمتی چیز کے لئے صرف کیا جائے اس کے مقابلہ میں دوسری چیزوں کو مقصود بنانا گویا اس کو ضائع کرنا ہے اور بلید و کم فہم لوگوں کا کام ہے کہ وہ دوسری چیزیں طلب کرتے ہیں۔

دوسرے معانی یہ ہیں کہ فہم نہیں بلکہ علم ہی مراد لیا جائے اور یہی زیادہ بہتر اور مناسب مقام ہے۔ کہ علم کی فضیلت بیان ہو رہی ہے فہم کی نہیں اگرچہ فہم مدار علم ہے۔ حافظ عینی و حافظ ابن حجر وغیرہ نے دونوں معانی ذکر کئے ہیں۔

تذکرہ ربیعہ رضی اللہ عنہ

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ وہی مشہور ربیعۃ الرائی ہیں جو امام مالک کے شیخ ہیں۔ اور امام مالکؒ کا اکثر علم فقہ ان ہی سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ربیعہ نے علم فقہ امام اعظم[1] سے حاصل کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ سلف میں رائے سے مراد فقہ ہوتی تھی اور اہل الرائے کو

---

[1] حافظ عینی نے لکھا ہے کہ حضرت ربیع سے بڑے بڑے حضرات نے روایت حدیث کی ہے، جن میں امام ابوحنیفہ بھی ہیں، اور آپ کی وفات بمقام مدینہ طیبہ یا انبار بزمانۂ دولتِ ابی العباس ۱۳۶ھ میں ہوئی ہے (عمدۃ القاری ص ۴۷۲ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب نے حدیث کی روایت حضرت ربیعہ سے کی، اور تفقہ انہوں امام صاحب سے حاصل کیا ہوگا روایت حدیث میں بہت توسع ہوتا ہے، اور وہ اصاغر و اکابر سب سے ہوتی ہے، حضرت ربیعہ تابعی تھے، حضرت انسؓ ہوگا روایت حدیث میں بہت توسع ہوتا ہے، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بمعنی اہل الفقہ بطور مدح کہا جاتا تھا۔ متاخرین نے رائے کو بمعنی قیاس مشہور کیا اور اس کو بطور تعریض استعمال کرنے لگے۔ چنانچہ بعض شافعیہ نے بطور ہجو و تعریض ہی حنفیہ کو اہل الرائے کا لقب دیا ہے۔ حالانکہ درحقیقت یہ ان کی منقبت و مدح ہے۔

امام محمد نے سب سے پہلے فقہ کو حدیث سے الگ کیا: امام محمدؒ نے سب سے پہلے فقہ کو حدیث سے لے کر مستقل طور سے مدون کیا ہے۔ اور اسی کے سبب ہماری طرف فقہ کی نسبت سب سے پہلے ہوئی۔ اور اہل الفقہ و اہل الرائے کہلائے گئے۔ لہٰذا اہل الرائے کے معنی فقہ کے موسسین و مدونین کے ہیں نہ کہ قیاس کرنے والے یا ظن و تخمین سے بات کرنے والے۔

''پھر یہ کہ ہر مذہب والے نے اپنے مذہب کی فقہ کو حدیث سے الگ کر کے مستقل طور سے مدون کیا ہے۔ صرف حنفیہ کو اس بات پر مطعون کرنا کہاں تک درست ہے؟

اصول فقہ کے سب سے پہلے مدون امام ابو یوسف تھے

اصول فقہ کی تدوین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے نزدیک تاریخی شہادتوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی سب سے پہلے تدوین کرنے والے امام ابو یوسفؒ ہیں امام شافعیؒ نہیں ہیں، جیسا کہ مشہور کیا گیا ہے اور بعض کتابوں میں بھی لکھا گیا ہے، امام ابو یوسف املاء حدیث کے وقت بھی محدثین کو قواعد اصول فقہ بتلایا کرتے تھے، جس کا کچھ حصہ جامع کبیر میں بھی موجود ہے، مگر چونکہ امام شافعی کا رسالہ چھپ گیا اور اس کی اشاعت بھی شافعیہ نے خوب کی، اس لئے یہی مشہور ہو گیا کہ وہ اصول فقہ کے مدون ہیں۔ حنفیہ نے کبھی اس قسم کے پروپیگنڈے وغیرہ کی طرف توجہ نہیں کی، اس لئے اس بارے میں امام ابو یوسف کا نام نمایاں نہیں ہو سکا۔

اضاعت علم کے معنی

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ''شرح تراجم ابواب البخاری'' میں لکھا کہ علم کا اٹھ جانا اور جہل کا ظہور ایک مصیبت ہے مصائب میں سے، اور اسی کو امام بخاری نے حضرت ربیعہؒ کے قول سے ثابت کیا ہے، اضاعت نفس سے مراد لوگوں سے ایک طرف کنارہ کش ہو کر روایت حدیث کا ترک کر دینا ہے، وغیرہ، جس کے سبب علم کے اٹھ جانے اور ظہور جہالت کی مصیبت آئے گی، اسی کو حضرت ربیعہ نے لا ینبغی سے ادا کیا، اور بتلایا کہ ترک روایت کی وجہ سے جہالت آئے گی جو مذموم ہے۔''

واضح ہو کہ یہاں حضرت شاہ صاحب نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ رفع علم و ظہور جہل چونکہ علامات قیامت میں سے ہے اس لئے اس کو روکو، بلکہ یہی فرمایا کہ جو چیز فی نفسہٖ مذموم ہے اس کو کسی قیمت بھی نہ بڑھنے دو، کہ اس کی وجہ سے اچھی چیز کا خاتمہ ہو جائے گا۔

بہر حال ایک معنی تو اضاعت علم کے ترک روایت حدیث کے ہوئے کہ اس کو کسی حال میں ترک نہ کیا جائے۔ دوسری بات اسی کے ضمن میں حضرت شاہ صاحب کے ارشاد مذکور ہی کی روشنی میں یہ بھی نکلی کہ اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ ایک عالم کے لئے اپنے وطن یا دوسرے مستقر میں کسی وجہ سے رہائش دشوار یا بے سود ہو جائے تو اس کو جائز ہے کہ دوسری جگہ جا کر رہے اور اپنے علمی فیض کو جاری رکھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور وہ اصاغر واکابر سب سے ہوتی ہے' حضرت ربیعہ تابعی تھے' حضرت انسؓ سے روایت بھی سنی ہے' مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان کی ولادت کس سنہ میں ہوئی' جس سے اندازہ ہوتا کہ امام صاحب سے عمر میں بڑے تھے یا چھوٹے' واللہ اعلم۔

تہذیب ص ۲۵۹ ج ۳ میں ایک قول ان کی وفات ۱۳۳ھ کا اور ایک ۱۴۲ھ کا بھی درج ہے' تہذیب میں ان کے مناقب تفصیل سے لکھے ہیں' مثلاً یہ کہ مدینہ طیبہ میں صاحب فتویٰ تھے' ان کی مجلس میں بڑے درجے کے لوگ حاضر ہوتے تھے صاحب معضلات (مشکلات مسائل حل کرنے والے) اور اعلم و افضل سمجھے جاتے تھے' کثیر الحدیث تھے' امام مالک نے فرمایا کہ جب سے ربیعہ کی وفات ہوئی' حلاوت فقہ رخصت ہو گئی وغیرہ

اس کے لئے یہ مناسب نہیں کہ حالات یا ماحول سے بددل ہو کر، لوگوں سے متنفر ہو کر تعلیم دین کو ترک کر دے، پس معلوم ہوا کہ تحصیل علم و تعلیم دین و شریعت کا کام کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے معنی اضاعت علم کے یہ بھی بیان کئے گئے ہیں کہ عالم کو اپنی علم کی پوری نگہداشت کرنی چاہیے، مثلاً علم کو ذریعہ حصول دنیا نہ بنائے، حرص و طمع نہ کرے کہ پہلے گزر چکا سب سے بڑی رفع علم کی وجہ علماء کی طمع ہی ہوگی، علم کو اہل دنیا کے تقرب کا ذریعہ نہ بنائے کہ اس سے وہ خود بھی ذلیل ہوگا اور علم کو بھی ذلیل کرے گا، حق کے اظہار میں ادنیٰ تامل نہ کرے کہ یہ بھی علمی شان کے خلاف ہے، آج کل مدارس کے اساتذہ مہتمم مدرسہ یا صدر مدرسہ کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔ اگر وہ کوئی بات ناحق بھی کہیں تو وہ ان کی تائید طوعاً یا کرہاً ضروری سمجھتے ہیں، یا ارباب اہتمام اہل ثروت کی بے جا خوشامد و تملق کر کے مدارس کے لئے روپیہ جمع کرتے ہیں، یا اپنی ذاتی دولت جمع کرنے کے لئے بھی مدارس یا اپنی علمی قابلیتوں کو استعمال کرتے ہیں اس قسم کی سب صورتیں علم اور اہل علم کے شایان شان نہیں اور اضاعت علم کا موجب ہیں، قریبی زمانے میں جو طریقہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے برملا اظہار حق اور اہل ثروت سے بے تعلقی کا سب کو برت کے دکھلا دیا، وہی لائق اتباع ہے ان کی تمام زندگی اس پر شاہد ہے کہ ایک لحہ کے لئے بھی علم دین اور اہل علم کی خفت و ذلت گوارہ نہیں فرمائی اور یہی طریقہ ہمارے دیگر اکابر دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی رہا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی ان کے نقوش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

قلت و رفع علم کا تضاد

آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں رفع علم کو علامات قیامت میں سے فرمایا اور دوسری میں قلت علم کو، مگر ان دونوں میں کوئی تضاد اس لئے نہیں کہ دونوں ایک وقت میں نہ ہوں گے، یعنی علم میں رفتہ رفتہ کمی ہونا ابتدائی مرحلہ ہے، اس کے بعد ایک وقت وہ آجائے گا کہ اس کو بالکل اٹھا لیا جائیگا۔

رفع علم کی کیا صورت ہوگی؟

پھر یہ سوال آتا ہے کہ رفع علم کے آخری زمانہ میں کیا صورت ہوگی؟ آیا علماء کو دنیا سے اٹھا لیا جائے گا یا وہ دنیا میں موجود رہیں گے اور ان کے سینوں سے علم کو سلب کر لیا جائے گا؟

ہمارے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ صحیح بخاری شریف کی روایت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم کو علماء کے سینوں سے نہیں کھینچا جائے گا، بلکہ علماء اٹھا لئے جائیں گے اور ان کے بعد ان کے علوم کو سنبھالنے والے نہ ہوں گے، لیکن ابن ماجہ میں ایک روایت بسند صحیح موجود ہے کہ ایک رات کے اندر علماء کے سینوں سے علم کو نکال لیا جائے گا اور دونوں روایتوں میں توفیق کی صورت یہ ہے کہ ابتداء میں وہی صورت ہوگی جو روایت بخاری میں ہے اور قیام ساعت کے وقت وہ صورت ہوگی جو روایت ابن ماجہ سے ثابت ہے۔

شروح ابن ماجہ: اس موقع پر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ "ابن ماجہ" کے حواشی تو بہت سے علماء نے لکھے ہیں مگر اس کی شرح جیسی ہونی چاہیے تھی لکھی نہیں گئی، البتہ نقل ہوا ہے کہ محدث شہیر حافظ علاء الدین مغلطائی حنفی نے اس کی شرح بیس جلدوں میں لکھی تھی، یہ محدث آٹھویں صدی کے اکابر علماء محدثین میں سے تھے، حافظ ابو الحجاج مزی شافعیؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ کے معاصرین میں سے تھے، ہم نے مقدمہ انوار الباری ص ۱۳۲ /۱ میں آپ کے حالات لکھے ہیں، اور آپ کی دوسری تالیفات قیمہ کا ذکر ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۳۶۶ میں ہے ذیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نہ صرف تہذیب الکمال کا ذیل لکھا بلکہ اس کے اوہام بھی جمع کئے اور اوہام اطراف بھی درج کئے جو رجال و سند

کے نہایت علم پر دال ہے، مگر حافظ نے در کامنہ میں صرف ذیل تہذیب الکمال کا ذکر کیا ہے۔

یہ تھا ہمارے محدثین احناف کا ذوق علم حدیث کہ جس کتاب کی دوسرے حضرات نے خدمت صرف حواشی تک کر کے چھوڑ دی شیخ مغلطائے حنفی اس کی شرح بیس جلدوں میں لکھ گئے (رحمہم اللہ تعالیٰ)

قلت و کثرت کی بحث

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حدیث بخاری میں تو یہاں یقل العلم ہے لیکن دوسری روایت میں جو حاشیہ نسائی پر بطور نسخہ درج ہے، یکثر العلم ہے، اور وہ بھی اس لحاظ سے صحیح ہے کہ علم واسباب علم کی بظاہر تو مقدار میں زیادتی نظر آئے گی جیسی آج کل ہمارے زمانے میں ہے مگر علم کی کیفیات خاصہ، نور، بصیرت، برکت وغیرہ کم ہو جائے گی، اس لئے علماء باوجود کثرت تعداد کے قلت میں ہوں گے، جیسے متنبی نے کہا

لا تكثر الاموات كثرة قلة الا اذا شقيت بك الاحياء

متنبی کہتا ہے کہ اے ممدوح تو نے اپنی بے مثل شجاعت اور اعلاء حق کے جذبہ سے دنیا کے بدکار، نامعقول، مفسد باغی لوگوں کا دنیا سے اتنا صفایا کر دیا ہے کہ دیکھنے والے لوگوں کو یہ گمان ہونے لگا ہے کہ مرنے والوں کی تعداد موجودہ زندہ رہنے والوں سے بڑھ گئی ہے۔ یعنی مردوں کی کھلی اکثریت کے باعث زندوں کی اکثریت کا اعتراف ناگزیر ہو گیا ہے۔ کثرت قلت کا یہی مطلب ہے مگر حقیقت یہ نہیں ہے، کیونکہ جتنے لوگ بھی رہ گئے خواہ وہ تعداد میں کم بھی ہوں، وہ سب صلاح و فلاح کے حامی اور تیری سرپرستی کے سبب نیک بخت و خوش نصیب ہیں، ان کو کم نہیں کہا جا سکتا، ہاں! اگر بالفرض یہ سب بھی تیری نگاہ لطف و کرم سے محروم ہو کر بدبخت ہو جائیں تب یہ کہا جائے گا کہ دنیا کے لوگ قلت کی زد میں آ گئے۔

اسی طرح علم زندگی ہے اور جہالت موت، اور علم کی کثرت و قلت کا مدار اس کی مقبولیت عنداللہ پر ہے۔ اگر تھوڑا بھی ہے مگر مقبول اور صحیح علم ہے جس کے ساتھ عمل ہو، اخلاص ہو، دنیا کی حرص و طمع کی کالک اس پر نہ لگی ہو تو وہ حقیقت میں کثیر در کثیر ہے، اور اگر علم بکثرت ہے مگر صحیح نہیں، اس کے ساتھ زیغ ہے، فساد ہے، خبث باطن ہے، دنیا کی حرص و طمع ہے، تو وہ نہ صرف ہیچ در ہیچ بلکہ وبال پر وبال ہے (مؤلف)

زنا کی کثرت: دوسری علامت قرب قیامت کی زنا کی کثرت بتلائی گئی ہے، اس کے بڑے اسباب دین و علم سے بے تعلقی، خدا کا خوف دلوں سے اٹھ جانا، بے حیائی اور بے شرمی کا عام ہو جانا اور کریکٹر کی خرابی ہے اور بے پردگی اس کا سب سے پہلا قدم ہے۔ چنانچہ آوارہ مزاج انسان کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ بے پردگی کی حمایت کرے گا، ہمارے ہندوستان میں بھی بے پردگی کی وبا عام ہوتی جا رہی ہے۔ اور لوز (Loose) یعنی ڈھیلے کریکٹر کے لوگ اس کو پسند کرتے ہیں، ایک بڑے شخص نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ پردہ نشین خواتین کے برقعوں کو دیکھ کر میرا خون کھولتا ہے، اسلام کی تعلیم چونکہ ہر بے حیائی کے خلاف ہے اور وہ نہایت مضبوط کریکٹر کو پسند کرتی ہے اس لئے اس نے نہ صرف زنا کو حرام قرار دیا بلکہ اسباب و دواعی زنا نظر و اختلاط وغیرہ کو بھی ممنوع قرار دے دیا ہے۔ حیاء بھی چونکہ ایمان کا ایک شعبہ ہے اس لئے قرب قیامت میں اور خوبیوں کی طرح وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہو کر فنا ہو جائے گی، اور زنا اور دواعی زنا کی کثرت ہو جائے گی، جبکہ دنیا کی مہذب کہلانے والی غیر مہذب قومیں اس کو برا بھی نہ سمجھیں گی۔ وما ذا بعد الحق الا الضلال؟

عورتوں کی کثرت

تیسری علامت عورتوں کی کثرت اور مردوں کی قلت بتلائی گئی ہے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرب قیامت میں فتنوں کی

کثرت، اور جنگوں کی زیادتی ہوگی جن میں مرد زیادہ کام آئیں گے اور عورتوں کی کثرت زیادہ ہو جائے گی، جیسا کہ عموماً جنگوں کے بعد اور خصوصاً جنگ عظیم وغیرہ کے بعد ہوا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حق تعالیٰ کی مشیت ہی کچھ اسباب و مصالح کے تحت ایسی ہو اور اس کے وہ اسباب و مصالح ہمیں نہیں بتلائے گئے۔ اس وجہ کا ذکر علامہ عینی نے بھی کیا ہے اور پھر یہ بھی لکھا کہ ممکن ہے کہ کثرت جہل بھی کثرت نساء کے سبب ہو، اور پھر کثرت فساد و عصیان بھی کہ عورتیں شیطان کے جال ہیں اور ان کا نقصان دین و عقل بھی مسلم ہے۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۴۷۵ ج ۱)

باقی جو وجہ صاحب ایضاح البخاری نے ذکر کی ہے کہ قرب قیامت میں زنا بہت ہوگا اور واقعات شاہد ہیں کہ زنا کرنے والوں کے یہاں اولاد ذکور کم ہوتی ہیں پھر اس کی ایک عقلی وجہ بھی لکھی ہے وہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی نہ کسی جگہ نظر سے گزری۔

قیم واحد کا مطلب

حدیث الباب میں یہ بھی ذکر ہے کہ قرب قیامت میں مردوں کی اتنی قلت ہو جائے گی کہ پچاس عورتوں پر صرف ایک نگران و قیم ہوگا۔

حافظ عینی نے لکھا:- ممکن ہے کہ واقعی یہی عدد مراد و متعین بھی ہو، یا مجازاً اس سے کثرت مراد ہو، حافظ ابن حجر نے علامہ قرطبی سے نقل کیا کہ قیم سے مراد یہ ہوسکتی ہے کہ پچاس عورتوں کی دیکھ بھال اور ان کی ضروریات کا تکفل ایک مرد کو کرنا پڑے اس سے یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کے ازدواجی تصرف میں بھی ہوں اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایسی صورت بالکل آخر زمانے میں ہو جبکہ اللہ اللہ کہنے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ تو اس وقت اس قسم کے تصرف کے جواز و عدم جواز کا سوال بھی نہ رہے گا۔ ایک ایک شخص جتنی عورتوں سے چاہے گا تعلق کر لے گا کہ نہ وہ حکم شرعی کو جانے گا اور نہ مانے گا، حافظ نے اس کو نقل کر کے لکھا کہ ایسی صورتیں ہمارے زمانے کے بعض امراء میں بھی دیکھی گئی ہیں حالانکہ وہ اسلام کے مدعی ہیں۔ واللہ المستعان (فتح الباری ص ۱۳۱ ج ۱)

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ عجیب بات ہے کہ حافظ کو پچاس کے عدد میں اشکال پیش آیا اور بیان توجیہات میں لگ گئے۔ حالانکہ دوسرے طریق سے یہی حدیث اس طرح مروی ہے کہ کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں القیم الواحد الامین ہے اور امین کی قید سے ساری بات صاف ہوگئی۔ یعنی قرب قیامت میں امانت دار لوگوں کی نہایت کمی و ندرت ہوگی خصوصاً عورتوں کے بارے میں مضبوط کریکٹر کے آدمی دو فیصد رہ جائیں گے۔ یعنی ایک تو مردوں کی کمی یوں بھی ہوگی پھر جو ہوں گے ان میں بھی اچھے اخلاق و کریکٹر کے لوگ نہایت کم ہوں گے۔ جیسے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ لوگوں کی مثال اونٹوں جیسی ہے۔ کہ سو اونٹوں میں سے بمشکل ایک اونٹ اچھی سواری کے لائق ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

شراب کی کثرت: یہ بھی علامت ساعت میں سے ہے۔ لیکن یہاں امام بخاریؒ نے صرف یشرب الخمر والی روایت ذکر کی ہے۔ اور کتاب النکاح میں بطریق ہشام عن قتادہ ویکثر شرب الخمر کا الفاظ ذکر کئے ہیں۔ حافظ نے اسی قید کو ملحوظ رکھ کر یہاں لکھا کہ مراد بکثرت شراب پینا ہے۔ تا کہ اشراط ساعت میں سے بن سکے۔ ورنہ صرف شراب پینے کا ثبوت تو ہر زمانے میں ملتا ہے۔ حتیٰ کہ حضور علیہ السلام کے زمانے میں بھی ہے۔ بلکہ حضور علیہ السلام نے بعض لوگوں پر اس کے سبب پر حد بھی قائم کی ہے۔

حافظ عینی کی رائے ہے کہ صرف شرب خمر بھی اشراط ساعت سے ہے۔ جیسا کہ یہاں بغیر قید کثرت وغیرہ مروی ہے۔ اور کثرت شرب بھی اشراط ساعت سے ہے۔ جیسا کہ ہشام کی روایت میں آگے آئے گا۔ کیونکہ ایک چیز کے کئی سبب ہو سکتے ہیں مثلاً ملک کا سبب شراء ہے ہبہ صدقہ وغیرہ بھی ہے۔

حافظ ابن حجر پر نقد: علامہ عینی نے لکھا کہ حافظ ابن حجر نے اس بارے میں غلطی کی ہے اور انہوں نے شاید اس بات کو کرمانی سے لیا ہے انہوں نے اعتراض رفع کرنے کے لئے کہا تھا کہ اول تو صرف شرب خمر مراد نہیں بلکہ اس کی کثرت مراد ہے۔ ورنہ شرب خمر کو مستقل علامت ساعت نہ بنانا چاہیے۔ اور کہنا چاہیئے کہ متعدد امور کا مجموعہ ملکر اشراط ساعت میں بیان ہوئے ہیں۔

امور اربعہ کا مجموعہ علامت ساعت ہے

پھر حافظ عینیؒ نے لکھا کہ یہ بات تو صحیح نہیں کہ جو چیز حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں ہوئی ہو اس کو علامت ساعت میں سے نہیں بنا سکتے البتہ دوسری بات جو علامہ کرمانی اور حافظ نے لکھی ہے کہ مجموعے کو اشراط ساعت قرار دیا جائے یہ درست و صحیح ہے اور ہم بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے چاروں چیزوں کو حرف جمع کے ذریعہ یکجا ذکر فرمایا ہے۔

غرض حافظ عینی نے لکھا کہ ہمارے نزدیک بھی سب امور کا مجموعہ علامت ہے اور ہر امر مذکور اس کا ایک جز ہے۔ پس ہر چیز مستقل علامت نہیں لہٰذا شراب خمر، اس کی کثرت، شہرت وغیرہ بھی اس کے اجزاء ہیں۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۳۴۷ ج ۱)

فائدہ جلیلہ: حافظ عینی نے آخر میں خاص طور پر صرف امور مذکورہ کو بطور اشراط ساعت ذکر فرمانے کی بہترین توجیہ بھی فرمائی جو یہاں ذکر کی جاتی ہے فرمایا جتنی چیزیں حدیث میں ذکر کی گئی ہیں وہ سب ان امور میں خلل ڈالتی ہیں جن کی حفاظت ورعایت ہر مذہب و دین میں ضروری و لازمی قرار دی گئی ہے اور ان کی حفاظت پر ہی معاش، معاد اور دنیا اور آخرت کا نظام قائم ہے وہ امور یہ ہیں۔ دین، عقل، نفس، نسب و مال، پس

(۱) علم کی کمی یا اس کے فنا ہونے سے تو دین کی حفاظت میں خلل آئے گا اور وہ خطرے میں پڑ جائے گا۔

(۲) شراب کی عادت و کثرت سے عقل میں خلل آئے گا مال ضائع ہوگا اور ہوش و حواس مختل ہو کر بہت سے مفاسد رونما ہوں گے

(۳) قلت رجال و کثرت نساء کے سبب لوگوں میں مزید فتنے و فساد پھیلیں گے۔ یہ خلل فی النفس ہوگا۔

(۴) زنا کی کثرت کے سبب نسب میں فرق پڑے گا۔ اور اس کی حفاظت سخت دشوار ہو جائے گی۔ ساتھ ہی اس سے مال بھی بے جا صرف و ضائع ہوگا۔

(۵) مال کی اضاعت علم حلال و حرام نہ ہونے اور جمع اور صرف کا ناجائز طریقوں کے رواج پانے نیز دوسرے امور شراب زنا وغیرہ کی کثرت کے باعث ہوگی کیونکہ نظر شارع میں عقل سلیم کے نزدیک بھی غلط طریقوں پر مال کا صرف ہونا اس کی اضاعت ہی ہے۔

دوسرا فائدہ مہمہ: اس کے بعد حافظ عینیؒ نے ایک اور بہت اونچی تحریر فرمائی کہ کوئی کہہ سکتا ہے ان امور کا اختلال علامت قیامت سے کیوں قرار دیا گیا، جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کو آزاد و بے مہار نہیں چھوڑ سکتے اور کوئی نبی اب آنے والا نہیں ہے جو ایسی عام خرابیوں کی اصلاح کر سکے لہٰذا ان عالمی خرابیوں کے باعث سارے عالم کی خرابی و بربادی متعین ہوگئی۔ اور قرب قیامت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے ایک بہت بڑا نشان نبوت کی صداقت کے نشانوں میں سے ظاہر ہو۔ کیونکہ اس میں ان امور کی خبر دی گئی جن کا وقوع سب کے سامنے ہوتا جا رہا ہے۔ خصوصاً ہمارے زمانہ میں۔ واللہ المستعان (عمدۃ القاری صفحہ ۳۷۶ ج ۱)

علامہ قرطبی کے زمانے سے ہمارے زمانے تک جو کچھ خرابیوں میں مزید اضافے ہوا وہ بھی سب پر روشن ہیں۔ واللہ یوفقنا لما یحب و یرضی. (مؤلف)

بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

علم کی فضیلت کا باب

(۸۲) حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنِي اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي عُقَيْلٌ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بَيْنَمَا اَنَا نَائِمٌ اُتِيْتُ بِقَدَحِ لَبَنٍ فَشَرِبْتُ حَتّٰى اِنِّيْ لَاَرَى الرِّيَّ يَخْرُجُ فِيْ اَظْفَارِيْ ثُمَّ اَعْطَيْتُ فَضْلِيْ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالُوْا فَمَا اَوَّلْتَهٗ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ الْعِلْمَ.

ترجمہ: حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں سو رہا تھا (اسی حالت میں) مجھے دودھ کا ایک قدح دیا گیا میں نے خوب اچھی طرح پی لیا حتی کہ میں نے دیکھا کہ اس کی تازگی میرے ناخنوں میں جھلک رہی ہے۔ پھر میں نے اپنا پس ماندہ عمر بن الخطاب کو دے دیا۔ صحابہ نے پوچھا کہ آپ نے اس کی کیا تعبیر لی؟ آپ علیہ نے فرمایا علم۔

تشریح: ابتدائے کتاب العلم میں بیان ہو چکا ہے کہ وہاں راجح قول کے مطابق علم کی فضیلت بلحاظ رفع درجات علماء کے مذکور ہوئی تھی۔ اور یہاں اس حیثیت سے بیان ہوئی کہ علم حضور علیہ کے لئے نہایت گراں قدر خداوندی عطایا و مواہب میں سے ہے۔ اور اسی علم نبوت کا کچھ حصہ جو بطور بچا کھچا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نصیب ہوا اور ان سے واسطہ بواسطہ ساری امت کو پہنچا۔

عطاء روحانی و مادی کا فرق

علم وغیرہ روحانی عطایا کی شان مادی عطیات سے بالکل الگ ہے، کہ وہاں عطاء کرنے والے کے پاس باوجود عطاء و تقسیم کمی نہیں آتی۔ جیسے سورج کے نور سے سارے ستارے روشنی حاصل کرتے ہیں اور سورج کے نور میں کچھ کمی نہیں آتی اور یہاں مادی اشیاء میں بقدر عطاء و تقسیم کمی ہو جاتی ہے۔

علوم نبوت بہر صورت نافع ہیں

دوسرے یہ کہ علوم نبوت و شرائع میں سے اگر کوئی جزو کسی کے لئے بوجہ مجبوری و معذوری کار آمد نہ ہو تو دوسروں کے لئے ذریعہ تعلیم مفید و کار آمد ہو جاتا ہے۔ اس لئے علم کے بارے میں بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ فلاں وجہ سے وہ علم عالم کے پاس فاضل و زائد ہے۔

علم ایک نور ہے: تیسرے یہ کہ علم ایک نور ہے جس سے قلب و دماغ اور سارے جوارح میں روشنی کی کرنیں پھیلتی ہیں، فرض کیجئے کہ ایک عالم کے پاس بقدر فرضیت حج و زکوٰۃ و جہاد وغیرہ مال نہیں تو کیا اس کے علم مسائل حج و زکوٰۃ و جہاد وغیرہ کو فاضل و زائد کا مرتبہ دیں گے؟ بعض حضرات نے باب فضل العلم کے تحت حدیث فضل اللبن سے یہ سمجھا کہ جس طرح حضور اکرم علیہ نے اپنا بچا ہوا دودھ حضرت عمر کو خواب میں عطاء فرمایا۔ اور اس کی تعبیر علم سے ارشاد فرمائی۔ اسی طرح علم کے لئے بھی ایسی فاضل و زائد یا بچی ہوئی صورتیں نکالی جائیں، حالانکہ بات یہاں پہنچ کر ختم ہوگئی کہ دودھ کی تعبیر علم سے ہے۔ اور جو کچھ حضرت عمر کو عطاء ہوا وہ تمام علوم نبوت و شرائع کے لحاظ سے بطور

فضل کے ہے۔اوراسی طرح جتنے علوم تمام صحابہ وامت کوحضوراکرم علیہ کے صدقہ میں مل گئے وہ بھی سب بطور فضل وزائد ہی ہیں۔گوفی نفسہ وہ تمام سابقہ امتوں کے مجموعی علوم سے بھی بڑھ جائیں۔پھر نیة المؤمن خیر من عمله اگر ایک شخص نے باوجود افلاس مسائل حج، زکوٰۃ وجہاد حاصل کئے تو اس کونیت کا ثواب تو ضرور ہی ملتا رہے گا اور عجب نہیں کہ آخر عمر میں دولت مند بھی ہوجائے اور یہ سارے فرائض ادا کرلے اور معذوری بھی کیا ہوسکتی ہے۔ایک شخص مفلوج یا لنگڑا لنجا، نابینا وغیرہ بھی اگر دولت مند ہے تو موٹر یا ہوائی جہاز سے حرمین شریفین حاضر ہوسکتا ہے۔شبری میں طواف، سواری پرسعی اور وقوف عرفہ وغیرہ سب ارکان ادا کرسکتا ہے اسی طرح جہاد میں شرکت کے بھی بہت سے طریقے نہایت مؤثر اختیار کرسکتا ہے، رہا یہ کہ فضل العلم سے مراد زائد کتابیں وغیرہ ہوں تو کتابوں وغیرہ کو علم قرار دینا ہی غلط ہے۔ان کو صرف حصول علم کا ذریعہ ووسیلہ کہہ سکتے ہیں۔

زائد از ضرورت علم مراد لینا محل نظر ہے

فضل العلم سے زائد از ضرورت علم مراد لینا بھی محل نظر ہے کیونکہ فضل کے معنی کسی چیز کو صرف کرنے کے بعد جو بچ جاتا ہے، اس کے ہیں، جیسے فضل الوضوء (وضو سے بچا ہوا پانی) زائد اور وہ بھی ضرورت سے زائد کا معنی نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے

آپ کی رائے یہ ہے کہ فضل العلم سے مراد اگر یہاں بمعنی ماقی (بچا کھچا) بھی ہو تو یہ عنوان امام بخاری نے بطور استغراب کے باندھا ہے، یعنی عجیب چیز بتلانے کے لئے کہ اور اکثر چیزیں تو عطاء کرنے سے کم ہوجاتی ہیں، علم کی شان دوسری ہے کہ وہ دینے سے کم نہیں ہوتا۔ جیسے حضور اکرم علیہ نے اپنا بچا ہوا دودھ حضرت عمرؓ کو دیا اور اس کی تعبیر بھی علم سے فرمائی، پھر بھی ظاہر ہے کہ آپ علیہ کے علم مبارک میں سے کچھ کم نہیں ہوا۔

باقی رہا یہ کہ زائد علم سے مراد فن زراعت، تجارت، صنعت وحرفت وغیرہ کا علم مراد لیا جائے، تو اس کی گنجائش اس لحاظ سے ضرور ہے کہ تمام پیشے اور حرفے بروئے شریعت اسلامی فرض کفایہ ہیں اس لئے ان کا علم اور ان سے متعلق مسائل شریعت کا علم حاصل کرنا بھی فرض کفایہ ہیں۔

اس کے بعد موجودہ دور کی حکومتوں کی ملازمتوں کے حصول کے لئے خاص خاص نصاب پڑھ کر ڈگریاں حاصل کرنا ہے۔ان علوم کی تحصیل وتعلیم کو فضیلت علم دین وشرائع کے تحت لانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں نہ ان سے کوئی روحانی فضل وکمال ہی حاصل ہوتا ہے۔البتہ ان کے جواز میں شبہ نہیں بشرطیکہ ان کو پڑھنے سے عقائد واعمال پر کوئی برا اثر نہ پڑے اور کسی غیر شرعی نظام کو تقویت نہ پہنچے تو اس کے ذریعہ ملازمت کرنا بھی درست ہے۔تاہم بنظر احتیاط وبطور تقویٰ ہمارے اسلاف واکابر ان علوم سے احتراز پسند کرتے تھے اس کے بعد دوسرا دور وہ آیا کہ کچھ علماء نے بھی اپنے لڑکوں کو مروجہ حکومت کے سکولوں وکالجوں میں تعلیم دلانا شروع کی۔

لڑکیوں کے لئے کالجوں کی تعلیم

اور اب ایسا بھی دیکھا جارہا ہے کہ بعض اچھے اہل علم اپنی لڑکیوں کو بھی اسکولوں وکالجوں میں پڑھانے لگے ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکیوں کو بی اے، ایم اے وغیرہ تک تعلیم دلانے کا جواز کس ضرورت کے تحت نکالا گیا ہے۔عورتوں کی ضرورت سے زیادہ عصری تعلیم کے مضر نتائج یورپ امریکہ وروس وغیرہ میں منظر عام پر آچکے ہیں اور اس کے سب سے زیادہ مضر اثرات ازدواجی زندگی پر پڑ رہے ہیں۔جس کو

بہتر سے بہتر بنانے کے لئے اسلامی تعلیمات کا بڑا حصہ وقف ہوا ہے۔ پھر اگر علماء ہی اس کو نظر انداز کریں گے تو دوسرے اس کا پاس ولحاظ کیسے اور کب کریں گے؟ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہمیں سرے سے تعلیم نسواں کی ضرورت ہی سے انکار ہے۔ ہرگز نہیں! مگر جس اونچی تعلیم کے مضر اثرات مشاہدہ معلوم ہیں اس کو مفید بھی نہیں کہا جاسکتا۔

عصری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم

اسی کے ساتھ گذارش ہے کہ جن حضرات کو واقعی اس بارے میں شرح صدر ہوگیا ہے کہ لڑکیوں کو اونچے درجے تک عصری تعلیم دلائی جائے ان کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ ان صاحبزادیوں کو دینی تعلیم بھی اس معیار سے دلائیں کہ وہ عصری تعلیم کے برے اثرات سے محفوظ رہیں۔

ذکر حضرت لیث بن سعدؒ:

حدیث الباب کی روایت میں ان جلیل القدر محدث وامام مصر کا ذکر ہے۔ ان کے حالات ہم نے مقدمہ انوارالباری صفحہ ۲۱۹ جلد ۱ میں لکھے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے بھی اس مقام پر ان کے مناقب وحالات ارشاد فرمائے۔ اور تاریخ ابن خلقان کے حوالہ سے ان کا حنفی ہونا نقل فرمایا۔ اور طحاوی شریف باب القراءۃ خلف الامام میں حدیث" من کان له امام فقراء ة الامام له قراء ة" کا امام لیث بن سعد کی سند سے مروی ہونا ذکر کیا۔ اس میں حضرت لیث امام ابویوسف اور امام ابویوسف، امام اعظم سے وہ حضرت موسیٰ بن ابی عائشہ سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ اسناد بھی حضرت لیث کے حنفی ہونے کا قرینہ ہے۔ امام شافعی ایسے محدث اعظم اور امام مجتہد کو حضرت لیث سے ملنے کی تمنا رہی ہے اور نہ ملنے کا سخت افسوس کیا کرتے تھے۔

قول علیہ السلام "لاری الریَّ" کے معنی

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ باب محاورات سے ہے اور عام محاوروں میں ایسے طریقے پر کہا جایا کرتا ہے اس لئے ان باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہئے کہ ایک نہ دیکھی جانے والی چیز کو کیسے دیکھا؟

تذکرہ حضرت بقی بن مخلد

اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے محدث کبیر بقی بن مخلد کا قصہ ذکر کیا جو شیخ اکبر نے نصوص میں لکھا ہے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو دودھ پلایا۔ بیدار ہونے پر انہوں نے اپنے خواب کی تصدیق کے لئے قے کی تو اس میں دودھ نکلا۔ اس پر شیخ اکبر نے لکھا کہ وہ دودھ تو علم تھا اس کو نہ نکالتے تو اچھا ہوتا۔ کیونکہ قے کرنے کے سبب وہ علم دودھ کی صورت میں بدل گیا اور باہر ہوگیا۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا میرے نزدیک قے کرنے سے کوئی حرج نہیں ہوا۔ اس لئے کہ جو علم نبوی ان کے مقدر میں تھا وہ ان کو ضرور مل کر رہا۔ قے کرنے کے سبب وہ اس سے محروم نہیں ہوئے۔ جس طرح حضور اکرم ﷺ نے فضل لبن حضرت عمرؓ کو دیدیا اور حضور ﷺ کے علم میں سے کچھ بھی کم نہیں ہوا۔

حضرت مولانا محمد چراغ صاحب کی ضبط کردہ تقریر درس بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے حضرت شیخ الہند کا یہ ارشاد بھی نقل کیا۔ شیخ اکبر یہ سمجھے ہیں کہ بقی نے خواب کو صرف ظاہر وحس پر محمول کر کے اس کی تعبیر بھی ظاہری وحسی خیال کی۔ لہٰذا اب تعبیر معنوی

''علم'' کا کوئی موقع نہ رہا۔اس لئے ان سے خطا ہوئی۔مگر حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ میرے نزدیک بقی سے کوئی خطانہیں ہوئی نہ انہوں نے تعبیر صرف ظاہری وحسی سمجھی بلکہ تعبیر کوحسی ومعنوی دونوں طرح مان کر اپنے خواب کی تصدیق ظاہر میں کر کے صداقت رسول علیہ کا مظاہرہ اس نہج سے بھی کر دیا۔جس سے معنوی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ بقی بن مخلد بڑے جلیل القدر محدث تھے۔امام بخاری کے معاصر امام احمد کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ان سے بہت بڑا علم کا حصہ غالباً اس زمانے میں حاصل کیا ہے۔جب کہ امام احمد درس دیا کرتے تھے۔کیونکہ جب سے خلق قرآن کے مسئلہ میں مبتلائے حوادث ہوئے تھے درس کا مشغلہ چھوٹ گیا تھا۔فیض الباری اور مولانا محمد چراغ صاحب کی تقریر درس بخاری قلمی میں بقیع بن مخلد ضبط ہوا ہے جو بظاہر غلط ہے نہ ہمیں اس نام سے کسی محدث کا تذکرہ ابھی تک مل سکا ہے۔حضرت شاہ صاحب نے حافظ ذہبی کے حوالہ سے یہ بھی فرمایا کہ انہوں نے حدیث کی ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں تیس ہزار احادیث جمع کی تھیں۔حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ مسند احمد میں چالیس ہزار احادیث ہیں اوران کے بعد کنز العمال میں احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں بقی بن مخلد کے حالات لکھے ہیں۔جس میں ان کو صاحب المسند الکبیر لکھا۔(غالباً اس سے اسی مسند کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا) نیز صاحب التفسیر الجلیل لکھا جس کے بارے میں ابن حزم کا قول نقل کیا کہ ''ایسی تفسیر آج تک نہیں کی گئی'' ابن ابی شیبہ وغیرہ کے تلمیذ تھے یہ بھی لکھا کہ امام علم قدوۃ مجتہد تھے کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے۔وغیرہ اندلس کے علماء وفقہاء نے ان کے ساتھ ان کے عمل بالحدیث اور عدم تقلید کے سبب تعصب کا برتاؤ کیا۔توامیر اندلس نے ان کی طرف سے مدافعت کی اوران کی کتابیں لکھوائیں اوران سے کہا کہ اپنا علم پھیلاؤ۔ابن حزم نے یہ بھی لکھا کہ بقی بن مخلد کو امام احمد سے بڑی خصوصیت حاصل تھی۔اور وہ بخاری ومسلم ونسائی کے ہمسر تھے۔طلب علم کے لئے، مشرق ومغرب کے سفر کئے ہیں۔اور خود بقی کا بیان ہے کہ جس کے پاس بھی میں طلب علم کے لئے گیا ہوں۔تو پیدل چلکر اسکے پاس حاضر ہوتا تھا۔مجاب الدعوۃ تھے۔ہررات تیرہ رکعات میں ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے۔ولادت ۲۰۱ھ میں اور وفات ۲۷۶ھ میں ہوئی۔حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی نے ''امام ابن ماجہ اور علم حدیث'' صفحہ ۴۹ میں اس آخری قصہ کو '' نفح الطيب عن غصن الاندلس الرطيب'' سے دوسرے طریقہ پر نقل کیا ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بقی بن مخلد اپنے استاذ محترم ابن ابی شیبہ کی مصنف مشہور لے کر اندلس میں داخل ہوئے اور لوگوں نے ان کے پاس اس کو پڑھنا شروع کیا۔تو فقہاء کو اپنے مسائل کا خلاف ناگوار ہوا۔اور شیخ الاسلام بقی بن مخلد پر یورش کر کے کتاب مذکور کی قراءت بند کرادی۔اس زمانے کے فرمانروا محمد بن عبدالرحمٰن اموی نے جو خود بھی بڑا ذی علم اور علماء کا قدردان تھا موافقین ومخالفین کو اپنے دربار میں بلوا کر کتاب سنی اور پھر اپنے سرکاری کتب خانہ کے ناظم کو حکم دیا کہ اس کتاب کی نقل ہمارے کتب خانہ کے لئے بھی کراؤ۔اور بقی سے کہا کہ آپ اپنے علم کی نشر واشاعت کریں اور جو روایات آپ کے پاس اپنی ہیں وہ لوگوں کو سنائیں۔فریق مخالف کو ہدایت کی کہ آئندہ ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں۔

معلوم ہوا کہ عدم تقلید، صرف ظواہر حدیث پر عمل، اور ائمہ مجتہدین کے فیصلہ شدہ مسائل کے خلاف کو اس کے ابتدائی دور میں بھی پسند نہیں کیا جاتا تھا۔واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

تقلید وعمل بالحدیث

تقلید ائمہ مجتہدین کے خلاف سب سے زیادہ مؤثر حربہ یہ استعمال کیا گیا ہے کہ اس کو عمل بالحدیث کے مقابل وضد قرار دیا گیا ہے۔

حالانکہ یہ صریح مغالطہ ہے۔ چنانچہ علامہ محدث شیخ عبداللطیف سندی نے ''ذب ذبابات الدراسات'' صفحہ ۳۵۸ ج ا میں لکھا: ''ائمہ اربعہ آپ کے اصحاب ومقلدین اہل عدل وانصاف واکثر محدثین حتمی ویقینی طور پر صرف آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس کو ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں حَکَم وحاکم تسلیم کرتے ہیں اور آپ کے منصوص ارشادات واحکام کی موجودگی میں کسی قیاس ورائے کو جائز نہیں سمجھتے، بلکہ اس کو حرام سمجھتے ہیں۔حتیٰ کہ کسی صحابی کی رائے کو بھی سنت وحدیث رسول کے مقابلہ میں اہمیت نہیں دیتے۔ان کا طریقہ احادیث صحیحہ وحسنہ کی موجودگی میں صرف تمسک بالحدیث ہی ہے۔البتہ کسی مسئلہ میں احادیث متعارضہ مروی ہوں تو ان میں جمع وترجیح کی کوشش اپنی آراء سے ضرور کرتے ہیں۔غرض وہ کسی حال میں بھی آراء رجال کی وجہ سے احادیث رسول کو ترک نہیں کرتے۔رحمہم اللہ تعالیٰ۔ (تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۶۲۹ ج ۲)

بَابُ الْفُتْیَا وَھُوَ وَاقِفٌ عَلَی ظَھْرِ الدَّابَّۃِ اَوْغَیْرِھَا

کسی جانور کی پیٹھ پر سوار یا دوسری حالت میں فتویٰ دینا

(۸۳) حَدَّثَنَا اسْمٰعِیْلُ قَالَ حَدَّثَنِی مَالِکٌ عَنْ ابْنِ شِھَابٍ عَنْ عِیْسَی بْنِ طَلْحَۃَ بْنِ عُبَیْدِاللہِ عَنْ عَبْدِاللہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَفَ فِیْ حَجَّۃِ الْوَدَاعِ بِمِنًی لِلنَّاسِ یَسْاَلُوْنَہٗ فَجَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ لَمْ اَشْعُرْ فَحَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَذْبَحَ ؟ قَالَ اِذْبَحْ وَلَا حَرَجَ فَجَآءَ اٰخَرُ فَقَالَ لَمْ اَشْعُرْ فَنَحَرْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِ ؟ قَالَ اِرْمِ وَلَا حَرَجَ قَالَ فَمَا سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ شَیْءٍ قُدِّمَ وَلَا اُخِّرَ اِلَّا قَالَ اِفْعَلْ وَلَا حَرَجَ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نقل کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ لوگوں کے مسائل دریافت کرنے کی وجہ سے منی میں ٹھہر گئے۔تو ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے نادانستگی میں ذبح کرنے سے پہلے اپنا سر منڈوا لیا، آپ نے فرمایا (اب) ذبح کرلے کچھ حرج نہیں ہوا۔ پھر دوسرا آدمی آیا اس نے کہا میں نے نادانستگی میں رمی سے پہلے قربانی کرلی، آپ ﷺ نے فرمایا (اب) رمی کرلے (پہلے کر دینے سے) کچھ حرج نہیں ہوا۔ابن عمرو کہتے ہیں (اس دن) آپ سے جس چیز کا بھی سوال ہوا (جو کسی نے مقدم ومؤخر کرلی تھی) تو آپ نے یہی فرمایا کہ کرلے کچھ حرج نہیں۔

تشریح: فتویٰ اور فتیا ایک ہی معنی میں آتے ہیں۔یعنی کسی مسئلہ یا حادثہ کے بارے میں شرعی جواب، مقصد ترجمہ یہ ہے کہ اگر کوئی عالم سواری پر سوار ہے، کہیں جا رہا ہے یا کسی دوسری جگہ بیٹھا ہے اور کسی کام میں مصروف ہے تو سائل کے سوال کا جواب دینا مطابق سنت ہے۔ بخلاف قضاء کے کہ اس کے لے بڑی جگہ ہونی چاہئے۔ جہاں لوگ جمع ہوسکیں اور شرعی فیصلے سن سکیں۔وہ چلتے پھرتے سواری پر یا یونہی سرسری طور سے نہ ہونا چاہئے۔غرض مسئلہ وفتوی بتانے میں عوام کی سہولت مدنظر ہے۔اگرچہ بہتر یہی ہے کہ وہ بھی اطمینان کی جگہ بیٹھ کر اور اہم مسائل میں چند علماء کے باہمی مشورہ سے گفتگو کے بعد ہو۔جس کی طرف حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اشارہ فرمایا ہے۔غرض حدیث سے اس امر کی سہولت وجواز کا اشارہ مل گیا بلکہ طریق سنت بھی یہی ہوا کہ سائل کا جواب دیا جائے۔اور بعض اوقات وقتی ضرورتوں کے تحت فوری جواب کی ضرورت واہمیت بھی ہوتی ہے۔پھر سواری کی پیٹھ پر ہوتے ہوئے سوال سننے اور جواب دینے کے وقفہ میں چونکہ جانور کو تکلیف ہوگی اس لئے بھی امام بخاری نے اس خاص صورت کا جواز بتلایا جس سے علم کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ ایسے حالات میں بھی تعلم وتعلیم کو جاری

رکھا جا سکتا ہے بظاہر امام بخاریؒ کا مقصد وغیر ہا سے بھی ایسی ہی خاص صورت مراد ہے۔ جو علی الدابہ سے ملتی جلتی ہو مثلاً ایک عالم کسی ضرورت سے کسی اونچی نمایاں جگہ پر بیٹھا ہے۔ جلسہ کا صدر ہے یا کسی کام میں مصروف ہے۔ تب بھی اس کو لوگوں کی فوری و وقتی ضرورتوں میں شرعی رہنمائی کرنی چاہیئے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایسے اوقات میں سواری کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہوئے لمبی چوڑی تقریریں کی جائیں۔ کہ اس میں جانور کو بے ضرورت تکلیف دینا ہے۔ اور اسی لئے حدیث میں اس کی ممانعت بھی ہے۔ فرمایا ''جانوروں کی پشت کو منبر مت بناؤ'' اسی طرح عالم اگر کسی دوسری نمایاں جگہ پر کسی ضرورت و مصروفیت میں ہے تو نہ لوگوں کو اس سے غیر وقتی اور طویل ابحاث کے مسائل دریافت کرنے چاہئیں اور نہ اس وقت عالم کو جواب دینے کی ضرورت ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی رائے

آپ نے فرمایا،، باب الفتیا سے امام بخاری کا اشارہ اس حدیث نہی کی طرف ہے جس میں سواری کی پیٹھ کو منبر بنانے سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ یعنی یا تو بحالت سواری چلتے ہوئے باتیں کرے یا اتر کر کرے۔ جانور کو کھڑا کر کے نہ کرے۔ کہ اس میں جانور کی ایذاء ہے۔ اس کے پیش نظر امام بخاریؒ نے یہاں یہ ثابت کیا کہ فتویٰ یا جواب مسئلہ چھوٹی معمولی بات ہے۔ وہ نہی مذکور کے تحت نہیں آتی۔

بحث ونظر: حدیث الباب میں صرف اتنا ذکر ہے کہ حضور اکرم ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر بحالت وقوف لوگوں کے سوالات کا جواب دے رہے تھے۔ یہاں یہ ذکر نہیں کہ آپ کا وقوف سواری پر تھا یا کسی اور نمایاں مقام پر۔ امام بخاری نے اس عموم سے فائدہ اٹھا کر عنوان باب کو عام کر دیا تا کہ اوپر کی ذکر کی ہوئی سب سورتیں جواز وسنت کے تحت آ جائیں۔ باقی یہ بات کہ علی الدابہ والی خاص صورت حدیث الباب سے ظاہر نہیں ہوئی تو اس کے بارے میں حافظ ابن الحجر نے فتح الباری میں لکھا کہ امام بخاری نے ذکر رکوب کو اس طریق روایت پر محول کر دیا۔ جس کو وہ کتاب الحج میں لائیں گے۔

حافظ عینیؒ نے اس جواب پر نقد کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ کوئی معقول بات نہیں کہ ترجمہ تو یہاں ہو اور اس کی مطابقت کسی دوسرے باب کی روایت سے کی جائے۔ اس لئے جواب کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ امام بخاریؒ نے حدیث الباب میں وقوف کے عموم میں وقوف علی الدابہ کو بھی شامل سمجھا ہے جو دوسری روایت سے بصراحت ہی ثابت ہے۔ لہٰذا ترجمہ وحدیث الباب میں عدم مطابقت کا اعتراض اٹھ گیا۔

دابہ کی تشریح: حافظ عینیؒ نے لکھا کہ دابہ کے معنی عرفی چوپایہ حیوان کے ہیں۔ اور امام بخاری کی مراد وہ دابہ ہے جس پر سواری ہوتی ہے۔ جیسا کہ مغانی نے کہا اور اس سے مقصود اس امر کی طرف اشارہ ہے۔ کہ عالم سے اس وقت بھی علمی سوال کرنا جائز ہے جب وہ مشغول ہو۔ سوار ہو چل رہا ہو۔ یا ٹھہرا ہوا ہو، وغیرہ تمام احوال میں حتیٰ کہ اس وقت بھی کہ وہ کسی طاعت میں مشغول ہو۔ حافظ عینیؒ نے یہاں نقل کیا کہ کرمانیؒ نے دابہ کے معنی لغوی زمین پر چلنے والی ہر چیز اور عرفی معنی گھوڑے خچر اور گدھے کے لکھے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے لکھا کہ بعض اہل عرف نے دابہ کو حمار کے ساتھ خاص کیا ہے۔ پھر حافظ عینیؒ نے لکھا کہ یہ دونوں قول صحیح نہیں ہیں۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۴۷۸ ج ۱)

عادات امام بخاری رحمہ اللہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے ''وغیر ہا'' پر فرمایا کہ امام بخاری کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی حدیث کسی خاص جزء پر شامل ہو اور امام بخاری کے نزدیک اس کے حکم میں عموم ہو تو وہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ کہ لفظ وغیر ہا ترجمہ میں بڑھا دیتے ہیں تا کہ تخصیص کا واہمہ نہ ہو اور عموم سب کو معلوم ہو جائے۔ اسی لئے ایسے موقع پر اس خاص جزء کو ثابت کرنے والی دلیل بھی ذکر نہیں کرتے۔ چنانچہ یہاں اگرچہ امام بخاری نے

حدیث الباب سے صرف دابہ پر سواری کی حالت کا مسئلہ نکلا ہے تاہم بیان عموم کے لئے ''وغیرہا'' کا لفظ بڑھادیا تاکہ عموم حکم بھی سب پر واضح ہو جائے۔ پس یہ فقہ بھی ہے اور بطور احتراس بیان مسئلہ بھی، لہٰذا اس خاص جزو دابہ پر سواری کی حالت کی دلیل امام بخاری کے کلام میں طلب و تلاش کرنا بھی بے ضرورت ہے۔ پھر حضور اکرم ﷺ کا دابہ پر ہونے کا ذکر بھی بعینہ اس حدیث میں موجود ہے۔ اگرچہ وہ دوسرے طریق سے مروی ہے اور یہ بھی امام بخاری کی دوسری عادت ہے کہ ایک جگہ ترجمہ وعنوان باب قائم کرتے ہیں لیکن جس لفظ پر ترجمہ کی بنیاد ہوتی ہے وہ یہاں نہیں ہوتا بلکہ حدیث کے دوسرے طریق میں ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ان کی اس کتاب میں بھی نہیں ہوتا بلکہ خارج میں ہوتا ہے۔ باوجود اس کے بھی اسی دوسری جگہ کے لفظ کے لحاظ سے یہاں حدیث کا ترجمہ باندھ دیتے ہیں۔ یہاں اس طریق حدیث کا ذکر عمداً اس لئے نہیں کرتے کہ دوسروں کے لئے یہ چیز ایک چیستان ومعمہ بن جائے۔

اذبح ولاحرج کا مطلب

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس کا ترجمہ یوں کرو ''ذبح ہونے دو کچھ مضائقہ نہیں'' یعنی امر کا صیغہ یہاں ابقاء کے لیے ہے کہ جو کچھ بھول سے ہو چکا وہ درست ہو گیا یا جو ہو گیا اسے ہونے دو۔ اس کا فکر اب مت کرو۔ اس کا مقصد نفی اثم ہے۔ جزاء کی نفی نہیں ہے اور یہ حج ہی کی خصوصیت ہے کہ اس میں ایک چیز کا امر بھی ہوتا ہے اور دوسری صورت جزاء واجب ہونے کی بھی ہوتی ہے۔ دوسرے فرائض میں یہ صورت نہیں ہے کہ ارکان وواجبات کی ادائیگی مطلوب ہونے کے ساتھ ان کی جگہ جزاء وبدل بھی قائم مقام ہو سکے۔ کیونکہ بظاہر امتثال امر بھی مطلوب ہو اور ایجاب جزاء بھی۔ ان دونوں میں تضاد ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی بلند پایا تحقیق

حضرت شاہ صاحب نے **افعل ولا حرج** (ہونے دو کوئی تنگی نہیں) مذاہب کی تفسیر اور سب کے دلائل بیان فرما کر اپنی رائے یہ قائم کی تھی کہ حضور ﷺ نے اس وقت صحابہ کرام کے جہل کو عذر قرار دیا اور اس لئے ترک ترتیب شرعی پر کوئی تنبیہ نہیں فرمائی۔ اور میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ اس وقت آپ نے اسم وجزاء سے دونوں کی نفی فرمادی ہوگی۔ جیسا کہ امام احمد کی رائے ہے۔ مگر وہ زمانہ انعقاد شریعت کا تھا لوگ امی تھے ابتدائی دور تھا۔ اس میں بہت سی خامیاں برداشت کرلی جاتی ہیں جو بعد کے دور میں نہیں کی جاتیں اس لئے میرے نزدیک ان کا جہل اس وقت رفع اثم اور رفع جزاء دونوں کے لئے معتبر ہوا مگر دوسری طرف میری رائے ہے کہ حضور ﷺ کے بعد جہل کو صرف رفع اثم کے لئے معتبر کریں گے رفع جزاء کے لئے نہیں۔ اور اس طرح میری رائے خلاف مذہب بھی نہ ہوگی۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ ہمیں حدیث نبوی میں کوئی تاویل نہیں کرنی پڑے گی، اس کے منطوق ومفہوم کو ہم نے پوری طرح بے تاویل وتامل قبول کرلیا۔

امام غزالی اور خبر واحد سے نسخ قاطع

پھر فرمایا کہ میری اس رائے کو ایسا سمجھو جیسے امام غزالیؒ نے خبر واحد کو حضور ﷺ کے زمانے میں تو قطعی اور ناسخ للقاطع قرار دیا کیونکہ اس کی تحقیق حضور سے ہو سکتی تھی۔ اس لئے تحویل قبلہ میں اس کو قطعی ومعتبر سمجھا گیا) مگر آپ کے بعد کے زمانے میں اس کو ظنی قرار دیا۔ کہ کوئی ذریعہ تحقیق وتثبت کے لئے باقی نہیں رہا۔ افعل ولاحرج کی تفصیلی بحث حج کے بیان میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ، میں نے بھی اسی طرح جہل کے معتبر وغیر معتبر ہونے میں تفسیر کردی ہے واللہ اعلم بالصواب۔

بَابُ مَنْ اَجَابَ الْفُتْيَا بِاِشَارَةِ الْيَدِ وَالرَّاْسِ

ہاتھ یا سر کے اشارے سے فتوی بتلانا

(۸۴) حَدَّثَنَا مُوْسٰى بْنُ اِسْمٰعِيْلَ قَالَ حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ ثَنَا اَيُّوْبُ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ فِىْ حَجَّتِهٖ فَقَالَ ذَبَحْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِىْ قَالَ فَاَوْمَاَ بِيَدِهٖ قَالَ وَلَا حَرَجَ وَ قَالَ حَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَذْبَحَ فَاَوْمَاَ بِيَدِهٖ وَلَا حَرَجَ.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے آپ کے آخری حج میں کسی نے پوچھا کہ میں نے رمی کرنے سے پہلے ذبح کرلیا آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرمایا کچھ حرج نہیں۔ کسی نے کہا کہ میں نے ذبح سے پہلے حلق کرالیا آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرمادیا کہ کچھ حرج نہیں۔

تشریح: امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح باقاعدہ درس وتعلیم وتبلیغ وغیرہ امور علم وفضل علم کے تحت داخل ہیں اور جس طرح کسی بات کو اچھی طرح سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کے لئے حضور اکرم ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ بار بار فرماتے اور دہراتے تھے وہاں کسی وقت محض اشارے سے بھی کام لیا گیا ہے چنانچہ ایسا حضور اکرم ﷺ کے عمل مبارک سے بھی ثابت ہے اور یہ عمل موقع محل کی مناسبت اور مخاطب کی صلاحیت واستعداد سے متعلق ہے کہ وہ اشارہ بھی تعلیم امور کے لئے کافی ووافی ہوجاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس ترجمۃ الباب کے تحت فرمایا کہ یہاں سے اگرچہ اشارہ کا جواز معلوم ہورہا ہے مگر اس زمانے میں احتیاط یہی ہے کہ تعلیم امور دین میں صراحت اختیار کی جائے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ جیسے مواقع میں حضور ﷺ سے اشارہ ثابت ہے ان میں اب بھی اشارہ زیادہ ابلغ واصرح ہوسکتا ہے۔ فرض کیجئے اسی طرح حج یا کسی بڑے اجتماع کے موقع پر کسی بڑے مستند ومعتمد عالم وقت سے لوگ کسی مسئلے کا جواب نفی واثبات میں چاہیں اور وہ عالم ہاتھ یا سر کے اشارہ سے کرنے یا نہ کرنے کا اشارہ کردے تو سب اس کو دیکھ اور سمجھ لیں گے اور بعض اوقات وہ بہ نسبت قولی امرونہی کے بھی زیادہ واضح وموکد ہوگا۔ معلوم ہوا کہ مشکوٰۃ نبوت سے جس موقع پر بھی جس طریقہ سے تعلیم ملی ہے وہی ہمیشہ کے واسطے اور ہر ایسے موقع کے لئے زیادہ موزوں ومناسب ہے۔ اور اگر ہم زمانوں کی تبدیلی کے ساتھ طریق سنت میں تبدیلی کے رجحان کو بڑھائیں گے تو یہ طریقہ مفید سے زیادہ مضر ثابت ہوگا۔ والعلم عند اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ۔

حضرت شاہ صاحب کا ارشاد

آپ نے فرمایا امام بخاریؒ اشارہ کی شرعی حیثیت واضح کرنا چاہتے ہیں اور خود ان کی رائے یہ ہے کہ تمام امور میں اشارہ معتبر ہے حتیٰ کہ ان کے نزدیک طلاق بھی اشارہ سے واقعہ ہوجاتی ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے کتاب الطلاق میں ایک باب الاشارۃ فی الطلاق والامور قائم کرکے جتنے اشارات بھی مختلف مواقع واوقات میں حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہیں سب کو ایک جگہ جمع کردیا ہے دیکھو بخاری صفحہ ۷۹۷، ۷۹۸ وہاں چودہ احادیث سے اشارہ کا ثبوت دیا ہے مگر عجیب بات ہے کہ کسی حدیث سے بھی طلاق کے بارے میں اشارہ کا جواز نہیں نکال سکے۔ جس کے لئے ترجمہ قائم کیا ہے۔

حافظ نے ابن بطال کا قول نقل کیا ہے کہ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اشارہ اگر سمجھا جائے تو بمنزلہ نطق ہے اس کی بعض صورتوں میں حنفیہ نے مخالفت کی ہے۔ اور شاید امام بخاری نے ان ہی کا رد ان احادیث سے کیا جس میں نبی کریم ﷺ نے اشارہ کو قائم مقام نطق کے کیا ہے۔ اور جب دیانت کے مختلف احکام میں اشارہ جائز ہو تو ایسے شخص کے لئے جو بولنے سے معذور ہو بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہئے۔

ابن بطال نے ایسی توجیہ کی جس سے امام بخاری کا مسئلہ اخرس (گونگے) وغیرہ کے ساتھ مقید معلوم ہوا۔ حالانکہ امام بخاری کا مسلک اس بارے میں عام معلوم ہوتا ہے اور وہ امام مالک کی طرح اشارہ طلاق کو قائم مقام تلفظ طلاق قرار دیتے ہیں۔ خواہ وہ اشارہ گونگے کا ہو یا قادر الکلام کا۔ اس بارے میں حنفیہ شافعیہ اور حنابلہ اس امر پر متفق ہیں کہ قادر الکلام کا اشارہ طلاق معتبر نہیں البتہ گونگے کا معتبر ہے۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ صفحہ ۲۹۴ ج ۴)

آگے چل کر خود حافظ نے بھی علامہ ابن منیر کا قول نقل کیا ہے کہ "امام بخاری کا مقصد یہاں گونگے غیر گونگے سب کے اشارہ طلاق وغیرہ کو ثابت کرنا ہے اور جس اشارے سے اصل و عدد مفہوم ہوسکے وہ ان کے نزدیک لفظ کی طرح نافذ ہے۔ پھر آخر میں خود حافظ نے لکھا کہ اکثر علماء کے نزدیک قادر الکلام کا اشارہ نطق کے قائم مقام نہیں ہوتا۔ گویا حافظ نے ابن بطال کے اس دعویٰ کی تردید کردی کہ جمہور کے نزدیک اشارہ بمنزلہ نطق ہے۔ (فتح الباری صفحہ ۳۵۴ ج ۹)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اگرچہ نفس طلاق میں ہمارے یہاں اشارہ معتبر نہیں مگر عدد طلاق میں معتبر ہے۔ امام بخاریؒ نے اس کو طلاق وغیرہ سب امور میں معتبر قرار دیا ہے۔ مگر ثبوت میں صرف ایسی چیزیں ذکر کرسکے ہیں جن کا کوئی تعلق عقود و معاملات اور باب قضا و حکم سے نہیں ہے حالانکہ ہمارا اختلاف ان میں ہے۔ باب فتویٰ و مسائل عبادات میں تو ہم بھی اشارہ کو معتبر قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا امام بخاری کا اشارہ کو مطلقاً معتبر قرار دینا یا اشارہ و کلام کو باب طلاق وغیرہ میں یکساں مرتبہ دینا اور حنفیہ پر تعریض کرنا صحیح نہیں۔ اشارہ طلاق کی پوری بحث اپنے مواقع پر آئے گی۔ یہاں چونکہ حضرت شاہ صاحب نے چند جملے فرمائے تھے ہم نے بھی کچھ شرح بڑھا دی تا کہ خلافیات میں دوسروں کے طرز تحقیق اور ہمارے ساتھ ان کے رویے کی کچھ جھلک نظر آجائے۔ واللہ المستعان

(۸۵) حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ بْنُ اِبْرَاهِيمَ قَالَ اَنَا حَنْظَلَةُ عَنْ سَالِمٍ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُقْبَضُ الْعِلْمُ وَ يَظْهَرُ الْجَهْلُ وَالْفِتَنُ وَيَكْثُرُ الْهَرْجُ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا الْهَرْجُ؟ فَقَالَ هٰكَذَا بِيَدِهِ فَحَرَّفَهَا كَاَنَّهُ يُرِيْدُ الْقَتْلَ.

ترجمہ ۸۵: حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب علم اٹھا لیا جائے گا۔ جہالت اور فتنے پھیل جائیں گے اور ہرج بڑھ جائے گا۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہرج کیا چیز ہے؟ آپ نے اپنے ہاتھ کو ترچھا کر کے فرمایا کہ اس طرح گویا آپ نے اس سے قتل مراد لیا۔

تشریح۔ فتنوں سے کیا مراد ہے

اس حدیث میں بھی وہی مضمون ہے جو پہلے حدیثوں میں گزر چکا ہے البتہ یہاں فتنوں کے ظہور اور ہرج کی کثرت کا ذکر مزید ہوا۔

فتنہ کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے۔ کہ اس سے کفار و مشرکین کے ساتھ جو قتال و جہاد ہوتے ہیں وہ مراد نہیں ہوتے بلکہ داخلی فتنے مراد ہوتے ہیں۔ جو مسلمانوں میں آپس ہی میں پیش آئے اور ہزاروں ہزار علماء و صلحاء شہید ہوگئے۔ مثلاً فتنہ ابی مسلم خراسانی فتنہ حجاج بن یوسف ثقفی فتنہ قرامطہ فتنہ تیمور وغیرہ

ھرج کیا ہے؟

ھرج کے لفظ پر فرمایا کہ اس کے معانی مزاج واختلاط کے ہیں اور قتل پر بھی بولا جاتا ہے علامہ عینیؒ نے لکھا کہ عباب میں ھرج بمعنی فتنہ واختلاط ہے۔

صغانی نے لکھا کہ ھرج کے اصلی معنی کسی چیز کی کثرت کے ہیں۔ ابن درید نے لکھا کہ ھرج آخر زمانہ کے فتنہ کو کہتے ہیں۔ قاضی نے کہا فتنے بھی ھرج کا ایک حصہ ہیں۔ مگر اصل ہرج وتہارج اختلاط وقتال ہے اور اسی سے حدیث میں ہے کہ فلن یزال الھرج الی یوم القیامة (ہرج قیامت کے دن تک باقی رہے گا اور اسی سے ہے یتھارجون تھارج الحمر (مردوں اور عورتوں کا اختلاط بڑھ جائے گا اور ایک دوسرے کے نکاح بصورت زنا ہوں گے۔) علامہ کرمانی کا قول ہے کہ ہرج سے قتل مراد لینا بطور تجوز ہے۔ کیونکہ وہ ہرج کا لازمی معنی ہے۔ ہاں اگر کسی لغت عرب میں ہرج کے معنی قتل کے ثابت ہو جائیں تو تجوز نہ رہے گا۔

حافظ عینیؒ نے لکھا کہ کرمانی کی اس بات پر حافظ ابن حجر نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ علامہ کرمانی سے غفلت ہوئی ایسی بات کہی ورنہ خود صحیح بخاری کتاب الفتن میں آیا ہے کہ ہرج حبش کی زبان میں بمعنی قتل ہے۔ حافظ عینیؒ نے لکھا کہ یہ حقیقت میں حافظ ابن حجر ہی کی غفلت ہے۔ کیونکہ ہرج کا حبشہ کی زبان میں بمعنی قتل ہونا اس امر کو مستلزم نہیں کہ وہ لغت عرب میں بھی بمعنی قتل کہا جائے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب اس کو بمعنی قتل استعمال کرلیا گیا تو وہ لغت حبش کے موافق صحیح ہو گیا رہا اصل وضع کے لحاظ سے اس کا استعمال تو وہ بدستور فتنہ واختلاط کے ہی معنی میں رہے گا اور قتل کے معنی میں اس کو استعمال کرنا بطور تجوز ہی ہوگا۔ پھر حافظ عینی نے لکھا کہ ایک حدیث میں ہرج کی تفسیر بھی قتل کے ساتھ ہوئی ہے اور اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ اس کے معنی ہی اصل وضع میں قتل کے ہو گئے۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۴۸۳ ج۱)

بحث ونظر: اس تفسیر کے بعد گذارش ہے کہ صحابہ کرام ہرج کے معنی سمجھنے سے قاصر نہیں تھے۔ وہ تو لغت عرب سے خوب واقف تھے۔ البتہ وہ مشکوٰۃ نبوت سے اس کے مقصد ومراد کی پوری وضاحت کے طلبگار تھے جیسے حدیث نبوی میں ہے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ساری دنیا کی اسلام دشمن قومیں ایک دوسرے کو تمہارے خلاف محاذ بنانے کے لئے بلائیں گی۔ جیسے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کسی دسترخوان پر جمع ہونے کو بلایا کرتے ہیں صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کیا ہم اس وقت کم ہوں گے (کہ ان کو ایسی جراءت ہوگی) فرمایا نہیں تم اس وقت بہت ہوگے۔ مگر تمہارے اندر وہن آجائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا وہن کیا چیز ہے فرمایا "دنیا کی محبت اور موت سے نفرت" تو ظاہر ہے صحابہ کرام وہن کو بھی جانتے تھے عربی زبان کا لفظ ہے مگر وہاں تو ایسے مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تلاش وطلب اس امر کی رہتی تھی کہ لسان نبوت شرح مطلب کرائیں۔ چنانچہ ان کے استفسار پر جو بات معلوم ہوئی وہ وہن کے صرف لغوی معنے جاننے سے کبھی حاصل نہ ہوسکتی تھی اسی طرح ھرج کے بارے میں استفسار ہوا اور علوم نبوت میں سے ایک باب علم ان کے لئے کھل گیا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واکمل

(۸۶) حَدَّثَنَا مُوْسَى بْنُ اِسْمٰعِيْلَ قَالَ ثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ ثَنَا هِشَامٌ عَنْ فَاطِمَةَ عَنْ اَسْمَاءَ قَالَتْ اَتَيْتُ عَآئِشَةَ وَهِيَ تُصَلِّيْ فَقُلْتُ مَا شَاْنُ النَّاسِ فَاَشَارَتْ اِلَى السَّمَآءِ فَاِذَا النَّاسُ قِيَامٌ فَقَالَتْ سُبْحَانَ اللّٰهِ قُلْتُ اٰيَةٌ فَاَشَارَتْ بِرَاْسِهَآ اَيْ نَعَمْ فَقُمْتُ حَتّٰى عَلَانِيَ الْغَشْيُ فَجَعَلْتُ اَصُبُّ عَلٰى رَاْسِيَ الْمَآءَ فَحَمِدَاللّٰهَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ مَا مِنْ شَيْءٍ لَمْ اَكُنْ اُرِيْتُهُ اِلَّا رَاَيْتُهُ فِيْ مَقَامِ هٰذَا حَتَّى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ فَاُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِيْ قُبُوْرِكُمْ مِثْلَ اَوْ قَرِيْبًا لَا اَدْرِيْ اَيُّ ذٰلِكَ قَالَتْ اَسْمَآءُ مِنْ فِتْنَةِ

الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ يُقَالُ مَا عِلْمُكَ بِهٰذَا الرَّجُلِ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ أَوِ الْمُوْقِنُ لَا أَدْرِيْ أَيُّهُمَا قَالَتْ أَسْمَآءُ فَيَقُوْلُ هُوَ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ جَآءَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى فَأَجَبْنَاهُ وَاتَّبَعْنَاهُ هُوَ مُحَمَّدٌ ثَلٰثًا فَيُقَالُ نَمْ صَالِحًا قَدْ عَلِمْنَا أَنْ كُنْتَ لَمُوْقِنًا بِهٖ وَأَمَّا الْمُنَافِقُ أَوِ الْمُرْتَابُ لَا أَدْرِيْ أَيُّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَآءُ فَيَقُوْلُ لَا أَدْرِيْ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ شَيْئًا فَقُلْتُهٗ.

ترجمہ: حضرت اسماء رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ لوگوں کا کیا حال ہے؟ یعنی لوگ کیوں پریشان ہیں تو انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا یعنی سورج کو گہن لگا ہے۔ اتنے میں لوگ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا اللہ پاک ہے۔ میں نے کہا کیا یہ گہن کوئی خاص نشانی ہے؟ انہوں نے سر سے اشارہ کیا ہاں پھر میں بھی نماز کے لئے کھڑی ہو گئی۔ نماز طویل تھی حتیٰ کہ مجھ غش آنے لگا تو میں اپنے سر پر پانی ڈالنے لگی پھر نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی اور اس کی صفت بیان فرمائی پھر فرمایا جو چیز مجھے پہلے دکھلائی نہیں گئی تھی آج وہ سب میں نے اس جگہ دیکھ لی یہاں تک کہ بہشت اور دوزخ کو بھی دیکھ لیا اور مجھ پر یہ وحی کی گئی ہے کہ تم اپنی قبروں میں آزمائے جاؤ گے۔ مثل یا قریب کا کونسا لفظ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں نہیں جانتی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں یعنی فتنہ دجال کی طرح آزمائے جاؤ گے۔ کہا جائے گا (قبر کے اندر) تم اس آدمی کے بارے میں کیا جانتے ہو جو صاحب ایمان یا صاحب یقین ہوگا۔ کونسا لفظ فرمایا حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے مجھے یاد نہیں وہ کہے گا وہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں جو ہمارے پاس اللہ کی ہدایت اور دلیلیں لے کر آئے تو ہم نے اس کو قبول کر لیا اور اس کی پیروی کی۔ وہ محمد ﷺ ہیں تین بار اسی طرح کہے گا پھر اس سے کہہ دیا جائے گا کہ آرام سے سورہ۔ بے شک ہم نے جان لیا کہ تو محمد ﷺ پر یقین رکھتا تھا۔ رہا منافق یا شکی آدمی میں نہیں جانتی کہ ان میں سے کونسا لفظ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا تو وہ منافق یا شکی آدمی کہے گا کہ جو لوگوں کو کہتے سنا تھا میں نے بھی کہہ دیا تھا۔

تشریح: اس حدیث کے لانے کا منشاء یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو سر کے اشارے سے جواب دیا۔ باقی پوری حدیث صلوٰۃ کسوف کے بارے میں ہے۔ جو سورج گہن ہونے کے وقت رسول اللہ ﷺ نے پڑھی تھی۔

حدیث الباب میں ہے جس واقعہ کسوف شمس اور نماز کسوف کا ذکر ہے وہ ۲۹ ذی الحجہ ۹ ہجری کو ٹھیک اس روز واقعہ ہوا جس روز حضور ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم علیہ السلام کی وفات ہوئی تھی۔ اور کچھ لوگوں کو یہ بھی خیال گزرا تھا کہ سورج کا گہن نبی زادہ کی وفات کے عظیم حادثہ کے سبب ہوا ہے۔ جس پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا۔ کہ سورج گہن کسی کی ولادت وفات کے سبب نہیں ہوا کرتا بلکہ وہ تو حق تعالیٰ شانہٗ کی ایک نشانی ہے جسے دکھلا کر وہ شان کبریائی اور عظمت وقدرت کاملہ کا مظاہرہ فرماتے ہیں کہ سورج ایسے کرہ عظیمہ کا نور سلب کر لیا یا ہماری دنیا کو اس کے نور سے محروم کر دیا جبکہ سورج کا کرہ ہماری زمین کے کرہ سے لاکھوں گنا بڑا اور کروڑوں میل دور ہے۔ اسی لئے اس وقت اس کے خاص اور مطیع بندے نماز اور ذکر وتسبیح وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں اور بہتر یہ ہے کہ پورا کسوف کا وقت نماز ودعا میں صرف کیا جائے۔ حضور اکرم ﷺ کا بھی یہی ارشاد بخاری ومسلم میں مروی ہے۔ کہ جب سورج یا چاند گہن کی نشانی ظاہر ہو تو جب تک وہ رہے نماز و دعا میں مشغول رہو۔

واضح ہو کہ حدیث میں سورج وچاند کے گہن کو آیتان من آیات اللہ فرمایا ہے۔ اور یہاں بھی حضرت اسماء کے سوال میں آیت کا لفظ وارد ہے۔ اس کا ترجمہ صرف اللہ کی ''نشانی'' ہونا چاہیے۔ ''عذاب کی نشانی'' قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا جو آیت قرآنی وما کان اللہ لیعذبھم و

انت فیھم (انفعال) کے بھی خلاف ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کس طرح جواب میں فرمادیتیں کہ ہاں یہ عذاب ہی کی نشانی ہے۔واللہ اعلم
''پھر آیت الھیہ'' ہونے سے جہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ تخویف وتہویل کی شان ہے تا کہ غافل، فاسق العقیدہ اور بدکار لوگ حق تعالیٰ کے غضب اور عتاب سے ڈریں اصلاح حال کی فکر کریں وغیرہ۔اسی طرح خدا کے ماننے والوں اور نیک بندوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس کی عبادت وشکر ونعمت زیادہ سے زیادہ اور پورے اخلاص سے بجالائیں۔وہ سوچیں گے کہ سورج وچاند کی حرارت ونور کی عظیم الشان نعمت جو مخلوق کے فائدہ کے لئے لاکھوں کروڑوں میل کے فاصلہ سے ہم تک پہنچائی جاتی ہے وہ کتنی قابل قدر اور اس کا خالق ہمارا کتنا بڑا محسن اور مستحق ہزاراں ہزار شکر وسپاس ہے اس لئے حکم ہوا کہ جب تک اس عظیم نشانی کا مظاہرہ ہو ہم نماز ودعا ہی میں مشغول رہیں۔بعض احادیث میں اس وقت ذکر وصدقہ کی بھی ترغیب ہے۔

حدیث میں اشارہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معلوم ہوا کہ نماز ہی میں آسمان کی طرف اشارہ فرما کر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو جواب دیا اور نماز اشارہ یا عمل قلیل سے فاسد نہیں ہوتی البتہ کراہت میں اختلاف ہے۔حدیث سے بھی صرف عدم فساد کا ہی ثبوت ہوا۔
حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حافظ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت نماز کسوف میں حضرت اسماء نے حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اقتداء کی تھی۔ (فتح ۳۶۹ ج ۲)
لیکن اس کا ثبوت کسی نص سے پیش نہیں کیا البتہ میں نے مدونہ میں یہ تصریح دیکھی ہے کہ امہات المؤمنین جمعہ کے دن اپنے حجروں میں سے اقتداء کیا کرتی تھیں اور اس طرح اقتداء ہمارے یہاں بھی درست ہے۔کیونکہ اقتداء کی صحت کے لئے امام کی حرکات وانتقالات کا علم کافی ہے۔

بحث ونظر

رؤیت جنت وجہنم اور حافظ عینیؒ کی تصریحات

حافظ عینیؒ نے لکھا کہ علماء نے اس بارے میں متعدد احتمال بیان کئے ہیں۔
(۱) ممکن ہے کہ آنحضرت علیہ السلام کو ان دونوں کی حقیقی رؤیت حاصل ہوئی ہو اس طرح کہ حق تعالیٰ نے درمیان سے سارے پردے ہٹا دیئے ہوں۔جس طرح معراج کی شب میں آپ نے اپنا مسجد اقصیٰ جانا اور وہاں سے آسمانوں پر جانے کا حال سنایا تو کفار ومشرکین مکہ نے آپ کو جھٹلانا چاہا اور مسجد اقصیٰ کے بارے میں سوالات کئے۔اس پر آپ نے مسجد اقصیٰ کی تمام وکمال صورت ونقشہ تعداد ستون وغیرہا ان لوگوں کو بتلادیئے کیونکہ وہ حق تعالیٰ کے حکم سے آپ کے روبرو کردی گئی تھی۔ہر چیز دیکھتے رہے اور بے تکلف بتلاتے رہے۔علم کلام میں یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ رؤیت ایسا امر ہے جس کو حق تعالیٰ دیکھنے والے کے اندر پیدا کر دیتا ہے وہ خروج شعاع وغیرہ یا شئی مرئی کے مقابلہ ومواجہہ کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔بلکہ یہ محض شرائط عادیہ ہیں جن سے علیحدگی عقلاً جائز ہے۔یعنی گو عادتاً ان امور کو ضروری سمجھا جاتا ہے مگر عقلاً ان کا وجود کسی چیز کو دیکھنے کے لئے شرط وضروری نہیں ہے۔
(۲) وہ جنت ودوزخ کا دیکھنا بطور علم ووحی ہوا ہو۔جس سے آپ کو ان کے بارے میں زیادہ تفصیلی اطلاعات حاصل ہوئی ہوں جو پہلے سے نہ تھیں۔
(۳) علامہ قرطبیؒ نے کہا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے لئے جنت ودوزخ کی صورتیں مسجد نبوی کی دیوار قبلہ میں متمثل ہو کر سامنے ہوئی ہوں جس طرح آئینہ کے اندر چیزوں کی صورتیں متمثل ہوا کرتی ہیں۔اس کی تائید اس روایت بخاری سے بھی ہوتی ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ

سے کسوف کے بارے میں مروی ہے۔ کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا میں نے جنت ونار کو اس دیوار کے قبلہ میں ممثل دیکھا ہے۔ اور مسلم میں ہے کہ میرے لئے جنت ودوزخ مصور کی گئی۔ جن کو میں نے اس دیوار کے اندر دیکھا ہے اور یہ کوئی مستبعد امر بھی نہیں ہے۔ کہ ایک صورت کا عکس جس طرح آئینہ میں اتر سکتا ہے دوسرے صیقل شدہ اجسام میں بھی اتر سکتا ہے کیونکہ یہ شرط عادی ہے عقلی نہیں۔ جائز ہے کہ عادت کے خلاف ایک بات واقع ہو جائے خصوصاً کرامات نبوت کے واسطے۔

آج زنک پلیٹوں پر جو سیاہی لکھی ہوئی کاپیوں کا عکس لیکر قرآن مجید اور بڑی کتابیں ہزاراں ہزار کی تعداد میں چھاپی جاتی ہیں وہ بھی استبعاد مذکور کو رفع کرنے کے لئے کافی ہیں۔

جب یہ امر مسلم ہو گیا کہ ایسی صورتیں عقلاً جائز ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنت ونار کی صورتیں مستقل طور سے اس دیوار کے جسم میں موجود ہوں اور حضور ﷺ کے سوا دوسروں کو نظر نہ آئی ہوں ان میں سے پہلی صورت زیادہ بہتر اور الفاظ حدیث کے لحاظ سے مناسب ہے۔ کیونکہ بعض احادیث میں یہ بھی وارد ہے کہ میں نے جنت کے پھلوں میں سے کچھ خوشے لئے اور نار جہنم کی لپٹ سے بچنے کے لئے آپ کا پیچھے کو ہٹنا بھی ثابت ہے۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۴۸۹ ج ۱)

حضرت شاہ صاحب کے ارشادات

فرمایا دوسرے واقعہ میں اس طرح مروی ہے کہ حضور ﷺ نے جنت ونار کو دیوار قبلہ میں ممثل دیکھا دونوں مواضع میں رؤیت عالم مثال کی ہے۔ جس میں عکس آئینہ کی طرح صرف کیت ہوتی ہے۔ مادیت نہیں ہوتی۔ فرمایا عالم بہت سے ہیں اور حق تعالیٰ سب کے رب وخالق ہیں۔

اقسام وجود: جس طرح وجود بہت سے ہیں فلاسفہ دو قسم کے وجود مانتے ہیں خارجی و ذہنی، متکلمین وجود ذہنی کو نہیں مانتے لیکن ان کے یہاں ایک دوسری قسم وجود ہے جس کو وہ تقدیری کہتے ہیں علامہ دوانی نے ایک قسم اور بتلائی جس کو دھری کہا، غرض اس طرح عالم مثال کی چیزوں کے لئے بھی ایک قسم کا وجود ثابت ہے۔

عالم مثال کہاں ہے؟

پھر یہ کہ عالم مثال کسی مخصوص حیز ومقام کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک خاص قسم کی موجودات کا نام ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اسی ہمارے عالم میں بھی عالم مثال کی چیزیں موجود ہوں۔ اسی طرح بعض اولیاء کچھ چیزوں کو ان کے وجود دنیوی سے پہلے ہی دیکھ لیتے ہیں یہ بھی ایک قسم کا وجود ہی ہے۔ جیسے حضرت بایزید بسطامیؒ ایک مدرسے کے قریب سے گذرے تو وہاں کی ہوا سونگھ کر فرمایا میں یہاں سے اللہ کے ایک خاص بندے کی ہوا محسوس کرتا ہوں۔ پھر اس مدرسے سے حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی پڑھ کر نکلے۔ نیز حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ یمن کی طرف سے مجھے نفس رحمٰن پہنچ رہی ہے۔ پھر وہیں سے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

شیخ اکبر کا قول

حضرت شیخ اکبرؒ نے لکھا ایک چیز جب عرش الٰہی سے اترتی ہے تو وہ جس جگہ سے ہو کر گزرتی رہتی ہے اسی کے خواص واثرات لیتی رہتی ہے۔ اور جو چیز بھی زمین پر اترتی ہے اس کے اترنے سے ایک سال قبل اس کا وجود آسمان دنیا پر ہوتا ہے۔

پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ سب غیبی امور ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں کہ اشیائے

عالم کا نزول آسمان سے ہوتا ہے۔ کیونکہ حدیث میں وارد ہے بلا آسمان سے اترتی ہے اور زمین سے دعا چڑھتی ہے۔ اور روز قیامت تک دونوں ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں۔ نہ بلا دعا کو اوپر چڑھنے دیتی ہے اور نہ دعا ہی بلا کو نیچے اترنے دیتی ہے دونوں ہمیشہ کے لئے زمین وآسمان کے درمیان معلق رہتی ہیں۔

محدث ابن ابی جمرہ کے افادات

آپ نے حدیث الباب پر ۴۶ تشریحی نوٹ لکھے ہیں اور حسب عادت ہر جزو پر تفصیلی کلام کیا۔ **قوله عليه السلام حتى الجنة والنار** کے تحت لکھا کہ اس میں دو احتمال ہیں۔

(۱) حضور علیہ السلام نے خبر دینی چاہی کہ آپ علیہ السلام نے ان سب حالات کا معائنہ فرمالیا جو لوگوں کو اس دنیا سے رخصت ہوکر جنت ودوزخ تک پہنچنے کے درمیانی وقفہ میں پیش آئیں گے۔

(۲) آپ علیہ السلام نے اپنے دیکھے ہوئے امور غیبیہ کی عظمت سے باخبر کرنا چاہا ہے۔ اور جنت ودوزخ کا ذکر ان میں سے بطور مثال کردیا ہے۔ کیونکہ روایت سے ثابت ہے جنت کی چھت عرش رحمٰن ہے اور دوزخ بحر اعظم کے نیچے اسفل السافلین میں ہے۔ جب عالم مادی کے سب سے اونچی جانب کی چیز اور سب سے نیچے کی چیز کا دیکھنا بتلادیا تو درمیانی چیزوں کا دیکھنا خود ہی معلوم ہوگیا۔ نیز معلوم ہوا کہ اہل سنت والجماعت ہی کا مذہب حق ہے۔ کہ جنت ونار اس وقت بھی حقیقۃً موجود ہیں ﴿حافظ ابن حجر نے فتح الباری کتاب الکسوف میں لکھا اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جنت ودوزخ مخلوق اور آج بھی موجود ہیں۔ (فتح الباری صفحہ ۳۶۹ ج ۲)﴾ کیونکہ حضور علیہ السلام نے اسی مقام پر ان کا معائنہ فرمایا۔

حافظ عینی وامام الحرمین وابوبکر بن العربی کے ارشادات

حافظ عینیؒ نے حسب عادت طویل کلام کیا اور حدیث الباب سے ۱۹ احکام مستنبط کئے جن میں سب سے پہلے لکھا۔

جنت ونار موجود ومخلوق ہیں

حدیث سے ثابت ہوا کہ جنت ونار مخلوق اور آج بھی موجود ہیں۔ یہی مذہب اہل سنت کا ہے۔ جس پر آیات واخبار متواترہ شاہد ہیں جیسے آیت **و طفقا يخصفان عليهما من ورق الجنة** اور آیت **عند سدرة المنتهى، عندها جنة الماوى** اور آیت **و جنة عرضها السموات والارض** وغیرہ نیز حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ جنت میں داخل ہونا اس سے نکلنا پھر جنت کی طرف لوٹنے کا وعدہ وغیرہ۔ امور قطعی اخبار وروایات سے ثابت ہے۔

امام الحرمین نے فرمایا کہ معتزلہ کی ایک جماعت نے جنت ونار کے یوم حساب سے قبل مخلوق ہونے کا انکار کیا ہے اور کہا کہ اس سے پہلے ان کے پیدا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے قصے کو دنیا کے کسی باغ پر محمول کیا ہے۔ امام نے فرمایا کہ یہ قول باطل دین کے ساتھ تلاطب اور اجماع مسلمین سے خروج ہے۔

قاضی ابوبکر بن العربی نے فرمایا کہ جنت مخلوق ہے اس میں تمام چیزیں موجود ومہیا ہیں اس کی چھت عرش رحمٰن ہے وہ زمین وآسمان کے کناروں سے باہر ہے۔ ہر مخلوق فنا ہوجائے گی سوائے جنت ونار کے۔ جنت کے اوپر کوئی آسمان نہیں ہے بلکہ عرش رحمٰن ہی موافق حدیث صحیح کے اس کی چھت ہے۔ اس کے آٹھ دروازے ہیں۔ یہ بھی روایت ہے کہ وہ سب دروازے مقفل ہیں سوائے باب توبہ کے کہ وہ کھلا ہوا ہے۔ جب تک کہ مغرب سے طلوع شمس ہو۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۴۹۰ ج ۱)

بعد و کثافت رؤیت سے مانع نہیں

یہ بھی معلوم ہوا کہ جواہر واجسام میں محجوب ہونا کوئی ذاتی وصف نہیں ہے نہ کوئی بڑے سے بڑا بعد کسی چیز کو دیکھنے سے مانع ذاتی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے آپ علیہ نے یہیں سے جنت کو بھی دیکھ لیا جو عالم علوی میں ہے اور ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے جس کی چھت عرش رحمان ہے اور وہ بڑی بڑی فصیلوں دیواروں سے گھری ہوئی ہے۔ جن میں برج اور پھاٹک بنے ہیں وغیرہ اوصاف معلومہ اور دوزخ کو بھی دیکھا ہے جو اسفل السافلین میں ہے مگر باوجود اس عظیم الشان دوری اور درمیانی بڑی کثافتوں کے کوئی چیز ان کی رؤیت سے مانع نہ ہوئی۔ پھر لکھا کہ اس سے حق تعالیٰ کی عظیم قدرت وحکمت اور عقل کا اس کے ادراک سے عاجز ہونا نیز اس کا برتر از قیاس ہونا معلوم ہوا کہ حضور اکرم علیہ نے جنت کو یہاں سے تو دیکھ لیا اور لیلۃ المعراج میں نہ دیکھا۔ کیونکہ وہاں ''سدرۃ المنتہیٰ'' کو دیکھا تھا۔ جو جنت میں سے نہیں ہے۔ اور دونہروں کو دیکھا تھا جو سدرۃ المنتہیٰ سے نکل کر جنت کو جاتی ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کی قدرت وحکمت پر بڑی دلیل ہے۔ جس چیز کو جس وقت چاہیں چھپالیں اور جس وقت چاہیں دکھادیں۔

اس کے بعد حضرت محقق علامہ ابن ابی جمرہ نے لکھا کہ اس خبر دینے کا فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنے شب روز کے امور عادیہ کی طرف توجہ ترک کریں اپنے ایمان کو قوی کریں۔ کسی دنیوی راحت ومصیبت پر غرور وغم نہ کریں۔ حق تعالیٰ کی عظیم قدرت کا تصور کر کے انشراح صدر کے ساتھ صرف حق تعالیٰ سے رشتۂ عبودیت مستحکم کریں ماسوا اللہ سے ترک علائق کریں۔ (بہجۃ النفوس ص ۱۲۱ ج ۱)

مسئلہ علم غیب محدث ابن ابی جمرہ کی نظر میں

حدیث الباب میں حضور اکرم علیہ نے ارشاد فرمایا:۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو مجھے پہلے سے نہیں دکھائی گئی تھی، کہ میں نے اس کو اس مقام میں دیکھ لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے تو آپ علیہ کو تمام چیزوں کی رویت حاصل تھی ہی نہیں، صرف بعض کی تھی، مگر اس مقام میں وہ رویت مکمل ہوگئی۔ لیکن پھر بھی یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا اس سے مراد تمام غیوب ہیں یا وہ غیوب ہیں جن کے بارے میں امت کو مطلع کرنے کی ضرورت تھی، یا جو آپ علیہ کی ذات مکرم ومعظم کے لئے بطور خاص ضروری تھے۔ اور جن امور کی اطلاع سے آپ علیہ کا خصوصی اعزاز واکرام مقصود تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ گو حدیث کے الفاظ سے دونوں کا احتمال ہے مگر بظاہر دوسری صورت ہی مراد ہے اور پہلی صورت کے ممنوع ہونے پر کتاب وسنت دونوں شاہد ہیں حق تعالیٰ نے فرمایا **قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ** (آپ علیہ کہہ دیجئے کہ زمین وآسمان میں سوائے خدا کے غیب کو کوئی بھی نہیں جانتا) حدیث میں ہے **مفاتح الغیب خمس لا یعلمھن الا اللہ** (پانچ چیزیں غیب کی کنجیاں ہیں، جن کو بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی بھی نہیں جانتا، پھر اس لئے بھی جمیع غیوب مراد نہیں ہو سکتے کہ اس سے خالق ومخلوق کا برابر ہونا لازم آتا ہے، جو عقلاً بھی محال ہے، لہٰذا علم غیب کلی حضور اکرم علیہ بطریق عقل ونقل مستحیل ہے۔ (بہجۃ النفوس ص ۱۲۰ ج ۱)

آنحضرت علیہ کیلئے علم غیب کلی کے ثبوت وعدم ثبوت کی بحث ہم آئندہ کسی مناسب موقع سے مکمل ومدلل لکھیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ماعلمک بھذا الرجل ؟ کی بحث:

حدیث الباب میں آیا ہے کہ قبر میں ایک سوال یہ بھی ہوگا کہ ''تم اس شخص کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' یہ سوال آنحضرت علیہ سے متعلق ہوگا، علامہ عینی نے لکھا کہ بظاہر یہاں حضور علیہ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ میرے بارے میں سوال ہوگا، مگر چونکہ آپ علیہ

نے فرشتوں (منکر نکیر) کے سوال کی نقل فرمائی ہے، اس لئے جو الفاظ وہ کہتے ہیں وہی ادا فرمائے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ فرشتے اس طرح کیوں کہتے ہیں، اور بجائے ہذاالرجل کے رسول اللہ کیوں نہیں کہتے، جواب یہ ہے کہ فرشتے تلقین کی صورت سے بچتے ہیں، اگر وہ سوال کے ضمن میں آنحضرت ﷺ کے لئے کلمات تعظیم واکرام استعمال کریں تو جواب دینے والا اپنے اعتقاد واقعی کا اظہار نہ کرے گا بلکہ فرشتوں کی تقلید کر کے کہہ دے گا کہ ہاں! میں بھی جانتا ہوں، وہ خدا کے رسول ہیں

یہاں یہ امر بھی لائق ذکر ہے کہ اگرچہ بخاری و مسلم کی حدیث میں صرف اسی سوال کا ذکر ہے مگر ابوداؤد و مسند احمد وغیرہ میں دو سوال اور بھی مروی ہیں، (۱) تیرا رب کون ہے؟ (۲) تیرا دین کیا ہے؟ اس کی وجہ علماء کرام نے یہ لکھی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے بارے میں سوال چونکہ باقی دونوں مذکورہ سوالوں کو بھی شامل ہے اور اس کے جواب سے ان دونوں کا جواب بھی معلوم ہو جاتا ہے، اس لئے بعض احادیث میں صرف اسی کا ذکر ہوا ہے اور احادیث رسول اللہ ﷺ چونکہ آپ ﷺ کی ساری زندگی کے مختلف اوقات ومجالس کے ارشادات وافعال ہیں، اس لئے کسی حدیث میں کوئی چیز مجمل ومختصر ملتی ہے تو دوسری میں اس کی تفصیل وتشریح ہوتی ہے واللہ علم۔

اشارہ کس طرف ہے؟

اس کے علاوہ ایک اہم بحث یہ ہے کہ یہ جو اشارہ کر کے دریافت کیا جاتا ہے اس کا مشار الیہ کیا ہے؟ اس بارے میں چونکہ احادیث و آثار سے کوئی تشریح نہیں ملتی، اس لئے علماء کے مختلف اقوال ہیں:۔

(۱) اشارہ معہود ذہنی کی طرف ہے کہ یہ شخص جو تمہارے اندر آیا تھا تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ حدیث ترمذی میں ہے **ما کنت تقول فی ھذا الرجل** (تم اس شخص کے بارے میں کیا کہا کرتے تھے؟) اور مسند احمد میں ہے۔**ما ھذا الرجل الذی بعث فیکم** (یہ شخص کون ہیں جو تم میں بھیجے گئے تھے؟) مسند احمد کی دوسری روایت میں ہے:۔ **من ربک ؟ ما دینک ؟ من نبیک ؟** اس طرح تین سوال ہوں گے۔ (الفتح الربانی ص۸۷ج۷وص۹۷ج۷)

(۲) اشارہ خود ذات اقدس ﷺ کی طرف ہے کہ قبر مبارک تک درمیان کے سارے حجابات اٹھا دیئے جاتے ہیں، اور میت آپ ﷺ کے جمال جہاں آراء کا مشاہدہ کرتا ہے، علامہ قسطلانی نے یہ قول نقل کر کے لکھا کہ اگر یہ بات صحیح ہو تو ظاہر ہے کہ مومن کے لئے بہت ہی بڑی بشارت عظیمہ ہے، اس بارے میں کوئی حدیث صحیح مروی نہیں ہے، اس کے قائل نے یہاں صرف اس امر سے استدلال کیا ہے کہ یہاں اشارہ ہے اور وہ حاضر موجود کے لئے ہی ہوا کرتا ہے، لیکن احتمال اشارہ ذہنی کا بھی ہے، لہٰذا مجاز ہوگا۔

(۳) اشارہ حضور ﷺ کی شبیہ مبارک کی طرف ہے، جو اس وقت میت کے سامنے پیش کی جاتی ہے، قاضی عیاض نے فرمایا ''احتمال ہے کہ قبر میں حضور ﷺ کی شبیہ میت کے لئے پیش کی جاتی ہو، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ صرف آپ ﷺ کا اسم مبارک لیا جاتا ہے۔'' یعنی اس لئے کہ صحیحین عن انس کی روایت **ما کنت تقول فی ھذا الرجل محمد** سے یہی متبادر ہے اور اسی طرح مسند احمد میں بھی روایت ابن المنکدر عن اسماء ہے (فتح الملہم ص۱۶۱ج۲)

صاحب مرعاۃ کا ریمارک

مولانا عبیداللہ مبارک پوری نے مرعاۃ شرح مشکوٰۃ ص۱۵۵ج۱ میں **ما ھذا الرجل الذی بعث فیکم** کے تحت لکھا ''اشارہ

مافی الذھن کی طرف ہے کیونکہ کوئی حدیث صحیح یا ضعیف اس بارے میں نہیں ہے کہ میت کے لئے حجابات اٹھا دیئے جاتے ہیں اور وہ آنحضرت ﷺ کو دیکھتا ہے، لہٰذا ''قبوریین'' اور ان جیسوں کی یہ بات قابل التفات نہیں کہ فرشتوں کے سوال کے وقت آں حضرت ﷺ بذات خود باہر تشریف لاکر ہر میت کی قبر میں پہنچ جاتے ہیں''

(فلا التفات الی قول القبوریین و من شاکلھم بان رسول اللہ ﷺ یشھد بذاتہ فی الخارج فی قبر کل میت عند سوال الملکین

ہم نے جہاں تک مطالعہ کیا اور اوپر کے تینوں قول نظر سے گزرے جو حوالے کے ساتھ اوپر نقل کردیئے گئے، مبارک پوری صاحب نے دوسروں کو بدنام کرنے کے لئے یہ چوتھا قول بھی کہیں سے نکال لیا کہ خود حضور اکرم ﷺ بذات خود ہر میت کی قبر میں تشریف لاتے ہیں، اگر یہ قول بھی کسی کا تھا تو اس کا حوالہ دینا چاہیے تھا۔

دوسرے یہ کہ کسی قول کو رد کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ کسی حدیث میں اس کی تصریح نہیں ہے، شرح حدیث کے سلسلہ میں جتنے اقوال علماء کے ذکر کئے جاتے ہیں، اور بیشتر مواقع میں متعدد ومختلف اقوال ہوتے ہیں اور وہ سب نقل کئے جاتے ہیں، کسی کا قول صرف اس لئے رد نہیں کیا جاتا کہ اس کا ذکر حدیث میں نہیں، البتہ یہ اصول ضرور صحیح ہے کہ کسی کا قول کسی حدیث وآیت کے مخالف ہو تو وہ قابل رد ہے، اور اس کو مبارک پوری صاحب نے یہاں ثابت نہیں کیا اور اگر موصوف نے مذکورہ بالا قول ۲، ۳ کو ہی اس طرح اپنی عبارت میں توڑ موڑ کر پیش کیا ہے جس کا احتمال قوی ہے تو ناظرین خود ہی ان سے مقابلہ کر کے فیصلہ کر سکتے ہیں۔

پھر یہ کہ جس قول کو علامہ قسطلانی پیش کریں اور بغیر تردید کے نقل کریں، یا جس احتمال کو قاضی عیاض ذکر کریں کیا اس کو قبوریین کا قول کہنا صحیح ہوگا؟ اگر ایسا ہے تو شروح حدیث کی کتابوں میں سے ان جیسے اکابر وعلماء ومحدثین کے سب اقوال نکال دینے چاہئیں، حالانکہ سارے محدثین ان حضرات کے اقوال بڑی عظمت وقدر کے ساتھ نقل کرتے آئے ہیں، محدث کبیر علامہ زرقانی نے بھی شرح موطا امام مالک میں قاضی عیاض سے قول مذکور نقل کیا ہے اور کوئی نقد اس پر نہیں کیا دیکھو (شرح الزرقانی ص ۳۸۲ ج ۱)

صاحب تحفۃ الاحوذی کی نقل

اور خود مولانا عبیداللہ صاحب کے استاذ محترم مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ نے بھی تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۳ ج ۲ میں علامہ قسطلانی کا قول مذکور نقل کیا ہے، اور اس کی کوئی تردید نہیں کی، نہ انہوں نے اس امر حق کی وضاحت فرمائی کہ یہ قول قبوریین کا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث کی نقل

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت فیضہم نے اوجز المسالک شرح موطا، امام مالک ص ۳۰۵ ج ۲ میں نقل کیا کہ ہٰذا الرجل کے بارے میں قاضی عیاض نے لکھا یحتمل انہ مثل للمیت فی قبرہ والاظھر انہ سمی لہ اور صحیحین میں حضرت انس ؓ سے ما کنت تقول فی ھذا الرجل لمحمد مروی ہیں، اس پر علامہ طیبی اور شراح مصابیح نے لکھا کہ لام عہد ذہنی کے لئے ہے اور اشارہ بوجہ تنزیل حاضر معنوی بمنزلہ حاضر صوری بطور مبالغہ ہے، پھر ہو سکتا ہے کہ محمد راوی کا قول ہو یا کلام رسول ہو (اوجز)

علامہ ابن ابی جمرہ کے ارشادات

علامہ محدث ابن ابی جمرہ نے بہجۃ النفوس ص۱۲۳ج ۱ میں لکھا کہ ما علمک بھذا الرجل ؟میں رجل سے مراد ذات اقدس ﷺ ہے اور آپ ﷺ کی رویت عینی ہوگی جو کہ حق تعالیٰ کی عظیم قدرت پر شاہد ہے، کیونکہ ایک وقت میں کتنے ہی لوگ دنیا کے مختلف خطوں پر مرتے ہیں اور وہ سب ہی حضور اکرم ﷺ کو اپنے قریب سے دیکھتے ہیں، اس لئے کہ لفظ ہذا عربی زبان میں صرف قریب ہی کے لئے بولا جاتا ہے، جس طرح نبی کریم ﷺ کو ایک وقت میں زمین کے مختلف حصوں میں لوگ خواب کے ذریعہ دیکھیں، اور آپ ﷺ کا خواب میں دیکھنا حق ہے حدیث سے ثابت ہے نہ اس میں کوئی استبعاد ہے نہ اس میں، اس لئے جو لوگ روئیت کا انکار کرتے ہیں وہ گویا حدیث مذکور کا انکار کرتے ہیں اور خدا کی غیر محصور قدرت کو محدود کرتے ہیں۔

اور عقلی[1] طور سے اس کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ حضور اکرم ﷺ کی مثال آئینہ جیسی ہے، ہر انسان اس میں اپنی صورت اچھی یا بری دیکھتا ہے، مگر آئینہ کا حسن اپنی جگہ ہے وہ نہیں بدلتا۔

کرامات اولیاء کرام

علامہ ابن ابی جمرہ نے لکھا کہ اس حدیث الباب سے اولیاء اللہ کی کرامات کا بھی ثبوت ہوتا ہے کہ وہ دور دراز کی چیزیں بھی دیکھ لیتے ہیں، اور چند قدم چل کر دنیا کے طویل راستے طے کر لیتے ہیں، اسی لئے بعض اولیاء نے کہا کہ ''الدنیا خطوۃ مومن'' (ساری دنیا مومن کا ایک قدم ہے) ایسے ہی وہ باوجود کثافت ابدان قلوب کے حالات دیکھ لیتے ہیں۔

نیز حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی چیز کی تمیز و معرفت بھی حق تعالیٰ کا ایک بڑا انعام ہے، اسی طرح حق تعالیٰ کے فضل و انعام سے وہ مومن صادق بھی جو علم سے بے بہرہ ہوں گے، قبر میں حضور اکرم ﷺ کو پہچان لیں گے، اور بار بار سوال پر کہیں گے کہ یہ تو محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، جن کے ذریعہ ہمیں ہدایت خداوندی نصیب ہوئی اور وہ لوگ جنہوں نے زندگی میں حضور ﷺ کو بار ہا دیکھا بھی تھا اور بہت سوں نے علم کے ذریعہ معرفت حاصل کی تھی، وہ بھی کفر و شرک کے سبب قبر میں نہ پہچان سکیں گے۔ (بہجۃ النفوس)

خلاصہ بحث: صاحب مرعاۃ کے ایک بے سوچے سمجھے ریمارک پر بقدر ضرورت چند نقول پیش کی گئیں، اور اصولی بات یہی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اگر کسی حدیث کی شرح اکابر علماء سلف و خلف سے منقول ہو اور وہ کسی اصل شرعی سے معارض بھی نہ ہو تو اس کے رد کے درپے ہونا مناسب نہیں، خصوصاً قبوریین (قبر پرست؟) وغیرہ۔ الفاظ کا بے جھجک استعمال موزوں نہیں اور اگر محض قبر کے کسی حال کی شرح ہی قبوری بنا دینے کے لئے کافی ہے تو پھر حافظ ابن حجر جیسے بھی اس طعن سے نہ بچ سکیں گے۔ حدیث میں ''فتعاد روحہ فی جسدہ'' وارد ہوا تو انہوں نے کہا روح میت صرف آدھے جسم میں واپس ہوتی ہے، کسی نے کہا اس سے بھی کم میں لوٹتی ہے، ملا علی قاری نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں اس پر نقد بھی کیا کہ عقل سے ان باتوں کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ کوئی نقل صحیح ملے تو اس طرف رجوع کرنا چاہئے مگر انہوں نے بھی حافظ ابن حجر کو قبوری نہیں کہا، شاید صاحب مرعاۃ تو ضرور کہہ دیں گے، کیونکہ حافظ ابن حجر کا یہ قول بھی بغیر کسی حدیث صحیح یا ضعیف کے لئے ہے۔

ملا علی قاری کا منشاء یہ ہے کہ جب حدیث میں مطلق لفظ آیا ہے تو عود روح کو کل جسم کے لئے ماننے میں کیا اشکال و استبعاد ہے، اسی

---

[1] موجودہ دور کی ایجاد ٹیلی ویژن سے بھی اس کو سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک شخص دنیا کے کسی ایک حصہ میں بیٹھ کر جو کچھ کہتا یا کرتا ہے، اس کے تمام اقوال و افعال، اس کی شکل و صورت، زمین کے ہر حصہ میں ہر شخص ایک ہی وقت میں بذریعہ ٹیلی ویژن ریڈیو دیکھ اور سن سکتا ہے واللہ اعلم

طرح یہاں گزارش ہے کہ جب تمام احادیث میں سوال قبر کے لئے ہذا الرجل کا لفظ آیا ہے تو اس کو ظاہر سے پھرانے کی کیا ضرورت ہے؟ خصوصاً جب کوئی صریح حدیث صحیح یا ضعیف اس کے خلاف موجود بھی نہیں ہے۔ پھر ہمارے نزدیک قبر کے دوسرے حالات سے بھی اس کو ظاہر پر ہی رکھنے کی تائید زیادہ ہوتی ہے مثلاً:۔

قبر مومن کے عجیب حالات

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سوال و جواب کے بعد مومن سے کہا جائے گا دیکھو! وہ تمہارے حصہ کی جہنم ہے۔ خدا نے اس کے بدلہ میں تمہیں جنت عطا کردی۔ پس وہ مومن مردہ جنت و جہنم دونوں کو دیکھ لے گا، دوسری روایت میں حضرت قتادہ سے بخاری و مسلم ہی میں ہے کہ اس کے لئے اس کی قبر میں ستر گز تک زمین کو کھول دیا جائے گا۔ وہ سارا ہرا بھرا شاداب میدان ہوگا اور قیامت تک اسی طرح رہے گا۔ ترمذی و ابن حبان نے "سبعون ذراعًا في سبعين ذراعًا" مروی ہے یعنی (ستر کو ستر میں ضرب دے کر) چار ہزار نو سو گز مربع اراضی اس کے لئے کھول دی جائیگی اور وہ سارا خطہ اس کے لئے چودھویں رات کے چاند کی طرح منور ہوگا۔ مشکوۃ شریف میں ابوداؤد وغیرہ سے یہ بھی روایت ہے کہ آسمان سے ایک منادی اس طرح ندا کرے گا: میرے بندے نے سچ کہا (یعنی ٹھیک ٹھیک جواب دیئے ہیں) اس کے لئے جنت کا فرش لاکر بچھاؤ۔ اس کے لئے جنت کا لباس لا کردو، اس کے لئے جنت کی طرف دروازہ کھول دو جس سے اس کو اچھی ہوا اور خوشبوئیں آتی رہیں اور اس کے لئے اس کی حد وسعت تک زمین کو کھول دو۔

یہ قبر کے گڑھے میں پڑا ہوا مومن مردہ کیا کیا دیکھ رہا ہے، جنت کو دیکھ لیا جو ساتویں آسمان سے بھی اوپر ہے (زمین سے اربوں کھربوں میل بعید سے بعید تر[1] جہاں روشنی تیز رفتار چیز بھی زمین تک کروڑوں نوری سال میں پہنچ سکتی ہے) جہنم کو بھی دیکھ لیا جو اسفل السافلین میں ہے۔

مومن جنتی کے برزخی محل کے لئے فرش و لباس بھی جنت سے مہیا کیا جاتا ہے اس کی قبر کو شاہی محلات کی طرح وسعت دے دی جاتی ہے اس کے برزخی محل کا ایک پھاٹک جنت کی طرف کھول دیا جاتا ہے، جس کی ہواؤں سے وہ سارا محل "ائر کنڈیشنڈ" اور جنت کی خوشبوؤں سے بسا ہوا رہتا ہے اور یہی۔ صورت و کیفیت روز قیامت تک رہے گی۔ کیا یہ سب کچھ صحیح و قوی احادیث سے ثابت نہیں۔ جب عالم برزخ یا قبر کے لئے ایسے عجیب و غریب حالات کا ثبوت موجود ہے تو قبر سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روزہ مطہرہ طیبہ تک حجابات کا اٹھ جانا اور بقول علامہ قسطلانی کہ اس وقت ایک مومن کا آپ کے دیدار مقدس کی نعمت عظیمہ سے مشرف ہو جانا، کس طرح نکیر کا مستحق ہو گیا، کہ اس کو قبر پرستوں کی بات کہا جائے، یا اگر شبیہ مبارک ہی سامنے کی جاتی ہے تو اس میں بھی کون سی بدعت و شرک کی شکل نظر آ گئی جس کے باعث اس کو اہل بدعت یا قبوریین کا قول کہا گیا؟

---

[1] ہمارے حضرات اکابر میں سے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ نے حجۃ الاسلام میں معجزہ "شق قمر" کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پورے نظام شمسی کو ہم آسمانوں سے ورے مان سکتے ہیں، جس کی تفصیل بسلسلہ "ملفوظات انور" راقم الحروف نے جنوری ۶۰ء کے رسالہ نقش دیوبند میں کی تھی اور لکھا تھا کہ بروئے تحقیق جدید ہمارے گرد کی فضائے محیط میں بہت سے ستارے ہم سے اتنی دور ہیں کہ ان کی روشنی زمین تک کئی کروڑ برس میں پہنچتی ہے اور ایک ستارہ ایسا بھی دریافت ہوا ہے جس کا فاصلہ زمین سے آٹھ سو مہا سنگ میل دور ہے۔ جس سے متاثر ہو کر یورپ کے بعض فلاسفروں نے لکھا کہ کائنات کا حجم یا لامحدودیت انسان کے لئے اتنی زیادہ اہم نہیں بلکہ جس سے انسان زیادہ ششدر و حیران رہ جاتا ہے وہ کائنات کی مکمل باضابطگی ہے کہ کوئی گڑ بڑ نہیں کوئی چیز خلاف توقع نہیں ہے" جب آسمان دنیا کے نیچے ہی نظام شمسی میں اتنی بڑی محیر العقول وسعت و پنہائی ہے، جس نے دنیا والوں کی عقلوں کو حیران کر دیا ہے، تو پھر ساتویں آسمان تک کتنا فاصلہ ہوگا اور اس کے اوپر کا علاقہ جنت کا ہے، جس کی چھت عرش الٰہی ہے، اس کا فاصلہ ہماری زمین سے، اور مردہ کی قبر سے کس قدر ہونا چاہئے، ظاہر ہے۔

(نوٹ) روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے، اس رفتار سے روشنی ایک سال میں جو فاصلہ طے کرتی ہے اسے "نوری سال" کہتے ہیں، اور اسی سال کے حساب سے ستاروں سیاروں کے فاصلے متعین کئے جاتے ہیں (مؤلف)

غرض ایک طرف اگر معہود ذہنی والی صورت کچھ قرائن کے تحت مراد ہو سکتی ہے تو دوسری طرف ھذا الرجل کو اصلی و حقیقی و غیر مجازی معنی میں لینا بھی کسی طرح بدعت و شرک نہیں قرار پا سکتا۔

ولو رغم انف بعض الناس. والعلم عندالله. و منه الرشد والهداية فى كل باب

قبر میں سونے کا مطلب: حدیث الباب میں ہے کہ مومن سے سوال و جواب کے بعد فرشتے یہ کہہ کر چلے جائیں گے "اب تم آرام سے سو جاؤ! ہم پہلے ہی جانتے تھے کہ تم ایمان و یقین کی نعمت سے سرفراز ہو"

علامہ باجی نے کہا کہ نوم سے مراد پہلی حالت موت کی طرف لوٹنا ہے اور اس کو نوم اس لئے کہا کہ اس میں نیند کی طرح راحت و سکون ہوگا۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں" **ثم نومة عروس فيكون فى احلى نومة نامها احد حتى يبعث** "(دلہن کی طرح سو جاؤ! پس وہ قبر سے اٹھنے کے وقت تک سب سے میٹھی اور پرسکون نیند سوئے گا، جو کوئی دنیا کی اچھی سے اچھی نیند سویا ہوگا۔ ترمذی میں ہے کہ اس سے کہا جائے گا کہ اب سو جاؤ! تو وہ دلہن کی طرح سو جائے گا۔ جس کو صرف وہی صبح کے وقت بیدار کرتا ہے، جو گھر کے لوگوں میں اس کو سب سے زیادہ محبوب ہوتا ہے) تا آنکہ حق تعالیٰ ہی اس کو خوابگاہ خاکی سے اٹھائیں گے۔

حضرت شاہ صاحب کی تحقیق

آپ نے فرمایا کہ بعض احادیث سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قبور معطل ہیں ان میں اعمال نہیں ہوتے، مگر دوسری احادیث سے اعمال کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ مثلاً اذان و اقامت کا ثبوت دارمی سے، قراءت قرآن کا ترمذی سے، حج کا بخاری سے، وغیرہ امام سیوطی کی شرح الصدور میں ان کی تفصیل ہے۔ پھر اسی طرح سے ہر دو جانب کی طرف کے اشارات قرآن مجید میں بھی ہیں مثلاً سورۂ یٰسین میں ہے **من بعثنا من مرقدنا** ؟ (ہماری خوابگاہوں سے کس نے ہمیں اٹھا دیا) اس سے معلوم ہوا کہ قبر میں کوئی احساس نہیں ہوتا اور سب بے خبر سوئے رہتے ہیں دوسری آیت میں ہے **النار يعرضون عليها غدوا وعشيا** (دوزخ ان پر صبح و شام پیش کی جاتی ہے) اس سے معلوم ہوا کہ قبر والے بیدار و باخبر رہتے ہیں۔ ورنہ صبح و شام ان کو دوزخ دکھانے کا کیا فائدہ؟ میرے نزدیک صورت واقعہ اس طرح ہے کہ برزخ کا حال ہر شخص کے اعمال زندگی کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی قبروں میں سوتے ہیں، کچھ لوگ برزخی نعمتوں سے محفوظ اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کچھ اعمال میں مشغول ہوتے ہیں نوم کا لفظ اس لئے اختیار کیا گیا کہ برزخی زندگی اسی کے ساتھ مشابہ ہے۔ اور اسی لئے حدیث میں **النوم اخ الموت** کہا گیا ہے اور اسی لئے قرآن مجید میں نوم و موت کو ایک ہی لفظ کے تحت درج کیا گیا۔" **الله يتوفى الانفس حين موتها والتى لم تمت فى منامها** "

غرض برزخ اس عالم کی زندگی سے انقطاع اور دوسرے عالم کی زندگی کی ابتداء کا نام ہے۔ اور اسی طرح نوم میں بھی اس دنیا سے ایک قسم کا انقطاع ہوتا ہے۔

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں   خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں

کافر سے قبر میں سوال ہوگا یا نہیں؟

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اکثر روایات میں **اما المنافق او المرتاب** ہی مروی ہے بعض روایات میں او الکافر ہے اور ایک نسخہ

اس میں والکافر بدون تردید کے بھی ہے۔اس لئے یہاں یہ بحث چھڑگئی کہ قبر کا سوال منافق کے ساتھ خاص ہے یا کھلے کافر سے بھی ہوگا؟

علامہ ابن عبدالبر کی رائے یہ ہے کہ قبر کا سوال صرف مومن سے ہوگا یا منافق سے جوظاہری طور پر اسلام لائے ہوئے ہے اور دل میں ایمان نہیں رکھتا پس اصلی مومن اور بناوٹی کا امتیاز کرنے کے لئے سوال کرایا جائے گا۔اور جو کھلے کافر ہیں ان سے سوال بے سود ہے۔اس لئے نہ ہوگا۔علامہ سیوطیؒ نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہے اور شرح الصدور میں اسی کو ثابت کیا ہے۔

علامہ قرطبی وابن قیم کی رائے یہ ہے کہ کافر سے بھی سوال ہوگا۔وہ کہتے ہیں کہ جب مومن ومنافق سے سوال ہوگا تو کافر سے بدرجہ اولیٰ ہونا چاہئے اور کتاب الروح صفحہ ۸۶ میں لکھا کہ آیت **فلنسئلن الذین ارسل علیهم ولنسئلن المرسلین** سے ثابت ہوا کہ قیامت میں ان سب سے سوال ہوگا تو قبروں میں کیوں نہ ہوگا۔

حافظ ابن حجر نے لکھا کہ جن روایات سے کافر کا مسئول ہونا نکلتا ہے وہ دوسری روایات کی نسبت زیادہ قوی وراجح ہیں۔لہٰذا وہی اولی بالقبول ہیں اور محدث حکیم ترمذی نے بھی یقین کے ساتھ کہا ہے کہ کافر سے سوال ہوگا۔حضرت شاہ صاحب نے فرمایا میرے نزدیک بھی یہی مختار ہے کہ کافر سے بھی سوال ہوگا۔ اس موقع پر فیض الباری صفحہ ۱۸۵ سطر اول میں **السوال غیر مخصوص** کی ------مخصوص چھپ گیا ہے۔

کیا قبر کا سوال اسی امت کے ساتھ مخصوص ہے

حافظ ابن قیم نے لکھا ابوعبداللہ ترمذی کی رائے ہے کہ سوال میت اسی امت محمد یہ کے لئے خاص ہے۔کیونکہ پہلی امتوں میں اگر لوگ رسالت یا احکام رسالت کا انکار کرتے تھے تو ان رسولوں کی موجودگی کافی ہوتی تھی وہ ان کافروں سے الگ ہوجاتے تھے پھر ان کافروں پر عذاب الٰہی آجاتا تھا۔اب آخری زمانے میں جب نبی اکرم خاتم النبیین ﷺ کی بعثت رحمت اللعالمین بنا کر ہوئی تو اس امت سے عذاب کا حکم اٹھ گیا۔جہاد کا حکم نازل ہوا کہ اگر کوئی شخص بالفرض ڈر وخوف سے مسلمان بھی ہوجائے تو اس کو سوچ سمجھ کر اسلام پر پختگی حاصل کرنے کا موقع مل جائے ورنہ نفاق اختیار کرے گا۔پھر جب دنیا سے اسی حال میں چل بسا تو قبر میں امتحان مقرر کردیا گیا تا کہ سوال کے ذریعہ بات صاف ہوجائے۔**لیمیز اللہ الخبیث من الطیب فیثبت اللہ الذین امنو بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ویضل اللہ الظالمین و یفعل اللہ ما یشاء** ان کی دلیل یہ بھی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "یہ امت قبروں میں آزمائی جائے گی"ایک دفعہ فرمایا میری طرف وحی ہوئی کہ تم قبر کے فتنہ سے آزمائے جاؤ گے۔اسی طرح یہ سوال بھی بظاہر مخصوص ہی ہے کہ اس امت کے مقبولین سے فرشتے حضور اکرم ﷺ کے بارے میں سوال کریں گے۔ایک حدیث میں ہے کہ تم سے میرے بارے میں سوال وامتحان ہوگا۔

دوسرے حضرات کی رائے اس کے خلاف ہے۔جن میں عبدالحق اشبیلی اور قرطبی وغیرہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ سوال قبر دوسری امتوں میں بھی تھا۔حدیث میں اس امت کے ذکر سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پہلے نہ تھا۔کہ عدم ذکر، ذکر عدم کو مستلزم نہیں، غالباً اسی لئے کچھ حضرات نے اس بارے میں توقف کیا ان میں ابوعمر ابن عبدالبر وغیرہ ہیں (کتاب الروح صفحہ ۸۶)

قبر کا سوال اطفال سے؟

جو بچے بغیر سن تمیز کو پہنچے ہوئے مرجاتے ہیں علامہ قرطبی نے تذکرے میں لکھا کہ ان سے بھی سوال ہوگا اور یہی قول حنفیہ سے بھی منقول ہے۔ اور بہت سے شافعیہ کی رائے ہے کہ ان سے سوال نہ ہوگا اور اسی لئے ان کے نزدیک ایسے اطفال کی تلقین مستحب نہیں۔(الفتح الربانی صفحہ ۸۵ ج ۷)

سوال روح سے ہوگا یا جسد مع الروح سے

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اسی جسد مع الروح سے ہوگا جیسا کہ اس کی طرف صاحب ہدایہ نے بھی اشارہ کیا ہے صوفیاء کہتے ہیں جسد مثالی مع الروح سے ہوگا۔ اس ترابی جسد کے ساتھ نہ ہوگا۔

عارف جامیؒ نے فرمایا اس عالم میں اجساد کے احکام غالب ہیں اور روح کے احکام مستور ہیں کیونکہ جسم ظاہر اور روح پوشیدہ ہے۔ عالم برزخ میں برعکس ہوگا۔ روح کے احکام وآثار ظہور کریں گے اور محشر میں دونوں کے احکام وآثار برابر ہو جائیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جسم کو برزخ میں عذاب کس طرح ہوگا

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ مرنے کے بعد جسم کے ذرات واجزاء منتشر ہو جانے کی صورت میں جو استبعاد عذاب کے بارے میں سمجھا جاتا ہے وہ اس بناء پر ہے کہ جمادات میں شعور نہیں مانا جاتا حالانکہ جمادات میں بھی شعور بسیط موجود ہے اور اس کو ہر زمانہ کے محققین نے تسلیم کیا ہے جب شعور بسیط ثابت ہو گیا تو پھر ذرات جسم کے عذاب میں کیا استبعاد باقی رہا۔ وہ جہاں جہاں بھی ہوں گے ان کو راحت و عذاب کی کیفیت حاصل ہوگی۔ یہ کس نے کہا کہ یہی دنیاوی وضع وصورت بھی عذاب کے وقت باقی رہنی چاہئے۔ مثلاً کسی کافر یا مومن کو اگر شیر درندے نے کھالیا یا بڑی مچھلی مگرمچھ نے نگل لیا تو وہی اس کی قبر یا اس کا عالم برزخ ہے۔ وہیں سوال ہوگا اور عذاب وراحت بھی روح و ذرات جسم کو ہوتی رہے گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سفر آخرت کا اجمالی حال

احادیث صحیحہ قویہ کی روشنی میں اس سفرنامہ کا مختصر حال یاد رکھنا چاہئے نیک بندہ خواہ مرد ہو یا عورت قریب وقت موت اس کے پاس رحمت کے فرشتے آتے ہیں اس کو جنت کی بشارت دیتے ہیں اس کو سلامتی اور اصحاب یمین میں سے ہونے کی خوشخبری سناتے ہیں اور اس کی روح کو نہایت سہولت سے نکالتے ہیں اور اس کو نہایت اکرام واعزاز کے ساتھ ملاء اعلیٰ پر لے جاتے ہیں۔ وہ روح عرش الٰہی کے سامنے حاضر ہو کر سجدہ میں گر جاتی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے علیین میں جگہ دو۔ پھر تجہیز وتکفین سے قبل ہی وہاں سے سند قبول وحضور الٰہی سے مشرف ہو کر اپنے جسم میں آجاتی ہے اور قبر یا عالم برزخ میں سوال کا جواب دیتی ہے۔ جس پر حسب حکم خداوندی اس کی قبر کو فراخ کر دیا جاتا ہے۔ جنت کے فرش ولباس مہیا ہو جاتے ہیں اور جنت کی طرف دروازہ کھل جاتا ہے جس سے برابر اچھی ہوائیں اور عمدہ خوشبوئیں آتی رہتی ہیں۔ اور اس کی روح کا اصل مستقر علیین میں ہوتا ہے۔ جو ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے لکھا کہ ارواح مومنین کا مستقر ساتویں آسمان پر علیین میں ہے اور ارواح کفار کا مستقر ساتویں زمین کے نیچے سجین میں ہے۔ یہی قول ایک جماعت علماء سلف وخلف کا ہے اور اسی پر حضور اکرم علیہ کا قول ''اللهم الرفيق الاعلیٰ'' دلیل ہے (الروح لابن قیم صفحہ ۱۰۷)

یہ بھی آتا ہے کہ انسان کے محافظ فرشتے مرتے وقت مومن کی تعریف اور غیر مومن کی مذمت کرتے ہیں۔ مرتے وقت اپنے اچھے اور برے اعمال زندگی کی صورت اچھی یا بری دیکھتا ہے۔ آسمان کے جس دروازے سے رزق اترتا ہے اور دوسرا دروازہ جس سے اس کے نیک اعمال اوپر چڑھتے ہیں، دونوں اس کی موت پر روتے ہیں اسی طرح زمین کے وہ حصے روتے ہیں جن پر وہ نمازیں وغیرہ ادا کرتا تھا۔ اللھم اجعلنا کلنا منهم بفضلك و کرمک یا ارحم الرحمین.

کافر مرد یا عورت، اور اسی طرح منافق و بدکار

قریب وقت موت اس کے پاس عذاب کے فرشتے آتے ہیں اور وہ انواع و اقسام کے عذاب و اہانت کی چیزیں دیکھتا ہے اس کی روح سختی سے نکالی جاتی ہے اور آسمان کے دروازے اس کے لئے بند ہوتے ہیں اس کو حقارت و نفرت سے نیچے پھینک دیا جاتا ہے نہ اس پر آسمان روتا ہے نہ زمین اس کے مرنے کا افسوس کرتی ہے۔ اس کی روح سجین میں رہتی ہے۔ اور جسم کے ساتھ عذاب و تکلیف اٹھاتی رہتی ہے۔ قبر تنگ ہو جاتی ہے اس کے نیچے آگ کا فرش بچھایا جاتا ہے اور دوزخ کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ اعاذنا اللہ منہ

سورج و چاند کا گہن اور مقصد تخویف

ایک سوال یہاں یہ ہوتا ہے کہ جب چاند و سورج اپنے اپنے وقت مقررہ پر گہن میں آتے ہیں اور اہل ہیئت و تقویم ٹھیک منٹوں وسیکنڈوں کا حساب لگا کر بتلا دیتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت سورج یا چاند کا گہن ہوگا اور کہاں نظر آئے گا کہاں نہیں وغیرہ تو پھر حق تعالیٰ کا جو اس سے مقصد بندوں کو ڈرانا ہے اور اپنی اطاعت و عبادت ذکر و تفکر کی طرف بلانا ہے وہ کیونکر صحیح مانا جائے؟

اس کا جواب علامہ ابن دقیق العیدؒ نے دیا کہ اہل حساب جو کچھ بتلاتے ہیں وہ حضور علیہ السلام کے ارشاد ذیل کے منافی نہیں۔ **آیتان من آیات اللہ یخوف اللہ بھما عبادہ** (یہ دونوں خدا کی نشانیاں ہیں جن سے حق تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتے ہیں) کیونکہ دنیا میں حق تعالیٰ کے کچھ افعال ایک عادت مقررہ کے موافق ظاہر ہوتے ہیں اور کچھ خلاف عادت عامہ یا بطور خرق عادت ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی قدرت کاملہ تمام اسباب دنیوی پر حاکم و حاوی ہے۔ وہ جن اسباب کو چاہے ان کو اپنے مسببات سے منقطع بھی کر سکتا ہے۔

غرض دنیا میں ظاہر ہونے والے عظیم ہولناک وقائع کا وجود خرق عادت کے طور سے ہو یا بغیر اس کے مقررہ نظام و عادت الٰہیہ کے تحت، ہر دو صورت میں وہ خلاق عالم قادر مطلق و معبود برحق ہی کی طرف سے ہے۔ اور دونوں ہی قسم کے واقعات سے حق تعالیٰ کے غصہ و عتاب و عذاب کا خوف اور اس کی رحمت و مغفرت رضا و خوشنودی کی طرف انابت و رجوع ہونا چاہئے۔ جس طرح ہم نے پہلے لکھا کہ یورپ کے بڑے بڑے فلسفی بھی اس عظیم الشان نظام عالم اور نظام شمسی و فضائی یکسانیت و ہم رنگی سے حیران و ششدر ہیں کہ ہزاروں برس سے ایک ہی ڈھرے پر سارا نظام چلا آ رہا ہے اور ہزاروں برس بعد کے لئے بھی اسی طرح متوقع ہے۔

کیا لاکھوں ہزاروں برس تک ایک ہی طرح سے نظام کا چلنا کہ کبھی ایک منٹ و سیکنڈ کا فرق بھی کسی بات میں نہ آپائے۔ کسی انسان کا بنایا اور چلایا ہوا ہو سکتا ہے جو سو سوا سو برس جی کر مر جاتا ہے یا اس مادی نظام میں خود بخود ایسی صلاحیت موجود ہے جو بغیر کسی قادر مطلق علیم وخبیر سمیع و بصیر کے خود ہی ایسے منظم و عظیم کارخانہ ہستی کی صورت میں چلتا رہے۔

بس یہیں سے انسانوں کی دو قسم بن جاتی ہیں ایک وہ کہ اپنی فطری صلاحیتوں اور شرائع سماویہ و علوم نبوت کے سبب اوپر کی بات سمجھ گئے اور خدا تک رسائی حاصل کر لی۔ وہ حزب اللہ اور مومن کہلائے۔ دوسرے وہ جو اپنی کج فطرتی اور شرائع سماویہ و علوم نبوت سے بے بہرگی کے سبب اوپر کی بات نہ سمجھ سکے نہ خدا تک ہی رسائی حاصل کر سکے، پھر ان میں سے بہت سے منکر و دہریہ ہو گئے، بہت سے مشرک بن گئے، یہ سب خرب الشیطان اور کافر کہلائے۔ منکر و دہریہ ہو گئے۔ بہت سے مشرک بن گئے۔ یہ سب حزب الشیطان اور کافر کہلائے۔

حضرت شاہ صاحب کا ارشاد

آپ نے بھی علامہ محقق ابن دقیق العید کی رائے سے اتفاق کیا اور مزید فرمایا کہ کسوف و خسوف کے اسباب معلومہ و حساب معلوم کے

مطابق ہونے کو موجب تخویف نہ سمجھنا بڑی ہی جہالت کی بات ہے۔ کیونکہ دنیا کی ساری ہی چیزیں اسباب کے تحت ظاہر ہورہی ہیں۔ اور ایک سمجھدار عبرت پذیر انسان کو چاہئے کہ شب وروز کے تمام حالات انفس وآفاق کو نظر وتفکر وعبرت سے دیکھے۔ ہواؤں کے تصرفات، رات دن کے انقلاب، بحری جہازوں کا سمندروں میں دوڑنا پھرنا ہوائی جہازوں اور راکٹوں کا فضا میں اڑنا، موٹروں وریلوں کا زمین ناپنا، موسموں کے تغیرات سورج چاند وغیرہ کے اثرات کونسی چیز اسباب کے تحت نہیں ہے۔ اور ضرور ہے، مگر پھر بھی ہر چیز میں ایک عاقل خداشناس انسان کے لئے سینکڑوں ہزاروں عبرتیں حاصل ہوسکتی ہیں۔ جن سے حق تعالیٰ کی عظیم قدرت قھاری جباری اور رحمانی ورحیمی کی شان ظاہر ہوتی ہے۔

گرنہ بیند بروز شپرہ چشم　　　چشمہ آفتاب راچہ گناہ

اس کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ قرآن مجید بسا اوقات اشیاء کے نفس الامری وحقیقی اسباب سے تعرض نہیں کرتا۔ کہ وہ کیا ہیں۔ وہ کس طرح ہیں۔ وہ صرف ایک ظاہری وسرسری عام بات بیان کردیتا ہے جو سب کو معلوم ہے یا سب کی سمجھ میں آسکتی ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے علوم وفنون کی ضرورت نہیں ہوتی اگر وہ اس طرف تعرض کرتا تو ہدایت کا سیدھا سادا آسان طریقہ علمی وفنی بحثوں میں گم ہوجاتا اور عوام اس سے محروم ہوجاتے کیونکہ انسان کی فطرت ہے۔ وہ اپنی تحقیق پر بھروسہ زیادہ کرتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے قرآنی ہدایات ودلائل ''حرکت ارض'' کے نظریہ پر مبنی ہوتے تو ایسے لوگ ضرور اس کی تکذیب کرتے جو حرکت فلک کے قائل تھے۔ چنانچہ جب یورپ کے فلاسفہ نے حرکت ارض کی تحقیق کی تو دوسو برس سے زیادہ عرصہ تک علماء ومتبعین انجیل ان سے جھگڑتے رہے وہ کہتے تھے کہ حرکت ارض کا نظریہ انجیل کے خلاف گمراہی ہے۔ پس اگر قرآن مجید حرکت ارض بتلاتا تو سینکڑوں سال تک لوگ اس کی بھی تکذیب کرتے، کیونکہ فلاسفہ یونان فلک کی حرکت مانتے تھے اور زمین کو ساکن کہتے تھے اسی طرح دوسرے اسباب کی طرف بھی قرآن مجید میں تعرض نہیں کیا گیا۔ اگر وہ ایسا کرتا اور اکثر لوگ ان کی حقیقت تک رسائی حاصل نہ کرسکتے تو وہ اپنی کم علمی وکم فہمی کے سبب قرآن مجید ہی کا انکار کردیتے اور گمراہی کا شکار ہوجاتے۔ اعاذنا اللہ من ذلک

بَابُ تَحۡرِيۡضِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ وَفۡدَ عَبۡدِالۡقَیۡسِ عَلٰٓی اَنۡ یَحۡفَظُوۡا الۡاِیۡمَانَ وَالۡعِلۡمَ وَیُخۡبِرُوۡا مَنۡ وَّرَاءَ ھِمۡ وَقَالَ مَالِکُ ابۡنُ الۡحُوَیۡرِثِ قَالَ لَنَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اِرۡجِعُوۡ اِلٰٓی اَھۡلِیۡکُمۡ فَعَلِّمُوۡھُمۡ

رسول اللہ ﷺ کا قبیلہ عبدالقیس کے وفد کو اس امر کی ترغیب دینا کہ وہ ایمان اور علم کی باتیں یاد رکھیں اور اپنے پیچھے رہ جانے والوں کو ان باتوں کی خبر کردیں۔ اور مالک بن الحویرث نے فرمایا کہ ہمیں نبی کریم ﷺ نے (خطاب کرکے) فرمایا کہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر انہیں دین کا علم سکھاؤ۔

(۸۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بۡنُ بَشَّارٍ قَالَ حَدَّثَنَا غُنۡدَرٌ قَالَ حَدَّثَنَا شُعۡبَةُ عَنۡ اَبِیۡ جَمۡرَةَ قَالَ کُنۡتُ اُتَرۡجِمُ بَیۡنَ ابۡنِ عَبَّاسٍ وَ بَیۡنَ النَّاسِ فَقَالَ اِنَّ وَفۡدَ عَبۡدِ الۡقَیۡسِ اَتَوُا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَنِ الۡوَفۡدُ اَوۡ مَنِ الۡقَوۡمُ قَالُوۡا رَبِیۡعَةٌ قَالَ مَرۡحَبًا بِالۡقَوۡمِ اَوۡ بِالۡوَفۡدِ غَیۡرَ خَزَایَا وَلَا نَدَامٰی قَالُوۡا اِنَّا نَاتِیۡکَ مِنۡ شُقَّةٍ بَعِیۡدَةٍ وَبَیۡنَنَا وَبَیۡنَکَ ھٰذَا الۡحَیُّ مِنۡ کُفَّارِ مُضَرَ وَلَا نَسۡتَطِیۡعُ اَنۡ نَّاتِیَکَ اِلَّا فِیۡ شَھۡرِ حَرَامٍ فَمُرۡنَا بِاَمۡرٍ نُّخۡبِرُ بِہٖ مَنۡ وَّرَآءَ نَا نَدۡخُلُ

بِهِ الْجَنَّةَ فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ وَّنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ أَمَرَهُمْ بِالْإِيْمَانِ بِاللهِ وَحْدَهُ قَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَا الْإِيْمَانُ بِاللهِ وَحْدَهُ؟ قَالُوْا اللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ قَالَ شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللهِ وَإِقَامُ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَصَوْمُ رَمَضَانَ وَتُؤْتُوا الْخُمُسَ مِنَ الْمَغْنَمِ وَنَهَاهُمْ عَنِ الدُّبَّاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالْمُزَفَّتِ قَالَ شُعْبَةُ وَرُبَمَا قَالَ النَّقِيْرُ وَرُبَمَا قَالَ الْمُقَيَّرُ قَالَ احْفَظُوْهُ وَأَخْبِرُوْهُ مَنْ وَّرَائَكُمْ.

ترجمہ ۸۷: شعبہ نے ابو جمرہ کے واسطے سے بیان کیا کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما اور لوگوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض سرانجام دیتا تھا تو ایک مرتبہ ابن عباس ؓ نے کہا کہ قبیلہ عبدالقیس کا وفد رسول اللہ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا آپ علیہ السلام نے دریافت فرمایا کہ کون قاصد ہے یا یہ پوچھا کہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ ربیعہ کے لوگ ہیں آپ نے فرمایا مبارک ہو قوم کو آنا یا مبارک ہو اس وفد کو جو کبھی رسوا نہ ہو۔ نہ شرمندہ ہو۔ اس کے بعد انہوں نے عرض کیا کہ ہم ایک دور دراز گوشہ سے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا یہ قبیلہ پڑتا ہے۔ اس کے خوف کی وجہ سے ہم حرمت والے مہینوں کے علاوہ اور ایام میں حاضر نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہمیں کوئی ایسی قطعی بات بتلا دیجئے جس کی ہم اپنے پیچھے رہ جانے والوں کو خبر دے دیں۔ اور اس کی وجہ سے ہم جنت میں داخل ہو سکیں تو آپ نے انہیں چار باتوں کا حکم دیا۔ کہ اللہ واحد پر ایمان لائیں اس کے بعد فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ ایک اللہ پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں آپ علیہ السلام نے فرمایا ایک اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا اقرار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا رمضان کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرو اور چار چیزوں سے منع فرمایا دبا، حنتم اور مزفت کے استعمال سے منع فرمایا اور چوتھی چیز کے بارے میں شعبہ کہتے ہیں کہ ابو جمرہ بسا اوقات نقیر کہتے تھے اور بسا اوقات مقیر (اس کے بعد رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ ان باتوں کو یاد رکھو اور اپنے پیچھے رہ جانے والوں کو ان کی اطلاع پہنچا دو۔

تشریح: مقصد ترجمۃ الباب یہ ہے کہ تعلیم کے بعد خواہ وہ افتاء کے ذریعہ ہو یا درس وغیرہ کے ذریعہ سے، معلم کو چاہئے کہ متعلم کو اس امر کی بھی ہدایت کرے کہ وہ دین کی باتوں کو یاد کر کے دوسروں تک پہنچائے صرف اپنی ذات تک محدود نہ رکھے جیسا کہ حضور اکرم علیہ السلام نے وفد عبدالقیس اور مالک بن الحویرث کو تاکید فرمائی۔ وفد عبدالقیس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور مالک بن الحویرث مشہور صحابی ہیں بصرہ میں سکونت تھی۔ ۷۴ھ میں وفات پائی۔ حضور اکرم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر انیس دن قیام کیا، علوم نبوت سے فیض یاب ہوئے رخصت کے وقت حضور علیہ السلام نے ان کو تاکید فرمائی کہ اپنے اہل وعیال میں پہنچ کر ان کو بھی دین کی تعلیم دیں۔ وفد عبدالقیس والی حدیث مذکور پہلے کتاب الایمان میں گذر چکی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے وربما قال المقیر پر فرمایا کہ حقیقت میں شک جو کچھ ہے وہ مزفت ومقیر کے درمیان ہے۔ نقیر ومقیر کے درمیان نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں عبارت میں ایک طرح کا ابہام ومسامحت ہے۔ علامہ عینی نے لکھا کہ مزفت ومقیر چونکہ ایک ہی چیز ہے اس لئے تکرار لازم آتا ہے اور اس سے بچنے کی صورت کرمانی نے لکھی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں مزفت ومقیر کا باہم مقابلہ ہی مقصود نہیں ہے کہ تکرار لازم آئے بلکہ مقصد یہ ہے کہ تین چیزوں کے ذکر پر تو یقین ہے یعنی حنتم، دبا، مزفت پر چنانچہ پہلے بھی ان کا ذکر آچکا ہے اور وہاں مقیر ومزفت دونوں الفاظ میں شک کا بیان بھی گزر چکا ہے یہاں اس شک کے علاوہ ایک دوسرے شک کا بھی اظہار ہے کہ نقیر کا ذکر ہوا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے ذکر میں وہاں شک نہیں بتلایا تھا۔ (عمدۃ القاری صفحہ ۴۹۲ ج ۱)

بَابُ الرِّحْلَةِ فِی الْمَسْئَا لَةِ النَّازِلَةِ

(کسی مسئلہ کی تحقیق کے لئے سفر کرنا)

(۸۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ اَبُو الْحَسَنِ قَالَ اَنَا عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ اَنَا عُمَرُ بْنُ سَعِيْدِ ابْنِ اَبِیْ حُسَيْنٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اَبِیْ مُلَيْكَةَ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ الْحَارِثِ اَنَّهُ تَزَوَّجَ ابْنَةً لِّاَبِیْ اِهَابِ بْنِ عَزِيْزٍ فَاَتَتْهُ امْرَاَةٌ فَقَالَتْ اِنِّیْ قَدْاَرْضَعْتُ عُقْبَةَ وَالَّتِیْ تَزَوَّجَ بِهَا قَالَ لَهَا عُقْبَةُ مَا اَعْلَمُ اَنَّكِ اَرْضَعْتِنِیْ وَلَا اَخْبَرْتِنِیْ فَرَكِبَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ فَسَاَلَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ وَقَدْ قِيْلَ فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ وَنَكَحَتْ زَوْجًا غَيْرَهٗ.

ترجمہ۸۸: عبداللہ ابن ابی ملیکہ نے عقبی ابن الحارث کے واسطے سے نقل کیا کہ عقبی نے ابواہاب ابن عزیز کی لڑکی سے نکاح کیا تو ان کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی کہ میں نے عقبی کواور جس سے اس کا نکاح ہوا اس کو دودھ پلایا ہے۔ یہ سنکر عقبی نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ تو نے مجھے دودھ پلایا ہے۔ تب عقبی مکہ معظمہ سے سوار ہوکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ کس طرح تم اس لڑکی سے تعلق رکھو گے۔ حالانکہ اس کے متعلق یہ کہا گیا تب عقبی نے اس لڑکی کو چھوڑ دیا اور اس نے دوسرا خاوند کرلیا۔

تشریح: انہوں نے احتیاطاً چھوڑ دیا کہ جب شبہ پیدا ہوگیا تو اب شبہ کی بات سے بچنا بہتر ہے مگر جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو ایک عورت کی شہادت اس کے لئے کافی نہیں۔ یہاں پر بر بنائے احتیاط آپ نے ایسا فرمادیا اس لئے جمہور ائمہ کے نزدیک دوعورتوں کی شہادت ضروری ہے۔ ائمہ مجتہدین میں سے صرف امام احمد یہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت کی شہادت بھی ایسے موقع پر کافی ہے۔ علامہ عینیؒ نے ابن بطال کا قول نقل کیا کہ جمہور علماء کے نزدیک حدیث الباب میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد مذکور محض محل شبہ و موضع تہمت سے بچنے کے لئے ہے۔ گویا حکم ورع ہے۔ حکم تحریم نہیں۔ (عمدہ ۴۹۵ ج ۱)

بحث ونظر

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ سند میں عبداللہ سے مراد حضرت عبداللہ بن مبارک ہیں اور مقاتل کے بعد سب جگہ وہی مراد ہوتے ہیں۔

نصاب شہادت رضاعت میں اختلاف

ہمارے یہاں قاضی خان سے دو متعارض اقوال حاصل ہوتے ہیں باب المحر مات میں تو یہ ہے کہ اگر قبل نکاح شہادت دے تو ایک عورت کی شہادت بھی معتبر ہے۔ بعد نکاح نہیں، اور باب الرضاع میں اس کے برعکس ہے۔ فرمایا قاضی خان کا مرتبہ صاحب ہدایہ سے بلند ہے علامہ قاسم بن قطلو بغا نے کتاب الترجیح و التصحیح میں لکھا ہے قاضی خان صاحب ہدایہ کے شیوخ میں ہیں۔ اور جلیل القدر علماء ترجیح میں سے ہیں۔

حدیث الباب دیانت پر محمول ہے

پھر فرمایا میرے نزدیک حدیث الباب دیانت پر محمول ہے۔ قضا پر نہیں اور صرف مرضعہ کی شہادت ہمارے یہاں بھی دیانتاً معتبر ہے

جیسا کہ حاشیہ بحرالرائق للرملی میں ہے انہوں نے لکھا ہے کہ اس کی شہادت دیانتاً قبول ہوگی حکماً نہیں۔ اور یہی مراد شیخ ابن ہمام کی بھی ہے۔ انہوں نے فتح القدیر میں لکھا کہ یہ شہادت تنزہاً قبول ہوگی۔

حدیث میں دیانت کے مسائل بکثرت ہیں

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا اس میں کوئی عجیب بات نہیں ہے کیونکہ حدیث میں جہاں قضاء کے مسائل بیان ہوئے ہیں وہاں دیانت کے مسائل بھی بکثرت بیان ہوئے لیکن لوگ اس سے غافل ہیں۔

تذکرہ محدث خیرالدین رملی

حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ خیرالدین رملی حنفی ہیں اور ایک دوسری خیر رملی شافعی بھی ہوئے ہیں۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ محدث رملی حنفی کا تذکرہ مقدمہ انوارالباری جلد دوم میں سہواً رہ گیا ہے۔ ترتیب ووفات کے لحاظ سے ان کی جگہ صفحہ ۱۸۶ جلد دوم میں ۳۴۵ حضرت خواجہ معصومؒ کے بعد ہونی چاہئے تھی۔ اس لئے ان کو ج ۲ ص ۳۴۵ سمجھنا چاہئے۔ ان کی وفات ۱۰۸۱ھ کی ہے۔ بڑے محدث مفسر وفقیہ کثیر العمر اپنے وقت کے شیخ حنفیہ تھے ولادت ۹۹۳ھ اپنے شہر اور مصر میں درس حدیث وفقہ دیا۔ اہم تصانیف یہ ہیں۔ فتاویٰ سائرہ، منح الغفار، حواشی عینی شرح کنز، حواشی الاشباہ والنظائر، حواشی بحرالرائق، حواشی زیلعی، حواشی جامع الفصولین وغیر بڑے لغوی نحوی وعروضی بھی تھے۔ بہت سے رسائل اور ایک دیوان بترتیب حروف معجم جمع کیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

دیانت وقضا کا فرق

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ بہت سے لوگ دیانت وقضا کا فرق نہیں سمجھے انہوں نے دیانت میں ان معاملات کو سمجھا جو حق تعالیٰ اور بندے کے درمیان ہوتے ہیں اور قضا میں ان کو جو ایک بندے کو دوسرے لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں پھر اس سے یہ سمجھا کہ دیانت کا تعلق ایک شخص کی ذات تک محدود رہنے والے معاملات سے ہے۔ اور جب وہ دوسروں کو پہنچ جائیں تو احاطہ دیانت سے نکل کر احاطہ قضا میں داخل ہو گئے۔ حالانکہ یہ بڑی کھلی ہوئی غلطی ہے۔ کیونکہ دیانت وقضا کا مدار شہرت وعدم شہرت پر نہیں۔ بلکہ جس وقت تک بھی کوئی معاملہ قاضی تک نہ جائے خواہ کتنا ہی شہرت پا جائے وہ دیانت ہی کے تحت رہے گا۔ اور جس وقت قاضی کی عدالت میں دائر ہو جائے خواہ کوئی بھی اس کو نہ جانے وہ دیانت سے نکل کر قضا میں داخل ہو جائے گا۔ پھر قاضی کا منصب امیر وحاکم وقت کی طرف سے احکام نافذ کرنے کا ہے۔ اس لئے اس کو واقعات کی پوری تحقیق کر کے فیصلہ دینا ہوتا ہے۔ مفتی کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ صرف کسی سوال کا جواب دینے کا مکلّف ہے۔ خواہ وہ واقعہ ہو یا محض فرضی وتقدیری صورت ہو۔

لہٰذا دیانات کے تمام مسائل مفتی بتلائے گا۔ قاضی ان کا حکم نہیں کرے گا۔ اس طرح قضا کے مسائل کا فیصلہ قاضی کرے گا۔ ان کا مفتی سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ بعض اوقات دیانت وقضا کے احکام باہم متناقض بھی ہوتے ہیں۔ اسی لئے علماء نے ہدایت کی ہے کہ ایک کو دوسرے کا منصب نہیں اختیار کرنا چاہئے۔ لیکن آجکل کے مفتی اس سے غافل ہیں۔ وہ اکثر احکام قضا پر بھی فتویٰ دے دیتے ہیں اور وہ بھی اس لئے غلطی کرتے ہیں کہ کتب فقہ میں عام طور سے مسائل قضا ہی مذکور ہیں۔ مسائل دیانت کا ذکر ان میں بہت کم ہے۔ البتہ مبسوطات میں ان کا ذکر کیا گیا ہے جس کو کثیر مطالعہ وتفتیش کے بعد ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شاید اسی صورتحال کی وجہ سے قاضی تو سلطنت عثمانیہ میں صرف حنفی المسلک مقرر ہوتے تھے۔ اور مفتی چاروں مذاہب کے ہوتے

تھے۔حنفی قاضی ان سب کے فتوؤں کے موافق احکام نافذ کر دیتے تھے۔اس لئے مفتیوں نے بھی احکام قضا لکھنے شروع کر دیئے پس کتابوں میں صرف مسائل قضا درج ہونے لگے اور مسائل دیانت کی طرف سے توجہ ہٹ گئی حالانکہ دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کرنا تھا۔ کتنے ہی مسائل میں دونوں کے حکم الگ الگ ہوتے ہیں مثلاً کنز میں ایک شخص نے بیوی کو کہا کہ اگر تیرے لڑکا پیدا ہو تو تجھے ایک طلاق لڑکی ہو تو دو طلاق۔ پھر اتفاق سے لڑکا اور لڑکی دونوں تولد ہوئے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ پہلے کون پیدا ہوا۔تو قضا کا فیصلہ ایک طلاق کا ہوگا۔اور تنزھاً یعنی دیانت کا فیصلہ دو کا ہوگا۔ قاضی نے تو یقینی جانب کو لے لیا اور مفتی نے احتیاط والی صورت کو ترجیح دی۔ پس یہاں دونوں حکموں میں حلت و حرمت کا فرق عظیم ہو گیا اور احوط کو اختیار کرنا واجب ہوگا جیسا کہ فقہانے اس کی تصریح بھی کی ہے۔صرف مستحب نہ ہوگا اور اسی طرح غرر فعلی کی صورت میں اقالہ بھی ہمارے مذہب میں دیانۃً واجب ہی ہوگا۔ مستحب نہ ہوگا۔لہٰذا یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ عمل بحکم دیانت کو مستحب سمجھنا صحیح نہیں ہے اس لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

دیانت و قضا کے احکام متناقض ہوں تو کیا کیا جائے؟

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں اس بارے میں ابھی تک متردد ہوں اور اس سلسلے میں صرف ایک جزئیہ صاحبین سے ملا ہے وہ یہ کہ شوہر اگر شافعی مذہب کا ہو اور وہ اپنی حنفی المسلک بیوی کو کنائی طلاق دے پھر رجوع کا ارادہ کرے کہ ان کے یہاں کنایات میں بھی رجعت کا حق ہے۔لیکن بیوی رجوع سے انکار کر دے اور معاملہ قاضی شافعی کے یہاں دائر ہو کر رجعت کا حکم مل جائے تو اس کا فیصلہ ظاہراً اور باطناً نافذ ہو جائے گا اور رجوع صحیح ہوگا۔لیکن ابھی تک کوئی ایسا کلی ضابطہ نہیں ملا۔ کہ کس وقت قضا کی وجہ سے دیانت کا حکم اٹھ جائے گا اور کس وقت نہیں اٹھے گا اس لئے مجھے تردد ہے کہ اگر موانع سبعہ نہ ہونے کی حالت میں قاضی رجوع فی الہبہ کا حکم کر دے تو دیانۃً کراہت رجوع کا حکم اٹھ جائے گا یا نہیں۔ بظاہر یہی صورت ہے کہ کبھی وہ اٹھ جائے گا اور کبھی نہیں اٹھے گا۔

دیانت وقضا کا فرق

حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ سب سے پہلے مجھے قضا و دیانت کا فرق تفتازانی کے کلام سے معلوم ہوا۔صاحب توضیح نے ''باب الحقیقۃ والمجاز'' میں سبب وحکم میں استعارہ کا مسئلہ ذکر کر کے لکھا کہ اگر شراء (خریدنے) سے نیت ملک کی کی یا برعکس تو اپنے نقصان کی صورت میں اس کو سچا مانیں گے نفع کی شکل میں نہیں۔اس پر تفتازانی نے تلویح میں لکھا کہ نفع والی شکل میں بھی دیانۃً اس کا قول معتبر ہوگا کہ مفتی اس کے لئے فتویٰ دے سکتا ہے قاضی حکم نہیں کر سکتا۔اس سے میں سمجھا کہ قضا اور فتوی میں فرق کرتے ہیں پھر اس فرق کو عبارت فقہاء میں بھی برابر تلاش کرتا رہا حتی کہ صاحب ہدایہ کے پوتے ابوالفتح عبدالرحیم بن عمادالدین بن علی (صاحب ہدایہ) کی فصول[1] عمادیہ میں اسی بارے میں ایک مقدمہ ممہدہ پڑھا اور دیکھا کہ امام طحاوی نے بھی مشکل الآثار میں اس موضوع پر بسط سے لکھا ہے۔

دیانت وقضاء کا فرق سب مذاہب میں ہے

فرمایا کہ ان دونوں کا فرق چاروں مذاہب میں موجود ہے قصہ امراۃ ابی سفیان میں ''خذی ما یکفیک وولدک'' آیا ہے جس پر

---

[1] اس کتاب کا ذکر تذکروں میں فصول عمادیہ ہی کے نام سے ہے' جو طباعت کی غلطی سے فیض الباری ص ۱۸۸ ج ا میں اصول العمادی ہو گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ فصول عمادیہ فقہ و اصول کی نہایت بلند پایہ نفیس و معتمد کتاب ہے۔ (مؤلف)

امام نووی نے بحث کی کہ یہ قضاء ہے یا فتوی؟ اگر فتوی ہے تو اس کا حکم ہر عالم و مفتی کرسکتا ہے اگر قضاء ہے تو بجز قاضی کے اس کا حکم کوئی نہیں کرسکتا۔

نیز طحاوی ج ۲ ص ۲۵۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرق سلف میں بھی تھا، سائب سے مروی ہے کہ میں نے قاضی شریح سے ایک مسئلہ پوچھا تو کہا میں تو قاضی ہوں مفتی نہیں ہوں اس سے صراحۃً یہ بات نکل آئی کہ قضاء وافتاء الگ الگ ہیں اور یہ بھی کہ قاضی کو جب تک وہ قاضی ہے اور مجلس قضاء میں بیٹھا ہے دیانات کے مسائل نہیں بتلانے چاہئیں جب وہاں سے اٹھ جائے اور عام لوگوں میں آئے تو اور علماء و مفتیان کی طرح مسائل و دیانات بتلا سکتا ہے۔

حاصل مسئلہ: آخر میں حضرت شاہ صاحب نے زیر بحث صورت مسئلہ میں فرمایا کہ اگر زوج کو مرضعہ کی خبر پر یقین ہو جائے تو وہ اس کی شہادت قبول کرسکتا ہے اور اس پر دیانۃً عمل بھی کرسکتا ہے کہ اس سے مفارقت اختیار کرلے، لیکن اگر معاملہ قاضی کی عدالت میں چلا جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اس شہادت پر فیصلہ کردے۔

اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ شیخ ابن ہمامؒ کی مراد تنزہ وتورع سے کراہت تنزیہی ہے صرف احتیاط نہیں ہے۔

فارقہا کا مطلب: فرمایا ممکن ہے طلاق دے کر مفارقت اختیار کی ہو۔ کیونکہ اس عورت کا مرضعہ ہونا تو ثابت ہو نہیں ہوسکا تھا اور فسخ نکاح کی صورت مرضعہ ہونے کے ثبوت پر ہی موقوف ہے اور اگر یہ مراد ہو کہ حضور اکرم ﷺ کے حکم کے سبب مفارقت اختیار کی تو مجتہد اس کا فیصلہ کرے گا آپ کا حکم قضاء تھا یا دیانۃً؟ باقی ظاہر ہے ہمارے مسائل کا اقتضاء یہی ہے کہ آپ کے فیصلہ کو دیانت پر محمول کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

مقصد امام بخاری: پہلے امام بخاری نے صرف طلب علم کے لیے سفر کی ضرورت وفضیلت ثابت کی تھی اس باب میں یہ بتلایا کہ کسی خاص مسئلہ میں اگر مقامی طور سے تشفی نہ ہوسکے تو صرف اپنے علم وفہم پر قناعت کر کے نہ بیٹھ جائے بلکہ صرف ایک مسئلہ شرعی کی تحقیق کے لیے بھی سفر کرنا چاہیئے، جیسے حضرت عقبہ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف ایک مسئلہ کی تحقیق کے لیے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک کا سفر فرمایا۔

بَابُ التَّنَاوُبِ فِی الْعِلْمِ

(علم حاصل کرنے میں باری مقرر کرنا)

(۸۹) حَدَّثَنَا اَبُو الْیَمَانِ قَالَ اَنَا شُعَیْبٌ عَنِ الزُّھْرِیِّ ح قَالَ وَقَالَ ابْنُ وَھْبٍ اَنَا یُوْنُسُ عَنِ ابْنِ شِھَابٍ عَنْ عُبَیْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اَبِیْ ثَوْرٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍؓ عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ کُنْتُ اَنَا وَ جَارٌ لِّیْ مِنَ الْاَنْصَارِ فِیْ بَنِیْ اُمَیَّۃَ بْنِ زَیْدٍ وَّ ھِیَ مِنْ عَوَالِی الْمَدِیْنَۃِ وَکُنَّا نَتَنَاوَبُ النُّزُوْلَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَنْزِلُ یَوْمًا وَّ اَنْزِلُ یَوْمًا فَاِذَا اَنْزَلْتُ جِئْتُہٗ بِخَبَرِ ذٰلِکَ الْیَوْمِ مِنَ الْوَحْیِ وَ غَیْرِہٖ وَاِذَا نَزَلَ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِکَ فَنَزَلَ صَاحِبِی الْاَنْصَارِیُّ یَوْمَ نَوْبَتِہٖ فَضَرَبَ بَابِیْ ضَرْبًا شَدِیْدًا فَقَالَ اَثَمَّ ھُوَ فَفَزِعْتُ اِلَیْہِ فَقَالَ حَدَثَ اَمْرٌ عَظِیْمٌ فَدَخَلْتُ عَلٰی حَفْصَۃَ فَاِذَا ھِیَ تَبْکِیْ فَقُلْتُ اَطَلَّقَکُنَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَتْ لَا اَدْرِیْ ثُمَّ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ وَاَنَا قَائِمٌ اَطَلَّقْتَ نِسَآءَکَ قَالَ لَا فَقُلْتُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔

ترجمہ ۸۹: حضرت عبداللہ بن عباس ؓ حضرت عمر ؓ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی دونوں عوالی

مدینہ کے ایک محلّہ بنی امیہ بن یزید میں رہتے تھے اور ہم دونوں باری باری رسول اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ایک دن وہ آتا، ایک دن میں آتا جس دن میں آتا تو اس دن کی وحی کی اور رسول اللہ علیہ کی مجلس کی دیگر باتوں کی اس کو اطلاع دیتا تھا اور جب وہ آتا تو وہ بھی اسی طرح کرتا تو ایک دن وہ میرا انصاری رفیق اپنی باری کے روز حاضر خدمت ہوا جب واپس آیا تو میرا دروازہ بہت زور سے کھٹکھٹایا اور میرے بارے میں پوچھا کہ کیا وہ یہاں ہے؟ میں گھبرا کر اس کے پاس آیا، وہ کہنے لگا کہ ایک بڑا معاملہ پیش آ گیا (یعنی رسول اللہ علیہ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی پھر میں حفصہ کے پاس گیا، وہ رو رہی تھی میں نے پوچھا کہ کیا تمہیں رسول اللہ علیہ نے طلاق دے دی ہے؟ کہنے لگیں میں نہیں جانتی، پھر میں نبی اکرم علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے کھڑے کھڑے آپ علیہ سے دریافت کیا کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ آپ علیہ نے فرمایا نہیں تب میں نے کہا اللہ اکبر!

تشریح: حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ بنی امیہ مدینہ طیبہ سے ملحق ایک بستی یا محلّہ تھا جو شہر کے نکال پر تھا اسی لیے اس کو مدینہ سے خارج بھی کیا گیا ہے۔ وہاں حضرت عمر نے نکاح کیا تھا اور وہیں رہنے لگے تھے مدینہ طیبہ میں حضرت محمد علیہ کی خدمت میں نوبت وباری سے آیا کرتے تھے اسی زمانے کا واقعہ یہاں بیان فرمایا ہے۔

مناسبت ابواب: علامہ عینی نے لکھا ہے کہ جس طرح طلب علم کے لیے سفر سے علم کی غیر معمولی حرص معلوم ہوتی ہے اسی طرح تناوب سے بھی معلوم ہوتی ہے لہٰذا دونوں بابوں کی باہم مناسبت ظاہر ہے

عوالی مدینہ: عوالی مدینہ سے مراد حافظ عینی نے مدینہ طیبہ کی جانب شرق کے قریبی دیہات بتلائے ہیں اور لکھا ہے کہ مدینہ طیبہ کے سب سے قریب والے عوالی کا فاصلہ ۲، ۳ میل سے ۴ میل تک کا ہے اور سب سے بعید کا فاصلہ آٹھ میل ہے۔

حادثہ عظیمہ: ''حدث امر عظیم'' (بڑا بھاری حادثہ ہو گیا) اس سے مراد حضور علیہ کا ازواج مطہرات سے علیحدگی اختیار کرنا تھا بلکہ ان انصار نے گمان یہی کیا تھا کہ حضور علیہ نے طلاق دے دی ہے اور بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت عمر کو طلاق کی خبر دی تھی۔

حادثہ اس لئے بہت بڑا تھا کہ علیحدگی یا طلاق کی صورت سے سب مسلمانوں کو رنج ہوتا، خصوصاً حضرت عمر کو کیونکہ آپ کی صاحبزادی حضرت حفصہ بھی ازوج مطہرات میں سے تھیں۔

اللہ اکبر کہنے کی وجہ

حضرت عمر نے یہ جملہ بطور تعجب کہا کیونکہ پہلے اپنے ساتھی سے طلاق کی خبر سن چکے تھے اب یکدم تعجب اور حیرت میں پڑ گئے کہ ساتھی نے ایسا بڑا مغالطہ کیسے کھایا، یا ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم علیہ کے خلاف توقع جواب سن کر فرط مسرت وخوشی میں اللہ اکبر کہا ہو۔

حدیث الباب کے احکام ثمانیہ

حافظ عینی نے حدیث الباب سے مندرجہ ذیل احکام کا استنباط فرمایا

(۱) حرص طلب (۲) طالب علم کو چاہیے کہ وہ اپنی معیشت ومعاش کی بھی فکر رکھے، جیسے حضرت عمر اور ان کے ساتھی ایک دن تجارت وغیرہ کرتے اور دوسرے دن حضور علیہ کی خدمت میں گزارتے (۳) ثبوت قبول خبر واحد وعمل بمراسیل صحابہ (۴) آنحضرت علیہ سے سنی ہوئی

باتیں ایک دوسرے کو پہنچاتے تھے اور اس بارے میں ایک دوسرے پر پورا بھروسہ واعتماد کرتا تھا کیونکہ ان میں سے نہ کوئی جھوٹ بولتا تھا اور نہ غیر ثقہ تھا (۵) کسی ضرورت سے دوسرے مسلمان بھائی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا درست ہے ((۶) باپ کو جائز ہے کہ بیٹی کے پاس بغیر اس کی شوہر کی اجازت کے چلا جائے اور اس کے احوال کی تحقیق وتفتیش بھی کرسکتا ہے خصوصاً ان حالات کی جو تعلقات زوجین کی اچھائی اور برائی سے متعلق ہیں (۷) کھڑے کھڑے بھی بڑے آدمی سے کوئی بات پوچھی جاسکتی ہے (۸) علمی اشتغال وتحصیل علم کے لیے باری ونوبت مقرر کرنا درست ہے۔ (عمدۃ ج ۱ ص ۴۹۸)

حافظ ابن حجر نے لکھا کہ حضرت عمر کے وہ ساتھی حسب تصریح ابن القسطلانی ''عتبان بن مالک ہیں لیکن اس کی کوئی دلیل انہوں نے ذکر نہیں کی۔ (فتح الباری ص ۱۳۴ ج ۱)

بَابُ الغَضَبِ فِی الْمَوْعِظَةِ وَالتَّعْلِیْمِ اِذَا رَاٰی مَا یَکْرَہُ

(شرعاً ناپسندیدہ امر دیکھ کر اظہار غضب کرنا)

(۹۰) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ کَثِیْرٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ سُفْیَانُ عَنْ اَبِیْ خَالِدٍ عَنْ قَیْسِ بْنِ اَبِیْ حَازِمٍ عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا اَکَادُ اُدْرِکُ الصَّلٰوۃَ مِمَّا یُطَوِّلُ بِنَا فُلَانٌ فَمَا رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ مَوْعِظَۃٍ اَشَدَّ غَضَبًا مِّنْ یَّوْمَئِذٍ فَقَالَ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّکُمْ مُنَفِّرُوْنَ فَمَنْ صَلّٰی بِالنَّاسِ فَلْیُخَفِّفْ فَاِنَّ فِیْھِمُ الْمَرِیْضَ وَالضَّعِیْفَ وَذَا الْحَاجَۃِ.

ترجمہ: حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں شخص لمبی نماز پڑھاتا ہے اس لیے میں جماعت کی نماز میں شریک نہیں ہوسکتا (ابومسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس دن سے زیادہ میں نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوران نصیحت میں غضب ناک نہیں دیکھا آپ نے فرمایا اے لوگو! تم ایسی شدت اختیار کر کے لوگوں کو دین سے نفرت دلاتے ہو (سن لو) جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو مختصر پڑھائے، کیونکہ ان میں بیمار کمزور اور ضرورت مند سب ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جو سفیان محمد بن کثیر کے بعد روایات میں آتے ہیں وہ سفیان ثوری ہوتے ہیں سفیان بن عیینہ نہیں ہوتے۔

دوسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ وعتاب اس لیے تھا کہ اس امام نے فطرت سلیمہ کے خلاف عمل کیا یعنی بروئے عقل بھی مناسب نہ تھا کہ ایسے مقتدیوں کو طویل نماز پڑھائی جائے جو دن کو محنت ومشقت کا کام کر کے تھک جاتے تھے۔

امام بخاریؒ نے بتلایا کہ ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باوجود خلق عظیم وشفقت عامہ کے ایسے مواقع پر غضب فرماتے تھے کہ ہتک حرمات خداوندی ہورہی ہو یا کوئی شخص کھلی ہوئی کم عقلی وحماقت کی حرکت کرے۔''

ابن بطال نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غضب اس لیے تھا کہ مقتدیوں میں بیمار، ضرورت مند وغیرہ سب ہی ہوتے ہیں ان کی رعایت چاہیے یہ مقصد نہیں کہ نماز میں طویل قراءۃ حرام ہے کیونکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی سورتیں (سورہ یوسف) وغیرہ پڑھنا ثابت ہے مگر آپ کے پیچھے بڑے بڑے صحابہ ہوتے تھے اور وہ لوگ جن کی بڑی خواہش طلب علم ہوتی تھی اور آپ کے پیچھے طویل نماز بھی ان پر گراں نہ ہوتی تھی۔

(۹۱) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ عَامِرِ نِ الْعَقَدِيُّ قَالَ ثنا سُلَيْمَانُ ابْنُ بِلَالِ نِ الْمَدِيْنِيُّ عَنْ رَّبِيْعَةَ بْنِ اَبِيْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ يَّزِيْدَ مَوْلَى الْمُنْبَثِ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ نِ الْجُهَنِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلَهُ رَجُلٌ عَنِ اللُّقْطَةِ فَقَالَ اعْرِفْ وِكَآءَ هَا اَوْ قَالَ وِعَآءَ هَا وِ عِفَاصَهَا ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً ثُمَّ اسْتَمْتِعْ بِهَا فَاِنْ جَآءَ رَبُّهَا فَاَدِّهَآ اِلَيْهِ قَالَ فَضَآلَّةُ الْاِبِلِ فَغَضِبَ حَتّٰى احْمَرَّتْ وَجنتاه اَوْ قَالَ احْمَرَّ وَجْهُهٗ فَقَالَ مَالَكَ وَلَهَا مَعَهَا سِقَآؤُهَا وَحِذَاءُ هَا تَرِدُالْمَآءَ وَ تَرْعَى الشَّجَرَ فَذَرْهَا حَتّٰى يَلْقَاهَا رَبُّهَا قَالَ فَضَآلَّةُ الْغَنَمِ قَالَ لَكَ اَوْ لِاَخِيْكَ اَوْ لِلذِّئْبِ.

ترجمہ۹۱: زید بن خالدالجہنی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے لقطہ کے بارے میں دریافت کیا آپ نے فرمایا اس کی بندش پہچان لے۔ یا فرمایا کہ اس کا برتن اور تھیلی پہچان لے پھر ایک سال تک اس کی شناخت کا اعلان کراؤ پھر اس کا مالک نہ ملے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ پھر اگر اس کا مالک آ جائے تو اسے سونپ دے اس نے پوچھا کہ اچھا گم شدہ اونٹ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ کو غصہ آ گیا کہ رخسار مبارک سرخ ہو گئے یا راوی نے یہ کہا کہ آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا (یہ سنکر آپ نے فرمایا تجھے اونٹ سے کیا واسطہ؟ اس کے ساتھ اس کی مشک ہے اور اس کے پاؤں کے سم ہیں وہ خود پانی پر پہنچے گا اور درخت سے کھائے گا لہٰذا اسے چھوڑ دے یہاں تک کہ اس کا مالک مل جائے اس نے کہا کہ اچھا گم شدہ بکری کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ تیری ہے یا تیرے بھائی کی ورنہ بھیڑیے کی غذا ہے

تشریح: لقطہ اسم مفعول ہے جیسے لقمہ، اکلہ ضحکہ وغیرہ بمعنی اٹھائی ہوئی چیز پھر ہر پائی ہوئی چیز کو بھی کہتے ہیں جس کا مالک موجود نہ ہو۔ اسی سے کوئی جانور آوارہ پھرتا ہوا ملے تو وہ بھی لقطہ کہلائے گا۔

پہلے سائل نے لقطہ کا حکم پوچھا تو آپ نے فرما دیا کہ کوئی تھیلی برتن وغیرہ ملے تو اس کی ہیئت کذائی کو اپنے ذہن میں رکھو۔ پھر اس پائی ہوئی چیز کے متعلق لوگوں کو بتلاتے رہو اور علامات پوچھ کر اصل مالک کا پتہ لگاؤ۔ مل جائے تو اس کو دے دو۔ کوئی چیز اگر نہایت بیش قیمت نہیں ہے تو اس کے لئے ایک سال تک لوگوں سے کہتے سنتے رہنا کافی ہے۔ پھر بھی کوئی مالک نہ آئے تو اس کو کارآمد بناؤ، خود ضرورت مند مسکین ہے تو وہ بھی استعمال کر سکتا ہے لیکن اس کے بعد بھی اگر مالک آ جائے تو وہی چیز اگر باقی ہے، ورنہ اس کا بدل دینا ہوگا۔ بات عام لقطہ کی تھی جس پر کسی سائل نے دوسرا ایک بے محل سوال کر دیا کہ اگر اونٹ چلتا پھرتا کہیں ملے تو کیا وہ بھی لقطہ ہے؟ حضور ﷺ کو اس بے محل بات پر غصہ آ گیا کہ اونٹ جیسی چیز کو جو عرب میں عام طور سے آزاد پھرا کرتے تھے لقطہ بنا دیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں اونٹ کی فکر کیوں ہو گئی اس کے ساتھ تو قدرت نے سب ضرورت کا سامان دے دیا ہے، پانی کی مشک اس کے ساتھ ہے کہ پانی خود پی لے گا اور اپنی مشک میں بھی بھر لے گا۔ چنانچہ کئی کئی روز تک وہ اسی سے کام چلا لیتا ہے۔ درختوں سے پتے توڑ کر دینے کی بھی ضرورت نہیں وہ خود اونچے اونچے درختوں کے پھل پتے کھا کر پیٹ بھر لے گا۔ کوئی ایسا چھوٹا موٹا جانور بھی وہ نہیں ہے کہ عام درندے بھیڑیے وغیرہ اس پر حملہ کر سکے۔ غرض وہ تو صحراو بیابانوں کا جہاز ہے۔ جس میں ضرورت کی سب چیزیں مہیا ہیں۔ اور عام خطرات سے بھی محفوظ ہے۔ اس لئے لوگ اس کو آزاد چھوڑ دیا کرتے تھے۔ بخلاف بھیڑ بکری وغیرہ کے ان کو نہ اس طرح آزاد چھوڑا جاتا ہے نہ وہ خود اپنے کھانے پینے کی اونٹ کی طرح کفالت کر سکتی ہیں۔ وہ ضرور لقطہ ہیں کہ اگر تم یا تمہارا کوئی بھائی (اصل مالک وغیرہ) اس کو اپنی حفاظت میں نہ لیگا تو وہ بھوک پیاس سے مر جائیں گے۔ یا بھیڑیے وغیرہ کی خوراک بنیں گے۔

سوال نصف علم ہے

معلوم ہوا کہ سوال کے لئے بھی اچھی عقل وسمجھ چاہئے کہ کم سے کم آدھا جواب تو خود اپنی عقل وفہم یا ابتدائی معلومات کے ذریعہ سمجھ چکا ہو۔اس کے بعد امید ہے کہ مکمل جواب کو کما حقہ سمجھ سکے گا ورنہ یونہی بے سوچ سمجھے الٹے سیدھے سوال کرنا اپنے کو بھی پریشان کرنا ہے اور جواب دینے والے کے دل ودماغ کو اذیت پہنچانی ہے۔

حضور علیہ السلام کا تعلیمی عتاب:

یہاں حضور علیہ السلام کا غصہ ایسے ہی سوال وسائل کے لئے تھا اور یہی تعلیم دینی تھی کہ سوال کرنے والے کو پہلے غور وفکر کرکے خود بھی اپنے سوال کو حدود ووسعتوں پر نظر رکھنی چاہئے تاکہ مجیب کا وقت ضائع کئے بغیر اس کے قیمتی افادات سے بہرہ مند ہوسکے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم

حضرت شاہ صاحب کا ارشاد

آپ نے فرمایا نبی کریم علیہ السلام نے بے محل سوال پر غصہ فرمایا دوسرے وہ اس دور کی بات ہے کہ دیانت وامانت کا عام دور دورہ تھا۔ اونٹ جیسی چیز کی چوری یا بھگا لے جانے کا بھی خطرہ نہ تھا، مگر اب زمانہ دوسرا ہے وہ دیانت وامانت باقی نہیں رہی اور بڑی سے بڑی چیز کی چوریاں ڈکیتیاں عام ہوتی جارہی ہیں اس لئے اس زمانہ میں اونٹ اور اس جیسے دوسرے جانوروں کو بھی لقطہ قرار دیا جائے گا اس لئے اگر کسی کو ایسا جانور بھی آوارہ پھرتا ہوا مل جائے تو اس کو پکڑ کر حفاظت کرنی چاہئے تاکہ غلط ہاتھوں میں نہ پڑے اور اصل مالک کو پہنچ سکے۔

بحث ونظر

''تعریف'' کی مدت میں متعدد اقوال ہیں، جامع صغیر میں ایک سال لکھا ہے اور مبسوط میں اٹھانے والے کی رائے پر ہے۔ جتنے عرصہ تک اس چیز کی حیثیت کے لحاظ سے وہ ضروری یا مناسب سمجھے اعلان کرتا رہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک بھی یہی بہتر ہے اور تحدید نہ ہونی چاہئے۔ اسی طرح اگر لقطہ دس درہم سے کم قیمت کا ہو تو اس میں بھی ان دونوں کتابوں کے اقوال مختلف ہیں اور حدیث میں لازمی حکم نہیں ہے بلکہ احتیاطی ہے۔ پھر اٹھانے والا اگر غنی ہے تو تعریف کے بعد وہ خود بھی اس لقطہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ میں حنفیہ وشوافع کا مشہور اختلاف ہے اور حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کی نہایت عمدہ تحقیق فرمائی ہے جو کسی آئندہ موقع سے یا کتاب اللقطہ میں ذکر ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(۹۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ اُسَامَةَ عَنْ بُرَيْدٍ عَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَشْيَآءَ كَرِهَهَا فَلَمَّا اُكْثِرَ عَلَيْهِ غَضِبَ ثُمَّ قَالَ لِلنَّاسِ سَلُوْنِیْ عَمَّا شِئْتُمْ فَقَالَ رَجُلٌ مَنْ اَبِیْ قَالَ اَبُوْكَ حُذَافَةُ فَقَامَ اٰخَرُ فَقَالَ مَنْ اَبِیْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَبُوْكَ سَالِمٌ مَوْلٰی شَيْبَةَ فَلَمَّا رَاٰی عُمَرُ مَا فِیْ وَجْهِهٖ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا نَتُوْبُ اِلَی اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ.

ترجمہ ۹۲: حضرت ابوموسیٰ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام سے کچھ ایسی باتیں دریافت کی گئیں جو آپ علیہ السلام کو ناگوار ہوئیں اور جب اس قسم کے سوالات کی آپ پر بہت زیادتی کی گئی تو آپ علیہ السلام کو غصہ آ گیا۔ اور پھر آپ علیہ السلام نے لوگوں سے فرمایا اچھا اب مجھ سے جو

چاہو پوچھو تو ایک شخص نے دریافت کیا کہ میرا باپ کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیرا باپ حذافہ ہے، پھر دوسرا آدمی کھڑا ہوا اور اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میرا باپ کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تیرا باپ سالم شیبہ کا آزاد کردہ غلام ہے۔ آخر حضرت عمرؓ نے آپ کے چہرے کا حال دیکھا تو عرض کیا یا رسول اللہ! ہم (ان باتوں کے دریافت کرنے سے جو آپ ﷺ کو ناگوار ہوئیں) اللہ سے توبہ کرتے ہیں۔

تشریح: ایک دفعہ کچھ لوگوں نے حضور ﷺ سے چند ایسے سوالات کئے جن کا تعلق رسالت و نبوت سے نہیں تھا۔ بظاہر یہ حرکت بعض منافقین کی تھی جو بلاوجہ آپ کو پریشان یا لاجواب کرنا چاہتے تھے اس پر آپ ﷺ کو غصہ آ گیا۔ اور آپ نے بہ سبب غصہ ہی کے وحی الٰہی کی روشنی میں فرما دیا کہ اب تم مجھ سے جو چاہو دریافت کرو۔ اس حالت میں بعض مخلصین صحابہ نے بھی سوالات کئے۔ اور ان کے جوابات بھی حضور ﷺ نے دیئے۔ حضرت عمرؓ نے آپ کے غصہ اور جلال کا صحیح احساس و اندازہ کر لیا تو انہوں نے سب کی طرف سے معذرت پیش کی اور کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم سب اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کرتے ہیں۔

ابن حذیفہ کے سوال وجواب وغیرہ کی تفصیل

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا شروع حدیث میں آتا ہے کہ ابن حذیفہ کے بارے میں لوگوں کو شبہات تھے کہ ان کے باپ حذیفہ ہی ہیں یا کوئی اور؟ اس لئے وہ بھی اس موقع پر آگے بڑھے اور پوچھ بیٹھے یا رسول اللہ! میرا باپ کون ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا.......... تمہارا باپ حذافہ ہے۔ وہ خوش ہوئے کہ لوگوں کے شبہات کا ازالہ ہو گیا مگر جب گھر پہنچے تو ان کی والدہ نے بڑی ملامت کی اور کہا تم بڑے نالائق نکلے! ایسی بات پوچھ بیٹھے تمہیں کیا خبر زمانہ جاہلیت میں مجھ سے کیا کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی کیا تم مجھے سب کے سامنے ذلیل و رسوا کرنا چاہتے تھے۔ (یعنی اگر خدانہ کردہ کوئی دوسری ہی بات ہوتی تو حضور ﷺ سے تم سب کی موجودگی میں پوچھ ہی بیٹھے تھے وہ یقیناً صحیح بات فرماتے اور تمہارے بلاوجہ و ضرورت سوال سے کتنی بڑی رسوائی ہوتی؟

اس نہایت سمجھدار اور دیندار عورت کی بات آپ نے سن لی اب صحابی رسول سعادت مند بیٹے کا جواب بھی سن لیجئے برجستہ کہا امی جان خدا ہی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر رسول ﷺ مجھے فرما دیتے کہ تیرا باپ حذافہ نہیں بلکہ دوسرا شخص ہے تو میں ضرور اسی کے ساتھ جا ملتا اور حضور ﷺ کی بات کو صحیح سمجھ کر اور صحیح کر کے ہی دکھا دیتا۔ اللہ اکبر! یہ تھی صحابی عورتوں اور مردوں کی سمجھ اور ایمان و یقین کی پختگی کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا تھا مگر ان کو جو یقین پیغمبر خدا ﷺ کی باتوں پر تھا وہ کسی طرح نہیں ٹل سکتا تھا یہاں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ حضور ﷺ ایسے سخت غضب و غصہ کے وقت اور دلی ناراضگی کے باوجود بھی دوسرے انسانوں کی طرح صبر و ضبط نہ کھو بیٹھتے تھے بلکہ وہ شدت غضب کی کیفیت اس قدر پرسکون و اطمینان تھی کہ بجز حضرت عمرؓ کے دوسرے حاضرین و مخاطبین کو محسوس تک بھی نہ ہو سکی صحیح ہے۔ **ولو کنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا من حولک**

حضرت عمر کے ارشادات کا مطلب

حضرت عمرؓ نے مذکورہ بالا جملے ادا کر کے ظاہر کیا کہ ہم توبہ کرتے ہیں ہمیں ادھر ادھر کے سوالات و جوابات سے کوئی تعلق و واسطہ نہیں، ہم تو صرف علوم نبوت و وحی اور ایمان و اعمال صالح سے اپنی وابستگی رکھنا چاہتے ہیں۔

ایسا واقعہ بھی ضروری تھا

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایسا واقعہ بھی حضور اکرم و صحابہ کی زندگی میں پیش آنا ہی چاہیے تھا جس سے لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ حق

تعالیٰ کو ایسی بھی قدرت ہے کہ جس قسم کی بھی باتیں لوگ پوچھنا چاہیں، ان سب کے جوابات پر وہ اپنے پیغمبر برحق کو مطلع فرما سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

بَابُ مَنْ بَرَکَ رُکْبَتَیْهِ عِنْدَ الْاِمَامِ اَوِ الْمُحَدِّثِ

(امام یا محدث کے سامنے دوزانو بیٹھنا)

(۹۳) حَدَّثَنَا اَبُوْ الْیَمَانِ قَالَ اَنَا شُعَیْبٌ عَنِ الزُّهْرِیِّ قَالَ اَخْبَرَنِیْ اَنَسُ بْنُ مَالِکٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ فَقَامَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ حُذَافَةَ فَقَالَ مَنْ اَبِیْ قَالَ اَبُوْکَ حُذَافَةُ ثُمَّ اَکْثَرَ اَنْ یَّقُوْلَ سَلُوْنِیْ فَبَرَکَ عُمَرُ عَلٰی رُکْبَتَیْهِ فَقَالَ رَضِیْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَبِیًّا ثَلٰثًا فَسَکَتَ۔

ترجمہ ۹۳: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بتلایا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تو عبداللہ بن حذافہ کھڑے ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا حذافہ! پھر آپ نے بار بار فرمایا کہ مجھ سے پوچھو تو حضرت عمر نے دوزانو ہو کر عرض کیا کہ ہم اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہیں (اور یہ جملہ) تین مرتبہ دہرایا یہ بات سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔

تشریح: امام بخاریؒ علم کی ضرورت فضیلت واہمیت بیان کرنے کے بعد اس کو حاصل کرنے کے آداب بتلانا چاہتے ہیں کہ جس سے کوئی علمی بات حاصل کی جائے خواہ وہ امام ہو یا محدث یا استاذ تحصیل علم کے وقت اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھے جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھے اور چونکہ یہ حالت ونشست نہایت تواضع پر دال ہے اسی لیے استاذ محدث کے دل کو متاثر بھی زیادہ کرتی ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غضب وغصہ کو کم کرنے کے لیے اس کو اختیار کیا اور کامیاب ہوئے بعض علماء نے یہ بھی لکھا کہ بروک کا ترجمہ اور عنوان امام بخاری نے اس لیے قائم کیا کہ دوزانو بیٹھنا نماز کی ایک خاص (تشہد والی) حالت ہے جو نہایت تواضع کو ظاہر کرتی ہے ہوسکتا ہے کہ کوئی اس طرح کی نشست کو غیر خدا کے سامنے اختیار کرنے کو ناجائز سمجھے لہٰذا اس کے جواز پر تنبیہ فرمائی اور حضرت عمر کے فعل کو دلیل بنایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے **رضینا باللہ** وغیرہ جملوں پر فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ معالی امور ومحاسن میں یکتا اور نہایت دانشمند تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں براہ راست خطاب کر کے کچھ بھی عرض نہیں کیا۔ آپ کے غضب وغصہ کو سمجھ گئے فوراً عرض کرنے لگے۔ "ہم ایک اللہ کو رب مان چکے، اس کے ہر حکم کے سامنے سر جھکا چکے، ہمیں اس کے احکام کی علتیں اور لمبی چوڑی تحقیقات کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ وحی الٰہی وعلوم نبوت سے ملے گا اس کو سر چڑھائیں گے دل وجان سے اس کی اطاعت کریں گے، اسلام کو پوری طرح اپنا دین بنا چکے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا نبی برحق تسلیم کر چکے۔"

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ "ہم خدا کی کتاب قرآن مجید کو اپنا امام بنا چکے" فرمایا کہ اس آخری جملہ سے میں نے فاتحہ خلف الامام کی نفی بھی سمجھی ہے کیونکہ قرآن مجید کو امام کہا ہے، مقتدی نہیں بتایا، شوافع کے قول پر وہ مقتدی بن جاتا ہے، پھر میں نے قرآن مجید میں بھی تتبع وتلاش کی کہ قرآن مجید کو امام کہا گیا ہے یا نہیں؟ تو سورۂ احقاف میں آیت ہے "**ومن قبله کتاب موسی اماما ورحمة وهذا کتاب مصدق**" دیکھی، (سورۂ ہود میں بھی کتاب موسیٰ کو امام ورحمت فرمایا ہے، پھر **انه الحق من ربک** فرمایا) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب موسیٰ تو امام ورحمت وغیرہ تھی ہی قرآن مجید اس سے بھی کہیں زیادہ ہے یہ دوسرے زائد علوم وافادات

کیساتھ کتاب موسیٰ کی تصدیق وتائید وغیرہ بھی کرتی ہے مگر چونکہ قرآن مجید کا امام ورحمت ہونا افہام ناس کی دسترس سے باہر تھا اس لیے اس کو مبہم ومجمل کر دیا اور کتاب موسی کا امام ورحمت ہونا اس درجہ[1] میں نہ تھا، اس کو کھول کر بتلا دیا۔

پھر فرمایا کہ وھذا کتاب مصدق کی مراد نظیروں کے دیکھنے سے سمجھ میں آسکتی ہے کسی عبارت میں سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آسکتی میں نے رسالہ فاتحہ خلف الامام میں سمجھانے کی کچھ سعی کی مگر حق ادا نہیں ہوسکا۔

علامہ طیبی نے بھی حاشیہ کشاف میں اس پر کچھ لکھا ہے ان کا ذوق لطیف بھی اس کے مذاق سے آشنا ہوا ہے مگر ان کے علاوہ دوسرا کوئی اس سے بہرہ ور نہیں ہوا۔

یہاں حضرت شاہ صاحب نے درس بخاری شریف دیوبند کے زمانے میں کسی مناسبت سے مسئلہ تقدیر پر بھی اہم ارشادات فرمائے تھے، اور حضرت شیخ الہند کے افادات بھی ذکر فرمائے تھے جن کو حضرت محترم مولانا محمد چراغ صاحب دام فیوضہم نے قلم بند کیا تھا ان کو تقدیر کے مسئلہ پر بحث کے وقت ذکر کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ. ومنه التوفيق والهداية

بَابُ مَنْ اَعَادَ الْحَدِيْثَ ثَلٰثًا لِّيُفْهَمَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا وَقَوْلَ الزُّوْرِ فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ بَلَّغْتُ ثَلٰثًا.

(کسی بات کو خوب سمجھانے کے لئے تین بار دہرانا، چنانچہ ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ الا وقول الزور کی بار بار تکرار فرماتے رہے، حضرت ابن عمر نے نقل کیا کہ حضور ﷺ نے تین بار ھل بلغت فرمایا)

(۹۴) حَدَّثَنَا عَبْدَةُ قَالَ ثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ قَالَ ثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ ثُمَامَةُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنُ اَنَسٍ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ كَانَ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلٰثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ وَاِذَا اَتٰى عَلٰى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلٰثًا.

ترجمہ۹۴: حضرت انس نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب کوئی کلمہ ارشاد فرماتے تو اسے تین مرتبہ لوٹاتے حتی کہ خوب سمجھ لیا جاتا، اور جب لوگوں کے پاس آپ تشریف لاتے تو انہیں تین بار سلام کرتے تھے۔

تشریح: مشہور ہے کہ جب کوئی بات کئی بار کانوں میں پڑتی ہے تو وہ دل میں اچھی طرح اتر جاتی ہے اسی لیے حضور ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ کس اہم بات کو سمجھانے اور دل نشین کرانے کے لیے اس کو تین بار ارشاد فرماتے تھے یہی طریقہ امت کے لیے بھی مسنون ہوا عالم مفتی

---

[1] کتاب موسیٰ (توراۃ) کو امام ورحمت فرمایا گیا، حالانکہ وہ وحی غیر متلو تھی اور قرآن مجید متلو اور بعینہ کلام خداوندی ہے، تو اس کو بدرجہ اولی امام ہونا ہی چاہیے، اور افضل عبادت نماز میں جب اس کی قراءت کی جائے تو اس کی امامت کا درجہ اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے اور خشعت الاصوات للرحمان کے تحت اس وقت تمام آوازیں نذر خشوع وخضوع ہو جانی چاہئیں، پھر چونکہ امام ضامن بھی ہے، اس لئے بھی سب کی آوازیں اس کی آواز میں شامل ہو چکیں اور قرآن مجید کا رحمت خاصہ خداوندی ہونا بھی اس کا مقتضی ہے کہ جس وقت وہ سامنے ہو تو ساری توجہ اس طرف مبذول ہو جائے۔

حضرت شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ جب قرآن مجید امام ہے اور امام کو قراءت قرآن مجید کا حق سپرد ہو چکا تو اب خواہ نماز جہری ہو یا سری ان دونوں کے امام کو امام ہی سمجھو، اپنے امام کی پوری طرح متابعت کرو اور امام اعظم (قرآن مجید) کی تلاوت کے وقت کامل استماع وخاموشی اور اس طرف دھیان وتوجہ کرو، اسی سے حق تعالیٰ کی رحمت خاصہ کے مستحق بنو گے یعنی اس رحمت (قرآن مجید) کا حق ادا کرو گے۔ تو رحمت حق بھی تمہارے حق میں ہوگی۔ واللہ علم۔

مدرس بھی کوئی اہم بات دین وعلم کی دوسروں کو بتائے سمجھائے تو اسکو تین بار دہرائے یا عنوان بدل کر سمجھائے تا کہ کم فہم یا غبی اچھی طرح سمجھ لیں اور زود فہم وذہین لوگوں کے دل نشین ہو جائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شاید امام بخاری نے اس باب سے مشہور نحوی خلیل بن احمد کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے جس کو امام بخاری نے اپنے رسالہ ''جزء القراءۃ میں نقل کیا ہے:۔ **یکثر الکلا م لیفھم ولعلل لیحفظ** (ایک بات کو بار بار یا بکثرت اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ خوب سمجھ میں آجائے اور کسی بات کی حلت اس لئے بیان کی جاتی ہے کہ وہ یاد ہو جائے) میں سمجھا کرتا تھا کہ خلیل کے کلام میں بات الٹی ہوگئی ہے، اور اصل یہ تھی کہ ایک بات بکثرت کہنے سے یاد ہو جاتی ہے اور علت بیان کرنے سے سمجھ میں اچھی طرح آجاتی ہے، پس علت کا بیان فہم کے لئے زیادہ نافع ہے اور تکرار کلام حفظ و یاداشت کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

میں نے رسالہ مذکورہ کے بہت سے نسخے دیکھے کہ شاید کتابت وطباعت کی غلطی نکل آئے، مگر سب نسخوں میں یکساں پایا اس لئے بظاہر امام بخاری کا منشا یہ بتلانا ہے کہ تکرار واعادہ کلام سے مقصد حفظ تو ہوتا ہی ہے کبھی افہام بھی مقصود ہوتا ہے اور تعلیل کا مقصد افہام تو ہوتا ہی ہے کبھی حفظ بھی ہوتا ہے۔

تکرار ہل بلغت کا مقصد

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کا تکرار تہویل شان اور مبالغہ کے لئے ہے اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس لئے شاہد بناتے تھے کہ قیامت کے روز رسول کریم علیہ السلام کے ابلاغ احکام شریعت کی گواہی دیں جبکہ بہت سی امتیں اپنے پیغمبروں کے ابلاغ احکام شریعت کا انکار کردیں گے۔

پھر یہ کہ حضور اکرم علیہ السلام اکثر اوقات ''**اللھم ھل بلغت**'' بھی فرمایا کرتے تھے تو اس طرح آپ علیہ السلام حق تعالیٰ کو بھی گواہ بنالیتے تھے کہ اس سے زیادہ پختہ شہادت کیا ہو سکتی ہے؟ اور ایسا کرنا چونکہ ضرورت وحاجت کے تحت ہے اس لئے اس کو بے ادبی یا خلاف شان و عظمت حق جل ذکرہ بھی نہیں کہہ سکتے۔

جس طرح بیت الخلا جانے کے وقت تسمیہ واستعاذہ کو خلاف ادب نہیں کہا جاتا، کیونکہ خبث وخبائث سے امن وحفاظت بغیر برکت اسم مبارک حضرت حق جل شانہ حاصل نہیں ہو سکتی۔

بحث ونظر

تکرار اسلام کی نوعیت

علامہ سندھی نے فرمایا:۔ مراد اسلام استیذ ان ہے، یعنی تینوں سلام طلب اجازت کے ہیں، کیونکہ کسی کے گھر پر جا کر تین بار اسلام و علیکم (ادخل؟) کہہ کر اجازت طلب کر سکتے ہیں، اگر تیسری دفعہ پر بھی اجازت نہ ملے تو لوٹ جانا چاہیے، چوتھی بار سلام استیذ ان کی اجازت نہیں ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فرمایا کہ پہلا سلام مجلس میں پہنچ کر سامنے والوں کو کرتے تھے، دوسرا داہنی جانب کے اہل مجلس کو، تیسرا بائیں جانب والوں کو اس طرح تین سلام ہوتے تھے۔

علامہ عینیؒ نے فرمایا:۔ پہلا سلام استیذ ان کا ہے، دوسرا مجلس یا مکان میں پہنچنے پر اہل مجلس کو یہ سلام تحیہ ہے، تیسرا سلام مجلس سے واپسی

ورخصت پر، جس کوسلام تودیع کہہ سکتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: شاید زیادہ واضح یہ ہے کہ تین بار سلام مجلس کے لوگوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ہوگا، جیسا کہ ہمارے زمانہ میں بھی رواج ہے اوراس طرح اگرچہ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں مگر تین پر اکتفا اس لئے کیا کہ شارع علیہ السلام کے اقوال وافعال منضبط ہوتے ہیں، آپ نے وسط کو اختیار فرمالیا، مگر میں اس توجیہ پر پورا بھروسہ اس لئے نہیں کرسکتا کہ اس کی تائید میں کوئی نقل نہیں ملی، غرض اس توجیہ کا حاصل یہ ہے کہ حضوراکرم علیہ السلام کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کسی بڑی جماعت کے پاس سے گزرتے تو صرف ایک سلام پر اکتفانہ فرماتے تھے بلکہ شروع کے لوگوں پر سلام فرماتے، پھر درمیان میں پہنچ کر سلام فرماتے، پھر آخر میں پہنچ کر سلام فرماتے، حضرت شیخ الہند کی رائے بھی اسی کے قریب ہے۔

تکرار مستحسن ہے یانہیں

حضرتؒ کا قول حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی نقل کیا کہ تکرار کلام کی اچھائی و برائی احوال کے اختلاف کے ساتھ ہوتی ہے، مثلاً وعظ و نصیحت کے اندر تکرار مستحسن ہے، مگر تصنیف میں اچھا نہیں، اسی لئے قرآن مجید چونکہ وعظ وتذکیر کے طرز پر ہے، اس میں بھی تکرار مستحسن ہے۔

آخر میں حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ تودیع کے بارے میں احادیث کا ذخیرہ کنز العمال میں ہے، اس کی مراجعت کی جائے،

''عبدۃ'' حضرتؒ نے فرمایا کہ ایک نسخہ میں اس کی جگہ ''الصمدۃ'' ہے جو کاتب کی غلطی ہے۔

(۹۵) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ ثَنَا اَبُوْ عَوَانَةَ عَنْ اَبِیْ بِشْرٍ عَنْ یُوْسُفَ بْنِ مَاھَکَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ تَخَلَّفَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ سَفَرٍ سَافَرْنَاہُ فَاَدْرَکَنَا وَقَدْ اَرْھَقْنَا الصَّلٰوۃَ صَلٰوۃَ الْعَصْرِ وَنَحْنُ نَتَوَضَّاُ فَجَعَلْنَا نَمْسَحُ عَلٰی اَرْجُلِنَا فَنَادٰی بِاَعْلٰی صَوْتِہٖ وَیْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ مَرَّتَیْنِ اَوْ ثَلٰثًا۔

ترجمہ ۹۵: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک سفر میں رسول اللہ علیہ السلام پیچھے رہ گئے، پھر آپ علیہ السلام ہمارے قریب پہنچے تو عصر کی نماز کا وقت تنگ ہو گیا تھا، ہم وضو کر رہے تھے تو جلدی میں ہم اپنے پیروں پر پانی کا ہاتھ پھیرنے لگے، تو آپ علیہ السلام نے بلند آواز سے فرمایا: آگ کے عذاب سے ان (سوکھی) ایڑیوں کی خرابی ہے۔ یہ دومرتبہ فرمایا، یا تین مرتبہ

تشریح: صحابہ کرامؓ نے عجلت میں اس ڈر سے کہ نماز عصر قضا نہ ہو جائے، پاؤں اچھی طرح نہ دھوئے تھے، ایڑیاں خشک رہ گئیں تھیں، پانی تو کم ہوگا ہی، اس پر جلدی میں اور بھی سب جگہ پانی پہنچانے کا اہتمام نہ کرسکے، اس لئے حضوراکرم علیہ السلام نے تنبیہ فرمائی اور بلند آواز سے فرمایا کہ وضو میں ایسی جلد بازی کہ پورے اعضاء وضو نہ دھل سکیں، یا پانی کی قلت کے سبب اس طرح ناقص وضو کرنا درست نہیں۔

بَابُ تَعلِيمِ الرَّجُلِ اَمَتَهٗ وَ اَهلَهٗ

(مرد کا اپنی باندی اور گھر والوں کو تعلیم دینا)

(۹۶) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ هُوَ ابْنُ سَلَامٍ قَالَ اَنَا الْمُحَارِبِيُّ نَا صَالِحُ بْنُ حَيَّانَ قَالَ قَالَ عَامِرُ الشَّعْبِيُّ حَدَّثَنِيْ اَبُوْ بُرْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثَلٰثَةٌ لَّهُمْ اَجْرَانِ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَ اٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ وَّ الْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ اِذَا اَدّٰى حَقَّ اللهِ وَ حَقَّ مَوَالِيْهِ وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَةٌ يَّطَأُهَا فَاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَادِيْبَهَا وَ عَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ ثُمَّ قَالَ عَامِرٌ اَعْطَيْنَا كَهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ قَدْ كَانَ يُرْكَبُ فِيْمَا دُوْنَهَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ.

ترجمہ۹۶: عامر شعبی ابو بردہ سے وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین شخص ہیں جن کو دو اجر ملیں گے۔ایک شخص اہل کتاب میں سے جو اپنی نبی پر ایمان بھی لایا تھا پھر محمد ﷺ پر بھی ایمان لایا، دوسرے وہ غلام جس نے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقاؤں کا بھی، تیسرے وہ شخص جس کی ایک باندی تھی، جس سے مِلک یمین کی وجہ سے بھی اس کو حق صحبت حاصل تھا، اس کو اچھی تہذیب وتربیت دے کر خوب علم وحکمت سے آراستہ کیا، پھر اس کو آزاد کردیا، اس کے بعد اس سے عقد نکاح کیا تو اس کے لئے بھی دو اجر ہیں۔

عامر شعبی نے (خراسانی سے) کہا ہم نے تمہیں یہ حدیث بغیر کسی محنت ومعاوضہ کے دے دی، کبھی اس سے بھی کم کے لئے مدینہ منورہ کا سفر کرنا پڑتا تھا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث کے تیسرے جملے میں (جو پوری حدیث کے بیان کا سبب ہے) متعدد امور ذکر ہوئے ہیں اور شارحین نے ان میں سے دو کی تعیین میں مختلف رائے لکھی ہیں میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ اعتاق سے پہلے جو امور مذکور ہوئے وہ بطور تمہید وتقدمہ ہیں اور آزاد کرنا،...... مستقل عبادت ہے ایک عمل ہے اور نکاح کرنا دوسرا عمل ہے کہ وہ بھی دوسری مستقل عبادت ہے، لہٰذا دو اجران دو عملوں پر مرتب ہیں۔

بحث ونظر

اشکال وجواب حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ

پھر یہاں ایک بڑا اشکال ہے کہ اہل کتاب سے اگر یہود مراد ہوں تو وہ اس لئے نہیں ہو سکتے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے انکار کی وجہ سے کافر ہوئے اور ان کا پہلا ایمان بھی بیکار رہا۔اب اگر وہ حضور ﷺ پر ایمان بھی لائیں تو ان کا صرف یہ ایک عمل ہوگا اور ایک ہی اجر ملے گا، دو اجر کے مستحق وہ نہیں ہو سکتے۔

اگر کہیں کہ نصاریٰ مراد ہیں جیسا کہ اس کی تائید بخاری کی حدیث ص ۴۹۰ ج ۱۱ حوال حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی ہوتی ہے کہ وہاں بجائے رجل من اهل کتاب کے رجل آمن بعیسیٰ مروی ہے، تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ یہود اس سے خارج ہیں، حالانکہ یہ

حدیث آیت قرآنی اولـئک یؤتون اجرهم مرتین کا بیان وتفصیل ہے، اور وہ آیت باتفاق مفسرین عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھ دوسرے ایمان لانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو یہودی تھے، لہٰذا ان کے لئے بھی دو اجر ہوں گے، پس ان سب کو بھی اہل کتاب کا مصداق ہونا چاہیے۔

اس اشکال کے جواب میں فرمایا: میری رائے ہے کہ حدیث تو یہود ونصاریٰ دونوں ہی کو شامل ہے اور دوسری حدیث بخاری کے لفظ رجل آمن بعیسیٰ کو اکثر روایات کے تابع قرار دے کر اختصار راوی پر محمول کریں گے۔

اس موقع پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں علامہ طیبی کا قول بھی نقل کیا ہے کہ حدیث میں زیادہ عموم بھی مراد ہو سکتا ہے اس طرح کہ خاص نہ ہو، اور دوسرے ادیان والے بھی اس میں داخل ہوں یعنی ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام پر ایمان لانے کی برکت سے دوسرے ادیان والوں کا ایمان بھی قبول ہو جائے اگرچہ وہ ادیان منسوخ ہوں۔

اس کے بعد حافظ نے لکھا کہ اس کی کچھ مؤیدات میں بعد کو ذکر کروں گا، پھر فوائد کے تحت داؤدی اور ان کے متبعین کا قول بھی حافظ نے نقل کیا ہے کہ ہو سکتا ہے، حدیث مذکور تمام امتوں کو شامل ہو، کیونکہ حدیث حکیم بن حزام میں ہے اسلمت علی ما اسلفت من خیر کہ کفار کی پہلی زمانہ کفر کی نیکیاں بھی حضور علیہ السلام پر ایمان لانے کے برکت سے مقبول قرار پائیں، پھر حافظ نے کہا کہ یہ قول درست نہیں کیونکہ حدیث میں اہل کتاب کی قید موجود ہے، دوسروں پر اس کا اطلاق کیسے ہوگا؟ البتہ اگر خیر کو ایمان پر قیاس کریں تو ممکن ہے دوسرے یہ کہ آمن بنبیہ سے بطور نکتہ اجر کی علت کی طرف اشارہ مفہوم ہوتا ہے کہ دو اجر کا سبب دو نبیوں پر ایمان ہے حالانکہ عام کفار ایسے نہیں ہیں (اور نہ ان کا پہلے کسی اور نبی پر ایمان ہی ہے)

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فرق اہل کتاب کا اور عام کفار میں یہ ہے کہ اہل کتاب حضور علیہ السلام کی علامات ونشانیاں کتاب میں پڑھ کر پہچانتے تھے، اور منتظر تھے، لہٰذا ان میں سے جو ایمان لائے گا اور اتباع کرے گا اس کو دوسروں پر فضیلت ہوگی اور ڈبل اجر ہوگا اور جو باوجود اس کے جھٹلائے گا اس پر گناہ بھی ڈبل ہوگا، جس طرح ازواج مطہرات کے بارے میں وارد ہوا، کیونکہ وحی ان کے گھروں میں اترتی تھی۔

اگر کہا جائے کہ اس موقع پر بھی ان کا ذکر ڈبل اجر کے سلسلہ میں ہونا چاہیے تھا، اور پھر ایسے چار طبقے یہاں ذکر ہو جاتے، ان کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

اس کا جواب شیخ الاسلام نے یہ دیا ہے کہ ان کا معاملہ خاص افراد اور خاص زمانے کا ہے اور یہاں ان تین طبقوں کا ذکر ہے جو قیامت تک ہوں گے۔

یہ جواب شیخ الاسلام کے نظریے پر ہی چل سکتا ہے کہ اہل کتاب کے ایمان لانے کا معاملہ وہ قیام قیامت تک مستمر مانتے ہیں، مگر کرمانی نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ حضور علیہ السلام کی ہی زمانہ بعثت کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ بعد بعثت تو سب کے نبی صرف حضور علیہ السلام ہی ہیں کہ آپ علیہ السلام کی بعثت عام ہے۔

علامہ کرمانی کی یہ دلیل اس لئے صحیح نہیں کہ اگر زمانہ بعثت کے ساتھ خاص کریں گے تو یہ بات حضور علیہ السلام کے زمانہ بعثت کے بھی سب لوگوں پر پوری نہ اترے گی یعنی جن کو حضور علیہ السلام کی دعوت نہ پہنچی ہوگی، ...... اور اگر ان لوگوں کو مراد لیں جن کو دعوت نہ پہنچی ہو تو پھر آپ علیہ السلام کے زمانہ بعثت اور بعد زمانہ بعثت کا کیا فرق رہا؟ لہٰذا شیخ الاسلام کی تحقیق زیادہ صاف ہے اور ان لوگوں کے ہمارے پیغمبر علیہ السلام کے سوا

دوسرے پیغمبروں کی طرف منسوب ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اس سے قبل ان کی طرف منسوب تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے عالی ہے کہ حدیث میں عام مراد لینا کسی طرح درست نہیں اسی لئے وہ حافظ کی اس بارے میں کسی قدر نرمی یا تائیدی اشارہ کو بھی پسند نہیں فرماتے جو حافظ کی اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے، پھر فرماتے ہیں کہ خلاصہ حدیث دواجر کا وعدہ دو عمل پر ہے۔ اور کفر صریح کو ہر گز نیکی نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر اجر کا استحقاق مانا جائے، لہٰذا صرف ایک عمل رہا یعنی حضرت اقدس علیہ السلام (فداہ ابی وامی) پر ایمان لانا، اور وہ اگر چہ اجل قربات وافضل اعمال میں سے ہے اور اس کا اجر بھی عظیم ہے، تاہم وہ ایک ہی عمل ہے اور اس پر ایک ہی اجر ملے گا۔

نیز ایک حدیث نسائی ص ۳۰۶ ج ۲ میں ہے کہ **یوتکم کفلین من رحمته** سے مراد دواجر ہیں ایک بوجہ ایمان بعیسیٰ علیہ السلام یا ایمان بہ انجیل وتوراۃ کی وجہ سے، اور دوسرا آنحضرت علیہ السلام پر ایمان لانے کی وجہ سے، اسی سے بصراحت تمام معلوم ہوا کہ دواجر دو عمل کی وجہ سے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ بھی دواجر کے مستحق ہیں، اور وہ اہل کتاب میں سے بھی شمار ہوں گے اور اس کی وجہ سے کوئی اشکال بھی نہیں ہوگا، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت نہ ماننے کی وجہ سے جن لوگوں کے ایمان حبط ہوئے، وہ بنی اسرائیل میں سے وہ لوگ تھے، جن کو آپ علیہ السلام کی شریعت کی طرف دعوت پہنچ گئی تھی پھر بھی وہ منکر ہوئے، لیکن یہود مدینہ کو نہ آپ علیہ السلام کی دعوت پہنچی اور نہ ان کی طرف سے انکار وانحراف کی صورت پیش آئی، لہٰذا وہ دواجر کے مستحق ہو گئے ایک اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی وجہ سے اور دوسرے حضور علیہ السلام پر ایمان لانے کی وجہ سے۔ اور ان ہی میں سے عبداللہ بن سلام وغیرہ تھے۔

تاریخ میں ہے کہ بخت نصر کے زمانہ میں اس کے بے پناہ جور وظلم کی وجہ سے کچھ یہودی شام سے عرب کی طرف بھاگ آئے تھے۔ اور کئی سو سال کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت شام میں ہوئی تو شام کے یہودیوں کو تو توحید وشریعتؑ دونوں کی دعوت پہنچ گئی لیکن یہود مدینہ کو بالکل نہیں پہنچ سکی۔

چنانچہ وفاء الوفاء میں ہے کہ مدینہ منورہ کے باہر ایک چھوٹے ٹیلہ کے قریب ایک پتھر پایا گیا جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی: "یہ رسول خدا عیسیٰ علیہ السلام کے ایک فرستادہ کی قبر ہے جو تبلیغ کے لئے آئے تھے مگر وہ شہر کے لوگوں تک نہ پہنچ سکے۔"

تاریخ طبری میں اس جگہ ایک لفظ رسول سہو کتابت سے رہ گیا۔ جس سے یہ مطلب بن گیا کہ یہ قبر خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ (نعوذ باللہ) ایک زمانے میں اس کو قادیانیوں نے وفات عیسیٰ علیہ السلام کی بہت بڑی دلیل سمجھ کر شور وشغب کیا تھا۔ **ان ھم الا یخرصون**، ظاہر ہے ان اٹکل کے تیروں سے کیا بنتا؟

جدید تحقیقات اہل یورپ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے دو حواری ہندوستان بھی آئے تھے۔ جو مدراس میں مدفون ہیں۔ اسی طرح ایک حواری تبت میں اور دو حواری اٹلی میں مدفون ہیں۔ اور یونان وقسطنطنیہ بھی ان کا جانا ثابت ہوا ہے۔

پھر یہ کہ وہ خود سے نہیں گئے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو بھیجا تھا۔ اس امر سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے نجاشی، مقوقس، اور دومۃ الجندل وغیرہ کو مکاتیب وغیرہ روانہ فرمائے تو نامہ بر صحابہ سے فرمایا کہ میں بھی تم کو اسی طرح بھیج رہا ہوں جس طرح مسیح علیہ السلام نے اپنے حوارین کو بھیجا تھا۔

افادات حافظ ابن حجر

اس جواب کو مختصر طریقہ پر حافظ ابن حجر نے بھی ذکر کیا ہے۔ نیز حافظ نے فوائد کے تحت چند اہم امور ذکر فرمائے جو درج ذیل ہیں۔

(۱) شرح ابن التین وغیرہ میں جو آیت مذکورہ کا مصداق عبداللہ بن سلام کے ساتھ کعب احبار کو بھی لکھا ہے۔ وہ غلط ہے کیونکہ کعب صحابی

نہ تھے، اور نہ وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت سے قبل ایمان لائے تھے۔ البتہ تفسیر طبری میں جو سلمان فارسیؓ کو بھی ساتھ لکھا ہے وہ صحیح ہے کیونکہ عبداللہ یہودی تھے، پھر اسلام لائے اور سلمان نصرانی تھے مسلمان ہوئے، یہ دونوں مشہور صحابی ہیں۔

(۲) قرطبی نے فرمایا کہ جس کتابی کے لئے ڈبل اجر کا وعدہ ہے اس سے مراد وہ ہے جو قول و عمل دونوں کے اعتبار سے اپنے نبی کی صحیح شریعت پر عامل رہا ہو۔ (نہ تحریف شدہ شریعت پر) پھر خاتم الانبیاء علیہ السلام پر ایمان لایا ہو اس کو ڈبل اجر بوجہ اتباع حق اول وثانی ملے گا۔

لیکن اس قول پر اعتراض ہوگا کہ حضور علیہ السلام نے ہرقل کو تحریر فرمایا کہ تم اسلام لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دو اجر عطا کرے گا۔ حالانکہ ہرقل نے بھی نصرانیت کو تحریف کے بعد قبول کیا تھا۔

نیز یہاں حافظ نے اپنے شیخ، شیخ الاسلام کی تحقیق کا حوالہ دیا کہ باوجود اس کے کہ ہرقل بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا اور اس نے نصرانیت بھی تحریف کے بعد ہی قبول کی تھی، پھر بھی حضور اکرم علیہ السلام نے اس کو اور اس کی قوم کو اپنے مکتوب گرامی میں "یا اہل الکتاب" خطاب فرمایا تو اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ جو بھی اہل کتاب کا دین اختیار کرے گا خواہ وہ تحریف کے بعد ہی ہو اس کو اہل کتاب ہی کے حکم میں سمجھا جائیگا۔ دربارۂ مناکحت وذبائح وغیرہ۔

لہٰذا اس کی تخصیص اسرائیلیوں سے کرنا یا ان لوگوں کے ساتھ جو یہودیت و نصرانیت کو قبل تحریف وتبدیل اختیار کر چکے ہوں غلط ہے۔

افادات حافظ عینی

(۱) حافظ عینیؒ نے حافظ ابن حجرؒ کے رد کرمانی پر رد کیا اور فرمایا کہ قولہ آمن بنبیہ حال وقید ہے پس اجرین کی شرط یہ ہوگی کہ اپنے نبی پر ایمان لایا ہو جو ان کی طرف مبعوث ہوا ہو۔ اور پھر حضور علیہ السلام پر بھی ایمان لائے حالانکہ اہل کتاب کے لئے بھی حضور کی بعثت کے بعد کوئی دوسرا نبی سوائے حضور علیہ السلام کے نہیں ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کی بعثت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت ختم ہوگئی۔ لہٰذا آئندہ جو بھی اہل کتاب سے ایمان لائے گا وہ ایک نبی یعنی حضور علیہ السلام پر ایمان لانے کی وجہ سے ایک ہی اجر کا مستحق ہوگا۔ باقی دونوں صنفوں میں اجرین کا حکم تا قیام قیامت رہے گا۔

اور اختلاف رواۃ فی الحدیث بھی کرمانی کے دعوی کو مضر نہیں کیونکہ اذا کو استقبال کے لئے ماننے کے بعد بھی جب وہ شرط مذکورہ بالا موجود نہ ہوگی، حکم اجرین حاصل نہ ہوگا۔ اور ایما سے بھی تعمیم جنس اہل کتاب ہی ثابت ہو سکے گی۔ جس سے ان کے لئے تعمیم حکم اجرین ثابت نہ ہو سکے گا۔

(۲) **قوله بطأها - اى يحل و طأها، سواء صارت موطوءة اولا**

(۳) **التاديب يتعلق بالمروات والتعليم بالشرعيات اعنى ان الاول عرفي والثانى شرعى او الاوّل دنيوى والثانى دينى** (عمدۃ صفحہ ۵۱۶، ۵۱۸ جلد اول)

(۴) پہلے باب میں تعلیم عام کا ذکر تھا، یہاں تعلیم خاص کا ذکر ہوا، یہی وجہ مناسبت ہے دونوں بابوں میں۔ (صفحہ ۵۱۳)

(۵) ترجمہ میں والاہل ہے، حالانکہ حدیث میں نہیں ہے۔ تو یا تو بطریق قیاس اخذ کرنیکی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ **اعتناء بتعليم الحرائر الاهل من الامور الدينية اشد من الا ماء**، دوسرے یہ کہ ارادہ کیا ہوگا حدیث لانے کا مگر نہ مل سکی ہوگی۔ (عمدہ صفحہ ۵۱۳)

(۶) **قد كان يركب** یہ بات حضور علیہ السلام اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں تھی اس کے بعد فتح امصار ہو کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دوسرے

بلاد میں پھیل گئے۔ اور ہر شہر کے لوگوں نے اپنے شہر کے علماء پر اکتفاء کیا۔ بجز ان کے جنہوں نے زیادہ توسع فی العلم چاہا اور سفر کئے۔

(صفحہ ۵۱۸، مثل جابر وغیرہ، شرح شیخ الاسلام)

(۷) پس بعض مالکیہ نے جو اس قول شعبی کی وجہ سے علم کو مدینہ منورہ کے ساتھ خاص کہا۔ یہ ترجیح بلا مرجح ہے پس غیر مقبول ہے۔ (۵۱۹)

(۸) **ثم قال عامر:** بظاہر یہ خطاب صالح راوی حدیث کو ہے۔ اور اسی لئے کرمانی شارح بخاری نے یقین کے ساتھ فرمادیا کہ خطاب صالح کو ہے۔ اور کراچی سے حالیہ شائع شدہ تراجم بخاری میں بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور تیسیر القاری میں بھی اسی طرح ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ البتہ شرح شیخ الاسلام میں ہے ثم قال عامر مقولہ صالح بن حیان ہے۔ وخطاب بمردے از اہل خراسان است۔ کہ پرسیدہ بود شعبی را از حکم کسے کہ آزاد کرد واہ خود را پس از اں تزوج کند، چنانچہ از باب واذکر فی الکتاب مریم معلوم شود۔ (صفحہ ۱۶۲ ج ۲ حاشیہ تیسیر القاری، شیخ الاسلام)

یہ تحقیق صحیح ہے۔ (علامہ عینی نے بھی کرمانی کی تغلیط بطور مذکور کی ہے۔) پس خطاب اہل خراسان کے ہی ایک مشہور شخص کو ہے۔ جس کے سوال کے جواب میں عامر نے یہ حدیث بیان کی ہے۔ چنانچہ بخاری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں بھی یہی حدیث لائیں گے۔ وہاں سے یہ چیز واضح ہوگی۔ حافظ نے بھی فتح الباری میں یہی تحقیق کی ہے۔

دیگر افادات حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید فرمایا کہ بعض لوگوں نے دو اجر کو زمانہ عدم تحریف کے ساتھ خاص کیا ہے حالانکہ قول قرطبی نص حدیث مذکور کے بھی منافی ہے کیونکہ وہ آپ ہی کے زمانے کے لوگوں کے واسطے ہے۔ جب کہ وہ سب تحریف شدہ نصرانیت پر ہی عامل تھے۔

(۲) میرے نزدیک تحریف میں بھی تفصیل ہے اگر وہ حد کفر صریح تک پہنچ جائے تو ان کے لئے دو اجر نہ ہوں گے۔ ورنہ مطابق حدیث مذکور ان کے مستحق ہوں گے۔ البتہ اختلاف شرائع کی بھی رعایت ضروری ہے۔ کہ بعض کلمات مثلاً ''ابن'' کتب سابقہ میں مستعمل تھا۔ خواہ کسی تاویل سے ہی تھا۔ مگر ہماری شریعت میں مطلق کفر ہے۔ اور اس کی پوری بحث آیت نحن ابناء اللہ کے تحت فتح العزیز میں ہے کہ تاویل باطل مفید ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ نصاریٰ کا کفر قطعی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ توحید کے بھی دعویدار ہیں۔ اور ہماری شریعت نے بھی ان کی توحید کا کسی حد تک اعتبار کر کے ان کو جواز نکاح واکل ذبائح کے بارے میں دوسرے کفار سے ممتاز قرار دیا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ دینی سماوی کی رعایت سے دینی امور میں اتنی تخفیف کا معاملہ فرمایا۔ تو کیا بعید ہے کہ آخرت میں بھی کچھ مسامحت ہو۔ اور ان کو دو اجر ان کے پہلے ایمان کی وجہ سے بھی محض دعویٰ ایمان پر عطا ہو جائیں۔

(۳) دو اجر والی فضیلت صرف ان ہی تین قسم کے آدمیوں کے واسطے خاص ہے یا اور بھی ایسے ہیں؟ تو حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علامہ سیوطی نے ایسی ۲۲ قسم کی حدیث سے شمار کی ہیں۔

اور مجھ کو یہاں سے تنبہ ہوا اور غور کرنے لگا کہ کیا فضیلت عدد مذکور تک محصور ہے یا ان میں کوئی ایسی جامع وجہ ہے جو دوسری انواع میں بھی پائی جا سکتی ہے۔ جس سے ان میں بھی دو اجر کی فضیلت کا حکم منتقل ہو جائے تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہر عمل جو پہلی امتوں بنی اسرائیل وغیرہ پر پیش ہوا اور ان سے اس کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی ہے اور ہم اس امر شرعی کو پورے آداب کے ساتھ بجالائیں تو اس پر ہمیں دو اجر ملیں گے جیسے کہ مسلم شریف میں صلوۃ عصر کے بارے میں حدیث ہے کہ وہ نماز تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض ہوئی تھی پس اگر تم اس کی ادائیگی کما حقہ کرو گے تو تمہیں دو اجر ملیں گے۔

اور جس طرح ترمذی میں ہے کہ بنواسرائیل کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے تھے پس اگر ہم پہلے اور بعد کو بھی ہاتھ دھوئیں تو ہمیں دو اجر ملیں گے۔

(۴) اگر کہا جائے کہ جب دو اجر دو عمل کی وجہ سے ہیں تو پھر حدیث مذکور میں ان تین کو ذکر کرنے سے کیا فائدہ؟ کیونکہ ظاہر ہے جو شخص دو عمل کرے گا وہ دو ہی اجر کا مستحق بھی ہوگا۔

اس کے کئی جواب ہیں (الف) ان کو اس لیے خاص طور سے ذکر فرمایا کہ ان کی نظر شارع میں خاص اہمیت تھی (ب) وہ منضبط انواع تھیں اور احکام شرعیہ منضبط انواع واصناف سے ہی متعلق ہوتے ہیں۔ اشخاص وافراد سے نہیں اگر کہیں کسی فرد و شخص کے لیے کوئی حکم آئے گا تو وہ اس کے لیے خاص ہوگا سب کے لیے عام نہیں ہوگا اسی لیے اصول فقہ میں بحث ہے آیا کہ کسی حکم شرعی کا حکمت سے خالی ہونا جائز ہے یا نہیں؟ اور ہماری طرف سے منسوب ہے کہ جائز ہے جیسا کہ استبراء بکر کے مسئلہ میں ہے کہ اس میں سلوق نطفہ کا کوئی شبہ نہیں ہوسکتا پھر بھی حکم استبراء ہے حالانکہ اس میں کوئی حکمت ظاہر نہیں ہے تو شرح وقایہ نے اسکا جواب یہ دیا ہے کہ صرف اتنا ضروری ہے کہ کوئی صنف منضبط حکمت سے خالی نہ ہو، یہ ضروری نہیں کہ اس صنف کی ہر جزئی میں بھی حکمت موجود ہو۔

(ج) ان تینوں امور میں چونکہ ایک قسم کا اشکال تھا اور ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا تھا کہ ان میں دو اجر ہوں اس لیے ذکر فرمایا کہ کیونکہ بظاہر ایمان ہی طاعت ہے اور تعدد اس کی فروع میں آیا ہے تو حدیث نے اس کی وضاحت کی کہ گو ایمان جمالاً تو ایک ہی ہے مگر جب وہ تفصیل میں آ کر ایک نبی کے ساتھ متعلق ہوا تو وہ ایک مستقل عمل قرار پایا اور پھر دوسرے زمانے میں جب وہ دوسرے نبی سے متعلق ہوا تو دوسرا جدید عمل قرار دیا گیا اسی طرح بظاہر جب ایک غلام دوسرے کا مملوک ہے تو اس کے حقوق خدمت ادا کرنے پر اس کو اجر نہ ملنا چاہیے اور اعتاق ضرور طاعت وعبادت ہے مگر نکاح تو اپنے منافع کے لیے ہوتا ہے اس لیے اس پر بھی اجر نہ ہونا چاہیے تو شارع نے ان کو بھی مستقل اجر کا سبب قرار دے دیا۔

(د) شارع نے ان تینوں صورتوں کو اس لیے خاص طور سے ذکر کیا ہے کہ ان میں وہ دو دو کام دشوار یا خلاف طبع تھے لہٰذا شریعت نے ترغیب وتحریص کے طور پر ان پر دو دو اجر بتلائے۔

کیونکہ کتابی جب اپنے نبی پر ایمان لا چکا تو اس کو دوسرے نبی پر ایمان لانا شاق ہوگا اور وہ یہ بھی خیال کرے گا کہ دوسرے نبی پر ایمان لانے کی وجہ سے پہلا ایمان بیکار جائے گا تو فرمایا کہ نہیں اس کو دونوں کے اجر الگ الگ ملیں گے ایسے ہی غلام جب اپنے مولی کی خدمت پوری طرح کریگا تو بسا اوقات اس کو اداء نماز وغیرہ کا وقت نہیں ملے گا یا دشواری تو ضرور ہوگی اس لیے ترغیب دی گئی کہ اس کو ڈبل اجر ملے گا۔

اسی طرح طبائع فاضلہ باندیوں سے نکاح کو پسند نہیں کرتیں لہٰذا ترغیب دی گئی کہ ان کو آزاد کر کے نکاح کرنے پر دوگنا اجر ان کو حاصل ہوگا۔

(نصاری کا استدلال بابتہ عموم بعثت حضرت مسیح علیہ السلام اور اس کا مدلل ومفصل جواب)

حضرت عیسیٰ نے جو اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لیے بھیجا تھا اس سے نصاری نے آپ کی عموم بعثت پر استدلال کیا ہے جواب یہ ہے کہ عموم بعثت سرور انبیاء علیہم السلام کے خصائص میں سے ہے دوسرا کوئی اس وصف سے متصف نہیں ہوا وجہ یہ ہے کہ ایک تو دعوت توحید ہے اس کے اعتبار سے تو تمام انبیاء کی بعثت عام ہے جیسا کہ علامہ ابن دقیق العید نے بھی تصریح کی ہے اسی لیے وہ مجاز ہیں کہ جس کو بھی چاہیں اس کی طرف دعوت دیں خواہ ان کی طرف مبعوث ہوئے ہوں یا نہیں اور جن کو یہ دعوت پہنچ جائے گی وہ اس دعوت کو ضرور قبول کریں گے انکار کی گنجائش نہیں ہے اگر کریں گے تو مستحق نار ہوں گے۔

دوسری دعوت شریعت ہے اس میں تفصیل ہے کہ اگر پہلے سے ان لوگوں کے پاس کوئی شریعت موجود تھی جس پر وہ عمل کر رہے تھے اور

دوسری شریعت کی دعوت بھی باقاعدہ ان کو پہنچ گئی تو پہلی منسوخ سمجھی جائیگی اور جدید شریعت مذکورہ پر عمل واجب ہوگا اور اگر باقاعدہ نہیں پہنچی یا صرف خبر ملی تو نئی شریعت پر عمل واجب نہ ہوگا اگر پہلے سے کوئی شریعت ان کے پاس نہیں تھی تب بھی اس نئی شریعت مذکورہ پر عمل واجب ہوگا خواہ اس کی دعوت بھی باقاعدہ نہ پہنچی ہو صرف اس کی خبر ملنا کافی ہے۔

لیکن جن لوگوں کو شریعت کی دعوت نہیں پہنچی بلکہ عام خبروں کی طرح صرف کسی نبی کی بعثت کی خبر پہنچی ہو تو ان پر اس نبی پر ایمان لانا ضروری ہے اس کی شریعت پر عمل ضروری نہیں ہے جب کہ وہ پہلے سے کسی شریعت پر ہوں اگر ایمان نہیں لائیں گے ہلاک ہوں گے۔

یہ سب تفصیل اس آخری شریعت محمدیہ سے پہلے تک ہے اس لیے اس کے بعد دنیا میں کسی کو بھی اس کا انحراف جائز نہیں ہے۔ **و من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه و هو فی الاخرة من الخاسرین** ۔ مختصر یہ کہ دعوت توحید تو سب انبیاء کی عام تھی لیکن دعوت شریعت کا عموم صرف سرور کائنات علیہ افضل الصلوات والتسلیمات کے ساتھ خاص ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے فرض لازم تھا کہ تمام دنیا کے لوگوں کو اس شریعت کی طرف دعوت دیں اسی لیے آپ نے دنیا کے بہت سے ملوک و امراء کو تبلیغی مکاتیب ارسال فرمائے اور باقی کام کی تکمیل خلفاء راشدین کے ہاتھوں ہوئی۔

آپ کے علاوہ سب انبیاء علیہم السلام کی دعوت شریعت ان کی اپنی اپنی اقوام و امم کے ساتھ مخصوص تھی اور دوسروں تک اس کی تبلیغ کرنا ان کے لیے اختیاری امر تھا فریضہ الٰہی نہیں تھا۔

حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کے عموم بعثت کی شہرت اس لیے ہے کہ کفر کے مقابلہ کے لیے یہی دونوں مبعوث ہوئے حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے جو نسبتاً مسلمان تھے کیونکہ اولاد یعقوب سے تھے البتہ نوحؑ نے سب سے پہلے کفر کا مقابلہ کر کے اس کی بیخ کنی کی ہے اس لیے انکا لقب نبی اللہ ہوا ہے اور ابراہیم نے سب سے پہلے صابئین کا رد کیا اور حنیفیت کی بنیاد ڈالی۔

یہ قاعدہ ہے کہ جب نبی کسی چیز کا رد و مقابلہ کرتا ہے تو ساری دنیا کے لیے عام ہو جاتا ہے چنانچہ عقائد کے بارے میں تو یہ بات ظاہر ہے کہ عقائد تمام ادیان سماویہ میں مشترک ہیں لہٰذا رد و مقابلہ بھی عام ہونا چاہئے البتہ شریعت کے بارے میں محل نظر ہے پس ان دونوں کی عموم بعثت اسی نظریہ مذکورہ کے ماتحت تھی۔

(۲) اس تفصیل کے بعد ایک جواب کی صورت یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام کو حضرت مسیحؑ کے مبعوث ہونے کی خبر مل گئی اور ظاہر ہے جس شخص کی فطرت اس قدر سلیم تھی کہ حضور علیہ السلام کی مجلس مبارک میں پہلی بار حاضر ہو کر چہرہ انور کو دیکھتے ہی فرمادیا کہ یہ چہرہ مبارک کسی جھوٹے کا نہیں ہو سکتا اس نے حضرت مسیحؑ کی نبوت کی بھی ضرور تصدیق کی ہوگی اور یہ تصدیق ہی ان کو کافی تھی۔ شریعت عیسیٰ پر عمل ضروری نہ تھا البتہ اگر حواری عیسیٰؑ مدینہ منورہ میں ان تک پہنچ جاتے اور ان کی شریعت کی طرف بلاتے تب ان کو اس شریعت پر عمل بھی ضروری ہوتا۔

پس اجر ایمان بعیسیٰؑ حاصل کرنے کے لیے وہ تصدیق مذکور بھی کافی ہے اور یہودیت پر بقا اور شریعت موسوی پر عمل کرتے رہنا بھی اس تحصیل اجر سے مانع نہیں ہو سکتا پھر حضور سرور دو عالم علیہ السلام پر ایمان لانے سے دوسرے اجر کے بھی مستحق ہو گئے کیونکہ مدینہ میں ہوتے ہوئے اور دعوت شریعت نہ پہنچنے کی وجہ سے ان کے لیے صرف تصدیق بالشئی بھی کافی تھی۔

البتہ جو لوگ شام ہی میں رہے اور حضرت عیسیٰؑ کی تصدیق نہیں کی ان کو حضور علیہ السلام پر ایمان لانے سے صرف ایک ہی اجر ملے گا معالم میں جو حدیث ہے کہ عبداللہ بن سلام نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ اگر میں تمام انبیاء پر سوائے حضرت

عیسیٰ ؑ کے ایمان لاؤں تو کیا نجات کے لیے کافی ہوگا تو اول تو اس کی اسناد ساقط ہے دوسرے یہ سوال بطور فرض تھا اور مقصود صرف تحقیق مسئلہ تھی یہ نہیں کہ وہ اپنے حال کی خبر دے رہے تھے۔

تعلیم نسواں: حدیث الباب میں باندی کو آداب سکھانے اور تعلیم دینے کی فضیلت ہے جس سے دوسری عورتوں کو تعلیم دینے کی فضیلت بدرجہ اولی ثابت ہوئی، سنن بیہقی، دیلمی، مسند احمد وغیرہ کی روایات سے ہر مسلمان کو علم سیکھنا واجب وضروری معلوم ہوا، جو مردوں اور عورتوں سب کے لئے عام ہے، علم حاصل کرنے کا مقصد تحصیل کمال ہے، جس سے ظاہر و باطن کی سنوار ہو، اگر کسی علم سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو وہ لا حاصل ہے (جیسا کہ ہم پہلے بھی تفصیل سے بتلا چکے ہیں) اگر کسی علم سے بجائے سنوار کے بگاڑ کی شکلیں رونما ہوں تو اس علم سے جہل بہتر ہے۔

چونکہ علم دین وشریعت سے انسان کے عقائد اعمال، اخلاق، معاشرت و معاملات سنورتے ہیں اس کا حاصل کرنا بھی ہر مرد وعورت کے لئے ضروری، موجب کمال و باعث فخر ہے، اور جس تعلیم کے اثرات سے اس کے برعکس دوسری خرابیاں پیدا ہوں، وہ ممنوع قابل احتراز و نفرت ہوگی، لسان العصر اکبر الہ آبادی نے کہا تھا

ہم ایسے ہر سبق کو قابل ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جس کو پڑھ کر لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اسلام میں چونکہ ہر فن اور ہر پیشہ کو سیکھنا بھی فرض کفایہ کے طور پر ضروری قرار دیا گیا ہے تا کہ مسلمان اپنی روزمرہ کی ضروریات زندگی میں دوسروں کے محتاج نہ ہوں، اس لئے بڑھئی کا کام، لوہار کا کام، کپڑا بننے کا کام، کپڑا سینے کا کام وغیرہ وغیرہ حسب ضرورت کچھ لوگوں کو سیکھنا ضروری ہیں، یہ تو ان فنون و پیشوں کو اختیار کرنے کا اولین مقصد ہے، دوسرے درجہ میں ان کے ذریعہ روزی کمانا بھی درست اور حلال وطیب ہے، بلکہ ہاتھ کی محنت سے کمائی کی فضیلت وارد ہے اور روزی کمانے کے طریقوں میں سب سے افضل تجارت پھر صنعت وحرفت، پھر زراعت، اجرت ومزدوری، ملازمت وغیرہ ہے، علم اگر دین وشریعت کا ہے تو اس کو کسب معاش کا ذریعہ بنانا تو کسی طرح درست ہی نہیں، غیر اسلامی نظام کی مجبوری وغیرہ کی بات دوسری ہے، تاہم اجرت لے کر پڑھائے گا تو اس پر کوئی اجر متوقع نہیں، بلکہ بقول حضرت استاذ الاساتذہ شیخ الہندؒ آخرت میں برابر سرابر چھوٹ جائے تو غنیمت ہے، غرض علم دین حاصل کرنا نہایت بڑا فضل و کمال ہے اور اس کے مطابق خود عمل کر کے دوسروں کو اس سے بغیر کسی اجرت وطمع کے فائدہ پہنچانا انبیاءؑ کی صحیح نیابت ہے۔ رہے ''دنیوی علوم'' جو موجودہ حکومتوں کے سکولوں اور کالجوں وغیرہ میں پڑھائے جاتے ہیں، ان کے اولین مقاصد چونکہ اقتصادی، سیاسی وغیرہ ہیں اس لئے ان سے ذاتی فضل و کمال کے حصول، دین واخلاق کی درستی، معاشرت ومعاملات باہمی کی اصلاح جیسی چیزوں کی توقع فضول ہے، لہٰذا ان کی تحصیل کا جواز بقدر ضرورت ہوگا، اور اسلامی نقطہ نظر سے یقیناً اس امر کے ساتھ مشروط بھی ہوگا کہ ان کے حصول سے اسلامی عقائد ونظریات، اعمال واخلاق مجروح نہ ہوں، اگر یہ شرط نہیں پائی جاتی تو ایسی تعلیم کا ملازمت وغیرہ معاشی وغیر معاشی ضرورتوں کے تحت بھی حاصل کرنا جائز نہ ہوگا، پھر مردوں کے لئے اگر ہم موجودہ سکولوں کالجوں کی تعلیم کو ہم شرعی نقطہ نظر سے معاشی واقتصادی ضروریات کے تحت جائز بھی قرار دیں تو ان کے لئے گنجائش اس لئے بھی نکل سکتی ہے کہ ان کے لئے دینی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بھی بسہولت میسر ہیں، لیکن لڑکیوں کی اسکولی تعلیم کی نہ معاش کے لئے ضرورت ہے نہ کسی دوسری صحیح غرض کے لئے، پھر آٹھویں جماعت یا گیارہویں جماعت پاس کر کے لڑکیوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے، جس میں حکومت کی طرف سے وظیفہ بھی دیا جاتا ہے، اس سے فارغ ہو کر ان کو دیہات وقصبات کے اسکولوں میں تعلیم کے لئے مقرر کر دیا جاتا ہے، جہاں وہ اپنے والدین، خاندان و اسلامی ماحول سے دور رہ کر تعلیمی فرائض سرانجام دیتی ہیں، ایک مسلمان عورت اگر فریضہ حج ادا کرنے کے لئے بھی بغیر محرم کے ایک دو ماہ نہیں

گزار سکتی تو ظاہر ہے کہ ملازمت کے لئے اس کا بغیر محرم کے غیر جگہ مستقل سکونت و رہائش اختیار کرنا کیسے درست ہوگا؟ سنا گیا کہ بعض جگہ ان کے ساتھ ان کی ماؤں یا بہنوں کو بھیج دیا جاتا ہے، حالانکہ ان کا ساتھ ہونا شرعاً کافی نہیں کیونکہ محرم مرد ہی ہونا چاہیے۔

اس کے بعد تعلیم آگے بڑھی تو کالجوں میں داخلہ لے لیا گیا، جہاں ایف۔اے کے بعد عموماً مخلوط تعلیم دی جاتی ہے، پڑھانے والے اساتذہ مرد، اگلی صفوں میں نوجوان لڑکیاں اور پچھلی نشستوں پر نوجوان لڑکے ہوتے ہیں، باہم میل جول، بحث و گفتگو اور بے حجابی وغیرہ پر کوئی پابندی نہیں، اس ماحول میں کچی سمجھ کی سادہ لوح مسلمان لڑکیاں کیا کچھ اثرات لیتی ہیں، وہ آئے دن کے واقعات بتاتے رہتے ہیں اور خصوصیت سے اخبار دیکھنے والے طبقہ پر روشن ہیں، اعلیٰ تعلیم پانے والی لڑکیاں تو غیر مسلموں کے ساتھ بھی تعلقات بڑھا لیتی ہیں، ان کے ساتھ ازدواجی رشتے بھی قائم کر لیتی ہیں، پھر مسلمان ماں باپ و خاندان والے بھی سر پکڑ کر روتے ہیں، بڑی ناک اور عزت والے تو اخبار میں اس کی خبر بھی نہیں دے سکتے کہ مزید رسوائی ہوگی، سب کو معلوم ہے کہ مسلمان عورت کا ازدواجی رشتہ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی غیر مسلم مرد کے ساتھ جائز نہیں، اب مسلمان عورت اگر اسلام پر باقی رہتے ہوئے غیر مسلم کے ساتھ رہتی ہے تو ہمیشہ حرام میں مبتلا ہو کر عمر گزارے گی، اور اگر اس نے دین کو اپنے غیر مسلم محبوب کی وجہ سے چھوڑ دیا تو اس سے زیادہ وبال و عذاب کس چیز کا ہوگا؟ اور والدین و اعزہ و خاندان والے بھی اس مذکورہ گناہ عظیم یا کفر و ارتداد کا سبب بنے تو وہ بھی عذاب و وبال کے مستحق ہوئے۔ **اللهم احفظنا من سخطک و عذابک**

رحمت دو عالم فخر موجودات علیہ السلام نے جتنے احکام و ہدایت وحی الٰہی کی روشنی میں مردوں کو مناسب اور عورتوں کے حسب حال ارشاد فرمائے تھے، کیا ایک مسلمان مرد و عورت کو ان سے ایک انچ بھی ادھر سے ادھر ہونا عقل و دین کا مقتضا ہو سکتا ہے، ایک بار آنحضرت علیہ السلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا "تم جانتے ہو کہ عورت کے لئے سب سے بہتر کیا بات ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ خاموش رہے کہ حضور ہی کچھ ارشاد فرمائیں گے پھر انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ذکر کیا کہ انہیں معلوم ہوگا تو بتلائیں گی، چنانچہ انہوں نے بتلایا" **لا يراهن الرجال** "عورتوں کے لئے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ ان پر مردوں کی نظریں نہ پڑیں، اور صحیح حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب کوئی عورت گھر سے نکل کر باہر آتی ہے تو شیطان اس کو سر ابھار ابھار کر خوشی سے دیکھتا ہے (کہ مردوں کو پھانسنے کا سب سے اچھا جال اس کے ہاتھ آگیا) اور ایسی ہی عورتوں کو جو بے ضرورت و بے حجاب بن سنور کر گھروں سے نکلتی ہیں، حدیث میں "شیطان کے جال" کہا گیا ہے، غرضیکہ فی زمانہ عورتوں کا عصری تعلیم حاصل کرنا اور دینی تعلیم و تربیت سے محروم ہونا مسلمان قوم کی بہت بڑی بدبختی ہے اور اس سلسلہ میں علماء اسلام اور دردمندان ملت کو سعی اصلاح کی طرف فوری قدم اٹھانا ضروری ہے۔

عورتوں میں اگر دینی تعلیم کو عام رواج دے کر، عورتوں ہی کے ذریعہ ان کے طبقہ کی اصلاح کرائی جائے تو یہ بھی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ **والله يوفقنا لما يحب و يرضى**

عورت کا مرتبہ اسلام میں

اسلام نے اعلیٰ اوصاف و کمالات کو کسی شخص و جنس کے لئے مقرر مخصوص نہیں قرار دیا کیونکہ

دادِ اورا قابلیت شرط نیست   بلکہ شرط قابلیت دادِ اوست

حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت و فضل خاص سے نواز دیتے ہیں، تاہم صنف نازک میں کچھ کمزوریاں ایسی ہیں کہ ان سے عقلاً و شرعاً قطع نظر نہیں ہو سکتی، اسی لئے مردوں کو خاص طور سے ایسی ہدایات دی گئیں ہیں کہ وہ حدود شریعت کے اندر رہتے ہوئے عورتوں کے

جذبات وحقوق کی زیادہ سے زیادہ نگہداشت کریں اوراس معاملہ میں بسااوقات مردوں کے اخلاقی کردار کا بڑے سے بڑاامتحان بھی ہوجاتا ہے جس میں پورااترنے کے لئے نہایت بڑے عزم وحوصلے کی ضرورت ہوتی ہے حضوراکرم ﷺ نے ارشادفرمایا:'' ماذا الی جبرائیل یو صینی بالنساء حتی ظننت انه یسحرم طلا قهن ''(حضرت جبرائیلؑ نے عورتوں کے بارے میں مجھے اس قدرنصائح پہنچائیں کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ شاید ان کو طلاق دینا حرام ہی قرار پاجائے گا) یعنی جب ان کی ہر برائی پر صبر ہی کرنا لازمی ہوگا تو پھر طلاق کا کیا موقع رہے گا؟اس کی مزید تشریح پھر کی جائے گی۔ان شاءاللہ تعالیٰ

بَابُ عِظَتِ الْاِمَامِ النِّسَاءَ وَتَعْلِيْمِهِنَّ

(امام کا عورتوں کو نصیحت کرنا اور تعلیم دینا)

(۹۷) حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ اَيُّوْبَ قَالَ سَمِعْتُ عَطَآءَ بْنَ اَبِىْ رَبَاحٍ قَالَ سَمِعْتُ بْنَ عَبَّاسٍ قَالَ اَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْ قَالَ عَطَآءٌ اَشْهَدُ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ وَ مَعَهُ بِلَالٌ فَظَنَّ اَنَّهُ لَمْ يُسْمِعِ النِّسَآءَ فَوَعَظَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ فَجَعَلَتِ الْمَرْاَةُ تُلْقِىْ الْقُرْطَ وَالْخَاتَمَ وَ بِلَالٌ يَاْخُذُ فِىْ طَرَفِ ثَوْبِهٖ وَقَالَ اسْمٰعِيْلُ عَنْ اَيُّوْبَ عَنْ عَطَآءٍ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

ترجمہ: عطاابن ابی رباح نے حضرت ابن عباسؓ سے سنا کہ میں رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں یا عطاء نے کہا کہ میں ابن عباسؓ کو گواہ بناتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ (ایک مرتبہ عید کے موقع پر لوگوں کی صفوں میں) نکلے اور آپ ﷺ کے ساتھ بلالؓ تھے،تو آپ ﷺ کو خیال ہوا کہ عورتوں کو(خطبہ اچھی طرح) سنائی نہیں دیا،تو آپ ﷺ نے انہیں نصیحت فرمائی اور صدقے کا حکم دیا،تو یہ وعظ سن کر کوئی عورت بالی(اور کوئی عورت) انگوٹھی ڈالنے لگی اور بلالؓ اپنے کپڑے کے دامن میں یہ چیزیں لینے لگے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کا مقصد ترجمۃ الباب سے یہ ہے کہ تبلیغ مردوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ عورتوں کو بھی شامل ہے پھر فرمایا کہ جس روز حضوراکرم ﷺ نے عورتوں کو مذکورہ وعظ ونصیحت فرمائی تھی،وہ عید کا دن تھا اور شاید جس صدقہ کی رغبت دلائی تھی وہ صدقۃ الفطر تھا،قرط کانوں کی دریاں اور شنف بالی کو کہتے ہیں۔

یہ بھی حدیث اور ترجمۃ الباب سے معلوم ہوا کہ امام وقت کو مردوں کے علاوہ عورتوں کو بھی وعظ ونصیحت کرنی چاہیے،جس طرح حضور اکرم ﷺ سے اس کا اہتمام ثابت ہے،پھر یہ کہ عورتوں کی تعلیم کیسی ہونی چاہیے؟اس کو ہم سابق باب میں تفصیل سے بتلا چکے ہیں کہ دین و اخلاق کو سنوارنے کے لئے دین کا علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے،لیکن دنیوی علوم کی تحصیل کا جواز اس شرط پر موقوف ہے کہ اس سے دین و اخلاق اسلامی معاشرت ومعاملات پر برے اثرات نہ پڑیں۔

کیونکہ دینی تعلیم نہ ہونے سے اخلاقی وشرعی نقطہ نظر سے معاشرے میں خرابیاں بڑھ جاتی ہیں اور زیادہ فتنے چونکہ عورتوں کے سبب پھیل سکتے ہیں اس لئے جہاں ان کی دینی تعلیم سے معاشرہ کے لئے بہترین نتائج حاصل ہوسکتے ہیں،دینی تعلیم نہ ہونے سے اسی قدر برے اور بدترین حالات رونما ہوتے ہیں۔ اعاذنا الله منها و وفقنا لكل خير

بَابُ الْحِرْصِ عَلَى الْحَدِيْثِ

(حدیث نبوی معلوم کرنے کی حرص)

(۹۸) حَدَّثَنَا عَبْدُالْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِاللهِ قَالَ حَدَّثَنِيْ سُلَيْمَانُ عَنْ عَمْرِو بْنِ اَبِيْ عَمْرٍو عَنْ سَعِيْدِ بْنِ اَبِيْ سَعِيْدِ نِالْمَقْبُرِيِّ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ مَنْ اَسْعَدُ النَّاسِ بِشِفَاعَتِكَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ ظَنَنْتُ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ اَنْ لَّا يَسْاَلُنِيْ عَنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ اَحَدٌ اَوَّلَ مِنْكَ لِمَا رَاَيْتُ مِنْ حِرْصِكَ عَلَى الْحَدِيْثِ اَسْعَدُ النَّاسِ بِشِفَاعَتِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهٖ اَوْ نَفْسِهٖ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! قیامت کے دن آپ ﷺ کی شفاعت سے سب سے زیادہ کس کو حصہ ملے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے ابوہریرہ! مجھے خیال تھا کہ تم سے پہلے کوئی اس بارے میں مجھ سے دریافت نہیں کرے گا، کیونکہ میں نے حدیث سے متعلق تمہاری حرص دیکھ لی تھی قیامت میں سب سے زیادہ فیض یاب میری شفاعت سے وہ شخص ہوگا جو سچے دل سے یا سچے جی سے " لا الٰہ الا اللہ " کہے گا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ " من اسعد الناس " کا ترجمہ یہ ہے کہ "کس کی قسمت میں آپ ﷺ کی شفاعت زیادہ پڑے گی؟" یعنی آپ ﷺ کی شفاعت سے زیادہ نفع کن لوگوں کو پہنچے گا، تو آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کو جن کا یقین وعقیدہ خالص توحید پر ہوگا، لہٰذا اس حدیث کا تعارض اس حدیث سے نہیں، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لئے ہوگی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں گے" وہاں آپ ﷺ نے یہ بتلایا ہے کہ ایسے لوگ بھی میری شفاعت سے نفع اندوز ہوں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اسی طرح یہ حدیث بخاری ومسلم کی اس حدیث کے خلاف بھی نہیں ہے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ایک قوم ایسی بھی دوزخ سے نکالی جائیگی، جس نے ایمان لانے کے بعد کوئی نیک عمل نہیں کیا ہوگا، اور اس کو خود رحمٰن کی رحمت جہنم سے نکالے گی" اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے نہیں نکلیں گے اور آپ ﷺ کی شفاعت صرف عمل کرنے والوں کے لئے خاص ہوگی، مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی شفاعت سے ان کو بھی نفع پہنچے گا، فرق صرف یہ ہے کہ ان کو نکالنے کا تکفل خود حق تعالیٰ نے فرمالیا کسی دوسرے کی طرف اس کو سپرد نہیں کیا۔ اس کی مزید تشریح [1] وتفصیل انوارالباری جلد اول میں "باب تفاضل

[1] حضرت علامہ مولانا بدر عالم صاحب دامت برکاتہم نے اس موقع پر حاشیہ فیض الباری صفحہ ۱۹۹ جلد ا میں جو تشریح ذکر فرمائی ہے وہ بھی قابل ذکر ہے: "اس کی تفصیل یہ ہے کہ گنہگار مومن جب جہنم میں داخل کئے جائیں گے تو ان کے چہروں پر آگ کا کوئی اثر نہ ہوگا، اور یہ بھی قول ہے کہ اعضاء وضو سب ہی محفوظ رہیں گے، جو صورت بھی ہو بہر حال حضور اکرم ﷺ ان کے چہروں یا ان کے اعضاء وضو سے ان کو پہچان لیں گے، اور ان کو جہنم سے نکال لیں گے، لیکن جو لوگ بالکل ہی بے عمل ہوں گے، چونکہ ان کے سارے ہی اعضا آگ میں جھلس جائیں گے، ان کو پہچاننے کی کوئی صورت نہ ہوگی، اس لئے آپ ﷺ ان کو اپنے دست مبارک سے نکال بھی نہ سکیں گے، مگر جب آپ کی شفاعت ہر کلمہ گو مسلمان کے لئے قبول ہو چکی ہوگی، حق تعالیٰ اپنے علم محیط کے مطابق ان لوگوں کو بھی نکال دیں گے، جن کو حضور ﷺ نہ پہچاننے کے سبب چھوڑ دیں گے، اور آپ کی شفاعت ان کو شامل ہو چکی ہوگی، واللہ علم بالصواب۔

اهل الایمان فی الاعمال‘‘ کے تحت ہو چکی ہے۔

بحث ونظر

شفاعت کی اقسام: روز قیامت میں جو واقعات وحالات پیش آنے والے ہیں۔ان میں سے جن کا ثبوت قرآن مجید اوراحادیث صحیحہ سے ہو چکا ہے۔ان پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ان ہی میں سے شفاعت بھی ہے۔جس کا ثبوت بکثرت احادیث صحیحہ بلکہ متواترہ سے ہے۔ چند احادیث بخاری شریف میں بھی آئیں گی۔ یہاں ہم اس کی اقسام ذکر کرتے ہیں۔

(۱) شفاعت کبریٰ یا شفاعت عامہ، جو تمام اہل محشر کے لئے ہوگی۔تا کہ ان کا حساب وکتاب جلد ہو کر قیام محشر کی ہولناک تکلیف وحشت وپریشانی سے نجات ملے۔یہ شفاعت کافر، مشرک، منافق، فاسق، مومن وغیرہ سب کے لئے عام ہوگی، یہ سب سے پہلی شفاعت ہوگی، جس کے لئے اہل محشر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام سے شفاعت کرنے کی درخواست کریں گے۔اور سب کی معذرت کے بعد کہ ہم اس وقت تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے، تم نبی آخر الزمان ﷺ کی خدمت میں جاؤ۔وہ لوگ نبی الانبیاء فخر دوعالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔آپ ﷺ فرمائیں گے کہ ہاں! میں تم سب کی پریشانی کے بارے میں ضرور بارگاہ رب العالمین جل مجدہ سے اجازت لے کر معروضات پیش کروں گا۔

پھر آپ ﷺ بارگاہ محبوبیت عز شانہ سے اجازت شفاعت چاہیں گے۔، وہاں سے اجازت ملے گی۔اور بخاری ومسلم میں یہ بھی صراحت ہے کہ آپ ﷺ کو اس وقت حق تعالیٰ اپنے محامد وصفات کی ادائیگی کے لئے وہ کلمات تلقین فرمائیں گے۔جواب آپ ﷺ کو معلوم بھی نہیں ہیں۔آپ ﷺ ان ہی محامد اور تعریفی توصیفی کلمات کو ادا فرماتے ہوئے سربسجود ہو جائیں گے، اس وقت رب العزت کی خاص شان رحمت متوجہ ہوگی۔اور ارشاد ہوگا، سر اٹھایئے! جو کچھ کہنا ہو کہئے! آپ ﷺ کی بات سنی جائیگی جو آپ ﷺ سوال کریں گے اس کو پورا کیا جائے گا (بلکہ، جو کچھ دوسروں کے لیے بطور شفاعت آپ ﷺ کہیں گے اس کو منظور کیا جائے گا اس پر آپ ﷺ پہلی شفاعت سب اہل محشر کے لیے کریں گے کہ ان کا حساب وکتاب ہو جائے اور وہ قبول ہو جائیگی۔

(۲) شفاعت خاصہ جو نبی کریم ﷺ اپنی امت کے اہل کبائر (گناہ کبیرہ والے) مؤمنین کے لیے کریں گے تا کہ وہ جہنم سے نکال لیے جائیں۔

(۳) اپنی امت کے صالحین کے لیے شفاعت کریں گے تا کہ وہ بغیر حساب دخول جنت کا پروانہ حاصل کرلیں۔

(۴) بہت سے صلحائے امت کی ترقی درجات کے لیے شفاعت فرمائیں گے۔

(۵) اپنی امت کے مومنین کے لیے شفاعت فرمائیں گے جو نیک اعمال کی دولت سے خالی ہاتھ ہوں گے یہ حضور ﷺ کی سب سے آخری شفاعت ہوگی اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوا رب العالمین خود اپنے دست کرم سے، ایسے لوگوں کو آپ کی شفاعت کے صدقہ میں، جہنم سے نکال کر اپنی رضا وجنت سے نوازیں گے

من اسعد الناس کا جواب

یہیں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہی وہ نہایت خوش قسمت لوگ ہیں جن کے پاس دنیا میں صرف ایمان کی خالص دولت تھی اعمال صالح وغیرہ سے تہی دامن ہونیکے باعث ظاہری صورت سے وہ کفار مشرکین کے زمرہ میں داخل ہو چکے تھے یہاں تک کہ جہنم میں پہنچ کر کفار ومشرکین ہی کی طرح شکل وصورت بھی بگڑ جائیگی، البتہ جن لوگوں کو بداعمالیوں کے ساتھ کچھ نیک اعمال نماز، روزہ وغیرہ کی توفیق بھی مل گئی تھی تو جہنم میں جا کر بھی وہ دوسرے کفار ومشرکین سے ظاہر میں ممتاز ہی رہیں گے کہ ان کے چہرے اور اعضاء وضو پر آگ کا مطلق اثر نہ ہو گا، یعنی جس طرح نمازی مسلمانوں کو میدان حشر میں ان کے چہروں ہاتھوں اور پیروں کے نور سے پہچانا جائیگا ان میں سے جو لوگ اپنے کبیرہ

گناہوں کے سبب معین مدت کے لیے جہنم میں جائیں گے تو وہاں بھی الگ پہچانیں جائیں گے، اسی لیے ان کو قبول شفاعت کے بعد حضور علیہ السلام ہی خود پہچان کر دوزخ سے نکال لیں گے۔

بے عمل مومنوں کی صورت کفار جیسی

غرض بے عمل لوگوں کا معاملہ ظاہر میں کفار و مشرکین سے جہنم میں بھی ممتاز نہ ہوگا لیکن حضور علیہ السلام کی شفاعت چونکہ ہر کلمہ گو مومن مخلص کے لیے قبول ہو جائیگی اس لیے ایسے لوگوں کو بھی دوزخ سے نکلنا ہوگا اور خود علام الغیوب اور علیم بذات الصدور ہی ان کو دوزخ سے نکالنے کا بھی کرم بالائے کرم فرمائیں گے، نیز چونکہ دوزخ سے نکلنے، جنت میں داخل ہونے، اور رضائے الٰہی جیسی سب سے بڑی نعمت عظیمہ وغیرہ وغیرہ سے نیک بخت ہونیکی ان کے لیے بظاہر کوئی صورت نہ ہوگی اس لیے یہ بھی کہنا نہایت صحیح برمحل ہے کہ سب سے زیادہ آپ کی شفاعت سے ان لوگوں کو فائدہ پہنچےگا یا حضرت شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں سب سے زیادہ شفاعت انہی کی قسمت سنوارنے میں کام آئیگی، اس شرح کو سمجھ لینے کے بعد سوچئے کہ حدیث الباب میں صحابی رسول کا سوال کتنا اونچا ہے اور رحمت عالم علیہ السلام کے جواب کی رفعت کہاں تک ہے؟ اسی لیے محدث ابن ابی جمرہؒ نے یہاں تک فرمادیا کہ یہ حدیث تمام حدیث نبوی سے افضل ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ

علم غیب کلی کا دعویٰ

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت علیہ السلام کے لیے علم غیب کلی کا دعویٰ درست نہیں کیونکہ آپ نے خود ہی فرمایا کہ شفاعت کبریٰ کے وقت روز محشر میں مجھ پر وہ محامد خداوندی القاء ہوں گے جن کو میں اس وقت نہیں جانتا واللہ اعلم۔

اس کے بعد ایک قسم شفاعت کی وہ بھی ہے جو حضور علیہ السلام کے بعد دوسرے انبیاء، اولیاء، علماء صلحاء اپنی اپنی امتوں اور متعلقین کے لیے یا مثلاً کم عمر بچے اپنے والدین کے لیے کریں گے وغیرہ

ایک قسم یہ بھی ہے کہ خود اعمال صالحہ ہی اپنے عمل کرنے والوں کے بارے میں حق تعالیٰ سے شفاعت مغفرت و رفع درجات وغیرہ کی کرینگے۔ وغیرہ اسام والعلم عند اللہ تعالیٰ جل مجدہ

محدث ابن ابی جمرہ کے افادات

صاحب بہجۃ النفوس نے ''حدیث الباب'' کی شرح میں نہایت عمدہ بحث فرمائی ہے (جو عمدۃ القاری فتح الباری وغیرہ شروح میں نظر سے نہیں گزری، حالانکہ اس پر مبسوط کلام کی ضرورت تھی آپ نے ۳۴ قیمتی علمی فوائد تحریر کیے جن میں سے چند یہاں ذکر کیے جاتے ہیں۔

محبوب نام سے خطاب کرنا

معلوم ہوا کہ سوال سے قبل مسئول کو اس کے اچھے اور محبوب ترین نام سے خطاب کرنا چاہیے، جس طرح حضرت ابو ہریرہؓ نے سوال سے پہلے حضور اکرم علیہ السلام کو یارسول اللہ! سے خطاب کیا جو آپ علیہ السلام کے سب سے زیادہ محبوب اور اعلیٰ ترین وصف رسالت پر شامل ہے۔

محبت رسول کامل اتباع میں ہے

مستفاد ہوا کہ نبی اکرم علیہ السلام کی محبت آپ کے کامل اتباع میں ہے باتیں بنانے میں نہیں اس لیے کہ حضرت ابو ہریرہؓ آپ علیہ السلام سے

غیر معمولی محبت رکھنے میں نہایت ممتاز تھے اور آپ ﷺ کے اتباع میں بھی کامل تھے اور سارے ہی صحابہ کا یہ وصف خاص تھا مہاجر تھے یا انصار، اصحاب صفہ تھے یا دوسرے، مگر باوجود اس کے کسی ایک صحابی سے یہ بھی منقول نہیں ہوا کہ اس نے آپ ﷺ کی مدح وثنا میں مبالغہ کیا ہو، جس طرح یہ بھی ثابت نہیں کہ کسی نے آپ ﷺ کی تعظیم وتکریم میں ادنیٰ کوتاہی برتی ہو۔

سوال کا ادب: حضرت ابوہریرہؓ کے طریق سوال سے ایک علمی ادب وسلیقہ معلوم ہوا کہ جب کسی بڑے عالم سے کسی بارے میں سوال کیا جائے تو اس کے سامنے اپنی ذاتی معلومات واندازے اس چیز کے متعلق بیان نہ کرے، جس طرح موصوف نے شفاعت کے بارے میں سوال کیا حالانکہ اس کے متعلق بہت سی باتیں خود ان کو پہلے سے بھی معلوم ہونگی جن کا ذکر کچھ نہیں کیا۔

شفاعت سے زیادہ نفع کس کو ہوگا؟

(۴) سوال یہ نہیں کیا کہ آپ کی شفاعت کے اہل ولائق کون لوگ ہوں گے؟ کیونکہ ایک قسم شفاعت کی کفار ومشرکین، اور سب اہل محشر کے لیے عام ہوگی وہ سوال میں مقصود نہیں ہے، اسی لیے **من اسعد بشفاعتک** ؟ کہا کہ آپ کی شفاعت سے زیادہ نفع کن لوگوں کو ہو گا؟ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

پھر چونکہ سعادت وخوش بختی کا سوال سارے انسانوں کے لحاظ سے تھا اس لیے اسعد الناس کہا اور جواب بھی اسی کے لحاظ سے دیا گیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ گو آپ ﷺ کی شفاعت سے فائدہ تو سب ہی اہل محشر کو پہنچے گا مگر سب لوگوں میں سب سے زیادہ نیک بخت لوگ وہ ہوں گے، جن کو آپ کی شفاعت سے سب سے زیادہ نفع پہنچے گا، لہٰذا اس سے سوال وجواب کی مطابقت بھی خوب سمجھ میں آ گئی۔

امور آخرت کا علم کیسے ہوتا ہے؟

(۵) معلوم ہوا کہ ''امور آخرت'' کا علم عقل، قیاس واجتہاد سے حاصل نہیں ہو سکتا، اس کے لیے نقل صحیح اور علوم نبوت ووحی کی ضرورت ہے۔

سائل کے اچھے وصف کا ذکر

(۶) جواب سے پہلے یہ امر بھی مسنون ہوا کہ سائل میں کوئی اچھا وصف وکمال ہو تو اس کو جتلا کر اس کو خوش کر دیا جائے، جس طرح حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوہریرہؓ کی حرص حدیث کی تعریف فرمائی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو حرص حدیث کا وصف کس قدر محبوب تھا اور آپ کی نظر کیمیا اثر میں **حریص علی الحدیث النبوی** کی کتنی زیادہ قدر ومنزلت تھی کہ حضرت ابوہریرہؓ کو تمام صحابہ کرام میں سے خصوصی امتیاز ومرتبہ عطا فرمایا گویا وہ ہمہ وقت اسی فکر میں رہتے تھے کہ حضور ﷺ کے اقوال افعال عادات واطوار پر نظر رکھیں اور ان کو محفوظ کر کے دوسروں کو پہنچائیں

ظاہر ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بھی انکی اس حرص حدیث کو محسوس فرما لیا تھا، جس سے انکی طرف توجہات خاصہ قلبیہ مبذول ہوئی ہونگی سب جانتے ہیں کہ آپ کی ایک لمحہ کی نظر کرم اور قلبی توجہ سے ولایت کے سارے مدارج طے ہو جاتے تھے۔ تو حضرت ابوہریرہؓ کو آپ کے دائمی مستقل التفات وصرف ہمت سے کتنا عظیم الشان فیض پہنچا ہوگا اور آپ ﷺ نے جب اپنی اس توجہ خاص والتفات کا اظہار فرمایا ہوگا تو حضرت ابوہریرہؓ کی خوشی ومسرت سے کیا حالت ہوئی ہوگی؟ **فما اسعدہ وما اشرفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ**

ظاہر حال سے استدلال

(۷) معلوم ہوا کہ کسی ظاہر دلیل حالت وکیفیت سے بھی احکام کا استنباط کر سکتے ہیں کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے گمان کو جو حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں حرص حدیث دیکھ کر قائم ہوا تھا، قوت دلیل کے سبب قطعی ویقینی قرار دیا۔

مسرت پر مسرت کا اضافہ

(۸) حضور اکرم ﷺ اگر صرف اتنا ہی فرما کر خاموش ہو جاتے کہ مجھے پہلے ہی گمان تھا کہ تم ہی سب سے پہلے اس سوال کو پیش کرو گے تو یہ بھی حضرت ابو ہریرہؓ کے لیے کم مسرت کی بات نہ تھی کہ سب صحابہ میں سے اولیت ان کو حاصل ہوئی، مگر آپ نے ان کی مسرت پر مسرت اور بھی یہ فرما کر بڑھا دی کہ تمہیں اولیت کا شرف محض اتفاقی طور سے حاصل نہیں ہو گیا بلکہ اس لیے حاصل ہونا ہی چاہیے کہ تم حدیث رسول حاصل کرنے پر بہت حریص ہو۔

غرض یہ کہ حضور ﷺ نے سبب اولیت کا اظہار فرما کر حضرت ابو ہریرہؓ کو مزید شرف اور ڈبل مسرت سے نواز دیا معلوم ہوا کہ کسی مسلمان کو خوش کرنے کے لیے اس کے صحیح اوصاف بیان کیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اس تعریف سے مخاطب کر کے کبر وغرور وغیرہ برائیوں میں مبتلا ہونے کا خدشہ نہ ہو جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کو اس امر کا اطمینان ہو گا دوسرے یہ کہ حضور ﷺ نے ان کی ذات کی تعریف نہیں فرمائی جس سے عجب وکبر کا خطرہ زیادہ ہوتا بلکہ ان کے عمل (حرص حدیث) کی مدح فرمائی، یہ نکتہ بھی مدح رجال کے سلسلہ میں یاد رکھنے کے لائق ہے۔

حدیث کی اصطلاح

(۹) معلوم ہوا کہ حدیث رسول کو "حدیث" کہنے کی اصطلاح خود رسول اکرم ﷺ کے ارشاد سے ثابت ہے

علم حدیث کی فضیلت

(۱۰) علم قرآن مجید کے بعد دوسرے تمام علوم میں سے علم حدیث کی فضیلت واضح ہوئی کیونکہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی حرص حدیث ہی کے سبب مدح وعظمت بیان کی اور بتلایا کہ وہی دوسروں کے مقابلہ میں حدیث الباب کے فوائد وحکم معلوم کرنے کے سب سے اول اور زیادہ احق ہیں۔

حکم کیساتھ دلیل کا ذکر

(۱۱) مستحب ہوا کہ کسی حکم وفیصلہ کے ساتھ اس کی دلیل وسبب کی طرف اشارہ کر دیا جائے جس طرح حضور اکرم ﷺ نے اولیت کے حکم کے ساتھ اس کی دلیل وسبب حرص حدیث کو بھی بیان فرمایا، حالانکہ حضور کا ارشاد بلا کسی دلیل وسبب کے بھی حجت تھا۔

صحابہ میں حرص حدیث کا فرق

(۱۲) یہ شبہ نہ کیا جائے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم تو سب ہی حریص علی الحدیث تھے بلکہ اس معاملہ میں ایک ایک سے بڑھ کر تھا پھر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اس وصف خاص سے کیوں نوازا گیا؟ وجہ یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ سب ہی اس شان سے موصوف تھے مگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے صرف اسی علم حدیث کے لیے اپنے سارے اوقات وقف کر دیئے تھے چنانچہ خود ہی فرمایا کہ "میرے بھائی انصار تو باغوں میں کام کرتے تھے، مہاجر بھائی تجارت میں لگے ہوئے تھے اور میرا کام صرف یہ تھا کہ کسی طرح بھی پیٹ بھر لیا اور حضور علیہ السلام کی خدمت میں ہمہ وقت حاضر رہا کرتا تھا، اسی لیے میں نے حضور علیہ السلام کی وہ باتیں بھی یاد کر لیں جو دوسروں نے یاد نہیں کیں۔"

عقیدہ توحید کا خلوص

(۱۳) حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ ایمان خالص ہونا چاہیے جس میں ذرہ برابر بھی کفر و شرک کا شائبہ نہ ہو خالص دل اور خالص جی سے حق تعالیٰ کی وحدانیت کا یقین جب ہی ہوسکتا ہے کہ کھلے وچھپے شرک اور ہر چھوٹی و بڑی بدعت وغیرہ سے پاک صاف ہو۔

ربنا یوفقنا کلنا لمایحبه ویر ضاه ویجعلنا

ممن یطیعه ویطیع رسوله الکریم

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین.

وهذا آخر الجزء الثالث

ویتلوه الرابع إن شاء الله تعالیٰ.

وبمنه و کرمه تتم الصالحات

بجنور ۹ ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ م ۱۲۹ گست ۱۹۶۳ء

انوار الباری ٦

اردو شرح

صحیح البخاری

تقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ثم الصلوات والتسلیمات والتحیات المبارکت علی النبی الامی الکریم. امابعد

''انوارالباری کی چھٹی جلد پیش ہے جس میں کتاب العلم ختم ہوکر کتاب الوضوشروع ہوتی ہے۔ والحمد للہ بعد علی ذلک اس جلد میں حسب وعدہ ''مراتب احکام'' کی نہایت مفید علمی بحث بھی پوری تفصیل کے ساتھ درج ہوگئی ہے۔ اور ہر حدیث کے تحت محققین اسلام کی مکمل تحقیقات اور بحث ونظر کے نتائج بھی بدستور پیش کئے جارہے ہیں، اس طرح کتاب کو جس معیار سے اول تا آخر مرتب کرنے کا تہیہ کر لیا گیا ہے حق تعالیٰ کی توفیق وتائید سے اسی کے مطابق کام ہوتے رہنے کی امید ہے، ناظرین اس امر سے بھی بخوبی واقف ہو چکے ہیں کہ کسی مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں جو اکابر امت کے اقوال وآراء پیش کئے جاتے ہیں وہ اس لئے نہیں کہ ان کی بلند پایہ شخصیتوں سے مرعوب کیا جائے، بلکہ صرف اس لئے کہ کتاب وسنت اور آثار سلف کی روشنی میں ان کو پرکھا جائے، اور جتنی بات حق وصواب ہو، اس کو لیا جائے اور اس ضمن میں موافق ومخالف یا اپنے وغیر کی رعایت نہ کی جائے۔

احکام ومسائل کی تحقیق میں جب کہ ہم ائمہ مجتہدین کے اقوال کی جانچ مذکورہ اصول پر کرتے ہیں، تو بعد کے حضرات تو بہر حال ان سے مرتبہ علم وفضل میں بہت کم ہیں، ان کی بات نقد وجانچ کے اصول سے برتر کیونکر سمجھی جاسکتی ہے، مگر اس دور جہالت ومداہنت میں تو وہ علماء حال بھی تنقید برداشت کرنے کو تیار نہیں، جن کا علم وفضل، تقویٰ وسعت مطالعہ وغیرہ علماء متقدمین کے مقابلہ میں ہیچ درہیچ ہے، دوسری بڑی غلطی وخرابی یہ ہے کہ ذوات وشخصیات کو معیار حق وصواب سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ معیاری درجہ کسی وقت بھی کتاب وسنت اور آثار صحابہ یا اجماع وقیاس شرعی کے سوا کسی ذات وشخصیت کو نہیں دیا جاسکتا، یعنی بڑی سے بڑی شخصیت کے بارے میں بھی یہ فیصلہ شدہ بات ہے کہ اس کے اقوال وآراء کو مذکورہ بالا اصول مسلمہ کی کسوٹی پر پرکھیں گے، اور جتنی بات ان سے مطابق ہوگی اس کو اختیار کریں گے اور باقی کو چھوڑ دیں گے اگر ایسا نہیں کریں گے تو ہم کتاب وسنت وغیرہ سے دور ہوجائیں گے ونسأل اللہ التوفیق لما یحب و یرضی۔

ہم حضرت شاہ صاحب کا طرز تحقیق ذکر کر چکے ہیں کہ وہ حدیث سے فقہ کی طرف چلنے کو صحیح اور فقہ سے حدیث کی طرف جانے کو غلط فرمایا کرتے تھے، جب ائمہ مجتہدین کی عظیم المرتبت فقہ کا بھی یہ مرتبہ نہیں کہ اس کو پہلے طے شدہ سمجھ کر حدیث کو اس کے مطابق کرنے کی سعی کی جائے، تو دوسروں کے اقوال وآراء کو بلا دلیل شرعی واستناد کتاب وسنت کیسے قبول کر سکتے ہیں، البتہ کتاب وسنت، اجماع وقیاس شرعی، اور آثار سلف سے جو چیز بھی مستند ہوگی وہ بسر وچشم قبول ہوگی، ہم خدا کے فضل وکرم سے اسی اصول پر انوار الباری کو مرتب کررہے ہیں، اس

بارے میں ہمیں نہ لومت لائم کی پرواہ ہے نہ مدح وستائش کی حاجت، کلمۂ حق کہا ہے، اور آئندہ بھی کہیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ، اور اگر کسی بات کی غلطی ظاہر ہوگی تو اس سے رجوع میں بھی تامل نہ ہوگا ہم سمجھتے ہیں کہ ''مسلک حق'' پیش کرنے کی یہی ایک صورت ہے

من آنچہ شرط بلاغ است باتو مے گویم　　　تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

ضروری گزارش: ناظرین انوارالباری میں سے جو حضرات کتاب کے بارے میں ہمت افزائی فرما رہے ہیں اور جو حضرات اپنی مخلصانہ دعاؤں اور مفید مشوروں سے میری مدد فرما رہے ہیں، ان سب کا نہایت ممنون ہوں، لیکن بہت سے حضرات کو بے صبری اور شکوہ ہے کہ کتاب کی جلدیں بہت تاخیر سے شائع ہورہی ہیں، ان کی خدمت میں عاجزانہ التماس ہے کہ ہماری مشکلات کا لحاظ فرمائیں، اول تو تالیف کا مرحلہ ہے، ساری کتابیں دیکھ کر ان سے مضامین کا انتخاب کرنا، اپنے اکابرواساتذہ خصوصاً حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے گرامی کو وضاحت ودلائل کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے، شب وروز اسی کام میں لگا رہتا ہوں، سارے اسفار اور دوسرے مشاغل ترک کردیئے ہیں، پھر بھی کام آسان نہیں جو کچھ ہورہا ہے صرف خدا کے فضل وتوفیق سے ہورہا ہے اور ناظرین کی دعوات وتوجہات کا ثمرہ ہے، اس کے بعد کتابت کا مرحلہ ہے کہ ایک جلد کی دو سو صفحات کی کتابت میں تین ماہ سے کم صرف نہیں ہوتے، آگے طباعت کے مراحل ہیں جن میں مالی مشکلات بھی حائل ہوتی ہیں، خصوصاً اس لئے بھی کہ زیادہ خریدار پاکستان میں ہیں جہاں سے رقوم کی آمد ممنوع ہے، غرض ایک جلد کی تیاری میں تین چار ماہ کی مدت ضرور لگ جاتی ہے، **ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا.**

مکتبہ کا کام اگرچہ اپنی نگرانی وذمہ داری میں ہے، مگر قحط الرجال کہ صحیح کام کرنے والے کمیاب ہیں، تاہم اب کئی ردوبدل کے بعد اب جو صاحب انچارج ہیں وہ بسا غنیمت ہیں اور توقع ہے کہ آئندہ انتظامی امور کے بارے میں شکایات بہت کم ہوجائیں گی۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز.**

انوارالباری کی اشاعت کا پروگرام اگرچہ سہ ماہی ہے، مگر موانع ومشکلات کے سبب دیر سویر ہوتی ہے اور سردست کوشش کی جارہی ہے کہ ایک سال میں تین یا چار حصے ضرور نکل جایا کریں پھر اس سے زیادہ کی بھی توقع ہے ان شاء اللہ تعالیٰ

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید　　　دیگراں نیز کنند آنچہ مسیحا مے کرد

ارباب علم سے درخواست

اہل علم خصوصاً تلامذہ حضرت علامہ کشمیری اور بالخصوص ان حضرات سے جو تالیف یا درس ومطالعہ حدیث کا اشتغال رکھتے ہیں، گزارش ہے کہ ''انوارالباری'' کا مطالعہ فرما کر اپنے گرانقدر مشوروں اور ضروری اصلاحات سے مطلع فرماتے رہیں تاکہ ان کے افادات سے کتاب کی تکمیل ہوسکے، اور وہ بھی اس علمی خدمت میں میرے شریک ومعاون بن کر ماجور ومشکور ہوں، اسی طرح میں ان کی خصوصی توجہات و دعوات صالحہ کا بھی متمنی ہوں۔ **ولھم الاجر والمنہ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین رحمتہ للعالمین الف الف مرۃ** — احقر

سید احمد رضا۔ عفا اللہ عنہ　　بجنور، ۵ شعبان المعظم ۸۴ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بَابُ كَيْفَ يُقْبَضُ الْعِلْمُ وَ كَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اِلٰى اَبِىْ بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ اُنْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيْثِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاكْتُبْهُ فَاِنِّىْ خِفْتُ دُرُوْسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَآءِ وَلَا تَقْبَلْ اِلَّا حَدِيْثَ النَّبِىِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلْيُفْشُوا الْعِلْمَ وَلْيَجْلِسُوْا حَتّٰى يُعَلَّمَ مَنْ لَّا يَعْلَمُ فَاِنَّ الْعِلْمَ لَا يَهْلِكُ حَتّٰى يَكُوْنَ سِرًّا.

علم کس طرح اٹھالیا جائے گا؟

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی جتنی حدیثیں بھی ہوں ان پر نظر کرو اور انہیں لکھ لو، کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی کی حدیث قبول نہ کرو، اور لوگوں کو چاہیے کہ علم پھیلائیں اور اس کی اشاعت کے لئے کھلی مجلسوں میں بیٹھیں تاکہ جاہل بھی جان لے، اور علم چھپانے ہی سے ضائع ہوتا ہے۔

(۹۹) حَدَّثَنَا الْعَلَآءُ بْنُ عَبْدِ الْجَبَّارِ حَدَّثَنَا عَبْدُالْعَزِيْزِ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِيْنَارٍ بِذٰلِكَ يَعْنِىْ حَدِيْثَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِيْزِ اِلٰى قَوْلِهٖ ذَهَابَ الْعُلَمَآءِ.

ترجمہ: ہم سے علا بن عبدالجبار نے بیان کیا، ان سے عبدالعزیز بن مسلم نے عبداللہ بن دینار کے واسطے سے اس کو بیان کیا یعنی عمر بن عبدالعزیز کی حدیث ذہاب العلماء تک:۔

تشریح: حضرت ابوبکر بن حزم قاضی مدینہ تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کو حدیث وآثار صحابہ جمع کرنے کا حکم فرمایا تھا، ایک روایت میں ہے کہ کچھ تم اپنے پاس سے جمع کر سکو، جمع کرو، جس کا مطلب حافظ عینیؒ نے لکھا کہ تمہارے شہر میں جو روایت وآثار بھی لوگوں سے مل سکیں، ان سب کو جمع کر لو! حافظ عینی نے لکھا کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تدوین حدیث کی ابتداء حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں ہوئی، اور اس سے پہلے لوگ اپنے حافظے پر اعتماد کرتے تھے، حضرت موصوف کو (جو پہلی صدی کے شروع میں تھے) علماء کی وفات کے سبب علم کے اٹھ جانے کا خوف ہوا، تو آپ نے حدیث وآثار جمع کرنے کا اہتمام فرمایا تاکہ انکو ضبط کر لیا جائے اور وہ باقی ومحفوظ رہیں۔

حافظ عینی نے لکھا کہ:۔ **و لیفشوا** ۔ افشاء سے ہے اور **و لیجلسوا** جلوس سے ہے۔ **حدثنا العلآء** پر حافظ عینیؒ نے لکھا کہ علاء نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا کلام صرف ذہاب علماء تک روایت کیا پھر اس کے یہ بعد **و لا تقبل الاحدیث النبی** ﷺ (کہ سوائے حدیث ﷺ کے اور کوئی چیز قبول نہ کی جائے الخ) ہوسکتا ہے کہ یہ بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہی کا کلام ہو اور علاء کی روایت میں نہ ہو اور یہ بھی محتمل ہے کہ سرے سے یہ ان کا کلام ہی نہ ہو، اور یہی زیادہ ظاہر ہے، جس کی تصریح ابو نعیم نے بھی مستخرج میں کی ہے۔

اس صورت میں یہ امام بخاری کا کلام ہوگا، جس کو انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے کلام کے بعد زیادہ کیا، پھر حافظ عینیؒ نے شیخ قطب الدین بن عبدالکریم کے سلسلہ اجازت سے بھی اسی طرح علاء کی روایت وذہاب العلماء تک ہی نقل کی۔ (عمدۃ القاری ص ۵۲۷ ج ۱)

ہم نے تدوین حدیث کی بحث کرتے ہوئے مقدمہ انوار الباری ص۲۳ ج ۱، ص۲۴ ج۱ میں امام بخاریؒ کی اس حدیث کا ذکر کر کے دوسرے قرائن ذکر کئے تھے، جن سے یہ زیادتی امام بخاری ہی کی ظاہر ہوتی ہے، واللہ علم وعلمہ اتم

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ دروس کے معنی تدریجاً فنا ہونے کے ہیں (یعنی پرانا پن پیدا ہو کر رفتہ رفتہ کسی چیز کا ختم ہونا) پھر فرمایا کہ جس چیز پر بھی زمانے کے حوادث گزرتے ہیں وہ مندرس ہوتی رہتی ہے، یعنی تدریجی طور سے پرانی ہوتے ہوتے فنا کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے، اجسام بھی اسی لئے فنا ہوتے ہیں کہ ان پر زمانہ گزرتا ہے، اسی لئے حق تعالیٰ جل ذکرہ چونکہ زمانہ اور اس کے حوادث سے بلند اور وراء الوراء ہے وہاں اندراس یا مٹنے وفنا ہونے کا شائبہ ووہم بھی نہیں کیا جاسکتا۔

آپ نے فرمایا کہ سب سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہی نے پوری طرح آمادہ وتیار ہو کر جمع علم کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ رحمه الله رحمته واسعة وجزى الله عنا و عن سائر الامة خير الجزاء

(۱۰۰) حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ بْنُ اَبِیْ اُوَيْسٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ مَالِکٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا يَّنْتَزِعُهٗ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰكِنْ يَّقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى اِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمٌ اِتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا قَالَ الْفِرَبْرِی نَا عَبَّاسٌ قَالَ ثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا جَرِيْرٌ عَنْ هِشَامٍ نَحْوَهٗ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے نقل ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ اللہ علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اس کو بندوں سے چھین لے لیکن اللہ تعالیٰ علماء کو موت دے کر علم کو اٹھالے گا حتیٰ کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا، لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، ان سے سوالات کئے جائیں گے اور وہ علم کے بغیر جواب دیں گے، تو خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے فربری (راوی بخاری) نے کہا کہ اس حدیث کو اس طرح ہم سے عباس نے عن قتیبۃ عن جریر عن ہشام سے روایت کیا ہے۔

تشریح: "ینتزعه مِنَ العباد" پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا مقصد یہ ہے کہ دلوں میں حاصل شدہ علم کو سلب نہیں کریں گے، اور اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ ابتدائی صورت رفع علم کی ہے پھر آخر زمانے میں ایسا بھی ہوگا کہ ایک رات کے اندر سب علماء کے دلوں سے علم کو نکال لیا جائے گا، جس کا ذکر حدیث ابن ماجہ میں ہے۔

"اتخذ الناس روسا جهالا" جس طرح حدیث الباب کے پہلے جملے کے مطابق ہم اپنے زمانے میں دیکھ رہے ہیں کہ علم صحیح کا نور وروشنی کم ہوتی جارہی ہے اور کم علمی وکج فہمی بڑھ رہی ہے، ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کیسے کیسے علم کے پہاڑ اور بحر زخار اٹھ گئے، اور ان کے خلف میں ان کا سوواں ہزارواں بھی علم کا حصہ نہیں ہے، علماء آخرت کی جگہ علماء دنیا لیتے جارہے ہیں، اس وقت بکثرت علماء ایسے ملیں گے جو اپنے تھوڑے پر مغرور اور بڑے بڑے القاب وخطابات کے متمنی ہیں، واعظ عوام کو خوش کرنے اور ان سے رقمیں بٹورنے کے لئے بے سند باتیں کہیں گے، مصنف بے تحقیق چیزیں، اور چلتے ہوئے نکات ولطائف لکھنے پر فخر کریں گے، الا ماشاءاللہ

یہ سب قبض علم، رفع علم، اور تدریجی طور سے دروس علم کے آثار ہیں، ان آثار کو سب ہی ہر زمانے میں دیکھتے محسوس کرتے رہے، مگر جس تیز رفتاری سے یہ انحطاط ہمارے زمانے میں ہوا ہے، اور ہو رہا ہے اس کی نظیر دور سابق میں نہیں ملتی، علم دین کی وقعت وعزت خود علماء و

مشائخ کے دلوں میں وہ نہیں جو چالیس سال قبل تھی۔

حد ہے کہ اس زمانے میں بعض اونچی پوزیشن کے عالم اپنی صاحبزادیوں کو بی اے اور ایم اے کرا رہے ہیں اور ان کے رشتوں کے لئے بھی بی اے، ایم اے لڑکوں کی تلاش ہے کیا چالیس سال قبل اس صورت حال کا تصور بھی کیا جا سکتا تھا؟ اور کیا ہمارے اساتذہ واکابر بھی اس بات کو گوارا کر سکتے تھے؟ اور جب علماء ہی ماحول کے اثرات قبول کرنے لگیں تو دوسروں کی صلاح فلاح کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ پھر سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ علماء امت کا فریضہ منصبی ہے کہ دوسروں کی اصلاح حال کریں، لیکن جب خود ان ہی میں کوئی بگاڑ پیدا ہو تو ان کی اصلاح کون کرے؟ دوسرے مداہنت کا مرض بھی عام ہوتا جا رہا ہے، کسی بڑی آدمی سے کوئی غلطی ہو جائے تو کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ اس کو روک ٹوک سکے، الا ماشاء اللہ، ہمارے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ قیام ڈابھیل کے زمانہ میں فرمایا کرتے تھے کہ ''اس زمانہ میں کلمہ حق کہنا بہت مشکل ہو گیا ہے، ہم نے صرف ایک کلمہ حق کہا تھا تو اس کی وجہ سے آج آٹھ سو میل دور پھینک دیئے گئے۔''

''خدا رحمت کند آں بندگان پاک طینت را''

بحث ونظر

''قال الفربری الخ'' پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ عبارت امام بخاری کی نہیں ہے بلکہ فربری تلمیذ وراوی بخاری کی ہے، اور یہ اسناد ان کے پاس بخاری کی اسناد کے علاوہ ہے، جس کو یہاں ذکر کیا ہے اور اسی طرح دوسرے بہت سے مواضع میں بھی جہاں ان کے پاس دوسری اسانید ہوتی ہیں تو ان کو ذکر کرتے رہتے ہیں اس موقع پر حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ ''یہ راوی بخاری (فربری) کی زیادات میں سے ہے اور ایسی زیادات کم ہیں'' (فتح الباری ص۱۴۱ ج۱)

کمی وبیشی نسبی امور میں سے ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک چیز ایک کی نظر میں زیادہ اور دوسرے کی نظر میں کم ہو، واللہ علم

قال الفربری ثنا عباس، حافظ عینی نے وضاحت کی کہ یہ عباس بن الفضل بن زکریا الہروی ابو منصور البصری ہیں جن کی وفات ۳۲۷ھ میں ہوئی ہے، قتیبہ بن سعید مشائخ بخاری میں سے ہیں، جریر بن عبدالحمید الضبی ابو عبداللہ الرازی ثم الکوفی رواۃ جماعہ میں سے ہیں، ہشام حضرت عروۃ بن الزبیر بن العوام کے صاحبزادے ہیں، نحوہ سے مراد مثل حدیث مالک ہے، اور یہ روایت فربری عن قتیبہ عن جریر عن ہشام مسلم میں ہے۔ (عمدۃ القاری ص۵۳۰ ج۱)

بَابٌ هَلْ يُجْعَلُ لِلنِّسَآءِ يَوْمٌ عَلٰى حِدَةٍ فِى الْعِلْمِ

کیا عورتوں کی تعلیم کے لئے کوئی خاص دن مقرر کیا جائے

(۱۰۱) حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنِى ابْنُ الْاَصْبَهَانِيِّ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا صَالِحٍ ذِكْوَانَ يُحَدِّثُ عَنْ اَبِى سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ النِّسَآءُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَلَبَنَا عَلَيْكَ الرِّجَالُ فَاجْعَلْ لَّنَا يَوْمًا مِّنْ نَفْسِكَ فَوَعَدَهُنَّ يَوْمًا لَّقِيَهُنَّ فِيهِ فَوَعَظَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ فَكَانَ فِيْمَا قَالَ لَهُنَّ مَا مِنْكُنَّ اِمْرَاَةٌ تُقَدِّمُ ثَلٰثَةً مِّنْ وَّلَدِهَا اِلَّا كَانَ لَهَا حِجَابًا مِّنَ النَّارِ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ وَّ اثْنَيْنِ ؟ فَقَالَ وَ اثْنَيْنِ.

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ عورتوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا (آپ ﷺ سے مستفید ہونے میں) مرد ہم سے بڑھ گئے اس لئے آپ ﷺ اپنی طرف سے ہمارے لئے بھی کوئی دن مقرر فرمادیں، تو آپ ﷺ نے ان سے ایک دن کا وعدہ کرلیا اور اس دن انہیں نصیحت فرمائی، انہیں مناسب احکام دیئے جو کچھ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا تھا ان میں یہ بھی تھا کہ جو کوئی عورت تم میں سے اپنے تین لڑکے آگے بھیج دے گی تو وہ اس کے لئے دوزخ کی آڑ بن جائیں گے، اس پر ایک عورت نے کہا اگر دو لڑکے بھیج دیئے آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! دو بھی (اسی حکم میں ہیں)

(۱۰۲) حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ ثَنَا غُنْدُرٌ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ الْاَصْبَهَانِيِّ عَنْ ذَكْوَانَ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهٰذَا وَ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْاَصْبَهَانِيِّ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا حَازِمٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ ثَلٰثَةٌ لَّمْ يَبْلُغُوا الْحِنْثَ.

ترجمہ: ابوسعید رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت کرتے ہیں، اور (دوسری سند میں) عبدالرحمٰن بن الاصبہانی سے روایت ہے کہ میں نے ابو حازم سے سنا، وہ ابوہریرہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ایسے تین لڑکے جو ابھی بلوغ کو نہ پہنچے ہوں

تشریح: مردوں کو چونکہ علم دین حاصل کرنے کے مواقع بکثرت حاصل تھے اس لئے عورتوں کو اپنی محرومی کا رنج و ملال ہوا اور انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں بے تکلف عرض کردیا کہ مردوں نے ہمیں بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے، وہ علوم نبوت سے ہر وقت فیض یاب ہو رہے ہیں اور ہمیں یہ سعادت نصیب نہیں، کم از کم ایک دن ہمارے لئے بھی مقرر فرمایئے! تاکہ ہم بھی استفادہ کرسکیں۔

رحمت دو عالم ﷺ نے عورتوں کی اس درخواست کو بڑی خوشی سے قبول فرمالیا اور ان کے لئے دن مقرر فرما کر تعلیم دین اور وعظ و نصیحت کا وعدہ فرمالیا پھر اسی کے مطابق عمل فرمایا۔

ان کو وعظ و تذکیر کی، اوامر خداوندی کی تلقین فرمائی، اور خاص طور سے ان کو صبر و شکر کی تعلیم فرمائی کیونکہ وہ طبعی طور پر صدمات کا اثر زیادہ لیتی ہیں اور بے صبری اور ناشکری کا اظہار کر بیٹھتی ہیں جو حق تعالیٰ کو کسی طرح پسند نہیں، دنیا میں اولاد کی موت کا صدمہ سب سے زیادہ دل شکن اور صبر آزما ہوتا ہے، بہت سے مرد بھی اس امتحان میں پورے نہیں اترتے، چہ جائیکہ عورتیں، جو خلقی طور پر بھی نازک طبع، ضعیف القلب و مایوس المزاج ہوتی ہیں، پھر جس قدر زیادہ مصیبت، مشقت و غیر معمولی تکالیف جھیل کر وہ اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہیں، وہ بھی ان کے قلبی تعلق و محبت میں صد گونہ اضافہ کردیتی ہیں، ایسی حالت میں ماں کے لئے بچے کی موت بہت ہی سخت اور صبر آزما امتحان ہوتا ہے، اس لئے اس امتحان میں اگر کوئی خدا کی محبوب بندی پوری اترتی ہے تو حق تعالیٰ کی رحمت خاصہ متوجہ ہو جاتی ہے، جس کی ترجمانی رحمت دو عالم ﷺ نے اس طرح فرمائی کہ جس عورت کے تین بچے چھوٹی عمر میں مر جائیں تو وہ اس کے لئے دوزخ سے آڑ بن جائیں گے، ماں کی بد اعمالیاں اس کو دوزخ کی طرف لے جانا چاہتی ہیں، مگر اس کے چھوٹے معصوم بچے خدا کی رحمت خاصہ سے ایک نہایت طاقتور سد سکندری بن کر درمیان میں کھڑے ہو جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہماری موت پر ہماری ماں نے شریعت محمدیہ کے مطابق صبر جمیل کیا تھا، جس کی جزا حق تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی زبانی دوزخ سے نجات قرار دی تھی اس لئے یہ دوزخ میں نہیں جاسکتی، حافظ عینیؒ وغیرہ محدثین نے لکھا کہ یہ فضیلت صرف ماؤں کے لئے نہیں ہے بلکہ باپ بھی اس سے نوازے جائیں گے۔ مگر ماؤں کا ذکر اس لئے ہوا کہ ان پر صبر زیادہ شاق ہوتا

ہے اور نسبۃً ان کے صبر کی قیمت بلند و بالا ہے، پھر اسی حدیث میں ہے کہ کسی عورت نے حضور علیہ السلام سے سوال کیا کہ دو بچے مر جائیں تو ان کے لئے کیا ارشاد ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کا بھی یہی حکم ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حافظ ابن حجرؒ نے ثابت کیا ہے کہ ایک بچہ کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ اجماعی مسئلہ ہی مفہوم عدد کا اعتبار نہیں ہوا کرتا، نہ وہ مدار حکم ہوا کرتا ہے، متکلم کے ذہن میں کوئی خاص صورت واقعہ ہوتی ہے، جس کے لحاظ کسی عدد کا ذکر کر دیتا ہے، پھر فرمایا کہ حدیث میں ایک قید ''عدم بلوغت حنث'' کی بھی آئی ہے، حنث کے معنی ناشایاں کام کے ہیں اور اس سے مراد بلوغ ہوا کرتا ہے یعنی وہ بچے سن بلوغ سے قبل فوت ہوئے ہوں،

لیکن اجر و فضیلت بالغ بچوں کے فوت ہونے پر صبر کرنے کی بھی یہی ہے، فرق اتنا ہے کہ نابالغ بچے اپنی عصمت و شفاعت عنداللہ سے والدین کو نفع پہنچائیں گے اور بالغ اس طرح کے ان کی موت کا صدمہ و غم اور بھی زیادہ ہوگا جس پر صبر کا صلہ بڑھ جائیگا۔

بحث و نظر

حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو دینی تعلیم اور وعظ و نصیحت کی طرف بھی خاص توجہ کی ضرورت ہے تا کہ مردوں کی طرح وہ بھی خالق کائنات کو پہچانیں اس کے احکام پر چلیں اور منشاء تخلیق کو سمجھیں جس طرح آنحضرت علیہ السلام کی صحابیات رضی اللہ عنہن نے کیا۔

علوم نبوت سے جس طرح صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین بہرہ مند ہوئے تھے صحابی عورتیں بھی ان سے مستفید ہوئی تھیں تخلق باخلاق اللہ اور تخلق باخلاق الرسول جس طرح اس دور کے مردوں کا مقصد زندگی تھا عورتوں کا بھی تھا سارے مقدس دور رسالت میں اس امر کا ثبوت نہیں ملتا کہ عورتوں نے دنیوی ترقی میں مردوں جیسا بننے کی حرص ہو یا اس میں پسماندگی پر افسوس کیا ہو جبکہ دینی ترقی میں ہمسری کے لیے انہوں نے بار بار اپنی خواہشات کا اظہار فرمایا ابھی حدیث الباب میں آپ نے پڑھا کہ عورتیں علم دین اور علوم نبوت سے مردوں کی طرح ہمہ وقتی مستفید نہ ہو سکنے کی روحانی و قلبی اذیت اور رنج و غم کی تکلیف کا اظہار دربار رسالت میں کر رہی ہیں اور برملا کہہ رہی ہیں اس نیک رجحان کو نہ حضور علیہ السلام نے برا سمجھا نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے، بلکہ حضور علیہ السلام نے ان کی درخواست کو فوراً ہی قبول فرما کر اس پر عمل بھی شروع فرما دیا، ایک دفعہ عورتوں کی طرف سے حضرت اسماء وکیل ہو کر حاضر خدمت ہوتی ہیں اور عرض کرتی ہیں یا رسول اللہ علیہ السلام! مردوں نے تو دین کا بہت بڑا حصہ حاصل کر لیا جس سے ہم عورتیں محروم ہیں وہ جمعہ اور جماعات کا ثواب عظیم حاصل کرتے ہیں، وہ میدان جہاد کا رخ کرتے ہیں تو جنت ان کے قدموں تلے آجاتی ہے ہر ہر قدم پر اجر و ثواب کی گھڑیاں باندھتے ہیں اور ہم عورت ذات ہیں کہ گھروں میں گڑی پڑی ہیں مذکورہ بالا سعادتوں میں ہمارا حصہ کیوں نہیں؟

رحمت دو عالم علیہ السلام نے فرمایا: اسماء! تم نے عورتوں کی طرف سے وکالت کا واقعی حق ادا کر دیا انکے دلوں کی بڑی اچھی ترجمانی کی اب اس کا جواب سنو اور اپنی بہنوں کو پہنچاؤ، تمہیں شریعت کے مطابق اپنے گھروں کے اندر رہ کر تمام گھریلو معاملات کی دیکھ بھال نگرانی و سرداری کرنا بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کر کے آگے بڑھا دینا، اپنے شوہروں کی اطاعت کرنا انکی جان و مال اور متعلقات میں حاضر و غائب و امانت و خیر خواہی کے جذبہ سے تصرفات کرنا اور فرائض و واجبات کی ادائیگی گھروں کے اندر ہی رہتے ہوئے کرنا آخرت کے اجر و ثواب اور ترقی درجات کے لحاظ سے تمہیں مردوں کے برابر ہی کر دے گا۔ او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم

روایت میں ہے کہ حضرت اسماء یہ جواب سن کر بہت خوش خوش لوٹ گئیں اور تمام صحابیات بھی اس جواب سے مطمئن و خوش ہو کر اپنا

دین ودنیا سنوارنے میں لگ گئیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مرد جتنے بھی دینی اور دنیوی فضائل وکمالات حاصل کرتے ہیں عورتوں کا اس میں عظیم الشان حصہ ہے اور وہ اپنی گھریلو اور عائلی خدمات پر بجا طور سے فخر وناز کرسکتی ہیں مگر دنیا کے عقلمند بے وقوفوں نے ان کو احساس کمتری کا شکار بنا کر غلط لائنوں پر لے جانے کی سعی کی ہے چنانچہ یہ تو آج تک بھی یورپ امریکہ وروس میں نہ ہوسکا کہ عورتوں کو عام طور سے مردوں کی طرح سیادت وحکمرانی حاصل ہوگئی ہو البتہ وہ گھروں سے باہر ہوکر غیر مردوں کی جنسی خواہشات ورجحانات کا مرکز توجہ اور بہت سے شیطان صفت انسانوں کی آلہ کار وبن گئیں جس سے بچنے کے لیے حضور اکرم علیہ السلام نے **لا یر اھن الرجال** فرمایا تھا کہ عورتوں کے لیے سب سے زیادہ بہتر پوزیشن یہ ہے کہ ان پر مردوں کی نظریں ہرگز نہ پڑیں''

عورتوں کا مرتبہ شریعت حقہ محمدیہ نے کس قدر بلند کیا تھا کہ بڑے سے بڑے مرد کی جنت ماں کے قدموں تلے بتلائی تھی اور آج وہ نہایت مقدس جنس لطیف وشریف بازاری دکانوں پر فروخت ہونیوالی چیزوں کے مرتبہ میں لائی جارہی ہے۔ جس طرح بازار میں نئے نئے فیشن کی حسین وخوبصورت چیزیں فروخت ہونے کے لیے دوکانوں پر سجائی جاتی ہیں۔ کہ ہر دیکھنے والے کے لیے جاذب توجہ ہوں کیا اسی طرح فیشن اور بناؤ سنگار کر کے سڑکوں اور بازاروں پر نکلنے والی نوجوان لڑکیوں پر مردوں کی للچائی ہوئی نظریں نہیں پڑتیں؟ جن سے بچانے کے لیے سرور دوعالم علیہ السلام نے وحی الٰہی کی روشنی میں **لا یر اھن الرجال** فرمایا تھا، میں یہ نہیں کہتا کہ سب مرد برے ہیں یا سب عورتیں نمائش حسن ہی کے لیے نکلتی ہیں مگر نیتیوں پر کوئی فیصلہ نہیں ہوا کرتا آج بازاروں اور عام گزرگاہوں سے گزرنا دشوار ہوگیا ہے عورتوں کو مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے میں کوئی حیا مانع نہیں ہے اکبر آلہ آبادی تو عورتوں کے روز افزوں بے حجابی کے رجحانات سے گھبرا کر یہ فیصلہ بھی کرچکے تھے کہ پردہ اٹھے گا تو ساتھ ہی تقوی بھی سر پر پاؤں رکھ کر رخصت ہوجائے گا مگر حق تعالیٰ نے تو ہر بیماری کا علاج اتارا ہے دنیا میں جہاں اس نے شر زیادہ اور خیر کم رکھی ہے۔ حسن کے کم اور بدصورتی کے نمونے زیادہ دکھائے ہیں، اب یہ پابندی تو نہیں لگائی جاسکتی کہ بدصورت باہر نہ نکلیں اور صرف حسین وجمیل ہی نمائش حسن کریں سب کو برابر کا حق ملنا چاہیے تا کہ حق اور انصاف کا خون نہ ہو۔ پھر فرض کیجئے کہ خلاف شریعت بن ٹھن کر بے ضرورت وبے حجاب ہوکر باہر نکلنے والی دس بارہ فیصدی واقعی طور سے ملکہ حسن وجمال ہیں اور حسب ارشاد نبوی علیہ السلام شیطان صاحب بھی انکو خوب سر اٹھا اٹھا کر خوش ہوکر دیکھتے ہیں کہ مردوں کی خانماں خرابی کے لیے بڑا اچھا ذریعہ ہاتھ آرہا ہے اور انسانوں سے عداوت نکالنے کا زریں موقع مل رہا ہے مگر ان ہی شریعت حقہ اور گھروں سے بغاوت کرنے والیوں میں ۸۸۔۹۰ فی صدی ایسی ملکہ بدصورتی بھی تو ہوتی ہیں جن کے بارے میں بہت سے آزاد خیال مرد بھی دل میں یہی کہتے ہوں گے کہ ان کے لیے گھریلو مصروفیات ہی زیادہ اچھی ہیں۔

اسکے بعد سب سے اہم مسئلہ تعلیم نسواں کا آجاتا ہے جس کی آڑ میں عورتوں کی بے حجابی وغیرہ کو وجہ جواز عطا کی جاتی ہے۔

تعلیم نسواں کے بارے میں ہم پہلے بھی کچھ لکھ آئے ہیں۔ اور یہاں بھی کچھ لکھتے ہیں علماء اسلام کا فیصلہ ہے کہ'' دنیا قضاء ضروریات کے لیے ہے اور آخرت قضاء مرغوبات ومشتہیات کے لیے ہوگی'' (کما ذکرہ فی البدائع)

اس لیے دنیا کی مختصر زندگی کو اسی کے مطابق مختصر مشاغل میں صرف کرنا ہے اب اگر ہم دین کی ضروری تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ دنیوی تعلیم بھی حاصل کرسکیں تو اس کو نہ کوئی عالم دین ممنوع کہتا ہے نہ عالم دنیا شرط اسلامی نقطہ نظر سے یہ ضرور ہوگی کہ دین کے عقائد وفرائض وواجبات اور حلال وحرام کا علم حاصل کرنا تو ہر مرد وعورت پر فرض وواجب ہے اس سے کوئی مستثنی نہیں اسکے بعد مسلمان بچے اور بچیاں اگر عصر

ی تعلیم اور ماحول کے برے اثرات سے متاثر ہوں تو ان سے بچنے کے لیے ان افراد کو مزید علوم نبوی (قرآن وحدیث) کی تحصیل بھی فرض ضروری ہوگی۔ تاکہ وہ اپنے ایمان و اعمال کو سلامت رکھ سکیں۔

اسکے بعد مکمل علوم اسلامی کی تحصیل کا درجہ ہے جو بطور فرض کفایہ اتنے مردوں اور عورتوں پر لاگو ہوتا ہے جن سے باقی مسلمان مردوں اور عورتوں کی دینی اصلاح ہوسکے، اگر اتنے لوگ اس فرض کفایہ کی طرف توجہ نہیں کریں گے تو سارے مسلمان مرد و عورت ترک فرض کے گنہگار ہونگے۔

یہ بھی دور رسالت اور قرون مشہود لہا بالخیر ہی سے ثابت ہے کہ عورتوں کی دینی تعلیم و اصلاح کا کام زیادہ تر خود عالم دین عورتوں ہی کے ذریعہ عمل میں آیا اس لیے ضرورت ہے کہ اس سنت کو بھی زندہ کیا جائے جس کی بہتر صورت یہ ہے کہ علماء اپنی بچیوں کو مکمل طور پر اسلامی علوم خود گھر پر پڑھائیں اور اس طرح یہ سلسلہ جاری ہو کر چند ہی سال میں خاطر خواہ ترقی کرسکتا ہے۔ اور جو عورتیں مذہبی وعصری تعلیم کی جامع ہونگی وہ نو تعلیم یافتہ عورتوں کی دینی اصلاح کی بہت بڑی خدمات انجام دے سکتی ہیں اور کچھ قدرتی طور پر عورتوں کی اچھائی برائی کا اثر زیادہ ہوتا ہے، کچھ دنوں کی بات ہے کہ ملایا کے وزیر اعظم ٹنکو عبدالرحمٰن ایک اسلامی ملک میں گئے تو ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں ایک بڑے شہر کی نو تعلیم یافتہ مسلم خواتین نے ان کے استقبال و اعزاز میں رقص و سرور کی مجلس منعقد کی اور انکے سامنے کالج کی لڑکیوں نے اپنے سیکھے ہوئے فنون لطیفہ کے ہنر دکھلائے یعنی وہی ناچ گانے ڈرامے وغیرہ جو اس دور ترقی کی مایہ ناز باتیں گنی جاتیں ہیں وزیر اعظم موصوف کی اہلیہ محترمہ نے ایک مشہور عالم اسلامی مملکت کی مسلمان خواتین کی ان ترقیات سے کیا کچھ اثرات لیے ہونگے اسکا تو علم نہیں ہوسکا تاہم اتنی خبر اخبار میں شائع ہوئی کہ مجلس مذکورہ کی سربراہ خواتین نے آخر میں بیگم وزیر اعظم موصوف سے بھی درخواست کی کہ آپ بھی کچھ دکھائیں سنائیں تو موصوفہ نے قرآن مجید کا ایک رکوع تلاوت فرما کر کہا کہ مجھے تو صرف یہی آتا ہے۔ جس پر ان مسلم خواتین کو بڑی ندامت ہوئی اور سلیم الفطرت خواتین کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا۔

عورتوں کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی اعلیٰ تعلیم بغیر جداگانہ بہترین نظام کے نہایت مضر معلوم ہوتی ہے خصوصیت سے بھارت میں مخلوط تعلیم کے نتائج بہت تشویش ناک ہیں جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا کہ بی۔اے، ایم۔اے میں تعلیم پانے والی مسلمان لڑکیاں غیر مسلموں کیساتھ چلی جاتی ہیں۔ اور یہ بات بھی کم تشویش کی نہیں ہے کہ جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان مردوں کے لیے برس ہا برس سے ملازمتوں کے دروازے عام طور سے بند ہیں وہاں مسلمان عورتوں کے لیے تعلیم و ملازمتوں کی سہولتیں دی جارہی ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے۔ آمین

بَابُ مَنْ سَمِعَ شَيْئًا فَلَمْ يَفْهَمْهُ فَرَاجَعَهُ حَتّٰى يَعْرِفَهُ

ایک شخص کوئی بات سنے اور نہ سمجھے تو دوبارہ دریافت کرلے تاکہ (اچھی طرح) سمجھ لے

(۱۰۳) حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بْنُ اَبِىْ مَرْيَمَ قَالَ اَنَا نَافِعُ بْنُ عُمَرَ قَالَ حَدَّثَنِىْ ابْنُ اَبِىْ مُلَيْكَةَ اَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَا تَسْمَعُ شَيْئًا لَا تَعْرِفُهُ اِلَّا رَاجَعَتْ فِيْهِ حَتّٰى تَعْرِفَهُ وَاَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ حُوْسِبَ عُذِّبَ فَقَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ اَوَلَيْسَ يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا قَالَتْ فَقَالَ اِنَّمَا ذٰلِكِ الْعَرْضُ وَلٰكِنْ مَّنْ نُّوْقِشَ الْحِسَابَ يَهْلِكْ.

ترجمہ: حضرت نافع ابن عمر نے خبر دی ان کو ابن ابی ملیکہ نے بتلایا کہ رسول اللہ علیہ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب کوئی ایسی بات سنتیں جس کو سمجھ نہ پاتیں تو دوبارہ اس کو معلوم کرتیں تا کہ سمجھ لیں چنانچہ ایک مرتبہ نبی کریم علیہ نے فرمایا کہ جس سے حساب لیا گیا اسے عذاب دیا جائے گا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ سن کر میں نے کہا کہ کیا اللہ نے نہیں فرمایا عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا؟ تو رسول اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ صرف اللہ کے دربار میں پیشی ہے لیکن جس کے حساب کی جانچ پڑتال کی گئی (سمجھو) وہ ہلاک ہو گیا۔

تشریح: حدیث الباب میں ذکر ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم علیہ کے ارشادات کو سوال و جواب کر کے اچھی طرح سمجھا کرتی تھیں لہٰذا علم حاصل کرنے اور جواب دینے کا مسنون طریقہ معلوم ہوا جس کے لیے امام بخاری نے ترجمہ قائم کیا ہے۔

بحث ونظر

قولہ علیہ السلام "من حوسب عذب" حافظ عینیؒ نے لکھا ہے کہ اسمیں عذاب کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ قیامت کے روز جب لوگ اور انکے اعمال بارگاہ الوہیت میں پیش ہوں گے اور لوگوں کو ان کے برے اعمال جتلائیں جائیں گے کہ فلاں فلاں اوقات میں تم نے ایسے ایسے قبیح اعمال کیے تھے تو یہ جتلا وا ہی مناقشہ کی صورت اختیار کرلے گا جو ان لوگوں کے لیے تنبیہ وتوبیخ بن جائے گی اور گویا یہ بھی عذاب جہنم سے پہلے ایک قسم کا عذاب ہوگا دوسرے معنی یہ کہ پوچھ تاچھ چونکہ عذاب جہنم کا پیش خیمہ ہوگی اس لیے اس کو عذاب سے تعبیر کیا گیا اور آیت میں جو اصحاب الیمین کے لیے حساب یسیر کا وعدہ کیا گیا ہے وہ حساب بغیر مناقشہ کے ہوگا یعنی سرسری طور سے انکے سامنے سے حساب کی فہرست گزار دی جائے گی جس سے وہ اپنی طبائع پر گرانی بھی محسوس نہ کریں گے چنانچہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کا مطلب منقول ہے کہ گنہگار کو اس کے گناہ صرف بتلا دیئے جائیں گے پھر ان سے درگزر کر دی جائے گی۔

حافظ عینیؒ نے لکھا کہ اس حدیث سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خاص فضیلت اور علم وتحقیق کی حرص معلوم ہوئی اور یہ بھی کہ حضور علیہ ان کے بار بار سوال کا بوجھ نہیں محسوس فرماتے تھے اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے غیر معمولی علم وفضل وتبحر علمی کے سبب بڑے بڑے صحابہ کی ہمسری کرتی تھیں اور حضور اکرم علیہ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا "تم ان سے اپنے دین کا آدھا حصہ حاصل کرلو"

دوسرے حساب وعرض اعمال کا ثبوت ہوا تیسرے روز قیامت میں عذاب ہونا ثابت ہوا چوتھے مناظرہ اور کتاب اللہ پر سنت کو پیش کرنے کا جواز معلوم ہوا پانچویں حساب کے بارے میں لوگوں کو تفاوت دریافت ہوا۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۵۳۷)

حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات گرامی

آپ نے اس موقع پر ایک نہایت مفید تحقیق یہ فرمائی کہ جو احادیث مختلف الفاظ سے مروی ہیں ان کے تمام طرق روایت کو ملحوظ رکھ کر ان میں سے ایک متبادر وموزوں اختیار کرلینا چاہیے کیونکہ "روایت بالمعنی" کا عام رواج رہا ہے اور راویوں سے تغیرات ہوئے ہیں۔ چنانچہ حدیث الباب بھی مختلف الفاظ سے مروی ہوئی ہے۔ یہاں تو جملہ **من حوسب عذب** مقدم ہوا ہے جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سوال برمحل قرار پاتا ہے کہ حضور علیہ کا ارشاد مذکور بظاہر آیت کریمہ "**فاما من اوتی کتابه بیمینه فسوف یحاسب حسابا یسیرا وینقلب الی اهله مسرورا**" (سورہ انشقاق) کے معارض معلوم ہوتا ہے کیونکہ آیت سے اصحاب یمین کے حساب کا حساب یسیر ہونا ثابت ہے جو

دلیل رحمت ہے پھر ہر حساب والے کو معذب کیسے کہا جائے گا؟

اور بخاری ہی میں ص ۹۶۷ پر "باب من نوقش الحساب، عُذِّبَ" کے تحت جو حدیث ذکر ہے اور اس کے راوی بھی ابن ابی ملیکہ عن عائشہ ہیں "جملہ من نوقش عذب" مقدم ہے، اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سوال بے ضرورت اور بے محل قرار پاتا ہے، کیونکہ حضور اکرم علیہ نے اگر پہلے "من حوسب عذب" نہیں فرمایا، بلکہ شروع ہی میں عذاب کا مستحق صرف اسی کو بتلایا ہوتا جس سے مناقشہ ہوگا تو بات صاف تھی۔ نہ اس کا کوئی معارضہ مذکورہ آیت کریمہ سے تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حقیقت میں ترتیب وہی صحیح ہے جو یہاں ذکر ہوئی اور دوسری روایت میں ترتیب الٹی ہوگئی ہے۔ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لو۔

علم غیب: انما ذلک العرض پر فرمایا: میں اس سے یہ سمجھا ہوں کہ کسی بات کو سمجھانے کی ضرورت سے قرآن مجید کی تعبیر و عنوان کو بدلا جا سکتا ہے۔ جس طرح حضور اکرم علیہ نے حساب یسیر کو عرض سے سمجھایا۔ یہ بھی بہت اہم علمی فائدہ ہے۔ جس کو جاننا ضروری ہے۔ پھر یہ کہ عرض و تعلیم میں فرق ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "و علم آدم الاسماء کلها ثم عرضهم علی الملائکة" آدم علیہ السلام کو تو اسماء کی تعلیم دی گئی۔ اور فرشتوں پر تو وہ اسماء پیش کئے گئے، یعنی ان کا کچھ علم بھی فرشتوں کو نہیں دیا گیا، لہٰذا عرض اعمال والی حدیث میں بھی کوئی اشکال نہیں رہا، یعنی جو لوگ آنحضرت علیہ کے لئے علم غیب کلی کا اثبات اعرض اعمال والی حدیث سے کرتے ہیں، ان کا جواب بھی اسی حدیث الباب اور آیت مذکورہ و علم آدم الاسماء سے ہو جاتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

محدث ابن ابی جمرہ کے ارشادات

آپ نے "بہجۃ النفوس" میں حدیث الباب سے تحت گیارہ قیمتی فوائد لکھے ہیں، جن میں سے چند یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔
یوم قیامت میں حساب کی بہت سی اقسام ہوں گی مثلاً

(۱) عرض ہے جس کا ذکر حدیث الباب میں ہوا، اور اس کی کیفیت دوسری حدیث میں آئی ہے کہ حق تعالےٰ اپنے بندے مومن کا حساب اپنی خاص شان رحمت و ستاری کے ساتھ کریں گے، اور ذکر فرمائیں گے کہ اے میرے بندے! تو نے فلاں دن میں فلاں وقت یہ کام کیا تھا، اس طرح گناتے جائیں گے اور بندہ اعتراف کرتا رہے گا، دل میں خیال کرے گا کہ اس کی ہلاکت و بربادی کے لئے گناہوں کا سامان بہت ہے پھر حق تعالیٰ فرمائیں گے: اے میرے بندے! میں نے تیرے گناہوں کی دنیا میں پردہ پوشی کی تھی اور آج بھی (اسی شان ستاری سے) تیرے گناہوں کی مغفرت کر کے ان پر پردہ ڈالتا ہوں، فرشتوں سے فرمائیں گے کہ میرے اس بندے کو جنت میں لے جاؤ۔ اہل محشر اس کو (جنت میں جاتے ہوئے) دیکھ کر کہیں گے یہ کیسا نیک بخت بندہ ہے کہ اس نے حق تعالیٰ کی کبھی نافرمانی نہیں کی (اسی لئے تو اس طرح بے حساب جنت میں جا رہا ہے) غرض یہ تو وہ اجمالی یا سرسری عرض کی صورت ہوگی، جس کے ساتھ کوئی عتاب و عقاب نہ ہوگا۔

(۲) کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ ان کے پاس نیکیاں بھی ہوں گی اور برائیاں بھی، اور دوسروں سے لین دین برابر ہو کر ان کی نیکیاں اور برائیاں مساوی رہ جائیں گی، اسی لئے فیصلہ ان کے ایمان پر رہ جائے گا اور اسی کی وجہ سے وہ جنت میں چلے جائیں گے، یہ بھی عرض ہی کی ایک قسم ہے۔

(۳) جن لوگوں کی برائیاں بڑھ جائیں گی، اور ان کے لئے کسی کی شفاعت کا ذریعہ ہوگا، تو وہ حق تعالیٰ کے لطف و کرم سے نواز دیئے جائیںگے۔

(۴) کچھ لوگوں کے اعمال ناموں میں بڑے گناہ تو نہیں مگر چھوٹے چھوٹے گناہ بڑھ جائیں گے، تو وہ حسب وعدہ الٰہیہ ان تجتنبوا

كبائر ما تنهون عنه نكفر عنكم سياتكم وندخلكم مدخلا كريما (اگر تم بڑے گناہوں سے بچو گے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کو بخش دیں گے اور تمہیں اکرام کی جگہ دیں گے) مستحق جنت ہو جائیں گے۔

(۵) ایک قسم ان لوگوں کی بھی ہوگی جن کے پاس بڑے اور چھوٹے دونوں قسم کے گناہ ہوں گے، حق تعالیٰ اپنی خاص شان رحمت ظاہر فرمانے کے لئے فرشتوں سے فرمائیں گے کہ ان کے چھوٹے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دو، اس طرح جب ان کے نیکی کے پلڑے میں اضافہ ہو جائے گا تو وہ عرض کریں گے بار خدایا! ہم نے تو بڑے گناہ بھی کئے تھے (یعنی ان کو بھی اپنی فضل و رحمت سے بدل کر بڑی نیکیاں بنوا دیجئے!) اس سے حق تعالیٰ آیت کریمہ **فاولئک یبدل الله سیاتهم حسنات** کا وعدہ پورا فرمائیں گے یہ بھی عرض ہی میں داخل ہے۔

(۶) جن لوگوں کی حسنات (نیکیاں) برائیوں سے تعداد میں زیادہ ہوں گی، ان کی فلاح و کامیابی تو ظاہر ہی ہے۔

(۷) ایک قسم ان لوگوں کی بھی ہوگی جو بغیر حساب داخل جنت ہوں گے جیسے شہداء وغیرہ

(۸) وہ لوگ ہوں گے جن سے حساب میں مناقشہ، کھود کرید اور پکڑ ہوگی، صحیح معنی میں حساب کی زد میں یہی لوگ آئیں گے اور یہی ہلاک یعنی معذب ہوں گے، کیونکہ آخرت کی زندگی جس طرح مومن کے لئے ہوگی، فاسق و کافر کے لئے بھی ہوگی، فنا و عدم کسی کے لئے نہ ہوگا، اس لئے ہلاکت سے مراد ان کی فنا و عدم نہیں ہے، بلکہ عذاب ہے فاسق ایک مدت معین تک عذاب میں مبتلا رہیں گے، اور کافر و مشرک ہمیشہ کے لئے۔ **ویاتیه الموت من کل مکان وما هو بمیت** (عذاب اس کو اس طرح گھیرے گا کہ ہر طرف سے موت آتی ہوئی دکھائی دے گی مگر وہ کبھی نہ مرے گا) کیونکہ عذاب کا دکھ سہنے کے لئے زندگی ضروری ہے۔

علامہ محدث نے مندرجہ بالا آٹھ قسمیں حساب آخرت کی ذکر کیں ہیں جن میں سے پہلی سات قسموں کا تعلق عرض کے ساتھ ہے اور آخری قسم میں **من حوسب عذب** کے مصداق ہے۔

(۲) معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی تخصیص حدیث سے کر سکتے ہیں، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے آیت کریمہ کی تخصیص **انما ذلک العرض** فرما کر کی، اور اسی سے امام مالک کی اس رائے کی بھی تائید نکلی کہ بہ نسبت حکم نسخ کے جمع آثار اولی ہے، اس لئے کہ جمع زیادۃ حکم کا مقتضی ہے اور نسخ نفی حکم کا، لیکن یہ جب ہی ہے کہ نسخ کا علم نہ ہو، ورنہ جمع کا کوئی موقع نہیں: جیسے حدیث (۱) **انما الماء من الماء** اور حدیث (۲) **اذا جاوز الختان الختان فقد وجب الغسل** میں امام مالک نے دوسری کو جماع پر محمول کیا اور اول کو احتلام پر، اور ایسی ہی صورت یہاں حدیث الباب میں بھی ہے۔ (بہجۃ النفوس ص ۱۴۶ ج ۱)

امام اعظم محدث اعظم اور اعلم اہل زمانہ تھے

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ نسخ کا علم نہ ہو تو جمع آثار ہمارے نزدیک بھی اولی ہے، اور ناسخ و منسوخ کا علم نہایت ہی مہتم بالشان کا علم ہے، جیسا کہ ہم مقدمہ جلد اول میں ذکر کر آئے ہیں ہمارے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی ایک بہت بڑی منقبت یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں ناسخ و منسوخ احادیث و آثار کے سب سے بڑے عالم تھے، اور بڑے بڑے ائمہ محدثین نے ان کے اس وصف امتیازی کا اعتراف کیا ہے، بلکہ اس بارے میں کسی دوسرے امام و محدث کی ایسی تعریف ہماری نظر سے نہیں گزری، اور یہ وصف ظاہر ہے کہ کسی محدث اعظم ہی کو حاصل ہو سکتا ہے، قلیل الحدیث تو عالم ناسخ و منسوخ بھی نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ وہ بڑھے بڑوں کی نظر میں ناسخ و منسوخ کا علم اہل زمانہ قرار پائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حدیث انما الماء من الماء جمہور ائمہ کے نزدیک منسوخ ہے، اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کو جو غیر منسوخ کہا ہے وہ اس کی تاویل کی وجہ سے کہ اس کو حالت نوم پر محمول کیا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مسلم شریف کی حدیث عتبان بن مالک سے صراحتہً اس کا منسوخ ہونا ثابت ہے، اور امام طحاوی نے تو اس کی نسخ پر دلالت کرنے والی بہت احادیث ذکر کی ہیں۔ (العرف الشذی ص ٦٢)

بَابٌ لِيُبَلِّغِ الْعِلْمَ الشَّاهِدُ الْغَآئِبَ قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(''حاضر آدمی غائب کو علم پہنچائے''۔ اس کو ''حضرت ابن عباسؓ نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے'')

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي سَعِيْدٌ هُوَ ابْنُ اَبِي سَعِيْدٍ عَنْ اَبِي شُرَيْحٍ اَنَّهُ قَالَ لِعَمْرِو بْنِ سَعِيْدٍ وَّهُوَ يَبْعَثُ الْبُعُوْثَ اِلٰى مَكَّةَ ائْذَنْ لِيْ اَيُّهَا الْاَمِيْرُ اُحَدِّثْكَ قَوْلًا قَامَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغَدَ مِنْ يَّوْمِ الْفَتْحِ سَمِعَتْهُ اُذُنَايَ وَ وَعَاهُ قَلْبِيْ وَ اَبْصَرَتْهُ عَيْنَايَ حِيْنَ تَكَلَّمَ بِهٖ حَمِدَ اللّٰهَ وَ اَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللّٰهُ وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ فَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يَّسْفِكَ بِهَا دَمًا وَّلَا يَعْضِدُ بِهَا شَجَرَةً فَاِنْ اَحَدٌ تَرَخَّصَ لِقِتَالِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهَا فَقُوْلُوْا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذِنَ لِرَسُوْلِهٖ وَلَمْ يَاْذَنْ لَكُمْ وَ اِنَّمَآ اَذِنَ لِيْ فِيْهَا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ثُمَّ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْاَمْسِ وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَآئِبَ فَقِيْلَ لِاَبِيْ شُرَيْحٍ مَّا قَالَ عَمْرٌو قَالَ اَنَا اَعْلَمُ مِنْكَ يَا اَبَا شُرَيْحٍ اِنَّ مَكَّةَ لَا تُعِيْذُ عَاصِيًا وَّ لَا فَارًّا بِدَمٍ وَّ لَا فَارًّا بِخَرْبَةٍ.

ترجمہ: حضرت ابوشریح روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عمرو بن سعید (والی مدینہ) سے جب وہ مکہ (ابن زبیرؓ سے لڑنے کے لئے) لشکر بھیج رہا تھا کہا کہ اے امیر! مجھے اجازت ہو تو میں وہ بات آپ سے بیان کروں جو رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے روز ارشاد فرمائی تھی، اس حدیث کو میرے دونوں کانوں نے سنا ہے اور میرے دل نے اسے یاد رکھا ہے، اور جب رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے تو میری آنکھیں آپ ﷺ کو دیکھ رہی تھیں، آپ ﷺ نے اول اللہ کی حمد وثنا بیان کی، پھر فرمایا کہ مکہ کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، آدمیوں نے حرام نہیں کیا، تو سن لو کہ کسی شخص کے لئے کہ جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو یہ جائز نہیں کہ مکہ میں خون ریزی کرے یا اس کا کوئی پیڑ کاٹے، پھر اگر کوئی اللہ کے رسول کی وجہ سے اس کا جواز سمجھے تو اس سے کہہ دو کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے لئے اجازت دی تھی، تمہارے لئے نہیں دی، اور مجھے بھی دن کے کچھ لمحوں کے لئے اجازت ملی تھی، آج اس کی حرمت لوٹ آئی جیسے کل تھی، اور حاضر غائب کو (یہ بات) پہنچا دے۔ (یہ حدیث سننے کے بعد راوی حدیث) ابوشریح سے پوچھا گیا کہ (آپ کی بات سن کر کہ) عمرو نے کیا جواب دیا؟ انہوں نے کہا یہ کہ (ابوشریح) میں تم سے زیادہ جانتا ہوں، حرم (مکہ) کسی خطا کار کو یا خون کر کے اور فتنہ پھیلا کر بھاگ آنے والے کو پناہ نہیں دیتا۔

تشریح: حدیث الباب میں ''حرم مکہ'' کی حرمت و توقیر شان کا بیان حضرت ابوشریح صحابی رسول ﷺ کی زبانی معلوم ہوا ہے اور اس کے ضمن میں حضرت ابوشریح نے جس جراءت و بے باکی کے ساتھ عمرو بن سعید (والی مدینہ) کو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پر لشکر کشی سے روکا

ہے، وہ قابل تقلید بات ہے، علماء زمانہ میں جو بزدلی اور معمولی دنیاوی حرص وطمع کے تحت ''مداہنت'' کی عادت ترقی کرتی جارہی ہے، وہ دین کے لئے نہایت مضر ہے، ان کو اس واقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہیے، حق بات ہر حال میں کہنی چاہیے، علماء وعلم دین کا وقار اور دین قیم کی حفاظت اسی میں ہے، اور اس کے لئے جو کچھ قربانی دینی پڑے گی، اس کو خوشی سے انگیز کرنا چاہیے، امید ہے وہ ضرور ''**و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب**'' کا عینی مشاہدہ کریں گے، بشرطیکہ ان کے دلوں میں صرف خدا کا ڈر ہو، یعنی اس کے ساتھ کسی دوسری کا ڈر وخوف قطعاً نہ ہو، نہ کوئی مال وجاہ کی حرص وطمع یا اس کے زوال کا خوف ہو۔ واللہ الموفق۔

بحث ونظر

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ارشادات

حضرتؒ نے فرمایا کہ ابوشریح جلیل القدر صحابی ہیں اور عمرو بن سعید یزید بن معاویہ کی طرف سے والی مدینہ منورہ تھا، عام طور سے محدثین نے اس کے پوست کندہ حالات نہیں لکھے، میں نے اس کے معتمد حالات میں ایک واقعہ ایسا بھی دیکھا ہے، جس سے اس کا ایمان بھی مشتبہ ہو جاتا ہے میں نہیں سمجھتا کہ وہ واقعہ محدثین کی نظر سے مخفی رہا، یا کسی وجہ سے اس کو نظر انداز کر دیا جو صورت بھی ہو بہرحال! یہاں صحیح بخاری میں اس کا ذکر ضمناً آ گیا ہے، بطور راوی حدیث کے نہیں کہ کوئی غلطی سے اس کو رواۃ صحیح میں سے سمجھ لے،

پھر فرمایا کہ یہاں چند مسائل ہیں، اگر کوئی شخص حرم مکہ ہی کے اندر رہتے ہوئے کسی کو قتل یا زخمی کر دے تو اس کی سزا قتل وقصاص حرم ہی میں جاری کی جاسکتی ہے، کیونکہ اس نے حرم کی حرمت خود ہی باقی نہیں رکھی، اس مسئلہ میں تو سب ائمہ کا اتفاق ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ حرم سے باہر ایسی حرکت کرے پھر حرم میں داخل ہو کر پناہ لے، تو اگر جنایت اطراف کی ہے، مثلاً کسی کا ہاتھ کاٹ دیا، ناک کاٹ دی وغیرہ تب بھی اس کا قصاص حرم کے اندر لیا جاسکتا ہے، کیونکہ اطراف کو بھی اموال کے حکم میں رکھا گیا ہے، اور اگر جنایت قتل نفس کی ہے کہ کسی کو جان سے مار ڈالا تو ائمہ حنفیہ فرماتے ہیں کہ حرم کے اندر خون ریزی کی ممانعت ہمیشہ کے لئے ہو چکی، جیسا کہ اوپر کی حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ، اس لئے اور حرماً آمِناً اور مَنْ دخلہٗ کان آمنا، وغیرہ آیات واحادیث کی روشنی میں حرم کے اندر کسی سے قصاص نہیں لیا جاسکتا، البتہ اس قاتل کو مجبور کیا جائے گا کہ حرم سے باہر نکلے، اس سے مقاطعہ کیا جائے گا، کھانے پینے کی چیزیں اس کو دینا حرام ہوگا اس کو سمجھایا جائے گا تاکہ خدا کے خوف سے، عذاب سے ڈر کر قصاص کے لئے آمادہ ہو۔

غرض ہر طرح سے اس کو مجبور کر کے حرم سے باہر نکالنے کی تدابیر کی جائیں گی، تاکہ فریضہ قصاص حرم سے باہر پورا کیا جائے، یہی بات حضرت ابوشریح کے ارشاد سے بھی ثابت ہو رہی ہے کہ انہوں نے عمرو بن سعید کو مکہ معظمہ پر لشکر کشی سے روکا کہ عبداللہ بن زبیر کی جان حرم میں محفوظ ہو چکی ہے، اس کو کسی صورت سے حرم کے اندر ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ جو شخص قتل کر کے حرم میں داخل ہوا اس پر حد حرم میں بھی حد جاری کر کے قصاص لے سکتے ہیں، جس کی وجہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھی کہ اس شخص نے اپنے نفس کی خود ہی ہتکِ حرمت کی ہے اس لئے حق تعالیٰ نے اس کا امن باطل کر دیا۔ (فتح الباری ص ۴۴ ج ۴)

اسی طرح بقول حضرت شاہ صاحبؒ ائمہ حنفیہ کے یہاں حرمت حرم کا پاس وادب بہ نسبت ائمہ شافعیہ کے کہیں زیادہ ہے، پھر حضرتؒ نے بطور مزاح یہ بھی فرمایا کہ حافظ ابن حجرؒ نے حدیث الباب پر بحث کرتے ہوئے عمرو بن سعید کے قول کو اسی مسئلہ کی وجہ سے صحیح وصواب بھی کہہ دیا، کیونکہ یہ مسئلہ امام شافعیؒ کا ہے، اوران کو امام شافعیؒ کی تائید کرنی تھی، اور ہم بھی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ وہ اپنی تائید عمرو بن سعید سے حاصل کریں، جو اچھے تابعی بھی نہیں ہیں، اور ہماری تائید میں حضرت ابوشریح جیسے جلیل القدر صحابی ہیں، اس کے بعد مذکورہ مسئلہ پر مزید روشنی ڈالی جاتی ہے، واللہ الموفق۔

قتال کی صورت میں بھی اختلاف ہے

قتل کی صورت میں جو اختلاف ہے وہ اوپر بیان ہوا ہے، اس کے علاوہ قتال کی صورت ہے جس کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے ماوردی کا قول نقل کیا ہے کہ مکہ معظمہ کے خصائص میں سے یہ بات ہے کہ اس کے اہل سے محاربہ نہ کیا جائے، اگر وہ حکومت عادلہ سے بغاوت کریں تب بھی حتی الامکان ان کو بغیر قتال ہی کے بغاوت سے روکیں گے، اگر کسی طرح روکنا ممکن نہ ہو تو جمہور علماء نے قتال کو جائز کہا ہے، کیونکہ باغیوں سے قتال کرنا حقوق اللہ میں سے ہے، اس کو ضائع کرنا جائز نہیں۔

دوسرے علماء اس حالت میں بھی قتال کو جائز قرار نہیں دیتے، بلکہ ان پر ہر طرح تنگی کر کے طاعت کی طرف لانے کا حکم دیتے ہیں، امام نوویؒ نے لکھا کہ پہلا قول امام شافعیؒ کا بھی ہے اور ان کے اصحاب نے حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ اس سے وہ قتال حرام ہوگا جس سے سارے شہر کے لوگوں کو اذیت پہنچے، جیسے منجنیق سے پتھر برسانا، کہ دوسرے شہروں کے لئے اس قسم کی پابندی نہیں ہوتی، دوسرا قول امام شافعیؒ کا بھی تحریم ہی کا ہے جس کو قفال نے اختیار کیا ہے اور ایک جماعت علماء شافعیہ و مالکیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

علامہ طبری کا قول

فرمایا کہ جو حرم سے باہر کسی حد شرعی کا مستحق ہوا پھر حرم میں پناہ گزین ہو گیا، تو امام وقت اس کو حرم سے باہر نکلنے پر مجبور کر سکتا ہے، مگر اس سے محاربہ کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ حدیث سے یہی ثابت ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد کسی کے لئے حرم والوں سے محاربہ یا حرم میں قتل جائز نہیں۔

ابن عربی اور علامہ ابن المنیر کے اقوال

ابن عربی کی رائے بھی مذکورہ بالا ہے اور ابن منیر نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے تحریم کو خوب مؤکد کیا ہے، پہلے فرمایا، حرم اللہ، پھر فرمایا **فهو حرام بحرمته الله**، پھر فرمایا **ولم تحل لی الاساعته من نهار**، حضور کی عادت مبارکہ یہی تھی کہ جب کسی حکم کو موکد فرماتے تو اس کو تین بار دہراتے تھے، لہذا یہ ایسی نص شرعی ہے جس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔

علامہ قرطبی کا قول

فرمایا کہ ظاہر حدیث کا مقتضیٰ یہی ہے کہ حرم مکہ میں قتال کا جواز آپ ﷺ کی ذات اقدس ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا۔ کیونکہ آپ ﷺ نے اس تھوڑی دیر کے اباحت قتال سے بھی اعتذار فرمایا، حالانکہ اہل مکہ اس وقت قتل وقتال کے مستحق تھے، علاوہ اپنے کفر وشرک

کے انہوں نے مسلمانوں کو مسجد حرام کی عبادت سے بھی روکا تھا، اور حرم سے ان کو نکالا تھا، اس بات کو حضرت ابوشریح ؓ بھی سمجھے ہوئے تھے اور بہت سے اہل علم اسی کے قائل ہیں۔

حافظ ابن دقیق العید کا قول:

آپ[1] علماء شوافع میں سے نہایت اونچے درجہ کے حافظ حدیث ہیں اس لئے اس مسئلہ میں آپ کی رائے کی بھی بڑی اہمیت ہے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی آپ کی رائے ص۴۳ ج ۴ میں نقل کی ہے اور فتح الملہم ص ۳۹۱ ج ۳ میں بھی درج ہوئی ہے، لیکن ہم یہاں ان کی رائے دراسات اللبیب ص ۴۲۱ سے نقل کرتے ہیں، غالباً حافظ موصوف نے اپنی متعدد تصانیف میں اس مسئلہ پر کلام کیا ہے، اس لئے عبارتوں میں اجمال و تفصیل کا فرق ہے، مفہوم واحد ہے' تینوں کتابوں میں حوالہ کتاب نہیں دیا گیا، اس لئے ہم بھی نہیں لکھ سکے، صاحب دراسات شیخ محمد معین سندھی نے لکھا: "امام شافعیؒ نے حدود حرم کے اندر محاربہ یا قصاص نفس اور اجراء حدود کو حرام قرار دینے والی احادیث کا جواب یہ دیا ہے کہ ان کا مقصد خاص قسم کا قتال روکنا ہے جو منجنیق وغیرہ سے ہو، اور امام ابن دقیق العید (شافعی) نے انصاف کا حق ادا کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ تاویل ایک ظاہر، کھلی ہوئی اور قوی بات کے خلاف ہے جس پر حضور اکرم ﷺ کا ارشاد " **فلا یحل لاحد** " دلالت کررہا ہے، کیونکہ نکرہ سیاق نفی میں عموم چاہتا ہے، دوسرے یہ کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی خصوصیت کا اظہار فرمایا ہے کہ آپ ﷺ کے لئے صرف ایک بار دن کے کچھ حصہ میں قتال جائز ہوا تھا، اس لئے حضور نے فرمایا کہ اس کے بعد اگر کوئی شخص کبھی میرے فعل سے سند پکڑے تو اس کو بتلا دینا کہ حق تعالیٰ نے صرف اپنے رسول ﷺ کو اجازت دی تھی، تمہیں کسی کو اجازت نہیں دی ہے اس سے معلوم ہوا ہے کہ جس امر کی اجازت آپ ﷺ کو دی گئی تھی اس کی اجازت دوسروں کے لئے نہیں اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کو اجازت مطلق قتال کی دی گئی تھی۔ خاص قتال کی جو منجنیق وغیرہ سے ہو نہیں دی گئی تھی نہ آپ نے ایسے آلات سے قتال کیا تھا تو پھر تاویل مذکور کیسے صحیح ہوسکتی ہے؟ تیسرے یہ کہ حدیث اور اس کا سیاق بتلا رہا ہے کہ تحریم یعنی قتال و خونریزی کو روکنے کا مقصد اس بقعۂ مبارکہ (حرم مکی) کی حرمت وغیرہ شان ظاہر کرنا ہے جس کو استیصال کردینے والی خاص صورت کے ساتھ مخصوص نہیں کرسکتے۔

پھر یہ کہ اگر بغیر کسی دلیل و وجہ تعیین و تخصیص کے اس صورت کے ساتھ حدیث کو خاص کردیں گے تو کوئی دوسرا شخص بھی اسی طرح دوسری تخصیص جاری کردے گا۔

نیز یہ کہ حدیث استیصال والی صورت کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی دلیل و حجت موجود نہیں ہے لہٰذا اگر کوئی کہنے والا دوسرے معنی

---

[1] حافظ ذہبی نے لکھا: امام وفقیہ، مجتہد و امام محدث، حافظ حدیث، علامہ شیخ الاسلام تقی الدین ابوالفتح محمد بن علی بن وہب بن مطیع القشیری المنفلوطی الصعیدی المالکی والشافعی صاحب تصنیف ہیں۔ شعبان ۶۲۵ھ میں ینبع حجاز کے قریب ولادت ہوئی اپنے زمانے کے اکابر علماء و محدثین سے علم حاصل کیا، اور اپنے لئے چالیس تساعی احادیث نکالیں، مندرجہ ذیل تصانیف فرمائیں: شرح العمدہ، **الامام الامام فی الحکام**، ایک کتاب علوم حدیث میں۔

حافظ ذہبی نے لکھا میں نے بھی بیس حدیث سنی ہیں آپ کو اصول و معقول میں ید طولیٰ تھا علل منقول کے عالم تھے وقت وفات تک دیار مصریہ کے قاضی رہے بڑے بڑے ائمہ وقت نے آپ کی شاگردی کی، آپ کے تلمیذ حافظ قطب الدین حلبی نے کہا کہ شیخ تقی الدین امام اہل زمانہ اور علم و زہد میں فائق تھے، مذہب مالکی و شافعی دونوں کے بڑے عالم۔ اور ان کے اصول کے امام تھے حافظ حدیث تھے، حدیث و علوم حدیث میں درجہ اتقاء حاصل تھا بلکہ حفظ و اتقان میں ضرب المثل تھے، شدید الخوف ادائم الذکر تھے، رات کو بہت کم سوتے تھے، اور بار بار اٹھ کر مطالعہ کتب تلاوت قرآن مجید، ذکر و تہجد میں مشغول ہوتے تھے بیداری ان کی عادت ثانیہ ہوگئی تھی (یہ حالات ہمارے شیخنا العلامہ کشمیری قدس سرہٗ کے حالات سے بہت کچھ مشابہ ہیں) ماہ صفر ۷۰۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ (تذکرۃ الحفاظ ص۱۴۸۱)

بتلائے گا اور حدیث کو اس کے ساتھ خاص کرے گا تو اس معاملہ میں اس کے قول کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

صاحب دراسات نے حافظ ابن دقیق العید کی عبارت مذکورہ نقل کر کے لکھا کہ باوجود شافعی المذہب ہونیکے موصوف کا اس طرح لکھنا، ان کے کمال اتباع حدیث کی دلیل ہے اور کبار علماء کی جن پر حدیث رسول کا رنگ غالب ہوتا ہے یہی شان ہوتی ہے پھر لکھا کہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کی تائیدی شواہد میں سے جو الحمدللہ مجھے ظاہر ہوئے ہیں صحیح بخاری کی حدیث ابی ہریرہ بھی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے بنولیث کے مقتول کا کوئی قصاص قبیل بنی خزاعہ کے قاتل سے نہیں لیا (یہ حدیث ۱۱۲ پر عنقریب آنے والی ہے) یہ حدیث امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہے اس لیے کہ اس سے جانی کا قتل حرم میں بغیر نصب قتال بمنجنیق وغیرہ بھی ممنوع ثابت ہوا لہٰذا احادیث محتملہ کو صرف اس صورت کے ساتھ خاص کرنا اور اس کے سوا میں مباح قرار دینا جس کو امام شافعی نے اختیار کیا باطل ٹھہرا اور ظاہر ہے کہ اس حدیث میں محض حرم میں موجود ہونا تحریم قتل کے لیے کافی ہے پس ایسا شخص جو خارج حرم سے جنایت کر کے پناہ لینے کو حرم میں آ گیا تو وہ بدرجہ اولی اس کا مصداق ہوگا (دراسات ص ۴۲۲)

تذکرہ صاحب دراسات

ہم نے مقدمہ انوار الباری ج ۲ ص ۱۹۴ میں آپ کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا ہے کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے حدیث الباب کی شرح فرماتے ہوئے آپ کا ذکر فرمایا وہ کشمیری الاصل علماء سندھ میں سے تھے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اخص تلامذہ سے تھے آپ کی مشہور کتاب ''دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب'' کو غیر مقلدین نے طبع کرایا کیونکہ مصنف موصوف بھی غیر مقلد تھے اگرچہ آجکل کے غیر مقلدین کی طرح متعصب نہیں تھے کسی بات کو حق دیکھتے یا سمجھتے تو اس کا اعتراف کرتے تھے حدیث الباب پر بھی کلام کرتے ہوئے امام اعظم کی دل کھول کر مدح وثناء کی ہے اور کہا کہ اس حدیث کو سمجھنے کا حق امام صاحب ہی نے ادا کیا ہے اور آپ ہی نے اس پر بلاتاویل وتخصیص کے عمل کیا ہے''۔

اس میں شک نہیں کہ دراسات میں نہایت اہم علمی فنی حدیثی ابحاث ہیں جن سے کوئی عالم خصوصاً استاذ حدیث مستغنی نہیں ہو سکتا کسی غیر مقلد عالم نے ایسی تحقیق اور کم تعصب کے ساتھ شاید ہی کوئی کتاب لکھی ہو البتہ اس میں بہت جگہ مسامحات واغلاط ہیں جن پر ہمارے محترم مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی نے حواشی میں بڑا اچھا کلام کیا ہے اور اب ان کا مستقل رد بھی شیخ عبداللطیف سندیؒ کا ''ذب ذبابات الدراسات'' کے نام سے ضخیم دو جلدوں میں چھپ گیا ہے کتاب مذکور نہایت نادر ہو گئی تھی خدا کا شکر ہے کراچی کی ''الجنۃ احیاء الادب السندی'' سے بہت عمدہ ٹائپ سے مولانا عبدالرشید نعمانی کے حواشی سے مزین ہو کر شائع ہو گئی جس کے آخر میں محشی کی طرف سے ''**کلمه عن الدراسات ومولفها**'' بھی نہایت اہم تحقیقی وقابل مطالعہ مضمون ہے۔ جزاہم اللہ خیرا۔

صاحب دراسات[1] کے جن کلمات کی طرف حضرت شاہ صاحب نے اشارہ فرمایا وہ یہ ہیں ''(ملتجی الی الحرم کو حرم کی حدود میں قتل نہیں

---

[1] بارہویں دراسہ میں مولف نے امام اعظمؒ کے ساتھ اپنی دلی عقیدت کا اظہار کیا ہے، نیز بتلایا کہ امام صاحب اور ان کے مذہب کے ساتھ نہایت ادب و احترام کا لحاظ ضروری ہے اور لکھا کہ میں نے جو بعض مسائل میں امام صاحب کا مذہب ترک کیا ہے وہ خدانخواستہ امام صاحب یا ان کے مذہب سے بدظنی وانحراف کے سبب سے نہیں ہے، بلکہ ان مسائل میں مجھے چونکہ احادیث کے مقابلہ میں جواب سے تشفی نہ ہو سکی اس لئے ترک کیا ہے، اور یہ بھی حقیقت میں امام صاحب ہی کے مذہب پر عمل ہے کہ آپ نے فرمایا: حدیث صحیح کے خلاف جو رائے بھی ہو اس کو ترک کر کے حدیث پر عمل کیا جائے، پھر مولف نے چند مسائل امام اعظم کے نقل کئے، جن میں امام صاحب کا مسلک حدیثی اعتبار سے قوی ہے اور اعتراضات کو دفع کیا ہے، ان ہی مسائل میں سے یہ تحریم حرم مکہ معظمہ کا مسئلہ بھی ہے۔ (مؤلف)

کریں گے اور حرم کی حدود میں اباحت قتل موذیات خمسہ مذکورہ حدیث کا حکم دوسرے موذیات پر لاگو نہیں ہوگا ان دونوں مسائل میں امام ابوحنیفہ کے مذہب کا وہ بلند و برتر مقام ہے جس سے ان لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں جو حق تعالیٰ سجانہٗ کی خاص روح و ریحان سے مستفیض ہیں جس نے اپنے سر و صفی کو اپنے بلد مقدس کے بارے میں ''حرما آمنا'' اور ''من دخله كان آمنا'' سے ظاہر فرمایا یقیناً حق تعالیٰ کے سر حقیقت سے وہی لوگ مستفیض و مستنیر ہوتے ہیں جو اس کی صحیح معرفت سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور اس مذہب شریف (حنفی) کی رو سے عمر بن سعید شقی و مردود ٹھہرتا ہے جس نے اس مذہب کے لحاظ سے ایک حرام قطعی کا ارتکاب کیا کہ اس نے غیر معمولی نازیبا جسارت سے کام لے کر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو شہید کرنے کے لیے مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ کو فوجیں بھیجیں حالانکہ انکا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے خدا کی ایک نافرمان پیشانی اشقی ترین امت یزید کی بیعت سے انکار فرمادیا تھا اور یہ عمرو بن سعید اس کی طرف سے والی مدینہ تھا حضرت ابوشریح جلیل القدر صحابی تھے جو فتح مکہ سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے ان کی وفات ۶۸ھ میں ہوئی ان کی رائے اس مسئلہ میں بعینہ وہی تھی جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تھی امام صاحب موصوف کا قول ہی احادیث صحیحہ کا منطوق و مدلول ہے اور ان ہی احادیث میں سے یہ حدیث بھی ہے جس کو بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے الخ۔..... اس حدیث میں نہایت اہتمام سے تحریم مطلق موبد کا ذکر ہوا ہے جو کسی سے مخفی نہیں اور اس تعلیم و اہتمام کے ساتھ اعلام نبوت میں سے یہ پیشگوئی بھی ہے کہ کچھ لوگ بخاری و مسلم کی حدیث انس بن مالک سے قتل ملتجی کا جواز نکالیں گے جس میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ابن خطل کو قتل کرایا تھا، حالانکہ خود حضور ﷺ ہی نے یوم فتح سے اگلے دن اعلان فرمادیا تھا کہ میری خصوصیت تھی اس کے بعد کسی کے لیے ایسا کرنا جائز نہ ہوگا)''

اسی طرح صاحب دراسات نے باوجود غیر مقلد ہونے کے امام صاحب کی دوسرے مسئلہ مذکورہ کی تحقیق پر بڑی مدح کی ہے اور لکھا ہے کہ امام صاحب کا یہ قول آپ کے خصوصی محاسن مذہب سے ہے اور اس درجہ کا ہے کہ اس کی طرف ہر محقق کو مائل ہونا پڑے گا جس نے ملکوتی معانی حدیث کی شراب کا ذائقہ چکھا ہوگا۔

تحلیل مدینہ کا مسئلہ

آخر میں مولف دراسات نے یہ بھی لکھا کہ اگر امام صاحب کی طرف تحلیل مدینہ منورہ والی روایت منسوب ثابت نہ ہوئی تو ہماری خوشی اور انکے ساتھ عقیدت کی کوئی حد و انتہا نہ رہتی۔ (دراسات ص ۴۲۶)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ''تحلیل مدینہ'' والی جس بات کی طرف موصوف نے اشارہ کیا بلکہ آگے کچھ بحث بھی کی ہے اس کو ہم اپنے موقع پر پورے دلائل و براہین کے ساتھ ذکر کریں گے جس سے معلوم ہوگا کہ اس بارے میں امام صاحب کی دقت نظر کا فیصلہ کتنا صحیح و صائب ہے اور بظاہر مخالف احادیث کے بھی شافی جوابات لکھیں گے جن سے ہر قسم کی غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ

حافظ ابن حزم کی رائے

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حافظ ابن حزم نے بھی محلی امام اعظمؒ کے موافق رائے قائم کی ہے اور امام شافعیؒ کی رائے پر حسب عادت سخت سے طعن و تشنیع کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوشریحؓ اور عمرو بن سعیدؓ کا کیا مقابلہ ایک ولی الرحمان دوسرا الطیم الشیطان، یہ بھی لکھا کہ

حضرت ابوشریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلہ میں عمرو بن سعید کا علم ہی کیا؟ پھر اس کی یہ گستاخی کہ اپنے کو ان کے مقابلہ میں اعلم کہا۔

تحفۃ الاحوذی کا ذکر

ہم نے اس مقام پر تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ کو بھی دیکھا کہ کیا تحقیق فرمائی ہے مگر آپ نے صرف اتنا لکھا کہ "اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے اس کو فتح الباری میں بسط و تفصیل سے لکھدیا ہے جس کا دل چاہے اس کی طرف رجوع کرے۔ (ص ۸۷ ج ۲)

ایسے اہم مسئلہ پر کچھ بھی گوہرافشانی نہ فرمانا جس پر حافظ نے بقول ان کے بسط و تفصیل سے لکھا ہے حالانکہ حافظ سے زیادہ حافظ عینیؒ اور خود ان کے ہم مشرب صاحب دراسات نے بھی یہ لکھا ہے مگر چونکہ یہاں پہلو کمزور تھا اور خاص طور سے امام اعظمؒ اور فقہ حنفی زد میں نہیں آتے تھے بلکہ امام شافعیؒ کے خلاف بھی کچھ لکھنا پڑتا۔ اس لیے سارا مسئلہ اور اس کی تحقیق ہی لپیٹ کر رکھ دی اور یہ بھی خیال نہ کیا کہ تحفۃ الاحوذی دیکھنے والے بھی تو کسی حد تک مسئلہ کی نوعیت سمجھ لینے کے حق دار تھے انہیں بے وجہ کیوں محروم کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ ایک اہم بات اور بھی لکھنی ہے: ہم نے پہلے یہ بتلایا تھا کہ حضرت نواب صاحبؒ کی شرح بخاری عون الباری میں بیشتر جگہوں پر قسطلانی وغیرہ شروح بخاری کو بغیر حوالہ کے لفظ بہ لفظ نقل کر دیا گیا ہے اور اس طرح وہ ایک مستقل شارح بخاری کہلانے کے مستحق ہو گئے آج اتفاق سے مسئلہ مذکورہ کے لیے تحفۃ الاحوذی کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ (ص ۷۷ ج ۲) میں "یبعث البعوث" کی چار سطری شرح بعینہ فتح الباری (ص ۱۴۲ ج ۱) کی نقل کی ہے ہمیں نقل پر اعتراض نہیں بلکہ بغیر حوالہ نقل پر ہے جس سے ہر پڑھنے والے کو دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ علامہ محدث شیخ عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ کی خود اپنی شرح و تحقیق ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ایسی ہی شرح و تحقیق نواب صاحب کی طرح دوسرے مقامات میں بھی ہوگی، اگرچہ یہ پتہ چلانا دشوار ہے کہ کس کتاب کی خوشہ چینی کی گئی ہے یہ بات چونکہ خلاف توقع اس وقت سامنے آ گئی اس لیے ذکر میں آ گئی ورنہ اس کا مقصد حضرت مولانا مرحوم کی کسر شان یا انکی حدیثی خدمت کی تخفیف نہیں سامح اللہ عنا وعنھم اجمعین بمنہ و کرمہ۔

قولہ لا یعیذ عاصیا (حرم کسی باغی کو پناہ نہیں دیتا) حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ "کلمۃ حق ارید بھا الباطل (حق کلمہ کہہ کر باطل کا ارادہ کرنا) ہے اسلیے کہ یہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر کسی طرح صادق نہیں آتا بلکہ خود عمرو بن سعید اور یزید پر ہی صادق آتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر سے قتال کے واقعات

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد جب یزید جانشین ہوا تو حضرت عبداللہ بن زبیر اور آپ کے اصحاب نے اس کی بیعت سے انکار کر دیا اور حضرت عبداللہ مکہ معظمہ چلے گئے یزید کے بعد مروان جانشین ہوا پھر عبدالملک بن مروان اور اس نے حجاج ظالم کو حضرت عبداللہ سے قتال کا حکم دیا اور اسی کی تقدیر میں یہ بدبختی لکھی تھی اور جو کچھ اس نے سیاہ کارنامے کیے مشہور ہیں اسی نے کبش اسماعیل علیہ السلام کے سینگ بھی جلائے اور اسی وقت بیت اللہ کا بھی ایک حصہ منہدم ہوا والعیاذ باللہ۔

حافظ عینیؒ نے اسطرح لکھا ہے کہ حضرت معاویہ کی وفات کے بعد یزید نے جانشین ہوکر حضرت عبداللہ بن زبیر سے بیعت طلب

کی۔انہوں نے بیعت سے انکار کیااور مکہ معظمہ چلے گئے یزید بہت غضبناک ہوااور والی مکہ یحیٰ بن حکیم کو حکم بھیجا کہ حضرت عبداللہ سے بیعت لو انہوں نے بیعت کرلی اور یحیٰ نے یزید کو مطلع کیا تو اس نے لکھا: مجھے ایسی بیعت قبول نہیں ان کو گرفتار کرکے ہتھکڑیاں پہنا کر یہاں بھیجو۔

حضرت عبداللہ ؓ نے اس سے انکار کیا اور فرمایا کہ میں بیت اللہ کی پناہ لے چکا ہوں اس پر یزید نے عمرو بن سعید ؓ والی مدینہ کو لکھا کہ وہاں سے لشکر بھیجے اور حضرت عبداللہ ؓ کو قتل کرنے کے لیے مکہ معظمہ پر چڑھائی کی جائے (جس کا ذکر حدیث الباب میں ہے کہ عمرو بن سعید ؓ نے فوجیں بھیجیں تو حضرت ابوشریح ؓ نے روکا)

ابن بطال نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ علماء سنت کے نزدیک یزید اور عبدالملک سے زیادہ خلافت کے اہل تھے کیونکہ ان کی بیعت ان دونوں سے قبل ہو چکی تھی اور وہ نبی اکرم ﷺ کی شرف صحبت سے بھی ممتاز تھے امام مالکؒ کا قول ہے کہ ابن زبیر ؓ، عبدالملک سے اولیٰ تھے۔ (عمدۃ القاری ص۵۴۱ ج۱)

حافظ ابن حجرؒ نے اس واقعہ کو اس طرح لکھا: حضرت معاویہ ؓ نے اپنے بعد یزید کو خلافت کے لیے نامزد کیا تھا۔ اور لوگوں نے بیعت کرلی تھی مگر حضرت حسین بن علی ؓ اور حضرت ابن زبیر ؓ نے بیعت نہیں کی تھی حضرت ابن ابی بکر ؓ کی وفات، حضرت معاویہ ؓ کی وفات سے پہلے ہی ہوگئی تھی حضرت ابن عمر ؓ نے حضرت معاویہ ؓ کی وفات کے بعد یزید کی بیعت کرلی تھی حضرت حسین ؓ کوفہ تشریف لے گئے اور ان کا انکار بیعت ہی بالآخر انکی شہادت کا سبب بنا حضرت ابن زبیر ؓ نے مکہ معظمہ جاکر بیت اللہ کی پناہ لی جس سے ان کا نام عائذ البیت ہو گیا تھا چونکہ مکہ معظمہ کے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔ ان کو وہاں غلبہ وشوکت حاصل ہوگئی (غالباً اسی لیے وہاں ان کے خلاف کوئی موثر اقدام نہ کیا جاسکا اور یزید نے مدینہ طیبہ سے فوجیں بھجوانے کا انتظام کیا) فتح الملہم وغیرہ میں یہ بھی ہے کہ عمرو بن سعید ؓ نے لشکر کا سردار عمرو بن زبیر کو بنایا تھا جو اپنے بھائی حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ سے عداوت رکھتا تھا جب یہ لشکر مقام ذی طوی پر پہنچا تو حضرت ابن زبیر ؓ کے حامیوں کی ایک جماعت مکہ معظمہ سے نکلی اور اس لشکر کو شکست دی سپہ سالار عمرو بن زبیر ؓ عارم کے جیل خانہ میں قید کر دیئے گئے اس سے پہلے عمرو بن زبیر ؓ چونکہ والی مدینہ کی پولیس گارڈ میں تھے اور مدینہ طیبہ میں بہت سے لوگوں کو حضرت ابن زبیر ؓ سے تعلق کی تہمت لگا کر زدوکوب کر چکے تھے انکے قصاص میں عمرو بن زبیر ؓ کی جیل کے اندر پٹائی ہوئی۔ اور ان ضربوں ہی سے وہ وفات پاگئے۔

آگے فتح الباری میں ہے کہ یزید برابر امراء مدینہ کو حکم بھیج کر حضرت ابن زبیر ؓ سے قتال کے لیے لشکر بھجواتا رہا حتیٰ کہ پھر اہل مدینہ نے بھی متفق ہو کر یزید کی بیعت توڑ دی (فتح الباری ص۱۴۲ ج۱)

(۱۰۵) حَدَّثَنَا عَبْدُاللهِ بْنُ عَبْدِالْوَهَّابِ قَالَ ثَنَا حَمَّادٌ عَنْ اَيُّوبَ عَن محمدٍ عَنْ اَبِىْ بَكْرَةَ ذَكَرَ النَّبِىَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاِنَّ دِمَآءَ كُمْ وَاَمْوَالَكُمْ قَالَ مُحَمَّدٌ وَاَحْسِبُهُ قَالَ وَاَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِىْ شَهْرِكُمْ هٰذَا اَلَا لِيُبَلِّغَ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ وَكَانَ مُحَمَّدٌ يَقُوْلُ صَدَقَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ ذٰلِكَ اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ مَرَّتَيْنِ.

ترجمہ: محمد روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابوبکرہ نے رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا کہ آپ نے یوں فرمایا تمہارے خون اور تمہارے مال۔ محمد کہتے ہیں کہ میرے خیال میں آپ ﷺ نے اعراضکم کا لفظ بھی فرمایا، یعنی اور تمہاری آبروئیں تم پر حرام ہیں، جس طرح تمہارے آج

کے دن کی حرمت تمہارے اس مہینہ میں، سن لو، یہ خبر حاضر، غائب کو پہنچادے اور محمد کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا، (پھر) دوبار فرمایا کہ کیا میں نے (اللہ کا حکم) تمہیں نہیں پہنچادیا؟

تشریح: گذشتہ حدیث میں مکہ مکرمہ کے بقعہ مبارک کی حرمت بہ لحاظ خون ریزی کی ممانعت اور وہاں کے درخت وغیرہ نہ کاٹنے کے لیے تھی یہاں حدیث میں خون ریزی کی ممانعت کے ساتھ مال وآبرو کی بھی نہایت حرمت وحفاظت کی تاکید، اور دماء، اموال واعراض سب کو اس بلد مقدس اور اس ماہ ودن کی طرح محترم فرمایا گیا، اور یہاں چونکہ ان چیزوں کی حرمت مطلقاً ذکر فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف اس بلد مقدس کے اندر، اور نہ صرف ماہ معظم ویوم محترم کے اندر مسلمانوں کی جانیں، ان کے مال وآبروئیں ایک دوسرے پر حرام ہیں بلکہ مسلمانوں کا فرض خاص ہے کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی عزت وآبرو، مال وجان کی غائب وحاضر دل وجان سے حفاظت کریں "اشداء[1] علی الکفار رحماء بینھم" (کافروں کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں نرم دل، رحم وکرم کے پیکر مجسم جیسے صحابہ کرام تھے)

نیز ایک بار آنحضرت ﷺ نے بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہوکر فرمایا کہ اے بیت معظم! تیری عزت وحرمت خدا کے یہاں اور ہمارے قلوب میں بے انتہا ہے، مگر ایک مسلمان کی حرمت وعزت خدا کے یہاں تجھ سے زیادہ ہے، آج مسلمان ان ہدایات اسلامی کی روشنی میں اپنے حالات کا جائزہ لیں تو کیا واقعی ہم ایک مسلمان مردوعورت کی جان ومال وآبرو کی عزت وحرمت کا پاس ولحاظ اس درجہ میں کرتے ہیں یا نہیں، جتنا کہ مطلوب ہے، اگر نہیں تو اس امر کی صلاح پہلی فرصت میں ضروری وفرض ہے تاکہ ہم سب خدا کے غصہ وغضب سے محفوظ رہیں۔

بحث ونظر

قال محمد واحسبہ الخ میں محمد سے مراد محمد بن سیرین ہے، جو اس حدیث کے رواۃ میں ہیں۔　　(عمدۃ القاری ص ۵۴۶ ج ۱)

کان محمد یقول صدق اللہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم، کان ذلک (محمد بن سیرین کہا کرتے تھے کہ خدا اور رسول خدا ﷺ نے سچ فرمایا، اور جس طرح فرمایا تھا، اسی طرح ہوا) یہ جملہ معترضہ ہے یعنی حدیث رسول کے درمیان میں آ گیا آ گے "**الاھل بلغت**" ارشاد رسول اللہ ﷺ ہے،

یہاں ایک بحث ہے کہ محمد بن سیرین نے جو **کان ذلک** (اسی طرح ہوا) فرمایا، اس کا اشارہ کس طرف ہے؟ علامہ کرمانی نے کہا کہ اشارہ **لیبلغ الشاھد** کی طرف تو اس لئے نہیں ہوسکتا کہ وہ امر وانشاء ہے۔ اور تصدیق وتکذیب کسی خبر کی ہوا کرتی ہے۔

پھر جواب دیا کہ یا تو ابن سیرین کے نزدیک روایت لیبلغ بفتح اللام ہوگی یا امر بمعنی خبر ہوگا لہٰذا حضور اکرم ﷺ نے خبر دی کہ میری اس بات کو شاہد غائب تک پہنچائیں گے، یا یہ اشارہ تتمہ حدیث کی طرف ہے کہ شاہد غائب کو پہنچائے، ایسا بھی ہوگا کہ جس کو وہ بات پہنچے گی، وہ مبلغ سے زیادہ حفظ وفہم والا ہوگا، یا اشارہ مابعد کی طرف ہے، کیونکہ حضور ﷺ کا قول آخر میں **الاھل بلغت** آرہا ہے، مطلب یہ کہ

---

[1] واضح ہو کہ یہ اشداء علی الکفار والی بات جنگ وجدال اور کافروں کے معاندانہ رویہ کے مواقع میں ہے، ورنہ مسلمانوں کے ساتھ اگر ان کے معاہدات ہوں، ان کی طرف سے ہمدردی وخیر سگالی ہو، خلوص ومحبت ہو یا مسلمانوں کی حکومت میں وہ ذمی ورعایا ہوں، تو پھر کفار کے ساتھ بھی مسلمانوں یا مسلم حکومت کا بہترین خیر خواہی وخیر سگالی کا رویہ ہوتا ہے، بلکہ دنیا کے کسی مذہب والوں کا دوسرے مذہب والوں کے ساتھ اس قسم کا بہترین سلوک ثابت نہیں ہوا، حتیٰ کہ ایک غیر مسلم ذمی کی کوئی برائی وغیبت ہم گھروں کے اندر پوشیدہ بیٹھ کر بھی نہیں کرسکتے، کیونکہ اس کی آبرو وعزت کی حفاظت حاضر وغائب ہر حالت میں ہمارا فرض ہوگی، اس طرح ایک مسلمان اگر غیر مسلم ذمی کو بے استحقاق قتل کردے تو اس مسلمان کو اس کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔

حضور علیہ السلام کے ارشادات کی تبلیغ آگے امت کو ہوگی، اور اشارہ مابعد کی طرف ایسے ہوگیا جیسے هذا فراق بینی و بینک میں ہوا کہ فراق تو بعد کو ہوا مگر اشارہ اس کی طرف پہلے ہی ہوگیا، حافظ محقق عینی نے علامہ کرمانی کے مذکورہ بالا چار احتمالات و جوابات نقل کر کے فرمایا کہ پہلا جواب معقول ہے بشرطیکہ لام کے زبر والی روایت ثابت ہو، اور امر کا بمعنی خبر ہونا قرینہ کا محتاج ہے، اس کے بعد اشارہ مابعد والی صورت سے بہتر یہ ہے کہ اشارہ اس تبلیغ کی طرف ہو جائے جو لیبلغ الشاہد کے اندر موجود ہے، اور مطلب یہ ہوگا کہ جس تبلیغ کا حکم حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ شاہد غائب کو کردے وہ وقوع میں آچکی، (عمدۃ القاری ۵۴۷ ج ۱)

حضرت شاہ صاحب کا ارشاد

آپ نے فرمایا کہ مذکورہ جملہ معترضہ کا مقصد حضور اکرم علیہ السلام کے ارشاد کی تصدیق ہے کہ جو کچھ آپ علیہ السلام نے خبر دی تھی، وہ اسی طرح ظہور میں آئی اور ثابت ہوگیا، کہ بہت سے غائب، سامع سے زیادہ حفظ و فہم والے ہوں گے، حضرت شاہ صاحب کے ارشاد مذکور کی روشنی میں یہ بات منقح ہوئی کہ ایک جزو تو حافظ عینی کا لے لیا جائے، اور دوسرا جز و علامہ کرمانی کا، جس میں تتمہ حدیث کی طرف اشارہ تھا، اور اس طرح جواب مکمل صورت میں ہوگیا۔

اس موقع پر حافظ ابن حجر نے کوئی تحقیقی بات نہیں لکھی، اور مطبوعہ بخاری شریف ص ۲۱ کے حاشیہ نمبر ۷ میں جو عبارت عمدۃ القاری کی نقل ہوئی ہے، وہ ناقص و مختل تھے، جس سے حافظ کرمانی کی رائے کو حافظ عینی کی رائے سمجھا جائے گا، اس لئے ہم نے جو بات اوپر لکھی ہے، وہ مراجعت کے بعد اور مکمل لکھی ہے، فافهم و تشکر و العلم عند الله

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے

آپ نے شرح تراجم صحیح البخاری میں فرمایا کہ صدق بمعنی وقع ہے، یعنی جو کچھ نبی کریم علیہ السلام نے حکم فرمایا تھا، اس کی تعمیل کی گئی اور اس طرح محاورات میں استعمال بھی ہوا ہے، اور میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ یہ اشارہ تتمہ حدیث "رب مبلغ اوعی من سامع" کی طرف ہے۔

حضرت اقدس مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کا ارشاد

فرمایا صدق رسول اللہ علیہ السلام کا یہ مطلب ہے کہ اپنی امت میں جن شرور، فتن، باہمی قتل و خون ریزی وغیرہ کا آپ علیہ السلام کو ڈر تھا، اور اسی لئے آپ علیہ السلام نے سخت سے سخت تاکید فرما کر امت کو ان سے ڈرایا تھا، اور سب مسلمانوں کی جان و مال و عزت کا بڑے سے بڑا احترام سکھایا تھا، وہ باتیں ہو کر رہیں، یعنی آپ علیہ السلام کی وفات سے تھوڑے ہی دن بعد سے فتنوں کی ابتداء ہو کر باہمی قتل و قتال، خونریزی، نہب اموال اور ہتک حرمات وغیرہ امور پیش آگئے، اس طرح اگرچہ آپ علیہ السلام نے حدیث الباب میں خون ریزی وغیرہ کی صراحۃً خبر نہیں دی تھی، مگر قتل و قتال وغیرہ کے بارے میں تاکیدات (ان دماء کم و اموالکم و اعراضکم الخ) سے یہ بات ظاہر ہو چکی تھی۔

تاکیدی احکامات ان ہی اوامر و واجبات کے بارے میں دیئے جاتے ہیں جن کی بجا آوری سے غفلت کا خیال ہوتا ہے، اور سخت تنبیہات ان ہی نواہی و منکرات کے متعلق کی جاتی ہیں، جن کے ارتکاب کا خطرہ ہوتا ہے، اس لئے محمد بن سیرین کہا کرتے تھے کہ جن باتوں کا حضور علیہ السلام کو ڈر تھا، وہ باتیں پیش آکر ہی رہیں، اور حضور علیہ السلام کا ڈر و خوف صحیح ہوگیا۔ حضرت العلام شیخ الحدیث سہارنپوری دامت برکاتہم

نے حضرت گنگوہیؒ کی اس توجیہ پر فرمایا کہ یہ توجیہ سب سے بہتر معلوم ہوتی ہے، کیونکہ مسلمانوں کے اندر بگاڑ حد کو پہنچ کر خون ریزی تک نوبت پہنچ جانا، جس سے حضور اکرم علیہ السلام نے نہایت تاکید سے روکا تھا، یہ بات تصدیق ہی کے لائق تھی، (اسی لئے راوی حدیث ان واقعات پر نظر کرکے بے ساختہ حدیث کی روایت کے درمیان ہی میں صدق رسول اللہ علیہ السلام کہہ دیا کرتے تھے) پھر فرمایا کہ بخاری شریف کی کتاب الفتن ص ۱۰۴۸ میں ایک حدیث آئے گی " رب مبلغ یبلغه من هو اوعی له وکان کذلک فقال لاترجعو ابعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض الحدیث اس سے بھی حضرت شیخ المشائخ کے نظریات کی تائید ہوتی ہے　(لامع ص ۵۷)

حضرت مرشدی العلام مولانا حسین علی صاحب قدس سرہ نے بھی اپنے شائع کردہ تقریر درس بخاری حضرت گنگوہیؒ میں ذلک کا اشارہ قتال کی طرف ہی درج کیا ہے، یعنی جس قتال کا حضور علیہ السلام کو ڈر تھا وہ آپ علیہ السلام کے بعد واقع ہو کر ہی رہا۔

حضرت شیخ الاسلام نے شرح البخاری شریف میں دوسری توجیہات سے صرف نظر کرکے صدق کو مجرد تصدیق قول رسول پر محمول کیا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

بَابُ اِثْمِ مَنْ كَذَبَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

رسول خدا علیہ السلام کی طرف نسبت کرکے جھوٹی روایت کرنے کا گناہ

(۱۰۶) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ اَنَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِيْ مَنْصُوْرٌ قَالَ سَمِعْتُ رِبْعِيَّ ابْنَ حِرَاشٍ يَّقُوْلُ سَمِعْتُ عَلِيًّا يَّقُوْلُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَكْذِبُوْا عَلَيَّ فَاِنَّهٗ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَلِجِ النَّارَ.

(۱۰۷) حَدَّثَنَا اَبُو الْوَلِيْدِ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ جَامِعِ بْنِ شَدَّادٍ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ لِلزُّبَيْرِ اِنِّيْ لَآ اَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا يُحَدِّثُ فُلَانٌ وَّفُلَانٌ قَالَ اَمَا اِنِّيْ لَمْ اُفَارِقْهُ وَلٰكِنْ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ.

(۱۰۸) حَدَّثَنَا اَبُوْ مَعْمَرٍ قَالَ ثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ عَبْدِالْعَزِيْزِ قَالَ اَنَسٌ اِنَّهٗ لَيَمْنَعُنِيْ اَنْ اُحَدِّثَكُمْ حَدِيْثًا كَثِيْرًا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِبًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ.

(۱۰۹) حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ حَدَّثَنَا يَزِيْدُ بْنُ اَبِيْ عُبَيْدٍ عَنْ سَلَمَةَ هُوَابْنُ الْاَكْوَعِ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ يَّقُلْ عَلَيَّ مَالَمْ اَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ.

(۱۱۰) حَدَّثَنَا مُوْسٰى قَالَ ثَنَا اَبُوْ عَوَانَةَ عَنْ اَبِيْ حُصَيْنٍ عَنْ اَبِيْ صَالِحٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَسَمُّوْا بِاسْمِيْ وَلَا تَكْتَنُوْا بِكُنْيَتِيْ وَمَنْ رَّاٰنِيْ فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَاٰنِيْ فَاِنَّ الشَّيْطٰنَ لَا يَتَمَثَّلُ فِيْ صُوْرَتِيْ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ.

ترجمہ ۱۰۶: منصور نے ربعی بن حراش سے سنا کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:۔ رسول اللہ علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ مجھ پر جھوٹ مت بولو، کیونکہ جو مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ ضرور دوزخ میں داخل ہوگا۔

ترجمہ ۱۰۷: حضرت عبداللہ بن زبیرؓ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد زبیرؓ سے عرض کیا کہ میں نے کبھی آپ سے رسول اللہ ﷺ کی احادیث نہیں سنیں، جیسا کہ فلاں اور فلاں بیان کرتے ہیں؟ زبیرؓ نے جواب دیا کہ سن لو، میں رسول اللہ ﷺ سے کبھی جدا نہیں ہوا لیکن میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے (اسی لئے میں حدیث رسول بیان نہیں کرتا)

ترجمہ ۱۰۸: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے بہت سے حدیثیں بیان کرنے سے یہ بات روکتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ پر عمداً جھوٹ باندھے تو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

ترجمہ ۱۰۹: حضرت یزید ابی عبید نے سلمہ ابن الاکوعؓ کے واسطے سے بیان کیا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص میری نسبت وہ بات بیان کرے جو میں نے نہیں کہی تو اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔

ترجمہ ۱۱۰: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے نام کے اوپر نام رکھو مگر میری کنیت اختیار نہ کرو اور جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا تو بلاشبہ اس نے مجھے ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا اور جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانہ تلاش کرے۔

تشریح: یہ باب امام بخاریؒ نے اس لیے باندھا ہے کہ علم کی فضیلت، تبلیغ کی اہمیت اور احادیث رسول ﷺ کی اشاعت کی ضرورت و اہتمام کے ساتھ یہ بھی بتلادیں کہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے کوئی غلط بات منسوب کر کے پیش کرنا نہایت ہی مضر ہے اور اس سے چونکہ دین کو نقصان پہنچتا ہے حدیث گھڑ کر پیش کرنے والے کے لیے عذاب جہنم مقرر کیا گیا ہے اور اس باب میں امام بخاریؒ نے پانچ حدیث روایت کیں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ ان کی ترتیب بہت ہی اچھی رکھی گئی ہے پہلے حضرت علیؓ کی روایت لائے جس سے مقصود باب اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے اور پھر حضرت زبیرؓ کی حدیث ذکر کی جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے طریقہ کو بتلا رہی ہے کہ وہ کس طرح حدیث بیان کرنے میں انتہائی احتیاط فرماتے تھے۔ حتیٰ الامکان آنحضرت ﷺ کی طرف کسی بات کی نسبت کرنے سے احتراز کرتے تھے کہ کہیں بیان میں غلطی نہ ہو جائے جس سے وعید مذکور کے مستحق بن جائیں پھر حضرت انسؓ کی روایت بیان کی جس سے یہ معلوم ہو کہ نفس حدیث بیان کرنے سے نہیں رکتے تھے کیونکہ وہ تبلیغ دین و اشاعت علوم نبوت پر مامور تھے بلکہ روایت کی زیادتی سے بچتے تھے کہ کسی امر کی زیادتی اور افراط ہی خلاف احتیاط ہوا کرتی ہے۔

(یہاں حافظ نے چوتھی حدیث مسلمہ بن الاکوع کا ذکر نہیں کیا شاید اس لیے کہ اس کا اور سابقہ احادیث کا مفاد واحد ہے البتہ یہ فرق ہے کہ اور احادیث میں مطلق کذب کا ذکر ہے خواہ قولی ہو یا فعلی اور اس میں من یقل علی مالم اقل ہے جس میں قولی کذب کو خاص طور سے غالباً اکثری ہونے کے سبب ذکر کیا گیا ہے)

آخر میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث لائے جس میں اشارہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی طرف کسی قول و فعل کی نسبت غلط طور سے کرنا خواہ اس کی بنیاد بیداری کی سماع و رؤیت پر ہو یا خواب کے، دونوں حالت میں حرام و ناجائز ہے۔

اس کے بعد حافظؒ نے یہ بھی تحقیق فرمائی کہ حدیث من کذب علی الخ بہت سے طرق سے صحاح وغیر صحاح میں مروی ہے اور بہت سے حفاظ حدیث نے اس کے طرق جمع کرنے کی طرف بھی خاص توجہ کی ہے امام نوویؒ نے تو دو سو صحابہ تک سے روایت کا ذکر کیا ہے مگر

ان میں صحیح حسن، ضعیف اور ساقط سب ہی قسم کی روایات ہیں۔ (فتح الباری ۱۴۵ ج ۱)

حضرت سلمہ ابن الاکوع کے حالات

مذکورہ پانچ احادیث کے رواۃ صحابہ میں سے چوتھی حدیث کے راوی سلمہ ہیں آپ کی کنیت ابومسلم، ابو یاس، اور ابو عامر تھی بیعت رضوان میں حاضر ہو کر تین بار بیعت کی اول وقت لوگوں کے ساتھ پھر درمیان کے لوگوں کے ساتھ پھر آخر میں دوسروں کے ساتھ آپ سے حدیث روایت کی گئیں بڑے بہادر مشہور تیرانداز تھے اور تیز دوڑنے میں گھوڑوں میں آگے نکل جاتے تھے صاحب فضل وکمال اور سخی تھے یہ بھی منقول ہے کہ آپ سے ایک بھیڑیئے نے باتیں کیں۔

آپ کا بیان ہے کہ میں نے ایک بھیڑیا دیکھا جس نے ہرن کو دبوچ لیا تھا میں اس کے پیچھے دوڑا اور ہرن کو اس سے چھین لیا وہ بھیڑیا کہنے لگا آپ تو عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں بھلا آپ کو میرے پیچھے لگنے کی کیا ضرورت تھی مجھے خدا نے ایک رزق دیا تھا جو آپ کی ملک بھی نہ تھا پھر بھی آپ بیچ میں کود پڑے اور مجھ سے اس کو چھین لیا میں نے سخت حیرت سے کہا لوگو! دیکھو کیسی عجیب بات ہے بھیڑیا باتیں کررہا ہے؟ اس پر وہ بھیڑیا کہنے لگا یہ بھی کوئی تعجب کی بات ہے اس سے زیادہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ خدا کا رسول ﷺ مبعوث ہو کر کھجوروں کے باغوں والے شہر میں تمہیں خدا کی عبادت کی طرف بلا رہا ہے اور تم اس سے منحرف ہو کر بتوں کی عبادت میں لگے ہوئے ہو" سلمہ کہتے ہیں میں اس کی یہ بات سن کر سیدھا حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور اسلام سے مشرف ہو گیا۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۵۵۵)

ثلاثیات بخاری: حافظ ابن حجرؒ نے حدیث ۱۰۹ کے بارے میں لکھا کہ یہ حدیث صحیح بخاری کی پہلے ثلاثی ہے اور میں نے اس میں سے ثلاثیات کو الگ نکالا تو وہ بیس سے اوپر ہوئیں۔

حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری دام ظلہم نے حاشیہ لامع الدراری ج ۱ ص ۵۷ میں لکھا کہ ان کی تعداد ۲۲ ہے اور سب سے آخری حدیث خلاد بن یحییٰ کی باب قولہ تعالیٰ **وکان عرشہ علی الماء** میں ہے اور یہ مکی بن ابراہیم راوی حدیث امام اعظم کے تلامذہ حدیث میں سے ہیں جس کی تصریح حافظ نے مکی بن ابراہیم کے حالات میں کی ہے۔ (تہذیب ج ۱ ص ۲۹۳) مگر حضرت امام صاحب کے حالات میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ دارمی کے پاس ثلاثیات بخاری سے بھی زیادہ ہیں کیونکہ وہ عمر میں بخاری سے بڑے ہیں اور کچھ ثلاثیات ابن ماجہ کے پاس بھی ہیں باقی دوسرے ارباب صحاح میں سے کسی کے پاس نہیں ہیں اور مسند امام اعظم میں ثنائیات بھی ہیں اور محقق یہ ہے کہ امام صاحب روایت کے لحاظ سے تابعی اور تواریت کے اعتبار سے تبع تابعی تھے کیونکہ اس بات کو سب ہی نے تسلیم کرلیا ہے کہ آپ نے حضرت انس ؓ کو دیکھا تھا۔

حضرت شیخ الحدیث موصوف نے یہاں یہ بھی لکھا کہ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالک کی روایات اکثر ثنائی ہیں، لہٰذا ان دونوں کے مسلک و مذہب بھی سب سے اعلیٰ اور برتر ہونے چاہئیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

بحث و نظر

جھوٹی حدیث بیان کرنے والے کا حکم

علامہ محقق حافظ عینیؒ نے حدیث **من کذب علی** پر سات اہم علمی فوائد لکھے ہیں جن میں سے اول یہ ہے کہ حضور ﷺ کی طرف جان بوجھ کر

جھوٹی بات منسوب کرنے والے پر حکم شرعی کیا عائد ہوتا ہے مشہور یہ ہے کہ اس کی تکفیر نہیں کرینگے بجز اسکے کہ وہ حلال سمجھ کر ایسا کرے امام الحرمین نے اپنے والد ماجد کا قول نقل کیا ہے کہ وہ تکفیر کرتے تھے اور اس کو ان کے تفردات سے قرار دیا (اسی طرح امام الحرمین کے بعد بھی علماء نے اس قول کی تغلیط کی ہے کما صرح بہ الحافظ فی الفتح ج ا ص ۱۴۵ امام نووی نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ایک حدیث میں بھی عمداً جھوٹ بولے تو وہ فاسق ہے اور اس کی تمام روایات کو رد کیا جائے گا ابن صلاح نے کہا کہ اس کی کوئی رویت بھی کبھی قبول نہ ہوگی نہ اس کی توبہ قبول ہوگی بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے قطعی طور پر مجروح ہو گیا جیسا کہ ایک جماعت علماء نے کہا ہے جن میں سے امام احمد ابوبکر حمیدی (شیخ البخاری) اور ابوبکر صیرفی شافعی ہیں) صیرفی نے یہ بھی کہا کہ جس شخص کا یک بار بھی اہل نقل کے یہاں جھوٹ ثابت ہو جائے گا اسکی روایت گر جائے گی تو پھر کسی توبہ سے اس کو درجہ قبول حاصل نہ ہوگا اور جس کو ایک مرتبہ کسی وجہ سے ضعیف قرار دیا جائے گا پھر اس کو کبھی قوی نہیں کہیں گے۔

امام نوویؒ کا فیصلہ:

امام نوویؒ نے فرمایا کہ جو کچھ ان حضرات ائمہ نے ذکر کیا ہے، قواعد شرعیہ کے خلاف ہے، اور مسلک مختار یہی ہے کہ ایسے شخص کی توبہ اگر پوری شرطوں کے ساتھ ثابت ہو جائے تو اس کو صحیح مان کر اس کی روایت کو ضرور قبول کریں گے، اسلام لانے کے بعد کافر کی روایت مقبول ہونے پر اجماع ہے، اور اکثر صحابہ ایسے ہی تھے، پھر بھی ان کی قبول شہادت پر اجماع رہا ہے، شہادت و روایت میں کیا فرق ہے؟

حافظ عینی کا نقد

حافظ عینیؒ نے امام نوویؒ کے مذکورہ فیصلہ پر نقد کرتے ہوئے فرمایا کہ امام مالکؒ سے منقول ہے: جھوٹے گواہ کی جب شہادت جھوٹی ثابت ہو جائے تو اس کے بعد اس کی شہادت نہیں سنی جائے گی، خواہ وہ توبہ کرے یا نہ کرے، اور امام ابوحنیفہ و امام شافعیؒ نے اس شخص کے حق میں، جس کی شہادت ایک مرتبہ فسق کی وجہ سے رد ہو گئی ہو، پھر اس نے توبہ کر لی اور اس کا حال بہتر ہو گیا ہو، فرمایا کہ اس کی شہادت دوبارہ قبول نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کی سچائی متہم ہو چکی ہے نیز امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جب زوجین میں سے کسی ایک کی شہادت دوسرے کے حق میں رد ہو جائے، پھر وہ توبہ کرے تو اس کی روایت تہمت کی وجہ سے قبول نہ ہوگی، کیا بعید ہے کہ اس میں بھی جھوٹ بولے، روایت بھی شہادت ہی کی ایک قسم ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۵۵۰ ج ۱)

حضرت شاہ صاحب کا ارشاد:

فرمایا: جمہور نے عمداً کذب علی النبی ﷺ کو شدید ترین گناہ کبیرہ قرار دیا ہے اور کبائر فقہا میں سے ابومحمد جوینی (والد۔امام الحرمین) نے اس کو کفر کہا ہے، اس کی تائید متاخرین میں سے شیخ ناصر الدین بن المنیر، اور ان کے چھوٹے بھائی زین الدین بن المنیر نے کی ہے۔

فرمایا کہ جن لوگوں نے کذب علی النبی اور کذب للنبی میں فرق کیا، وہ جاہل ہیں کیونکہ نبی کی طرف جو جھوٹ بھی منسوب ہوگا وہ خلاف نبوت ہی ہوگا، اسی لئے ترغیب و ترہیب کے لئے بھی جھوٹی روایت کرنا جائز نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر کا ارشاد

لا تکذبوا علی پر لکھا ہے کہ نہی مذکور ہر جھوٹ بولنے والے، اور ہر قسم کے جھوٹ کو شامل ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ میری طرف

جھوٹی بات کو ہرگز منسوب نہ کرو، پھر علیؔ کا یہاں کوئی مفہوم ومنشا نہیں ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کے لئے جھوٹ بولنے کی کوئی صورت نہیں ہے، آپ ﷺ نے تو مطلقاً جھوٹ بولنے سے منع فرمایا ہے، بعض جاہل لوگ علیؔ کی وجہ سے دھوکہ میں پڑ گئے اور ترغیب وترہیب کی غرض سے احادیث وضع کردیں، کہا کہ ہم نے حضور ﷺ کے خلاف کوئی بات نہیں کی، بلکہ آپ کی شریعت کی تائید ہی کی ہے ایسا کیا ہے، ان لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ نبی ﷺ کی طرف منسوب کرکے ایسی بات کہنا جوانہوں نے ارشاد نہیں کی، خدا پر جھوٹ باندھنا ہے، کیونکہ وہ بمنزلہ اثبات حکم شرعی ہے، خواہ وہ حکم ایجابی ہو یا استحبابی، اور ایسے ہی اس کے مقابل حرمت کا حکم ہو یا کراہت کا۔

کرامیہ کی گمراہی

فرقہ کرامیہ میں سے کچھ لوگوں نے جھوٹی حدیث وضع کرنے کو قرآن وسنت کی ہدایات واحکام کی تقویت کے لئے جائز قرار دیا ہے، اورانہوں نے بھی استدلال میں بھی یہی کہا کہ یہ رسول خدا ﷺ کے لئے جھوٹ ہے، ان کے خلاف منشا نہیں ہے، حالانکہ یہ لغت عربیہ سے ناواقفی کی بات ہے اور بعض لوگوں نے اس زیادتی سے استدلال کیا ہے جواس حدیث کے بعض طرق میں مروی ہے، حالانکہ وہ ثابت نہیں ہے، بزار میں بروایت حضرت ابن مسعودؓ سے اس طرح روایت ہے **من کذب علی لیضل به الناس الحدیث**، جس کے وصل وارسال میں بھی اختلاف ہے اور برتقدیر ثبوت اس میں لام بیان علت کے لئے نہیں ہے بلکہ لام صیر ورۃ ہے، جس طرح آیت قرآنی، **فمن اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا لیضل الناس** میں ہے، یا ایسا ہے کہ جس طرح عام کے بعض افراد کا ذکر کسی خاص اہمیت یا اظہار شناعت وبرائی کے طور پر کردیا کرتے ہیں، صرف وہی افراد مراد نہیں ہوتے، بلکہ حکم عام ہی رہتا ہے۔ جیسے **لا تاکلوا الربا اضعافا مضاعفة یالا تقتلوا اولادکم من املاق** میں ظاہر ہے ان سب آیات میں اضلال **مضاعفة الربا** اور من املاق کا ذکر صرف تاکید امر کے لیے ہے تخصیص حکم کے لیے نہیں ہے (فتح الباری ج ۱ ص ۱۴۳)

افادات انور: فرمایا دنیا میں سب سے زیادہ پختہ ومستحکم نقل محدثین کی ہوتی ہے پھر فقہاء کی پھر اہل سنت کی جو صحیح معنی میں محدث وفقیہ ہوگا اور ایسی حدیث بیان نہیں کرے گا جس کی کوئی اصل نہ ہو یا کتب حدیث میں اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو اسی لیے میں امام صاحب وغیرہ کے مناقب بھی محدثین ہی سے لیا کرتا ہوں۔

جولوگ صرف فن معقول ہی سے شغف رکھتے ہیں ان میں سے اکثر کو دیکھا کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے حدیث کیا ہے؟ اسانید سے بحث کیا ہوتی ہے؟ نہ وہ حدیث صحیح کو حدیث موضوع سے تمیز کرسکتے ہیں فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ. حضرتؒ نے ترجمہ فرمایا ''تیاری کرلے دوزخ میں جانے کی''

وعید کے مستحق کون ہیں؟

حافظ عینیؒ نے لکھا کہ کسی حدیث کو موضوع جانتے ہوئے بیان کردے اور اس کے موضوع ہونے کو ظاہر نہ کرے تو وہ بھی اس وعید کا مستحق ہوگیا اور اگر حدیث کا اعراب غلط پڑھے جس سے مطلب الٹ جائے تو وہ بھی وعید کا مستحق ہوگا۔

فرمایا: میرے نزدیک اگر احادیث کی معتبر کتابوں کے علاوہ کسی کتاب سے حدیث نقل کرے، بغیر یہ جانے ہوئے کہ اس کا مصنف

محدث ہے یا نہیں، تو وہ بھی وعید کا مستحق ہے، مقصد یہ ہے کہ کسی ایسی کتاب سے حدیث نقل کرنے کے لئے علم جرح وتعدیل واسماء والرجال، سے واقف ہونا ضروری نہیں، بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس کے مصنف کے بارے میں محدث ہونے کا علم رکھتا ہو، بغیر اس کے نقل جائز نہیں ہے۔

مسانید امام اعظم

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر حدیث اور روایت حدیث کی اہمیت کی مناسبت سے حضرت امام الائمہ شیخ المحدثین امام ابوحنیفہؒ کی مسانید کا ذکر تفصیل سے فرمایا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ آپ کی مسانید کی جمع وتالیف امام صاحب کی وفات کے بعد عمل میں آئی ہے، مگر ان کی روایت کرنے والے بڑے بڑے ائمہ حدیث وحفاظ ومحدثین ہیں، جن میں امام حدیث ابوبکر مقری وابونعیم اصبہانی جیسے بھی ہیں لیکن بہت سے مسانید اس وقت مفقود ہیں، البتہ ہمارے پاس محدث خوارزمی کی جمع کی ہوئی مسانید کا مجموعہ موجود ہے (جو دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوا ہے، یہ بھی علماء حدیث کے لئے نہایت بڑی نعمت ہے، اس کی قدر کرنی چاہیے، بظاہر اس کے دوبارہ شائع ہونے کی توقع بھی نہیں ہے)

امام صاحب کی احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ امالی ابی یوسفؒ سے جمع کیا جا سکتا تھا، جن کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ ۶۰ یا ۸۰ جلدوں میں تھے، ان کا کوئی حصہ جرمن کے کتب خانے میں ہے، باقی کا پتہ نہیں لگتا، (**ولعل اللہ یحدیث بعد ذلک امرا**)

امام ابو یوسفؒ کے علمی حدیثی شغف کا یہ حال تھا کہ زمانہ قضا میں بھی املاء حدیث کے لئے مجلس منعقد کیا کرتے تھے۔ اور اسی زمانے میں امام احمد[1] وحافظ ابن معین پہنچے ہیں، اور آپ سے احادیث سنی ہیں حافظ ابن معین کی ایک روایت میری یادداشت میں محفوظ ہے کہ ''امام ابو یوسف کی ایک ایک مجلس میں ۶۰-۶۰ اور ۷۰-۷۰ حدیثیں بیان کرتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: ''ابن معین وہ ہیں کہ فن جرح وتعدیل میں ان سے بڑا کوئی نہیں ہے'' اگرچہ بعض لوگوں نے ان کو متعصب حنفی کہا ہے، مگر ''میزان'' سب ان ہی کا طفیل ہے'' (جس سے کوئی محدث مستغنی نہیں ہو سکتا)

فرمایا:۔ جامع صغیر میں احادیث نہیں ہیں، البتہ مبسوط میں ہیں، لیکن اس میں یہ مشکل ہے کہ طباعت کے اندر امام محمد اور شارح کا کلام ممیز نہیں ہوا ہے، اور احادیث کی اسناد حذف کردی گئی ہیں، جس سے پورا فائدہ حاصل نہ ہوا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام صاحبؒ کی مسانید کے بارے میں علامہ کوثریؒ وغیرہ کی تحقیق امام صاحبؒ کے تذکرہ میں گزر چکی ہے، مقدمہ میں دیکھ لی جائے اور یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کا قول اوپر درج ہو چکا ہے کہ امام صاحبؒ کی مسانید میں ثنائیات بھی ہیں، (جو مسانید امام کی بہت بڑی منقبت ہے) اسی کے ساتھ ہم نے لامع الدراری کے حاشیہ سے حضرت العلام شیخ الحدیث دامت برکاتہم کا یہ جملہ بھی نقل کیا تھا کہ ''روایات امام ابوحنیفہ وامام مالک میں اکثر ثنائی ہیں، پس ان دونوں کے مسلک سے اعلیٰ مسلک کس کا ہو سکتا ہے۔؟''

اس میں ہمیں تردد ہے اور اس کو نقل کرنے کے بعد سے اب تک دل میں یہ بات برابر کھٹکتی رہی، اب چونکہ یہ بحث ختم ہو رہی ہے، اس لئے اتنا عرض کرنا ضروری معلوم ہوا کہ بظاہر یہاں عبارت میں کچھ تسامح ہوا ہے، کیونکہ اتنی بات تو یقیناً صحیح ہے جو حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی فرمائی کہ امام صاحب کی مسانید میں ثنائیات ہیں، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بکثرت ہیں، مگر یہ بات غالباً معیار صحت پر نہ اترے گی،

---

[1] امام احمدؒ امام ابو یوسف کے تلمیذ حدیث ہیں، جیسا کہ ہم امام احمدؒ کے حالات میں بیان کر چکے ہیں کہ خود امام احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''سب سے پہلے مجھے حدیث کا علم ابو یوسف کی خدمت میں رہ کر حاصل ہوا، پھر اس میں ترقی کی۔'' اور فقہی وقت نظر کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ ''یہ چیز مجھے امام محمد کی کتابوں سے حاصل ہوئی'' (مقدمہ انوارالباری ص ۱۴۳ ج ۱)

خصوصاً موجودہ ومطبوعہ ذخیرہ مسانید کے پیش نظر کہ ان کی روایات کا اکثر حصہ ثنائیات پر مشتمل ہے۔ واللہ علم وعلمہ اتم واحکم۔

دیدار نبوی کے بارے میں تشریحات

حافظ عینیؒ نے لکھا کہ حدیث میں اس بارے میں متعدد الفاظ صحیح طور سے وارد ہوئے ہیں:

(۱) "ومن رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطان لا یتمثل فی صورتی" (۲) "من رآنی فقد رأی الحق" (۳) من رآنی فی المنام فسیرانی فی الیقظة اور (۴) من رآنی فی المنام فکانما رآنی فی الیقظة. پھر ایک روایت میں یہ بھی ہے۔ فانه لا ینبغی للشیطان ان یشتبه بی، اس میں دوسرا جملہ پہلے جملے کی تفسیر ہے (جس نے مجھے خواب میں دیکھا، اس نے مجھ ہی کو دیکھا، حق وحقیقت کو دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا، یا میری صورت بنا کر اشتباہ میں نہیں ڈال سکتا)

قاضی ابوبکر بن الطیب کی رائے

امام ماذری وغیرہ نے کہا کہ حدیث مذکورہ کی تفسیر وتاویل میں اختلاف ہوا ہے: قاضی ابوبکر الطیب نے فرمایا فقد رآنی کا مطلب یہ ہے کہ اس نے حق دیکھا، اس کا خواب صحیح ہے، اضغاث احلام سے نہیں ہے، نہ شیطانی اثر کے تحت ہے" (گویا حدیث میں خواب کے حق و صحیح ہونے کو بتلایا ہے، حضور علیہ کی رؤیت کا حق ہونا نہیں بتلایا اسی لئے) بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ حضور اکرم علیہ کو دیکھنے والا آپ کی منقول صورت وصفت پر نہیں دیکھتا، مثلاً سفید داڑھی کے ساتھ یا جسم کے دوسرے رنگ میں یا آپ کو ایک ہی وقت میں دو شخص اپنی اپنی جگہ پر دیکھتے ہیں، حالانکہ ان میں ایک مشرق میں ہوتا ہے دوسرا مغرب میں۔

قاضی عیاض وابوبکر ابن عربی کی رائے

اگر حضور اکرم علیہ کو صفت معلومہ پر دیکھا تو حقیقت تک رسائی ہوئی، ورنہ مثال کو دیکھا، اس کو رویائے تاویلی کہیں گے، کیونکہ بعض خوابوں کی تعبیر کھلی اور واضح ہوتی ہے، جیسا دیکھا اسی کے موافق ومطابق ہوا اور بعض خواب تاویل کے محتاج ہوتے ہیں۔

دوسرے حضرات محققین کی رائے

حدیث الباب اپنے ظاہری معنی پر ہے، مطلب یہ کہ جس نے خواب میں رسول اکرم علیہ کی زیارت کی، اس نے حقیقت میں آپ علیہ ہی کا ادراک کیا، اور اس میں کوئی مانع بھی نہیں، نہ عقل ہی اس کو محال قرار دیتی ہے، اور جو کوئی آپ علیہ کو آپ علیہ کی صفاست معلومہ کے خلاف دیکھتا ہے، اپنی تخیلات کی غلطی کے سبب سے دیکھتا ہے، عام طور سے عادتاً ایسا ہوتا ہی ہے کہ بیداری کے تخیلات خواب میں نظر آیا کرتے ہیں، لہٰذا ایسی صورت میں ذات تو حضور ہی کی مرئی ومشاہد ہوتی ہے۔ اور جو دوسری صفات دیکھی جاتی ہیں، ان کو متخیلہ غیر مرئیہ سمجھنا چاہیے۔

رہا یہ کہ ایک ہی وقت میں کئی جگہ مشرق ومغرب میں حضور علیہ کا ادراک کس طرح ہے؟ تو ادراک کے لئے نہ تحدیق ابصار شرط ہے (کہ نگاہیں ایک چیز کو گھیر لیں) اور نہ قرب مسافت ضروری ہے۔ (کہ دور کی چیز کا ادراک نہ ہو سکے) اور نہ زمین کے اندر یا باہر کسی مقرر جگہ

میں اس چیز کا مدفون ہونا شرط ہے، بلکہ اس چیز کا کہیں بھی موجود ہونا شرط ہے، اور احادیث سے یہ امر ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام کا جسم مبارک باقی ہے اور انبیاء علیہم السلام اجمعین کے اجسام میں زمین کوئی تغیر نہیں کر سکتی، پھر اس قسم کی صفات متخلیہ کے اثرات بھی بطور تعبیر خواب میں ظاہر ہوا کرتے ہیں، چنانچہ علماء تعبیر نے ذکر کیا ہے کہ اگر حضور علیہ السلام کو بوڑھا دیکھے، تو وہ سال امن وصلح کا ہوگا، جوان دیکھے تو وہ سال قحط کا ہو گا، اگر آپ علیہ السلام کو اچھی ہیئت میں، اچھے اقوال وافعال کے ساتھ مشاہدہ کرے اور اپنی طرف متوجہ دیکھے تو اس کے لئے بہت بہتر ہوگا، اس کے خلاف باتیں دیکھیں تو اس کے لیے برا ہوگا، لیکن حضور علیہ السلام پر ان سب باتوں میں سے کسی کا اثر نہ ہوگا، اور اگر دیکھے کہ حضور علیہ السلام نے ایسے شخص کو قتل کرنے کا حکم فرمایا، جس کا قتل شرعاً جائز نہیں، تو یہ بھی صفات متخیلہ غیر مرئیہ میں شمار ہوگا، غرض جس قسم کی بھی صفات غیر معلومہ اور امور خلاف شرع دیکھے گا وہ حدیث الباب کے مصداق سے خارج ہوں گی، اور ان کو رآئی کے تخیلات ومشاہدات خارجیہ کا اثر کہا جائے گا اور صرف حضور اکرم علیہ السلام کی مبارک ومقدس ذات کے ادراک وعمدہ احوال وافعال کے مشاہدہ کو حدیث کا مصداق قرار دیں گے۔

علامہ نووی کا فیصلہ: آپ نے فرمایا کہ قاضی عیاض وابوبکر بن العربی والا قول ضعیف ہے، اور صحیح وہی ہے جو دوسرے سب حضرات کی رائے ہے (اور آخر میں درج ہوئی) پھر فرمایا کہ فقد رآنی کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں میری مثال دیکھی، کیونکہ خواب میں مثال ہی دیکھی جاتی ہے اور **فان الشیطان لا یتمثل بہ** اس پر دلالت کرتا ہے (کہ مثال کا ذکر ہوا) اسی کے قریب امام غزالی کا قول بھی ہے، فرمایا: "اس کا معنی یہ نہیں کہ رائی نے میرا جسم وبدن دیکھا بلکہ مثال کو دیکھا۔ اور یہ مثال ہے رائی تک میرے دل کی بات پہنچانے کا ذریعہ ووسیلہ بن گئی، بلکہ بدن بھی بیداری کے وقت میں نفس کے لئے بطور آلہ ہی کے کام دیتا ہے، پس حق یہ ہے کہ جو کچھ خواب میں زیارت مقدسہ سے مشرف ہونے والا دیکھتا ہے، وہ حضور اقدس علیہ السلام ارواحنا فداہ کی حقیقت روح مبارک کی، جو کہ محل نبوت ہی مثال ہوتی ہے اور جو شکل نظر آتی ہے وہ حضور علیہ السلام کی روح یا جسم مبارک نہیں بلکہ اس کی مثال ہوتی ہے یہی تحقیقی بات ہے۔

سوال وجواب: حافظ عینیؒ نے مذکورہ بالا تحقیق انیق ذکر کر کے فرمایا: "اگر کوئی کہے کہ خواب تو تین قسم کے ہوتے ہیں: حق تعالیٰ کی طرف سے، شیطان کے اثر سے اور تحدیث نفس سے، احادیث الباب میں صرف من الشیطان والی قسم کی نفی ہوئی (کیونکہ فرمایا کہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا) تو کیا رویت منامی حضور علیہ السلام میں تحدیث نفس والی صورت جائز ہو سکتی ہے یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ جائز نہیں، اور اس کی دلیل ایک مقدمہ پر موقوف ہے، وہ یہ کہ دو شخصوں کی بیداری یا خواب میں جمع ہونا کسی اتحاد کے سبب ہوا کرتا ہے، اور اس کے پانچ اصول ہیں (۱) اشتراک ذاتی، (۲) اشتراک وصفی (ایک صفت میں ہو یا زیادہ میں) (۳) اشتراک حالی اور (یہ بھی کسی ایک حال میں ہو یا زیادہ میں)، (۴) اشتراک افعال (۴) اشتراک مراتب، جہاں بھی دو یا زیادہ چیزوں میں باہمی مناسبت دیکھو گے، ان پانچ کلی اصول سے باہر نہ ہوگی، اور جتنی یہ مناسبت قوی ہوگی، اتنا ہی ان کا باہم اجتماع بھی زیادہ ہوگا حتیٰ کہ کبھی دو شخصوں کو دیکھو گے کہ کبھی جدا نہیں ہوتے، اور ایسے ہی برعکس بھی ہوتا ہے۔

اسی سے یہ بھی سمجھ لو کہ جس کو اصول خمسہ مذکورہ حاصل ہو جائیں اور اس کے اور گزرے ہوئے لوگوں کی ارواح کے درمیان مناسبت مکمل ہو تو وہ ان کے ساتھ جب بھی چاہے جمع ہو سکتا ہے، پھر ظاہر ہے کہ تحدیث نفس میں کوئی صلاحیت اس امر کی نہیں کہ وہ کسی شخص اور نبی کریم علیہ السلام کے درمیان ایسی مناسبت پیدا کرا دے جو اجتماع کا سبب بن سکے، بخلاف موکل فرشتے کے کہ وہ لوح محفوظ والی مناسبت کو مثالی وجود کی صورت دے سکتا ہے۔ یعنی حق تعالیٰ جن پر انعام واکرام فرمائیں اس کا موکل فرشتہ حسب مناسبت، مثال روح مقدس کی زیارت سے مشرف کرا دیتا ہے واللہ علم (عمدۃ القاری ص ۵۵۷ ج ۱)

افادات انور: من رآنی فی المنام کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے دل کے اعتقاد کے ساتھ مجھ سے رؤیائی تعلق حاصل کرلے اس کا رؤیا اور تعلق صحیح ہیں، (کما قال صاحب القوت)

فرمایا:۔ حدیث الباب کی مراد میں اختلاف ہوا ہے، کچھ حضرات کہتے ہیں کہ یہ حلیہ مبارکہ اصلیہ میں دیکھنے کے ساتھ مخصوص ہے، اگر بال برابر بھی اس سے فرق دیکھا تو وہ اس کا مصداق نہ ہوگا، مثلاً اگر بچپن کی حالت میں دیکھا تو حضور علیہ کے بچپن کے حلیہ مبارکہ سے مطابق ہونا چاہیے، اور جوانی یا بڑھاپے میں دیکھا تو ان کے حلیہ سے موافق ہونا ضروری ہے، امام بخاری نے کتاب الرؤیا میں مشہور عالم تعبیر ابن سیرین سے نقل کیا کہ وہ خواب دیکھنے والے سے ضرور سوال کرتے تھے کہ کس حلیہ میں دیکھا، مگر یہ رائے تھوڑے لوگوں کی ہے، دوسرے حضرات نے تعمیم کی ہے کہ جس حلیہ میں بھی حضور اکرم علیہ کو دیکھے گا وہ آپ علیہ ہی ہوں گے، جب کہ دیکھنے والا پورا وثوق رکھتا ہو کہ آپ علیہ کو ہی دیکھتا ہے، پھر فرمایا کہ پہلے لوگوں نے تو رویئت میں شرطیں اور قیدیں لگائیں مگر دیکھنے والے کے رؤیائی اقوال قبول کرنے میں توسع سے کام لیا، اور دوسروں نے رویئت کے معاملہ میں توسع کیا تو اس کے اقوال معتبر ٹھہرانے میں تنگی کی ہے، لیکن اس معاملہ میں سب متفق ہیں کہ اس کے اقوال کو شریعت پر پیش کیا جائے گا، جو موافق ہوں گے، قبول، مخالف ہوں گے، نامقبول، اگر کسی نے اس میں بھی توسع کیا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے کیونکہ حضور علیہ نے اپنی رؤیت کے حق وصحیح ہونے کی خبر دی ہے یہ نہیں فرمایا کہ میں .... جو کچھ خواب میں بھی کہوں گا وہ حق ہوگا، اس لئے جو کچھ آپ علیہ سے یقظہ میں سنا گیا، اس کو خواب میں سنے گئے اقوال کی وجہ سے ترک نہیں کر سکتے، البتہ اگر وہ اقوال کسی ظاہری حکم شریعت کے خلاف نہ ہوں تو ان کے موافق عمل کرنا آپ علیہ کی صورت یا مثالی صورت مقدمہ کے ادب وعظمت کی وجہ سے بہتر ہوگا، لیکن پھر بھی ہمیں یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں کہ واقعی حضور علیہ نے وہ بات ضرور فرمائی ہے، نہ یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضور علیہ نے اس سے خطاب ضرور کیا ہے نہ یہ کہیں گے کہ حضور علیہ اپنے مقدس مقام سے منتقل ہوئے نہ یہ کہ آپ علیہ کا علم ان سب چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے بس اتنا کہنا درست ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ علیہ کی زیارت سے کسی حکمت کے تحت اس کو مشرف کردیا۔ جس کو وہی جانتا ہے، باقی تفصیل علامہ سبکی کی شرح منہاج السنہ میں دیکھی جائے، اور اس میں ایک حکایت ذکر ہوئی ہے، جس کو حضرت شیخ ابوالحق نے نقل کیا ہے:۔ ایک شخص نے نبی کریم علیہ کو خواب میں دیکھا کہ آپ علیہ نے فرمایا ''شراب پیو!'' حضرت شیخ محدث علی متقی حنفی[1] (صاحب کنز العمال) اس وقت حیات تھے ان سے تعبیر دریافت کی، آپ نے کہا ''نبی کریم علیہ نے تو تم سے فرمایا تھا ''شراب مت پیو'' ! مگر شیطان نے تم کو مغالطہ میں ڈال دیا کہ تم نے دوسری بات سمجھ لی نیند کا وقت اختلال حواس کا ہوتا ہے جب بیداری میں بھی کسی کی بات غلط سن یا سمجھ لیتا ہے تو نیند میں بدرجہ اولی ایسی غلطی ہوسکتی ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تم شراب پیتے ہو۔ چنانچہ اس سے اقرار کیا۔

حضرت شاہ صاحب نے یہ حکایت ...... بیان کر کے فرمایا کہ مذکورہ خواب میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضور علیہ نے بطور تعریض کے

---

[1] آپ کے حالات مقدمہ انوارالباری ج ۲ میں ذکر ہوئے ہیں، حضرت شاہ صاحب نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ ''شیخ محمد طاہر پٹنی بھی آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، جو بڑے محدث، لغوی اور حنفی تھے، انہوں نے خود اپنے آپ کو ایک قلمی رسالہ میں حنفی لکھا مولانا محمد عبدالحی صاحب لکھنوی صاحب کو سہو ہوا کہ ان کو شافعیہ میں سے شمار کیا۔'' مولانا الموصوف نے الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ میں آپ کا ذکر نہیں کیا، البتہ ضمناً اس کی تعلیقات ص ۱۶۴ (مطبوعہ مصر) میں ذکر کیا اور رئیس محدثی الہند لکھا، حنفی شافعی وغیرہ کچھ نہیں لکھا، شاید کسی دوسری جگہ شافعی کہا ہو، تاہم اتنے بڑے حنفی عالم کو فوائد میں نہ لینا اور تعلیقات میں بھی حنفی نہ لکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اس بارے میں تردد ہوگا، اس لئے حضرت شاہ صاحب نے تنبیہ فرمائی، ہم نے مقدمہ ص ۱۶۹ ج ۲ میں آپ کے حالات لکھے ہیں۔ ''مؤلف''

فرمایا ہو شراب پیو! یعنی کیسی بری بات ہے، اس کو سوچو اور سمجھو! ایک لفظ کے اصل معنی بھی مراد ہوتے ہیں اور کبھی وہی لفظ تعریض کے لئے بھی بولا جاتا ہے، جس کو لہجہ کے فرق اور قولی و فعلی قرائن سے سمجھا جاتا ہے۔

کبھی حلیہ سے مقصود رائی کی حالت پر متنبہ کرنا ہوتا ہے اگر اچھا حال ہو تو حضور ﷺ کو بھی اچھی حالت میں دیکھے گا، ورنہ دوسری صورت میں، چنانچہ ایک شخص نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ ہیٹ (انگریزی ٹوپی) پہنے ہوئے ہیں، حضرت گنگوہیؒ کو لکھ کر تعبیر دریافت کی، آپ نے تحریر فرمایا کہ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے دین پر نصرانیت غالب ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: تحقیق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی رؤیت منامی کو حضور ﷺ کی ذات مبارک کو بعینہ دیکھنے کے ساتھ خاص نہیں کر سکتے، لہٰذا کبھی تو آپ ﷺ کی صورت روحانیت مبارکہ کی تمثالی حقیقت و صورت دکھلائی جاتی ہے، اور ہم سے اس کا خطاب بھی کرایا جاتا ہے، کبھی وہ روح مبارک خود ہی بدن مثالی کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔

رؤیت کی بیداری کی بحث

پھر کبھی اس کا مشاہدہ خواب کی طرح بیداری میں بھی ہوتا ہے، میرے نزدیک یہ صورت بھی ممکن ہے، حق تعالیٰ جس خوش نصیب کو بھی چاہیں یہ دولت عطا فرما دیں، جیسے علامہ سیوطیؒ سے نقل ہے کہ انہوں نے ستر مرتبہ سے زیادہ بیداری کی حالت میں حضور ﷺ کی زیارت کی، اور بہت سی احادیث کے بارے میں سوالات کئے، پھر آپ ﷺ کی تصحیح کے مطابق احادیث کی تصحیح کی، علامہ سیوطیؒ کی سلطان وقت بھی بڑی عزت کرتا تھا، ایک مرتبہ شیخ عطیہ نے ان کو لکھا کہ فلاں معاملہ میں سلطان سے میری سفارش کر دیجئے! تو علامہ سیوطی نے انکار کر دیا کہ جواب لکھا: ''میں یہ کام اس لئے نہیں کر سکتا کہ اس میں میرا بھی نقصان ہے اور امت کا بھی، کیونکہ میں نے سرور دو عالم ﷺ کی ستر بار سے زیادہ زیارت کی ہے، اور میں اپنی بھلائی نہیں دیکھتا بجز اس کے کہ میں بادشاہوں کے دروازوں[1] پر نہیں جاتا۔

پس اگر میں کام آپ کی وجہ سے کروں تو ممکن ہے کہ حضور ﷺ کی زیارت مبارکہ کی نعمت سے محروم ہو جاؤں، بعض صحابہ کو ملائکہ سلام کیا کرتے تھے، انہوں نے کسی مرض کے علاج میں داغ لگوالیا تو وہ اس کی وجہ سے ملائکہ کی رؤیت سے بھی محروم ہو گئے، اس لئے میں آپ کے تھوڑے نقصان کو امت کے بڑے نقصان پر ترجیح دیتا ہوں (الیواقیت والجواہر ص ۱۳۳ ج ۱)

(غالباً امت کے نقصان سے اشارہ اس طرف ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی زیارت مبارکہ کے وقت علوم نبوت کا استفادہ کر کے امت کو افادہ کرتے تھے، جیسا کہ تصحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ علم)

علامہ شعرانی نے بھی لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور آپ ﷺ سے بخاری شریف پڑھی، آٹھ رفیق دوسرے بھی ان کے ساتھ تھے، جن میں ایک حنفی تھے، ان سب کے نام لکھے ہیں، اور وہ دعا بھی لکھی، جو ختم پر پڑھی تھی، غرض کہ رؤیت بیداری بھی حق ہے اور اس کا انکار جہالت[2] ہے۔

---

[1] اس زمانہ کے جو علماء و مشائخ رئیسوں اور سیٹھوں کی خوشامد و چاپلوسی مال و دولت حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں اور دوسرے علماء و امت نیز علم و دین کو ذلیل کرتے ہیں اس سے سبق حاصل کریں، پہلے یہ بھی گزر چکا ہے کہ علماء دین کے دلوں میں دنیا کی حرص و طمع آ جائے گی تو ان کے دلوں سے علوم نبوت نکال لئے جائیں گے۔ ''مؤلف''

[2] مشہور محدث و فقیہ شیخ عزالدین بن عبدسلام حنفی (استاذ حافظ قاسم بن قطلو بغا حنفی) نے ''القواعد الکبری'' میں لکھا: ابن الحاج نے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت شیخ الہند کا ارشاد

حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ بعض احادیث کے الفاظ سے تو حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کی تائید ہوتی ہے، جو بخاری وغیرہ میں مروی ہیں، کیونکہ صورت کا اطلاق کسی چیز کے اپنے اصلی حلیہ ہی پر ہوا کرتا ہے اور اس لئے آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے اصلی حلیہ ہی میں دیکھنا مصداق حدیث ہونا چاہیے، اور بعض طرق کے الفاظ سے عموم معلوم ہوتا ہے، جیسے حافظ عینیؒ نے اس حدیث کو ابن ابی عاصم عن ابی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) "المدخل" میں تحریر فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کی زیارت مبارکہ بحالت بیداری کا مسئلہ بہت دقیق ہے، تاہم ایسے حضرات اکابر کے لئے اس کے وقوع وثبوت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، جن کے ظاہر وباطن کی حق تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے حفاظت فرمائی ہو، البتہ بعض علماء ظاہر نے اس سے انکار کیا ہے۔ (الحاوی ص ۲۵۸ ج ۲)

حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ مسئلہ رؤیت منامی پر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے رسالہ لکھا ہے، آپ نے جمہور کا مذہب اختیار فرمایا اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے بھی رسالہ لکھا، جس میں دوسری رائے قلیل جماعت والی اختیار کی۔

حافظ ابن تیمیہؒ کا انکار رؤیت بیداری: ان منکرین ہی میں سے حافظ ابن تیمیہ بھی ہیں، جنھوں نے حسب عادت بڑی سختی وشدت سے بیداری کی رویت سے انکار کیا ہے، کتاب التوسل والوسیلہ میں لکھا کہ منامی رویت کبھی حق ہوتی ہے اور کبھی شیطان کے اثر سے۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ کی منامی رؤیت تو ثابت وتسلیم ہے، مگر بیداری کی رؤیت تو کسی کے لئے ثابت نہیں ہے، اور جو یہ گمان کرے کہ میں نے کسی میت کو دیکھا تو یہ بات اس کی جہالت سے ہے، اور بہت سے لوگ جو یہ کہا کرتے ہیں کہ انہوں نے کسی نبی یا صالح، یا خضر کو دیکھا، تو درحقیقت انہوں نے شیطان کو دیکھا ہے۔ حاوی ص ۲۶۳ ج ۲ میں ہے کہ "ائمہ شریعت کی ایک جماعت نے اس امر کو تسلیم کرلیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے کسی ولی مقرب کو یہ اکرام بھی عطا فرما دیتے ہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کی زیارت مبارکہ سے بحالت بیداری مشرف ہو، آپ ﷺ کی مجلس میں حاضر بھی ہو، اور آپ ﷺ کے معارف ومواہب سے حسب استعداد بہرہ ور ہو، اس کو ائمہ شافعیہ میں سے امام غزالی، باذری، تاج سبکی، یافعی نے اور ائمہ مالکیہ میں سے علامہ قرطبی، محدث ابن ابی جمرہ، اور ابن الحاج ایسے حضرات اکابر ومحققین نے تسلیم کیا ہے، شیخ ابوالحسن شاذلی فرمایا کرتے تھے کہ "اگر میں بقدر پلک جھپکنے کے بھی حضور اکرم ﷺ سے محجوب ہو جاؤں تو اپنے کو مسلمانوں میں شمار نہ کروں"

علامہ سیوطیؒ نے ایسے بہت سے حضرات کا ذکر کیا، جن کو بیداری میں حضور ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے مثلاً (۱) شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا کہ میں نے ظہر سے قبل حضور ﷺ کی زیارت کی، (۲) شیخ خلیفہ بن موسیٰ کے تذکرہ میں آتا ہے کہ وہ حضور ﷺ کو بکثرت دیکھتے تھے۔ (۳) شیخ عبدالغفار حضور ﷺ کو ہر وقت دیکھتے تھے۔ (۴) شیخ ابوالعباس موسیٰ کو حضرت ﷺ سے خصوصی اتصال کا شرف حاصل تھا کہ جب آپ ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کرتے تو آپ ﷺ جواب دیتے، نیز محادثہ اور سوال وجواب سے بھی مشرف ہوتے، اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے اور بہت سے اولیاء کرام کے نام ذکر کئے جو بیداری کی رؤیت سے مشرف ہوئے ہیں۔ اور ان کے قصے بھی لکھے (حاوی)

علامہ بازری شافعیؒ نے فرمایا کہ ہمارے زمانہ کے اور اس سے بھی قبل کے اور بہت سے اولیاء کرامؒ کے حالات میں سنا گیا ہے کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کو وفات کے بعد، عالم بیداری میں زندہ دیکھا ہے، ابن عربی نے فرمایا ہے کہ "انبیاء وملائکہ کی رؤیت اور ان کا کلام سننا مومن وکافر دونوں کے لئے ممکن ہے، فرق اتنا ہے کہ مومن کے لئے بطور کرامت ہوگا اور کافر کے لئے بطور عقوبت"

علامہ سیوطیؒ نے اپنے فتاوی میں یہ بھی لکھا کہ نبی کریم ﷺ کی بیداری میں رؤیت تو اکثر قلب کے ذریعہ ہوتی ہے، پھر ترقی ہو کر حاسۂ بصر سے بھی ہونے لگتی ہے، لیکن پھر بھی وہ رؤیت بصریہ عام متعارف رؤیت کی طرح نہیں ہوتی، بلکہ وہ ایک جمعیۃ حالیہ اور حالت برزخیہ وامر وجدانی ہیں، جس کی حقیقت کا ادراک وہی شخص کرسکتا ہے، جس کو جمعیت حاصل ہو، شیخ عبداللہ دلاصی کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ جب "امام نے اور میں نے احرام باندھا تو مجھے ایک پکڑنے والے نے پکڑ لیا اور میں رؤیت رسول اکرم ﷺ سے مشرف ہوا، تو اخذتنی اخذۃ میں اخذہ (پکڑ اور کشش) سے اسی حالت مذکورہ کی طرف اشارہ ہے (جس کے ساتھ ہی شرف رؤیت بیداری میں حاصل ہوجاتا ہے) (حاوی ص ۲۶۲ ج ۲)

علامہ سیوطیؒ نے اس مسئلہ پر اپنے رسالہ "تنویر الحلک فی رؤیته النبی والملک" پر مستقل طور سے بحث کی ہے اس کو بھی دیکھا جائے۔

غرض اولیاء کرام کے حالات میں بڑی کثرت سے بیداری کی رؤیت کا ثبوت ملتا ہے، قریبی زمانہ میں حضرت گنگوہیؒ کے حالات میں ہے کہ ایک روز "تصور شیخ" کے مسئلہ پر تقریر فرماتے ہوئے، جوش میں آکر اس امر مخفی کا اظہار بھی فرمادیا کہ "کامل تین سال تک حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کیا، پھر فرمایا کہ کتنے ہی سال تک میں نے کوئی بات حضور ﷺ سے استصواب کے بغیر نہیں کی اس کے بعد احسان کا درجہ حاصل ہوگیا۔" (امیر الروایات ص ۲۱۸) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہریرۃ ذکر کیا ہے جس میں ہے: فان اری فی کل صورۃ، لہٰذا کسی خاص حلیہ کی قید نہ ہونی چاہیے (مگر حافظ عینیؒ نے اس کے ایک راوی صالح مولی تو أمۃ کوضعیف کہا ہے (عمدۃ ص۱۴۰ ج ۲۴ طبع منیر یہ مصر)

شاہ صاحب رحمہ اللہ کا فیصلہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ظاہر حدیث بخاری سے تائید قلیل جماعت کی ہوتی ہے، خصوصاً اس لئے بھی کہ اس میں ایک لفظ **فان الشیطان لا یتکوننی** بھی مروی ہے (کتاب التعبیر) لہٰذا حافظ عینیؒ والی زیادتی مذکورہ کو حدیث بخاری کے برابر نہیں کرسکتی، اور اس کے معنی میں معمولی تصرف کریں گے، میرے نزدیک اس کا منشاء ایک استبعاد کو دفع کرنا ہے وہ یہ کہ جب خواب میں حقیقۃً حضور اکرم ﷺ ہی کی ذات مبارک کی مشاہدہ حق ادا ہوا، اور شیطان آپ ﷺ کی صورت میں نہیں آسکتا، تو آپ ﷺ کی رؤیت ایک ہی وقت کے اندر بہت سے اشخاص کو مختلف جگہوں پر کس طرح ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب دیا گیا کہ ایسا ممکن ہے کیونکہ آپ ﷺ کو ہر صورت میں دیکھا جاسکتا ہے، کوئی آپ ﷺ کی عین ذات کا مشاہدہ کرے گا اور کوئی آپ ﷺ کی صورت مثالیہ کو دیکھے گا۔

حضرت شاہ صاحب کی آخری رائے

اس موقع پر حضرت محترم مؤلف فیض الباری دامت برکاتہم نے حاشیہ میں تحریر فرمایا کہ اس بارے میں یہ آخری بات ہے جو میں نے حضرت شاہ صاحبؒ سے سنی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ابن سیرین والا مسلک اختیار فرمالیا، اور پہلی رائے سے رجوع فرمالیا جو اکثر حضرات کے ساتھ تھی (یعنی مطابقت حلیہ شرط نہیں ہے)، لیکن راقم الحروف نے جو حضرتؒ کے آخری دو سال کے درس بخاری شریف کے افادات قلمبند کئے تھے، ان میں آخری سال کی اس موقع کی تقریر کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

(''میرے نزدیک حلیہ کی مطابقت شرط نہیں ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے پہچاننے والے اب نہیں ہیں، اور جب تک ایسے لوگ رہے ہوں گے، یہ ضروری ہوگی، پھر فرمایا کہ حافظ عینیؒ نے شرح میں حدیث نکالی ہے'' من رانی فی المنام فقد رانی فانی اریٰ فی کل صورۃ '' گو یہ حدیث پکی نہیں ہے، مگر معلوم ہوا کہ مطابقت حُلیہ شرط نہیں ہے، اور حقیقت میں یہ حدیث صعب المنال ہے'') یعنی حدیث الباب کی شرح یقین کے ساتھ متعین کرنا بہت دشوار ہے، اس لئے احقر کا خیال ہے کہ آپ کی رائے کا اصل رجحان تو عدم مطابقت والے اکثری مسلک کی طرف آخر تک رہا، مگر محدثانہ نقطہ نظر سے آپ امام بخاری وغیرہ کی پختہ روایات ہی کو ترجیح دیتے رہے اور یہ آپ کے فطری عدل وانصاف اور آپ کے مزاج پر محدثانہ رنگ کے غلبہ کی کھلی دلیل ہے

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

اس موقع پر حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور حضرت گنگوہیؒ علم تعبیر کے بڑے ماہر تھے، بعد کو مولوی عبدالحکیم صاحب پٹیالوی بھی بہتر جاننے والے تھے، جنھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کے مقابلے میں اس کے پہلے مرنے کی پیش گوئی کی تھی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایسی صورت میں حافظ ابن تیمیہ ایسے محقق عالم کا انکار حیرت ہی کا باعث ہے، جس طرح بہت سے لوگ کسی اونچے پہاڑ یا بالائی منزل پر چڑھ کر ہلال دیکھ لیں، اور نیچے کھڑے ہوئے چند آدمی ان سب کو جھٹلانے لگیں، یا ان کو احمق و جاہل کہنے لگیں، کسی مسئلہ میں سب سے بڑا استبعاد عقلی و عرفی سے بھی بڑھ کر شرعی ہوا کرتا ہے، جو یہاں مفقود ہے، سچ یہ ہے کہ بڑوں سے غلطی بھی بڑی ہی ہوتی ہے، اور چند مسائل میں حافظ ابن تیمیہ کے تفردات بھی اسی قبیل سے ہیں، رحمھم اللہ و ایانا رحمتہ و اسعۃ و ارانا الحق حقا والباطل باطلا،'' مؤلف''

چنانچہ مرزا ہی پہلے مرگیا اور مولوی صاحب موصوف کا انتقال ابھی چند ماہ قبل ہوا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرت گنگوہیؒ کی علم تعبیر میں اصابت کے کئی قصے سنائے، ایک یہ کہ مولانا عبدالعلی صاحب (تلمیذ حضرت نانوتویؒ) نے خواب میں دیکھا کہ اسٹیشن غازی آباد پر حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری کا انتظار کیا جا رہا ہے، پھر حضور ﷺ ریل سے اترے لیکن آپ ﷺ کا لباس اس زمانے کے نصاری کا لباس تھا، بیدار ہو کر حضرت گنگوہی کو لکھا، حضرت نے فرمایا کہ تم نے دیکھا تو حضور اقدس ہی کو ہے ﷺ، اور لباس کی تعبیر یہ ہے کہ نصاری کا دین خاتم النبیین کے دین پر غالب ہو گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ خواب میں رؤیت تو حضور ﷺ ہی کی ہوتی ہے، باقی دوسرے متعلقات تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں، جو علماء تعبیر ہی حل کر سکتے ہیں۔

یہ بھی فرمایا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے رسالہ حقیقۃ الرؤیا لکھا ہے مگر اس میں کچھ مغز نہیں ہے صرف مذاہب متکلمین وفلاسفہ وغیرہ نقل کر دیئے ہیں۔

رؤیت خیالیہ کی بحث

حضرت شاہ صاحبؒ نے آخر میں فرمایا منامی و بیداری کی رؤیت کے علاوہ ایک رؤیت بطور تحدیث نفس بھی ہوتی ہے وہ بھی ایک قسم کی بشارت ہی ہے اگر چہ ضعیف ہے اور وہ مومن صالح و غیر صالح دونوں کو حاصل ہوتی ہے اس سلسلہ کی تحقیق و تفصیل حضرت مجدد سرہندی، حضرت مرزا جان جاناں شہید اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ کے ارشادات میں ملے گی کیونکہ یہ سب حضرات رؤیۃ خیالیہ کے بھی قائل تھے اور میں بھی اس کو مذہب کے مطابق واقع سمجھتا ہوں۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

خواب حجت شرعیہ نہیں ہے

سرور دو عالم، نبی الانبیاء علیہ السلام کی رؤیت منامی نہایت ہی جلیل القدر نعمت و بشارت عظمیٰ ہے لیکن اس میں اگر کوئی شخص یہ بھی دیکھے کہ حضور ﷺ نے کسی غیر شرعی امر کا حکم فرمایا ہے یا کسی امر شرعی کے ترک کی اجازت مرحمت فرمائی ہے تو اس کا اعتبار نہ ہوگا کیونکہ شریعت محمدیہ کو آپ ﷺ اپنی حیات دنیوی میں مکمل فرما چکے ہیں کہ اس میں کمی و بیشی کا امکان بھی باقی نہیں رہا اسی سے امور مشروعہ میں غیر نبی (ولی و مرشد وغیرہ) کے منامی و غیر منامی واقوال کی حیثیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ (واللہ اعلم)

بَابُ كِتَابَةِ الْعِلْمِ

(علمی باتوں کا لکھنا)

(۱۱۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ اَنَا وَكِيعٌ عَنْ سُفْيَانَ عَنْ مُطَرِّفٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ اَبِيْ جُحَيْفَةَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِيٍّ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ قَالَ لَا اِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ اَوْفَهْمٌ اُعْطِيَهُ رَجُلٌ مُسْلِمٌ اَوْ مَا فِيْ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ قَالَ قُلْتُ وَمَا فِيْ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ قَالَ الْعَقْلُ وَفَكَاكُ الْاَسِيْرِ وَلَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ.

ترجمہ ۱۱۱: ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کیا آپ حضرات کے پاس (کوئی اور بھی) کتاب ہے؟ انہوں نے فرمایا نہیں! مگر اللہ کی کتاب ہے یا فہم ہے جو وہ ایک مسلمان کو عطا کرتا ہے، یا پھر جو کچھ اس صحیفہ میں ہے، میں نے پوچھا! اس صحیفہ میں کیا ہے؟

انہوں نے فرمایا دیت اور اسیروں کی رہائی کا بیان اور یہ حکم کے مسلمان کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے۔

(۱۱۲) حَدَّثَنَا اَبُوْ نُعَيْمِ نِ الْفَضْلُ بْنُ دُكَيْنٍ قَالَ ثَنَا شَيْبَانُ عَنْ يَحْيٰى عَنْ اَبِىْ سَلَمَةَ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ خُزَاعَةَ قَتَلُوْا رَجُلاً مِّنْ بَنِىْ لَيْثٍ عَامَ فَتْحِ مَكَّةَ بِقَتِيْلٍ مِّنْهُمْ قَتَلُوْهُ فَاُخْبِرَ بِذٰلِكَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَكِبَ رَاحِلَتَهٗ فَخَطَبَ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ حَبَسَ عَنْ مَّكَّةَ الْقَتْلَ اَوِ الْفِيْلَ قَالَ مُحَمَّدٌ وَّاجْعَلُوْهُ عَلَى الشَّكِّ كَذَا قَالَ اَبُوْ نُعَيْمٍ الْقَتْلَ اَوِ الْفِيْلَ وَغَيْرُهٗ يَقُوْلُ الْفِيْلَ وَسُلِّطَ عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اَلَا وَاِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِىْ وَلَا تَحِلُّ لِاَحَدٍ بَعْدِىْ اَلَا وَاِنَّهَا حَلَّتْ لِىْ سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ اَلَا وَاِنَّهَا سَاعَتِىْ هٰذِهٖ حَرَامٌ لَّا يُخْتَلٰى شَوْكُهَا وَلَا يُعْضَدُ شَجَرُهَا وَلَا تُلْتَقَطُ سَاقِطَتُهَا اِلَّا لِمُنْشِدٍ فَمَنْ قُتِلَ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ اِمَّآ اَنْ يُّعْقَلَ وَاِمَّآ اَنْ يُّقَادَ اَهْلُ الْقَتِيْلِ فَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ اكْتُبْ لِىْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ اكْتُبُوْا لِاَبِىْ فُلَانٍ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ اِلَّا الْاِذْخِرَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاِنَّا نَجْعَلُهٗ فِىْ بُيُوْتِنَا وَقُبُوْرِنَا فَقَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا الْاِذْخِرَ اِلَّا الْاِذْخِرَ۔

ترجمہ۱۱۲: حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ قبیلہ خزاعہ کے (کسی شخص) نے بنولیث کے کسی آدمی کو اپنے مقتول کے عوض مار دیا تھا، یہ فتح مکہ والے سال کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر دی گئی، آپ ﷺ نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ اللہ نے مکہ سے قتل یا فیل کو روک دیا، امام بخاری کہتے ہیں کہ اس لفظ کو شک کے سات سمجھو، ایسا ہی ابونعیم وغیرہ نے القتل اور الفیل کہا، ان کے علاوہ دوسرے لوگ الفیل کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان پر اب خدا کا رسول اور مومن بندے غالب ہو گئے ہیں، سمجھ لو کہ وہ (مکہ) کسی کے لئے حلال نہیں ہوا، مجھ سے پہلے اور نہ (آئندہ) کبھی ہوگا، اور میرے لئے بھی صرف دن کے تھوڑے سے حصے کے لئے حلال کر دیا گیا تھا، سن لو کہ وہ اس وقت حرام ہے نہ اس کا کوئی کانٹا توڑا جائے نہ اس کے درخت کاٹے جائیں اور اس کی گری پڑی چیز بھی صرف وہی اٹھائے جس کا منشا یہ ہو کہ وہ اس شے کا تعارف کرادے گا تو اگر کوئی شخص مارا جائے تو (اس کے عزیزوں) کو اختیار ہے دو باتوں کا یا دیت لیں یا قصاص، اتنے میں ایک یمنی آدمی آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ! (یہ مسائل میرے لئے لکھوا دیجئے تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابوفلاں کے لئے (یہ مسائل) لکھ دو تو ایک قریشی شخص نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! اذخر کے سوا کیونکہ اسے ہم گھروں میں بوتے ہیں اور اپنی قبروں میں ڈالتے ہیں (یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: ہاں! مگر اذخر، مگر اذخر

(۱۱۳) حَدَّثَنَا عَلِىُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ ثَنَا سُفْيَانُ قَالَ ثَنَا عَمْرٌو قَالَ اَخْبَرَنِىْ وَهْبُ بْنُ مُنَبِّهٍ عَنْ اَخِيْهِ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا هُرَيْرَةَ يَقُوْلُ مَا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَدٌ اَكْثَرُ حَدِيْثًا عَنْهُ مِنِّىْ اِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو فَاِنَّهٗ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا اَكْتُبُ تَابَعَهٗ مَعْمَرٌ عَنْ هَمَّامٍ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ۔

ترجمہ۱۱۳: حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں عبداللہ ابن عمرو کے علاوہ مجھ سے زیادہ کوئی حدیث بیان کرنے والا نہیں، وہ لکھ لیا کرتے تھے، میں لکھتا نہیں تھا (دوسری سند سے معمر نے وہب بن منبہ کی متابعت کی، وہ ہمام سے روایت کرتے ہیں، وہ ابو ہریرہؓ سے)

(۱۱۴) حَدَّثَنَا یَحْیَ بْنُ سُلَیمَانَ قَالَ حَدَّثَنِی ابْنُ وَهْبٍ قَالَ اَخْبَرَنِی یُوْنُسُ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَیْدِاللہِ بْنِ عَبْدِ اللہِ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ وَ جْعُهٗ قَالَ ائْتُوْنِی بِکِتَابٍ اَکْتُبْ لَکُمْ کِتَابًا لَا تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ قَالَ عُمَرُ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ غَلَبَهُ الْوَجْعُ وَ عِنْدَنَا کِتَابُ اللہِ حَسْبُنَا فَاخْتَلَفُوْا وَ کَثُرَا للَّغَطُ قَالَ قُوْمُوْا عَنِّیْ وَ لَا یَنْبَغِیْ عِنْدِیَ التَّنَازُعُ فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍؓ یَقُوْلُ اِنَّ الرَّزِ کُلَّ الرَّزِیَّةِ مَاحَالَ بَیْنَ رَسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ و بین کِتَابِهٖ.

ترجمہ ۱۱۴: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے مرض میں شدت ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس سامان کتابت لاؤ تا کہ تمہارے لئے ایک نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوسکو، اس پر حضرت عمرؓ نے (لوگوں سے) کہا کہ اس وقت رسول اللہ پر تکلیف کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے جو ہمیں (ہدایت کے لئے کافی ہے، اس پر لوگوں کی رائے مختلف ہوگئی اور بول چال زیادہ ہونے لگی تو آپ نے فرمایا، کہ میرے پاس سے اٹھ جاؤ! میرے پاس جھگڑنا ٹھیک نہیں، تو ابن عباسؓ یہ کہتے ہوئے نکل آئے کہ بے شک مصیبت بڑی سخت مصیبت ہے، وہ چیز جو رسول اللہ ﷺ کے اور آپ کے (مطلوبہ) تحریر کے درمیان حائل ہوگئی۔

تشریح: کچھ لوگوں کو یہ شبہ تھا کہ حضرت علی کے پاس کچھ ایسے خاص احکام اور پوشیدہ باتیں کسی صحیفے میں درج ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں بتائیں، اس حدیث سے اس غلط فہمی کی تردید ہوتی ہے۔

مجموعی طور سے چاروں حدیثوں میں علوم نبوت کو ضبط تحریر میں لانے کا ثبوت ہے اس لیے امام بخاریؒ ان سب کو ایک باب کے تحت لائے ہیں اگر چہ ہر حدیث میں چند دوسرے امور کا بھی ذکر ہوا ہے مثلاً

(۱) پہلی حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک سوال کا ذکر ہے کہ آیا آپ کے پاس اور بھی کوئی کتاب ہے؟ منشا یہ تھا کہ اہل بیت نبوت کے پاس ممکن ہے کوئی اور کتاب بھی ہو، جس میں احکام وہدایات ہوں یا مقصد یہ تھا کہ خاص حضرت علی کے پاس کوئی کتاب ہو جیسا کہ شیعی صاحبان کا خیال ہے کہ ان کو مخصوص علم بھی عطا ہوئے تھے۔

حضرت علی نے جواب دیا کہ میرے پاس کوئی الگ کتاب نہیں ہے وہی کتاب اللہ (قرآن مجید) ہے (جو سب کے واسطے ہے اور سب کو معلوم ہے، دوسرے وہ ایمانی فہم جو حق تعالیٰ نے ہر مسلمان کو کم وبیش عطا کی ہے (یعنی وہ بھی کوئی خاص میری یا اہل بیت کی مخصوص صفت نہیں ہے) تیسری چیز وہ ہدایات واحکام ہیں جو میرے پاس حدیثی صحیفہ میں ہیں (ان کو حضور ﷺ کی خدمت میں رہ کر لکھتا رہا ہوں پھر سوال ہوا کہ اس صحیفے میں کیا کچھ ہے؟ تو فرمایا کہ دیت کے مسائل، قیدی کو چھڑانے کے بارے میں احکام نبوی، اور یہ کہ کسی مسلم کو کافر کے قتل کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا، اس حدیث میں صحیفہ کا ذکر محل ترجمہ ہے کہ حدیث لکھی گئی تھی۔

(۲) دوسری حدیث میں بنوخزاعہ کا واقعہ نقل ہوا کہ انہوں نے فتح مکہ کے سال میں اپنے کسی سابق مقتول کا بدلہ لیا، حضور ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ حرم مکہ میں آئندہ کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہیے، جو اس کی حرمت کے خلاف ہو یمن کے ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ سب ارشادات میرے لئے لکھوا دیجئے! آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اس کے لیے لکھ کر دے دو! یہی محل ترجمہ ہے کہ حدیث رسول آپ ﷺ کے ارشاد سے اور آپ ﷺ کی موجودگی میں لکھی گئی۔

(۳) تیسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہ کا ارشاد مجمل ترجمہ ہے کہ صحابہ میں سے سب سے زیادہ مجھے حدیث رسول اللہ ﷺ سننے کا موقع ملا اور مجھ سے زیادہ اگر کسی کے پاس احادیث کا ذخیرہ ہوسکتا ہے تو صرف حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے پاس ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہ لکھتے بھی تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

(۴) چوتھی حدیث میں آنحضرت ﷺ کی آخری عمر میں علالت کا ذکر ہے کہ ایک روز آپ مرض کی سخت تکلیف میں تھے، فرمایا لکھنے کا سامان لاؤ! میں تمہارے لیے ایسی ہدایات لکھوادوں گا کہ ان کے بعد تم گمراہ نہ ہوسکو گے اس وقت حضرت عمر نے آپ کی شدت مرض کا خیال کر کے فرمایا کہ اس وقت کچھ لکھوانے کا موقع نہیں حضور ﷺ تکلیف میں ہیں اور (اگر پھر موقعہ آپ سے معلوم کرنے کا بھی ملا تو ہمارے پاس کتاب اللہ موجود ہے، وہ ہر طرح کافی ہے جس میں ہر قسم کی ہدایات مکمل ہیں)

دوسرے بعض صحابہ کی خواہش یہ ہوئی کہ اسی وقت لکھوالیا جائے اس لئے اختلاف رائے اور زیادہ گفتگو سے حضور ﷺ کو تکلیف ہوئی آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس سے اٹھ جاؤ اختلاف کی بات مجھے پسند نہیں حضرت ابن عباسؓ بھی ان لوگوں میں تھے جو اسی وقت اور اسی حالت شدت مرض میں لکھوانے کے حق میں تھے اس لیے وہ اس حدیث کو بیان کر کے اپنا تاثر بھی ظاہر کردیا کرتے تھے کہ اس وقت وہ تحریر لکھی جاتی تو بہت سے مصائب پیش نہ آتے۔

تنبیہ: یہاں فخرج ابن عباس کے الفاظ اسطرح ذکر ہوئے ہیں جن سے وہم ہوتا کہ اسی موقع پر حضور ﷺ کی مجلس سے باہر آ کر حضرت ابن عباس نے یہ بات فرمائی، حالانکہ واقعہ اس طرح نہیں ہے اس وقت حضرت ابن عباسؓ یا کسی اور صحابیؓ سے باہر نکل کر کوئی بات خلاف کہنے کا کوئی ثبوت ہی نہیں اور بظاہر جو اختلاف رائے تھا وہ اسی مجلس تک رہا، باہر آ کر نہ کوئی اختلاف ہوا نہ مزید جھگڑا پیش آیا اور حضرت عمرؓ کی اصابت رائے اسی بات سے ظاہر ہے کہ انحضرت ﷺ اس کے بعد کئی روز تک زندہ رہے مگر پھر آپ ﷺ نے کوئی تحریر لکھنے کا حکم نہیں فرمایا ممکن ہے دوسرے واقعات کی طرح اس بارے میں بھی حضور اکرم ﷺ کو وحی کے ذریعہ حضرت عمرؓ کی موافقت القاء کی گئی ہو یا قرآن مجید کی مکمل اصولی ہدایات اور اپنی دوسرے ارشادات سابقہ پر اعتماد کر کے مزید کچھ لکھوانے کی خود ہی ضرورت نہ سمجھی ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی اہم شرعی ضرورت ہوتی تو اس کو آپ کسی ایک دو صحابی کیا تمام صحابہؓ کے خلاف بھی بیان فرمانے سے نہ رکتے۔

مقدرات خداوندی کسی طرح اپنے وقت و موقع سے ذرہ برابر بھی نہیں ٹل سکا آنحضرت ﷺ کے سفر آخرت کے بعد اول آپ کی جانشینی کے مسئلہ پر کچھ اختلاف ہوا پھر کچھ معاملات کی تلخی اور بعض غلط فہمیوں کے باعث آپس کی قتل و قتال تک بھی نوبت پہنچی، جو صحابہ کرامؓ کے پاکیزہ علمی و دینی ماحول کے لحاظ سے بڑی حد تک غیر متوقع بات تھی مگر اس بات سے حضور ﷺ پہلے ہی خائف تھے اور پوری طرح سب صحابہ کرامؓ کو ڈرا بھی چکے تھے صاف فرمادیا تھا کہ میرے بعد کافروں کی طرح باہم لڑائی جھگڑے اور قتل قتال کی صورتیں اختیار نہ کرلینا وغیرہ بعض حضرات کی رائے ہے کہ آپ اختلافی احکام کے بارے میں کوئی تحریر لکھوانا چاہتے تھے کہ اس کے بعد کوئی اختلاف نہ ہو بعض نے فرمایا کہ اپنے بعد خلفاء کے نام لکھواتے وغیرہ، جو کچھ بھی ہو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر قسم کی ہدایات قرآن سنت کی روشنی میں پہلے ہی سے مکمل آچکی تھیں اور آپ کے بعد کوئی بات ایسی باقی نہیں رہی تھی جس کے نہ ہونے کی وجہ سے کوئی شخص گمراہ ہو سکے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے خود ہی فرمایا ترکتکم علی ملة بیضاء لیلها و نهارها سواء (میں تمہیں ایسی روشن ملت پر چھوڑے جاتا ہوں جس کا دن اور رات برابر ہے)

دوسری بات یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے اور تقریباً سب کو معلوم بھی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے سارے اختلافات اور مشاجرات دین کی ترقی اور اشاعت اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی غرض سے تھے، ذاتی اغراض یا دنیوی حرص و طمع کے تحت نہیں تھے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم.

بحث ونظر

عہدِ نبوی میں کتابت حدیث

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی حدیثی یادداشتوں کا مجموعہ ''صادقہ'' مشہور ہے اس کی علاوہ حضرت علی کے صحیفہ کا ذکر بھی ان ہی احادیث الباب میں موجود ہے ان کے علاوہ آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں جو چیزیں لکھیں گئی وہ حسب ذیل ہیں۔

(۳) حضرت ابوشاہؓ کے لیے حضور اکرمؐ نے اپنا خطبہ لکھوایا۔

(۴) حضرت عمرو بن حزم کو سترہ سال کی عمر میں اہل نجران پر عامل بنا کر بھیجا تو ان کے ساتھ ایک تحریر دی جس میں فرائض، سنن اور خون بہا کے احکام مذکور تھے۔

(۵) مختلف قبائل کے لیے تحریری ہدایات۔ (۶) خطوط کے جوابات۔

(۷) سلاطین وقت اور مشہور فرماں رواؤں کے نام مکاتیب دعوت اسلام (۸) عمال و ولاۃ کے نام حکم نامے

(۹) معاہدات و وثائق (۱۰) صلح نامے (۱۱) امان کے پروانے

منع کتابت حدیث کے اسباب

امام بخاریؒ نے یہاں کتابت علم کی ضرورت و اہمیت کو اس لئے بھی بیان کیا ہے کہ پہلے حدیث رسول اللہ ﷺ بیان کرنے میں غلطی پر سخت وعیدیں گزر چکی ہیں، ممکن ہے کہ ان کی وجہ سے کوئی شخص روایت و کتابت و حدیث سے بالکل ہی احتراز کرے، جس سے دین و شریعت کی اشاعت رک جائے، دوسرے اس لئے بھی کہ ابتداء میں حدیث لکھنے سے ممانعت بھی ہو چکی تھی، اگرچہ اس کی صحیح اور بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلے قرآن مجید کے جمع و حفظ اور کتابت وغیرہ کا اہتمام مقصود تھا، اگر اسی وقت حدیث کو لکھ کر جمع کیا جاتا تو بڑا خطرہ تھا کہ دونوں مختلط نہ ہو جائیں اور الاہم فلاہم کے قاعدہ سے بھی پہلے ساری توجہ قرآن مجید کی جمع و کتابت کی طرف ضروری تھی، تاہم زبانی روایت حدیث کی اجازت ہر وقت رہی ہے، اور بعد کو کتابت حدیث سے بھی پابندی اٹھالی گئی تھی، جس پر مندرجہ بالا شہادتیں بہت کافی ہیں، اس لئے منکرین و مخالفین حجیت حدیث جو اوہام و شبہات پیش کرتے ہیں، ان کے اندر کوئی وزن اور معقولیت نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد

آپ نے فرمایا: احادیث کی جمع و کتابت وغیرہ کا ابتدائی دور میں اہتمام زیادہ نہ ہونا، محض اتفاقی امر نہیں تھا، بلکہ وہ میرے نزدیک اسی لئے تھا کہ قرآن مجید کو ہر لحاظ سے اولی درجہ حاصل ہو اور احادیث رسول اللہ ﷺ اس کے بعد ثانوی درجہ میں ہوں اور ان میں ائمہ کے لئے اجتہاد اور علماء و محدثین کے لئے بحث و نظر کی گنجائش و توسع رہے، جس سے ''الدین یسر'' کا ثبوت ہوتا رہے، پھر فرمایا کہ میں نے اسی کی تائید امام زہریؒ کے اثر سے بھی پائی جو کتاب الاسماء والصفات میں نقل ہوا ہے: اس میں وحی کی تقسیم کرنے کے بعد فرمایا کہ ''پوری طرح قید کتابت

میں آنے والی ایک ہی قسم ہے'' اس سے میں سمجھا کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک نوع وحی کا انضباط اور دوسری نوع کا عدم انضباط ایک سوچا سمجھا ہوا مسئلہ تھا، اور کتابت حدیث کی طرف عام رجحان نہ ہونا محض اتفاقی امر نہیں تھا واللہ علم

تدوین وکتابت حدیث پر مکمل تبصرہ

مقدمہ انوار الباری جلد اول ص ۲۷ میں ''تدوین حدیث'' کے تین دور'' ہیں لکھا تھا کہ کتابت حدیث کے لئے سب سے پہلی سعی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے کی تھی اور ایک مجموعہ تالیف کیا تھا، جس کا نام ''صادقہ'' رکھا تھا اور آپ کی طرح بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی اس کی طرف توجہ کی تھی (مثلاً حضرت علیؓ نے ''صحیفہ'' لکھا تھا، جس کا ذکر یہاں حدیث الباب میں ہوا ہے، یہ حدیث کی کتابت و تدوین خود آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں اور آپ ﷺ کے علم واجازت سے ہوئی تھی) دوسرا اقدام حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی تحریک پر ہوا اور امام شعبی، زہری وابوبکر حزمی نے احادیث وآثار لکھ کر جمع کئے اگرچہ اس وقت تک ترغیب وتبویب فقہی نہ تھی۔

تیسرا دور سراج الامت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے شروع ہوا آپ کی روایات کو آپ کے تلامذہ محدثین، امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر وغیرہ نے جمع کیا، اور تبویب وترتیب فقہی کی بھی بنیاد ڈالی،

اس طرح ہمارے زمانے تک جو احادیث رسول اللہ ﷺ کے ذخیرے مدون ومبوب ہوکر پہنچے ہیں، ان میں سے امام صاحب کی کتاب الآثار سب سے پہلی خدمت ہے جو دوسری صدی کے ربع ثانی کی تالیف ہے اور کتاب الآثار کا جو مجموعہ امام حسن بن زیاد لؤلؤیؒ نے مرتب کیا، وہ غالباً سب سے بڑا ہے کیونکہ انہوں نے امام صاحب کی احادیث مرویہ کی تعداد چار ہزار بیان کی ہے، یہ تعداد اس لئے بڑی اور اہم ہے کہ امام صاحب نے حسب تصریح مورخین چار ہزار اساتذہ حدیث سے حدیثی استفادات کئے تھے، اور حسب تصریح امام موفق مکیؒ آپ سے احادیث مرویہ چالیس ہزار احادیث میں سے منتخب تھیں، پھر یہ کہ وہ سب احکام سے متعلق تھیں، دوسرے ابواب کی طرف آپ توجہ نہ فرما سکے تھے، نہ ان کی احادیث روایت فرماتے تھے، آپ کے سامنے سب سے اہم خدمت احادیث احکام سے تحت تدوین فقہ اسلامی ہی تھی۔ جو سب کو معلوم ہے۔

امام صاحب کثیر الحدیث تھے

واضح ہو کہ امام بخاریؒ کی جامع صحیح میں تمام ابواب کی احادیث غیر مقرر موصول کا مجموعہ ۲۳۵۳ ہے (فتح الباری ص ۴۱۹ ج ۱۳) تو اگر امام صاحب کی صرف احادیث احکام مرویہ بوساطت امام زفرؒ کی تعداد چار ہزار ہے، تو امام صاحب قلیل الحدیث ہوئے یا کثیر الحدیث؟ پھر اسی کے ساتھ اس امر کو بھی ملحوظ رکھیے کہ امام اعظم کی شرائط روایت، امام بخاری ومسلم کی شروط روایت سے بھی زیادہ سخت تھیں مثلاً

امام صاحب کی شرائط روایت

(۱) امام صاحب کے نزدیک راوی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کہ اس نے روایت کو سننے کے وقت سے وقت روایت تک برابر یاد رکھا ہو اگر درمیان میں بھول گیا، اور پھر کہیں لکھی دیکھ کر یا ویسے ہی یاد آ گئی تو اب اس کی روایت نہیں کر سکتا، نہ اس کی وہ روایت حجت ہوگی، امام بخاری ومسلم یا دوسرے بعد کے محدثین کے نزدیک اس پابندی سے روایت کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اس لیے وہ اس شرط سے اتفاق نہیں کرتے اور روایت میں بھی توسع کرتے ہیں۔

(۲) اکثر شیوخ کا حلقہ درس نہایت وسیع ہوتا تھا اور وہ مستملی بٹھلاتے تھے تا کہ ان کا ذریعہ سے دور بیٹھنے والوں تک حدیث پہنچ سکے اور وہ ان مستملیوں ہی سے حدیث سن کر روایت کرتے تھے اور سوال ہوتا ہے کہ ایسے لوگ حدثنا کہہ کر اصل شیخ کی طرف ایسی حدیث کی نسبت کر سکتے ہیں یا نہیں، اکثر ارباب روایت اس کو جائز کہتے ہیں لیکن امام صاحب اس کے خلاف ہیں۔ ائمہ محدثین میں سے حافظ ابونعیم فضل بن دکین اور محدث زائدۃ بن کدامہ امام صاحب کے ہم زبان ہیں، حافظ ابن کثیر نے لکھا کہ مقتضائے عقل تو یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے، لیکن عام مذہب میں آسانی ہے۔ (فتح المغیث)

(۳) ایک طریقہ یہ عام ہو گیا تھا کہ حدثنا و اخبرنا سے وہ حدیث بھی بیان کردی جاتی تھی جن کو خود راوی نے مروی عنہ سے نہیں سنا تھا بلکہ اس کے شہر یا قوم کے لوگوں نے سنی تھی، اس امر پر اعتماد کر کے خود براہ راست نہ سننے والے بھی حدثنا کہہ کر روایت بیان کر دیتے تھے۔

حضرت حسن بصرہ تک ایسی روایات بیان کرنے کا ثبوت ملتا ہے حالانکہ یہ طریقہ حدیث کی اسناد کو مشتبہ کرنے والا تھا، اس لیے امام صاحب نے اس کو ناجائز قرار دیا اس کے بعد دوسرے محدثین نے بھی ان کا اتباع کیا۔

(۴) حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کسی بدعتی سے خواہ وہ کیسا ہی پاکباز ہو اللہجہ اور استباز ہو حدیث کی روایت کے روادار نہیں برخلاف اس کے بخاری و مسلم میں مبتدعین اور بعض اصحاب اہواء کی روایات بھی لی گئی ہیں اگرچہ ان میں ثقہ و صادق اللہجہ ہونیکی شرط و رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

(۵) حضرت امام اعظم ان احادیث کو استنباط احکام کے وقت مقدم رکھتے تھے، جن سے آنحضرت ﷺ کا آخری فعل ثابت ہوتا ہے اس کا اعتراف سفیان ثوریؒ نے کیا ہے۔ (الانتقاء)

اور یہ بھی اس زمانہ کے بڑے بڑے محدثین نے کہا ہے کہ امام صاحب ناسخ و منسوخ احادیث کے سب سے بڑے عالم تھے اور یہ بات اس سے بھی موئید ہوتی ہے کہ امام مکی بن ابراہیم (استاذ امام بخاری) وغیرہ نے امام صاحب کو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا حافظ حدیث تسلیم کیا ہے اور امام جرح و تعدیل محدث بے عدیل یحییٰ القطان (استاذ امام احمد و ابن معین وغیرہ) فرمایا کرتے تھے کہ ''واللہ! امام ابوحنیفہ اس امت میں قرآن و سنت کے سب سے بڑے عالم ہیں''۔

(۶) امام صاحب نے نہ صرف نہایت مضبوط و مستحکم اصول روایت حدیث کے لیے وضع کئے جن کی چند مثالیں اوپر لکھیں گئیں، بلکہ اصول درایت بھی بنائے جن کا تفصیلی ذکر مولانا شبلی نعمانی نے ''سیرۃ النعمان'' میں کیا ہے۔

نیز امام صاحب کے اصول استنباط احکام بھی نہایت ہی پختہ، معتمد اور قابل تقلید تھے۔ جن کا کسی قدر تفصیل سے ذکر علامہ کوثریؒ نے ''تانیب الخطیب'' میں ۱۵۲ تا ۱۵۴ کیا ہے یہ سب امور علماء کے لیے قابل مطالعہ ہیں۔

امام صاحب کی اولیت تدوین حدیث وفقہ میں

یہاں کتابت حدیث کے سلسلہ میں یہی بات بتلائی تھی کہ امام اعظم نے جہاں اپنے چالیس رفقاء حفاظ حدیث و فقہاء کے ساتھ سب سے پہلے تدوین فقہ اسلامی کی نہایت عظیم ترین خدمت انجام دی وہاں انہوں نے تقریباً چار ہزار احادیث صحیحہ قویہ کا بھی وہ مرتب و مبوب ذخیرہ یادگار چھوڑا جو احادیث احکام کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ مستند ذخیرہ تھا جس میں اکثر ثلاثیات بکثرت ثنائیات اور بعض

وحدانیت بھی ہیں۔

ہم نے ابھی بتلایا کہ امام اعظم کی کتاب الآ ثار مذکور میں صرف احادیث احکام کی تعداد چار ہزار تک پہنچی ہے اس کے مقابلہ میں جامع صحیح بخاری کے تمام ابواب کی غیر مکرر موصول احادیث مرویہ کی تعداد ۲۳۵۳ حسب تشریح حافظ ابن حجر ہے اور مسلم شریف کی کل ابواب کی احادیث مرویہ چار ہزار ہے ابوداؤد کی ۴۸۰۰ اور ترمذی شریف کی پانچ ہزار اس سے معلوم ہوا کہ احادیث احکام کا سب سے بڑا ذخیرہ کتاب الآ ثار امام اعظم پھر ترمذی وداؤد میں ہے مسلم میں ان سے کم اور بخاری میں ان سب سے کم ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کہ امام بخاری صرف اپنے اجتہاد کے موافق احادیث ذکر کرتے ہیں۔

کتاب الآ ثار کے بعد موطا امام مالک

امام اعظم کی کتاب الآ ثار ہی کے تتبع میں امام مالکؒ کی موطا مرتب ہوئی ہے جیسا کہ علامہ سیوطی شافعی نے تبییض الصحیفہ میں لکھا: ''امام ابوحنیفہ کے ان خصوصی مناقب میں ہے کہ جن میں وہ منفرد وممتاز ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم شریعت کو مدون کیا اور اس کی ابواب پر ترتیب دی پھر امام مالک نے موطاء کی ترتیب بھی ان ہی کی پیروی میں کی اور اس بارے میں امام ابوحنیفہ پر کسی کو سبقت حاصل نہیں ہے'' اور موطاء امام مالک وہ ہے جس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے صحیحین کی اصل قرار دیا ہے یہ تو اولیت کی بات ہوئی اس کے علاوہ بھی امام ابوحنیفہ کی تصانیف سے امام مالک کے استفادہ کا ذکر کتب تاریخ میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

علامہ شبلی اور سید صاحب کا مغالطہ

اس بارے میں ہمارے علامہ شبلی اور مولانا سید سلمان ندوی کو مغالطہ ہوا ہے کہ ان دونوں حضرات نے علی الترتیب سیرۃ النعمان وحیات امام مالک میں معاملہ برعکس کر دیا کہ جیسے امام اعظم بطور شاگرد امام مالک کی خدمت میں بیٹھتے تھے اور یہ مغالطہ امام دارقطنی اور خطیب کی وجہ سے پیش آیا ہے جس کی تردید حافظ ابن حجرؒ اور علامہ سیوطی وغیرہ کر چکے تھے اور اس امر کی تحقیق وضاحت کر دی تھی کہ درحقیقت امام مالک کی روایت امام ابوحنیفہ سے تو ثبوت کو پہنچی ہے اور امام صاحب کی روایت امام مالک سے پایۂ ثبوت وصحت کو نہیں پہنچی اور ہم پہلے ذکر کر چکے تھے کہ علامہ ابن حجر مکی نے امام مالک کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔

کتابۃ العلم کا اولی واکمل مصداق

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ''کتابۃ العلم'' امام بخاری کے عنوان باب کا سب سے اول، اعلی، واکمل مصداق حضرت امام اعظم کی تدوین حدیث وفقہ کی مہم تھی جس کی رہنمائی میں تقریباً ساڑھے بارہ سو سال سے امت محمدیہ کا دوثلث سواد اعظم دین وعلم کی روشنی حاصل کرتا رہا اور تا قیام قیامت اسی طرح یہ فیض جاری رہے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

علامہ کشمیری کی خصوصی منقبت

پھر یہ بھی عجب حسن اتفاق ہے کہ اس دور انحطاط میں سراج امت حضرت امام اعظم رحمہ اللہ علیہ ہی کے خاندان کا ایک فرد علامہ انور شاہ پیدا ہوا جس نے تمام علوم نبوت کی تحقیق وتشریح اور سارے علماء امت کے علمی ودینی افادات پر گہری نظر کر کے ہر ہر مسئلہ کو پوری طرح

نکھار وسنوار کر پیش کر دیا حق بات جہاں بھی تھی اور جس کی بھی تھی اس کو نمایاں کیا غلطی اگر کسی اپنے سے ہوئی یا کسی بھی بڑے سے اس کے اظہار میں تامل نہیں کیا اس طرح تحقیق واحقاق حق اور ابطال باطل کا ایک نہایت مکمل ومعیاری علمی ذخیرہ سامنے ہو گیا اور اب حسب استطاعت اس کو ''انوارالباری'' کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔

لایقتل مسلم بکافر کی بحث

یہ بحث بھی نہایت اہم ہے کہ لا یقتل مسلم بکافر (کوئی مسلمان کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا) سے کیا مطلب ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ اور ایک روایت میں امام ابو یوسف کا یہ قول ہے کہ ذمی کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قصاصاً قتل کیا جائے گا، یہی قول امام نخعی شعبی سعید بن المسیب، محمد بن ابی لیلی عثمان بتی کا بھی ہے اور یہی قول ایک روایت میں حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہم اجمعین کا بھی ہے ان کا قول یہ بھی ہے کہ مستأمن ومعاہدے کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

دوسرا مذہب امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا ہے کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلہ میں بھی قصاصاً قتل نہیں کر سکتے خواہ وہ ذمی ہو یا مستأمن یا کافر حربی یہی قول امام اوزاعی، لیث، ثوری، اسحٰق، ابوثور، ابن شبرمہ، اور ایک جماعت تابعین واہل ظاہر کا بھی ہے امام بخاری کا رجحان بھی اسی مسلک کی طرف معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ اس حدیث کو کتاب الجہاد باب فکاک الاسیر میں، پھر دیات میں دوجگہ لائے ہیں اور آخر میں باب لا یقتل المسلم بالکافر کا عنوان اختیار کیا ہے۔

ابوبکر رازی نے کہا: حضرت امام مالک ولیث بن سعد نے فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو اچانک یا دھوکہ سے قتل کر دے تو اس کے بدلہ میں مسلمان قاتل کو قتل کیا جائے گا ورنہ اور صورتوں میں قتل نہیں کریں گے۔

حافظ عینیؒ نے حسب تفصیل مذکور اختلاف نقل کر کے لکھا

شافعیہ نے کہا کہ حنفیہ نے اپنے مذہب کے لیے روایت دارقطنی سے استدلال کیا ہے جو حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک مسلمان کو قتل معاہدہ کی وجہ سے قتل کرا دیا تھا پھر فرمایا کہ جن لوگوں نے آج تک اپنے عہد وذمہ کو پورا کیا ہے میں ان سب سے زیادہ اپنے عہد وذمہ کو پورا کرنے کا اہل اور اس کرم وشرف کا مستحق ہوں'' پھر شافعیہ نے اس روایت کا ضعف بیان کیا۔

جواب حافظ عینی رحمہ اللہ

حافظ عینی نے لکھا کہ یہ غلط ہے کہ حنفیہ کا استدلال اسی حدیث پر منحصر ہے کیونکہ ہمارا استدلال تو ان تمام عام ومطلق نصوص سے ہے جن میں قصاص جاری کرنے کا بلاتفریق حکم دیا گیا ہے۔

دوسرا نہایت اہم ودقیق جواب حافظ عینی نے یہ دیا کہ حدیث الباب میں لا یقتل مسلم بکافر کا کوئی تعلق مذکورہ بالا نزاعی صورت سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق دماء جاہلیت سے ہے یعنی زمانہ جاہلیت کے قتل کی وجہ سے اب کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ آنحضرت ﷺ نے

---

[1] مستأمن کے بارے میں حنفیہ کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ قصاص کے طور پر مسلم قاتل مستأمن کو قتل کیا جائے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس کو قتل نہیں کریں گے بلکہ دیت دینی ہوگی، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اگرچہ بعض عبارات فقہ حنفی سے وہم ہوتا ہے کہ اس کے بدلہ میں قتل نہیں مگر مذہب یہی ہے کہ اس کو قتل کیا جائے گا۔

فتح مکہ کے موقع پر خطبہ میں فرمایا تھا دماء جاہلیت سب کے سب میری وجہ سے مٹا دئے گئے ان میں کسی کا کوئی بدلہ اب نہیں لیا جاسکتا اور دوسرے جملہ میں جوفرمایا کہ کسی معاہدے کوبھی اس کے عہد کی مدت میں قتل نہیں کیا جائے گا اس سے مراد وہ معاہدے ہیں جو فتح مکہ سے قبل حضرت محمد ﷺ اور مشرکین کے درمیان متعین مدتوں کے لئے ہوئے تھے کیونکہ فتح مکہ کے بعد سے ذمیوں کے لیے اہل ذمہ کو مستقل عہد کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ جس کا تعلق کسی مدت سے نہیں ہوتا وہ اسلام کا ذمہ ہے اور کسی مدت ووقت پر ختم نہیں ہوتا۔ (عمدۃ القاری ج ا ص ۵٦۵)

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ توجیہ بہت ہی لطیف ہے کیونکہ یہ ایک ٹکڑا ہے خطبہ فتح مکہ کا۔ اور اس مسئلہ کا اعلان واظہار علی رؤس الاشہاد مناسب مقام بھی تھا اسی طرح بخاری شریف ص ۱۰۱٦ (باب من طلب دم امر بغیر حق) میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض لوگوں میں سے تین ہیں (۱) حرم میں الحاد کرنے والا (۲) اسلام کے اندر جاہلی طریقہ تلاش کرنے والا (۳) بغیر حق کے کسی شخص کے خون کا پیاسا ہونا علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیث دماء جاہلیت کے بارے میں ہے پس کیا بعید ہے کہ یہ حدیث الباب بھی دماء جاہلیت ہی سے متعلق ہو۔

جواب امام طحاوی رحمہ اللہ

امام طحاوی کا جواب یہ ہے کہ کافر سے مراد حربی ہے ذمی نہیں کیونکہ اگلا جملہ **ولا ذو عھد الخ** بطور عطف اس پر قرینہ ہے لہٰذا مطلب یہ ہوگا کہ کسی مسلمان کو اور کسی معاہد کافر کو کسی حربی کافر کے بدلہ میں قتل کیا نہیں کیا جائے گا۔

جواب امام جصاص

فرمایا **لا یقتل مسلم بکافر** یہ پوری حدیث حضور ﷺ کے خطبہ میں فتح مکہ کے دن بیان ہوئی تھی کیونکہ ایک خزاعی نے ہذیلی کو دم جاہلیت کے سبب قتل کر دیا تھا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا خبردار جاہلیت کا ہر خون میری شریعت نے اٹھا دیا ہے اب کسی مومن کو کسی کافر کے بدلہ میں اور نہ عہد والے کو اس کے عہد کے اندر کسی کافر کے بدلہ میں جس کو اس نے جاہلیت میں قتل کیا ہوگا) قتل نہ کیا جائے گا اور **لا یقتل مسلم الخ** اسی ارشاد مذکور کی شرح وتفسیر ہے اہل مغازی نے ذکر کیا ہے کہ اہل اسلام کا عہد ذمہ فتح مکہ کے بعد سے شروع ہوا ہے اس سے پہلے حضور ﷺ اور مشرکین کے درمیان مقررہ میعاد ومدت کے معاہدے ہوئے تھے لہٰذا فتح مکہ کے وقت حضور ﷺ کے ارشاد مذکور **لا یقتل** کا مطمح نظر وہی قسم ہے سابق کے کفار معاہدین تھے جس پر قرینہ **ولا ذو عھد الخ** ہے یہ جواب حافظ عینی کے جواب سے ملتا جلتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کا جواب

فرمایا ذمی کی جان کی حفاظت سے تو اس کے مسلمانوں سے عہد کر لینے سے ہی ضروری ہوگئی، کیونکہ ظاہر ہے وہ اپنے مال وجان کی حفاظت ہی کا طلب گار ہے اور ترمذی شریف میں حدیث بھی ہے کہ اہل ذمہ کے وہی حقوق ہیں جو ہم مسلمانوں کے ہیں۔ اور جو ملکی وسیاسی ذمہ داریاں ہم پر ہیں وہ ان پر بھی ہیں غرض معاہدے کا مقصد تو حفاظت جان ومال وآبرو ہی ہے اسکے بعد اگر کوئی مسلمان اس کو قتل کر دیتا ہے تو وہ سارے مسلمانوں کے ذمہ وعہد کی توڑ پھوڑ کرنا اور اس کو ضائع کرنا چاہتا ہے پس اگر اس قتل کے بدلے میں اس شخص کو قتل نہ کیا جائیگا تو معاہدہ جیسی چیز بے معنی ہو جائیگی لہٰذا اس مسلمان کا قاتل کا قتل اصالۃً نہ سہی مگر معاہدہ مذکور کے سبب تو ضروری ہوگا گویا مسلم کا قتل ذمی کے لوازم عقد

ذمہ میں سے ہے لہٰذا پہلے جملہ حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی مسلمان اور ذمی کو کافر کی وجہ سے قتل نہ کیا جائیگا بلکہ اس لیے کہ ذمی بھی عقد ذمہ کے بعد دنیوی احکام کے لحاظ سے مسلمانوں کے حکم میں داخل ہوگیا اور دوسرے جملہ کا مطلب وہی رہے گا جو دوسرے حضرات نے لے لیا ہے۔

اس طریقہ سے حدیث کا جوب ان حضرات کی شرح کی موافقت کے ساتھ درست ہوجائے گا اور اس اعتراض کا جواب بھی ہوجائے گا جو ان لوگوں نے امام زفر پر کیا تھا کہ قتل مسلم کا فیصل اصالۃً نہیں ہوا بلکہ مسلمانوں کے عہد وذمہ کو توڑنے اور اسکی عصمت زائل کرنے کے سبب ہوا۔

حضرت شاہ صاحب کا دوسرا جواب

فرمایا میری ایک توجیہ ایسی بھی ہے کہ جس کی طرف پہلے کسی نے توجہ نہیں کی اس کو سمجھنے کے لیے بطور مقدمہ ایک تمہید کی ضرورت ہے پہلے زمانہ میں بیت اللہ کے پاس قبیلہ جرہم آباد ہوا تھا اور وہ ان ہی لوگ کی ولایت میں تھا ان ہی کے خاندان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام نے نکاح کیا تھا کافی مدت کے بعد یہ ولایت قبیلہ بنی خزاعہ میں منتقل ہوگئی جو قریشی نہیں تھے قریشی کا لقب قصی سے شروع ہوا ہے اور خزاعہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ مضری تھے یا نہیں اس کے بعد جواب جب ولایت مذکورہ لوٹ کر قریش میں آ گئی تو انہوں نے بنی خزاعہ کو مکہ سے باہر نکال دیا اور وہ حوالی مکہ معظمہ میں رہنے لگے اس سے معلوم ہوا کہ ان دونوں قبیلوں میں عرصے سے عداوت قائم تھی۔ جب صلح حدیبیہ ہوئی تو بنوخزاعہ بھی نبی کریم کے ساتھ معاہدے میں داخل ہوگئے آپ کی رضاعت مبارکہ بھی ان ہی لوگوں میں ہوئی تھی۔

پھر بنوبکر یا بنولیث بھی قریش کے ساتھ مل گئے ایک مدت کے بعد بنوخزاعہ اور بنوبکر میں لڑائی ہوئی تو معاہدہ صلح حدیبیہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قریش نے اپنے حلیف بنوبکر کی بنوخزاعہ کے خلاف اعانت کی۔ معاہدہ کو توڑ دیا اور ان کا ایک آدمی بھی قتل کردیا خزاعہ حضور علیہ السلام کے پاس آئے اور اس واقعہ کی خبر دی، یہ بھی نقل ہوا ہے کہ حضور علیہ السلام کو اس واقعہ کی خبر ان کی آمد سے پہلے ہی ہوگئی تھی آپ اس وقت وضوء فرمارہے تھے اسی وقت فرمایا ہم خزاعہ کی مدد کرینگے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ حضرت! آپ کس سے فرمارہے ہیں؟ فرمایا خزاعہ کا وفد آرہا ہے پھر جب وہ آئے تو ان سے بھی قصہ سن کر آپ علیہ السلام نے مدد کا وعدہ فرمالیا اور دس ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر قریش سے غزوہ کیا اور ان کیساتھ طلوع شمس سے وقت غروب تک لڑائی رہی یہ فتح مکہ کا واقعہ ہے اور اس دن میں جتنے وقت آپ نے یہ لڑائی لڑی آپ کے لیے یہ شہر اور حرم مکہ معظمہ حلال ہوا تھا فتح ہوگئی تو آپ نے فوراً ہی امن کا اعلان فرمادیا اس اثناء میں ایک شخص بنوبکر بنی لیث کا حضور علیہ السلام کی خدمت میں آتا جاتا رہا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا ارادہ اسلام لانے کا تھا یا نہیں۔ اس کو خزاعہ کے آدمی نے اپنے اس قتیل کے بدلے میں جو بنوبکر یا بنولیث نے مار دیا تھا قتل کردیا جیسے کہ جاہلیت میں وہ اس طرح کے بدلے لیا کرتے تھے حضور علیہ السلام کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اسی وقت اپنی اونٹنی پر سوار ہوکر نکلے اور وہ خطبہ ارشاد فرمایا جس کا ذکر ۱۱۲ حدیث الباب میں ہے اس کے آخر میں فرمایا کہ جس کا کوئی عزیز و قریب ان حالات وہدایات کے اثناء میں قتل ہوگیا اس کو دو باتوں کا اختیار ہے دیت لے لے یا قصاص دلایا جائے گا۔

اس واقعہ میں ایک مسلم نے ذمی کو قتل کیا تھا کیونکہ حضور علیہ السلام نے قتال کی صورت ختم فرماکر لوگوں کو امن عام دیدیا تھا جس میں یہ قتیل مذکور بھی شامل ہے۔ اس کے باوجود آپ نے قصاص کا ذکر صراحت کیساتھ فرمایا اور ایک اختیار قصاص لینے کا بھی دیا جس سے وہ اختیار بھی حدیث کا مورد مصداق بن گیا اس سے صاف طور پر ہماری مذہب کی تقویت ہوتی ہے اور دوسرے حضرات کو ایسی صورت اختیار کرنی پڑرہی ہے کہ وہ اس حدیث کے نص صریح کو مورد وسبب ورود حدیث کے سوا دوسری صورت کے ساتھ خاص کریں اور مورد حدیث کے بارے میں کوئی حکم واثر اسکا نہ ہو۔

اس مسئلہ میں اگرچہ اصولیین کا اختلاف ہے کہ حکم نص سے مورد وحدیث کو نکال سکتے ہیں یا نہیں مگر ظاہر یہی ہے کہ نہیں نکال سکتے پھر یہ بات کہ حضور علیہ السلام نے قتیل مذکور کا قصاص کیوں نہیں دلایا تو اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ موقع تسامع اور چشم پوشی کا تھا امن کا اعلان کچھ ہی دیر قبل فرمایا تھا اور یہ بھی احتمال تھا کہ اس کی خبر سب کو نہ پہنچی ہو خصوصاً اطراف وحوالی مکہ معظمہ میں (جہاں یہ قتل کا واقعہ پیش آیا ہوگا) اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام نے اولیاء مقتول کی رضا مندی وغیرہ دیکھ کر قصاص کو معاف فرما دیا ہو اور ایسا کرنا رضا مندی اور عدم خصومت کی شکل میں جائز بھی ہے۔ ہماری فقہ میں ہے کہ قاضی کے لیے مستحب ہے کہ وہ پہلے ان لوگوں کو تحکیم وغیرہ صلح کی صورتوں کی طرف بلائے اور اور رغبت دلائے اور حضرت عمرؓ مالی حقوق میں تو اکثر ایسا ہی کرتے تھے۔

غرض اس وقت یہی موزوں سمجھا ہوگا کہ ہر صورت سے فتنہ کا سد باب کیا جائے اور غالبا اسی لیے اس کا خوں بہا بھی خود حضور علیہ السلام نے اپنی طرف سے ادا فرمایا تھا۔

توجیہ مذکورہ کی تائید حدیث ترمذی سے

پھر اس توجیہ کی تائید حدیث ترمذی کی کتاب الدیات سے بھی ہوتی ہے کہ اس میں یہاں سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ مورد سبب ورد کا شمول ثابت ہو رہا ہے ابوشریح کعبی سے بھی مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے اس طرح فرمایا تھا:

اے خزاعہ کے لوگو! تم نے ہذیل کے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے اور میں نے اس وقت اس کی دیت بھی ادا کر دی ہے لیکن آج کے بعد اگر کسی کا کوئی عزیز قریب قتل ہو جائے تو اس کو دو چیزوں میں سے ایک اختیار کرنے کا حق ہوگا "دیت یا قصاص" اس سے مزید صراحت ملتی ہے کہ لینا تو اس وقت بھی قصاص ہی چاہیے تھا، مگر آپ نے کسی مصلحت سے اس کو نظر انداز فرما دیا۔

حافظ ابن حجر اور روایت واقدی سے استدلال

مذکورہ بالا نہایت محققانہ ومحدثانہ جواب کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس موقع پر واقدی کی روایت نقل کر کے اپنے مذہب کے لئے استدلال کیا ہے، اگرچہ اس کا نام ذکر نہیں کیا، میں نے کہا سبحان اللہ، یہ کام حافظ نے خوب کیا کہ واقدی جیسے شخص سے احکام فقہ میں استدلال کیا اگر ایسی بات کسی حنفی سے ہو جاتی تو اس کے واسطے ہمیشہ کے لئے عار وشرم کی بات بن جاتی اور ہر موقعہ پر اس کا طعنہ دیا جاتا۔

حاصل کلام سابق

حدیث الباب کے جملہ لا یقتل مسلم بکافر کے چار جواب ذکر ہوئے

(۱) امام طحاوی کا جواب کہ کافر سے مراد حربی ہے ذمی نہیں

(۲) حدیث کا مقصد دماء جاہلیت کے قضیوں کا ختم کرنا ہے، اس جواب کو حافظ عینی، امام جصاص اور حافظ ابن ہمام وغیرہ نے اختیار کیا ہے

(۳) ذمی جان ومال وآبرو کی حفاظت کے حق میں باعتبار احکام دینوی بحکم مسلم ہے

(۴) نبی کریم علیہ السلام نے اپنے خطبہ فتح مکہ میں، مسلم وذمی کے درمیان بھی حکم قصاص کی صراحت فرمائی، اس کے علاوہ پانچواں جواب یہ ہے کہ اس امام طحاوی کی روایت بسند قوی موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے کافر کے بدلے میں مسلم سے قصاص لینے کا حکم فرمایا، پھر دوسرا حکم دیا

کہ دیت لے لی جائے، اس سے شافعیہ نے گمان کیا کہ انہوں نے پہلے قول سے رجوع کر لیا، امام طحاوی نے فرمایا کہ رجوع کا خیال بعید ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے پہلے اصل مسئلہ کا حکم فرمایا، پھر صلح کی صورت سے دیت کا حکم فرمایا، یہ تینوں جواب حضرت شاہ صاحب کے مختار ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا میرے پہلے جواب کی تائید حضرت علیؓ کے ایک اثر سے بھی ہوتی ہے جو جصاص کی احکام القرآن میں ابوالجنوب اسدی سے مروی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل حیرہ میں سے ایک شخص نے حضرت علیؓ کے پاس آ کر عرض کیا کہ ایک مسلمان نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے، آپؓ نے ثبوت لیا، پھر اس مسلمان کو بٹھلا کر حیری کو تلوار دی کہ مقتل میں لے جائے کر اس کو قتل کر دے، حیری نے کچھ دیر کی اور اس اثناء میں اولیاء قاتل نے اس سے کہا کہ تم دیت لے سکو تو اچھا ہے، اس سے تمہیں معاشی مدد ملے گی اور ہم پر احسان ہو گا، حیری نے کہا کہ اچھا اور تلوار میان میں کر لی، حضرت علیؓ کے پاس گیا، حضرت علیؓ نے اس کی بات سن کر فرمایا کہ شاید لوگوں نے تجھے برا بھلا کہہ کر یا ڈرا دھمکا کر ایسا کہلایا ہے، اس نے کہا واللہ ایسا نہیں ہوا ہے میں نے خود ہی اپنے اختیار و مرضی سے اس کام کو اختیار کیا ہے، آپ نے اس سے فرمایا اچھا تم جانو۔! پھر لوگوں سے فرمایا "کہ ہم نے اولیاء مقتول کو جو کچھ حق دیا تھا، وہ اس لئے دیا تھا کہ ان کی جانیں ہماری جانوں کی طرح اور ان کی دیت ہماری دیت جیسی سمجھی جائے۔"

اس قسم کی روایت حضرت عمرو، حضرت عبداللہ بن مسعود، اوران کی متابعت میں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی مروی ہیں (پھران روایات کو نقل کر کے) امام جصاص نے کہا 'اور ہمیں ان جیسے دوسرے حضرات اکابر میں سے بھی کسی سے اس کے خلاف رائے نہیں معلوم ہوئی۔" احکام القرآن ص۱۶۴ ج۱ و ص۱۶۵ ج۱، طبع مطبعہ بہیہ مصریہ فی ۱۳۴۷ھ)

دیت ذمی کے احکام

ائمہ حنفیہ کے نزدیک ذمی کی دیت بھی دیت مسلم کے برابر ہے، شافعیہ ثلث دیت کے قائل ہیں، اور مالکیہ نصف آثار سب طرف ہیں، پوری، آدھی، بلکہ تہائی کا ثبوت موجود ہے، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا غالباً کہ آنحضرت علیہ السلام کے زمانے میں مختلف صورتوں میں مختلف احکام صادر ہوئے ہیں اور کم والی صورتیں خاص خاص مصالح ومعذوریوں کے سبب ہوئی ہیں، اور بہ نسبت اس کے کامل دیت والے حکم کو کسی مصلحت ومعذوری پر محمول کرنا موزوں نہیں ہے، پھر تخریج زیلعی میں بسند قوی یہ بھی نقل ہوا ہے کہ خلفاء اربعہؓ کے زمانوں میں دیت ذمی، دیت مسلم ہی تھی، ان کے بعد حضرت معاویہؓ کے زمانے میں کمی ہوئی ہے (العرف الشذی ص۴۶۴)

امام ترمذی کا ریمارک

امام ترمذی نے یہی زیر بحث حدیث الباب نقل کر کے لکھا کہ بعض اہل علم کا عمل اسی پر ہے، وہ سفیان ثوری، مالک، شافعی، احمد و اسحاق ہیں کہتے ہیں کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا، دوسرے بعض اہل علم نے کہا مسلم کو معاہد کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا اور قول اول زیادہ صحیح ہے (باب ماجاء لایقتل مسلم بکافر)

تحفۃ الاحوذی مبارکپوری میں یہاں مختصر ایک دو دلیلیں طرفین کی نقل کی ہیں، اور ابن حزم کا یہ قول بھی نقل کیا ہے بجز حضرت عمرؓ کے اثر مذکورہ کے اور کسی صحابی سے کوئی اثر مروی نہیں ہے، پھر صاحب تحفہ نے لکھا کہ حنفیہ کے پاس کوئی دلیل صریح وصحیح نہیں ہے، حالانکہ امام

جصاص نے آیات، احادیث و آثار صحابہ سب حنفیہ کے مسلک کی تائید میں نقل کئے ہیں، اگر صاحب تحفہ کو ایسا ہی بڑا دعوی کرنا تھا تو احکام القرآن کا مطالعہ فرما کر کچھ جوابات لکھتے۔

خیر! ہم نے یہاں جو کچھ لکھا ہے وہ اس مسئلہ کی عظمت و اہمیت کے لحاظ سے بہت کم لکھا ہے اور خدا نے چاہا تو اس کی سیر حاصل بحث اپنے مقام پر آئے گی، جس سے معلوم ہوگا کہ امام اعظم یا ائمہ حنفیہ جس مسئلہ میں سب سے الگ ہوتے ہیں، اس میں بھی قرآن وسنت، قیاس و آثار صحابہ وغیرہا سے کس قدر قوی و مستحکم دلائل ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔

فقہ حنفی کی نہایت اہم خصوصیت

فقہ حنفی کی نہایت اہم خصوصیات پر مستقل تصنیف میں بحث ہونی چاہیے، استاذ محقق ابوزہرہ مصری نے امام ابوحنیفہ کے مناقب میں جو کتاب لکھی ہے، وہ بڑی حد تک "اپ ٹو ڈیٹ" ہے، یعنی قدیم قدروں کے ساتھ جدید اقدار کے لحاظ سے بھی اس میں فقہ حنفی کی برتری نمایاں کرنے میں ان کا قلم کامیاب ہے، مگر جہاں انہوں نے فقہ حنفی کی عظمت دوسرے ائمہ کی فقہوں کے مقابلہ میں بلحاظ رائے، ملکیت وحقوق کی آزادی کے ثابت کی ہے وہاں انہوں نے بہت بڑی خصوصیت کو چھوڑ دیا کہ فقہ حنفی میں ذمی ومستامن کو ایک مسلمان کے برابر، جان، مال وعزت کی حفاظت ضروری قرار دی ہے، حتی کہ مسلمان اگر کسی ذمی کافر کا مال مارلے تو اس کو ایک مسلمان کی طرح وہ مال واپس دلایا جائے گا۔ ذمی کی وہی عزت ہوگی جو مسلمان کی ہوگی، یہاں تک کہ اس کے پیٹھ پیچھے ایک مسلمان کی طرح ذمی کی غیبت بھی جائز نہیں کہ ہم اس کے بارے میں ایسی بات کہہ دیں جو اس کے سامنے کہی جائے تو اس کو ناگوار ہو، کیونکہ اس کی عزت کی حفاظت مسلمان کی عزت کی طرح قرار دے دی گئی ہے۔

بے نظیر اصول مساوات

اگر مسلمان کسی ذمی ومستامن کو دارالاسلام کے اندر قتل کر دے، خواہ وہ مسلمان کتنا ہی بڑا حاکم، مالدار، کاروباری، یا علامہ وقت ومقتدا ہو کہ دارالاسلام کے سارے مسلمان اس کی عزت کرتے ہوں اور خواہ وہ مقتول ذمی کیسا ہی ادنیٰ درجہ کا ہو، خواہ وہ غلام اور دوسروں کا مملوک ہی ہو، اس کو فقہ حنفی کی رو سے قصاص کے طور پر قتل کیا جائے گا، الا یہ کہ مقتول کے وارث دیت اور خون بہا لے کر اپنے حق قصاص کو معاف کر دیں، دوسری طرف سارے ائمہ مجتہدین کا مذہب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کے قتل پر قتل نہیں کیا جائے گا، کسی آزاد کو غلام کے قتل پر قتل نہیں کیا جائے گا اور ذمی مقتول کا خون بہا بھی جو دلایا جائے گا وہ مسلمان مقتول کے خون بہا سے نصف ہوگا۔

فقہ حنفی نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر ورثہ مقتول قصاص چھوڑنے پر آمادہ ہو کر دیت وخون بہا لینا چاہیں تو ان کو وہی پوری رقم دلائی جائے گی، جو مسلمان مقتول کے ورثاء کو ملتی ہے، کیونکہ ذمی ومستامن کافروں کو شریعت اسلامی نے مسلمانوں کے برابر کے حقوق حفاظت عطا کئے ہیں۔

فقہ اسلامی حنفی کی رو سے غیر مسلموں کے ساتھ بے مثال رواداری

اسلام کو چونکہ ہمیشہ سے نہایت وسیع دنیا پر حکمران رہا ہے۔ اب بھی دنیا میں اس کی چھوٹی بڑی تقریباً چالیس حکومتیں موجود ہیں جن میں سینکڑوں قومیں آباد ہیں، اگر ان میں غیر مسلموں کے حقوق کی واجبی حفاظت نہ کی جائے تو امن قائم نہیں رہ سکتا، خصوصیت سے فقہ حنفی نے جو حقوق غیر مسلم رعایا کو عطا کئے ہیں، دنیا میں کسی غیر مسلم حکومت نے آج تک کسی غیر قوم کو نہیں دیئے، بطور مثال چند اہم امور کا ذکر یکجا کیا

جاتا ہے، جن میں فقہ حنفی اور غیر فقہ حنفی کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

(۱) فقہ حنفی میں جیسا کہ مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم رعایا کا خون، حاکم قوم مسلمانوں کے برابر ہے، اگر کوئی مسلمان عمداً غیر مسلم ذمی کو قتل کردے تو اس مسلمان کو بھی اس کے بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا۔

(۲) اگر غلطی سے ایسا کرے تو جو خون بہا مسلمانوں کے باہمی قتل خطاء سے لازم آتا ہے وہی ذمی کے قتل سے بھی لازم ہوگا۔ دوسرے ائمہ کا مذہب اور خود امام بخاری کا رجحان اس کے خلاف ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

(۳) مسلم حکومت میں غیر مسلم بھی تجارت میں پوری طرح آزاد ہیں، اور ان سے وہی ٹیکس لیا جاسکتا ہے جو مسلمانوں سے لیا جائے گا کوئی فرق نہیں کر سکتے، غیر حنفی فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر غیر مسلم رعایا کے افراد تجارت کا مال ایک شہر سے دوسرے شہر کو لے جائیں تو سال میں جتنی بار لے جائیں گے ہر بار ان سے نیا ٹیکس لیا جائے گا۔

(۴) فقہ حنفی میں غیر مسلم رعایا کے بڑے مالداروں سے چار درہم[1] ماہوار، متوسط حال سے دو درہم ماہوار اور تیسرے درجہ کے لوگوں سے ایک درہم ماہوار جزیہ لیا جائے گا، جو ان کی محافظت کا ٹیکس اور بطور علامت تابعیت ہوگا، مفلس، فقیر، معذور اور تارک الدنیا سے کچھ نہیں لیا جائے گا، جزیہ صرف جوان اور بالغ مردوں پر ہوتا ہے، بچے اور عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اگر کوئی غیر مسلم جزیہ کا باقی دار ہو کر مرجائے تو جزیہ ساقط ہو جائے گا اس کے ترکہ یا ورثہ سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔

یہ جزیہ کی وہ صورت ہے کہ کفار کے کسی ملک کو صلحاً فتح کر کے وہاں کے کفار کو بدستور اپنی املاک واموال پر قابض رکھا جائے اور امیر المسلمین ان پر جزیہ مقرر کرے، اور اگر کسی خاص رقم کو باہمی معاہدہ کے تحت طے کر لیا جائے کہ مثلاً سالانہ اتنی رقم دی جایا کرے گی تو اس طرح بھی درست ہے۔

جزیہ کے متعلق امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ وہ کسی حال میں ایک اشرفی سے کم نہیں ہوسکتا اور بوڑھے، اندھے، اپاہج، مفلس، تارک الدنیا کو بھی معاف نہیں کیا جائے گا، بلکہ امام شافعی سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مفلس ہونے کے باعث جزیہ نہ دے سکے تو اس کو مملکت کی حدود سے باہر نکال دیا جائے گا، غرض اس قسم کی کوئی سختی فقہ حنفی کے اندر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس نرمی ہے کیونکہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک بوڑھا ذمی مانگتا پھر رہا تھا، حضرت عمرؓ نے دیکھا تو اپنے آدمیوں سے فرمایا کہ اس بوڑھے کا وظیفہ بیت المال سے جاری کردو، یہ مناسب نہیں کہ جوانی میں اس سے ہم نے جزیہ لیا اور اب وہ بڑھاپے میں دست سوال دراز کر کے اپنا پیٹ پالے۔

(۵) ذمیوں کی شہادت فقہ حنفی کی رو سے، ان کے باہمی مقدمات میں قبول ہوگی لیکن اس مسئلہ میں امام مالک و شافعی دونوں متفق ہیں کہ ذمی کی شہادت کسی حال میں قبول نہیں۔

---

[1] **درھم، شرعی، نصاب زکوۃ اور مہر فاطمی کی وضاحت:** درم شرعی کا وزن تین ماشہ سے کچھ زائد ہے یہ جس کے حساب سے حدیث میں وارد ہوا ہے کہ دو سو درہم پر پانچ درہم زکوۃ کے ہیں۔ مطلب یہ کہ کم سے کم زکوۃ کا نصاب دو سو درہم ہے جن کا وزن ہمارے مروجہ تولہ کے حساب سے 52.1/2 تولہ ہوتا ہے اور چالیسواں حصہ زکوۃ کا دینا فرض ہے، اس 52.1/2 تولہ چاندی کی قیمت ہر زمانہ میں بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً آج آج کل چاندی کا نرخ سوا دو روپیہ تولہ ہے تو اسی کے حساب سے چاندی کا نصاب زکوۃ سمجھنا چاہیے، عام طور سے جو کتب مسائل میں نصاب زکوۃ کو مروجہ روپوں سے متعین کر کے لکھا جاتا ہے وہ طریقہ صحیح نہیں ہے، چاندی کی موجودہ وقت کی قیمت سے حساب لگانا چاہیے اور لکھ دینا چاہیے کہ یہ مقدار فلاں حساب سے ہے کہ تا کہ غلط فہمی نہ ہو، اسی طرح مہر فاطمی کی مقدار چار سو مثقال وارد ہے، مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے لہذا کل وزن ۱۵۰ تولہ ہوا اور اتنے وزن چاندی کی قیمت مروجہ دیکھنی چاہیے، اس کو بھی ۱۳۷ یا ۱۵۰ روپیہ متعین کر کے بتلانا صحیح نہیں موجودہ قیمت ۲۵ تولہ کے حساب سے ۱۵۰ تولہ چاندی کی قیمت ۳۳۷ روپے پچاس نئے پیسے ہوتی ہے۔ (مؤلف)

(۶) ذمی حدودحرم میں داخل ہوسکتا ہے، دوسرے فقہا کے نزدیک وہ داخل نہیں ہوسکتا اور نہ وہ مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں آباد ہوسکتے ہیں۔

(۷) ذمی تمام مسجدوں میں بغیر اجازت حاصل کرنے کے، داخل ہوسکتے ہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک عام مسجدوں میں اجازت کے ساتھ داخل ہوسکتے ہیں، مگر امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اس کو بالکل اجازت مل ہی نہیں سکتی۔

(۸) اگر اسلامی حکومت کو کسی دوسری حکومت سے جنگ کرنی پڑے تو مسلمانوں کا سپہ سالار فوج، غیر مسلم ذمیوں پر اعتماد کرکے، ان سے ہر طرح کی مدد لے سکتا ہے، دوسرے فقہوں میں اس کی ممانعت ہے اور ذمیوں پر کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا نہ ہی وہ اسلامی فوج میں شریک ہوسکتے ہیں۔"

(۹) فقہ حنفی کی رو سے، بجز اس صورت کے کہ غیر مسلم ذمی رعایا منظم ہو کر اسلامی حکومت کے مقابلہ پر آجائے اور صورتوں میں اس کے حقوق رعیت باطل نہیں ہوتی، مثلاً کوئی ذمی جزیہ ادا نہ کرے، یا کسی مسلمان کو قتل کرے، یا کسی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو، یا کسی مسلمان کو کفر کی ترغیب دے تو ان حالتوں میں وہ سزا کا تو مستحق ہوگا مگر باغی نہ سمجھا جائے گا۔، نہ اس کے حقوق شہریت باطل ہوں گے۔ اس کے برخلاف دوسری فقہوں کی رو سے ایسا کرنے والوں کے تمام حقوق باطل ہوجائیں گے اور وہ کافر حربی سمجھے جائیں گے۔

غرض بطور مثال چند چیزوں کا ذکر ہوا جس سے فقہ حنفی کی برتری اور اسلامی حکومت کے مزاج سے اس کا نہایت قریب ہونا معلوم ہوا، اور یہی وجہ ہے کہ حنفی قانون کے مطابق دنیا کی اکثر اور بڑی بڑی اسلامی حکومتوں میں کامیابی کے ساتھ عمل درآمد رہا ہے اور امام شافعی وغیرہ کا مذہب سلطنت وغیرہ کے ساتھ نہ چل سکا۔

مصر میں البتہ ایک مدت تک حکومت اسلامی کا مذہب شافعی رہا، مگر اس زمانہ میں عیسائی و یہودی قومیں اکثر بغاوتیں کرتی رہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم.

موجودہ دور کی بہت سی جمہوری حکومتوں میں مسلمانوں کی زبوں حالی

ایک طرف اسلامی قانون کی غیر معمولی رعایتیں غیر مسلموں کے ساتھ دیکھی جائیں، جن کا کچھ ذکر اوپر ہوا ہے اور پھر تیرہ سو سال کے عملی مشاہدات و تاریخی واقعات کے علاوہ موجودہ دور کی اسلامی حکومتوں کی بھی انتہائی رواداری کے مقابلہ میں اس ترقی یافتہ دور کے مہذب نام نہاد جمہوری ملکوں کے اس طرز عمل کو دیکھا جائے جو مسلم رعایا کے ساتھ اختیار کیا جارہا ہے تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ آج اگر ہر ملک کی اقلیتوں سے آزادی رائے کے ساتھ استصواب کیا جاسکے کہ وہ اپنے حکمرانوں کی زیردستی میں ہنسی خوشی کی زندگی گزار رہی ہیں یا مصیبت و تنگدستی اور ہمہ وقت کوفت و پریشانی کی، ان کو مذہب، کلچر، اور ضمیر و رائے کی آزادی حاصل ہے یا نہیں تو سب قوموں سے زیادہ بدقسمت اس معاملہ میں وہ مسلمان ہی نکلیں گے، جو جمہوریت اور عدل و انصاف کا ڈھنڈورا پیٹنے والے حکمرانوں کے استبدادی پنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔" شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن" کے اصول پر نہایت بیکسی و بے بسی کے عالم میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اللھم ارحمھم واعزھم وانصرھم علے عدوک وعدوھم بکرمک ومنک وفضلک یا ارحم الراحمین! آمین

صحیفہ علیؓ میں کیا کیا تھا

جیسا کہ اس صحیفہ میں لایقتل مسلم بکافر تھا، جس کی مکمل بحث اوپر لکھی گئی، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس میں احکام زکوۃ بھی

تھے جس کا ذکر بخاری میں ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ سے باسناد جید بھی ثابت ہے کہ اس میں زکوٰۃ کے مسائل مذہب حنفیہ کے موافق تھے۔ مگر حافظ ابن حجر نے جہاں صحیفہ مذکورہ کے احکام ایک جگہ جمع کر کے لکھے ہیں، وہاں ان مسائل کا ذکر ترک کر دیا اور ان کو نا قابل التفات سمجھا، اللہ تعالیٰ حافظ سے درگزر کرے کہ ایسی چیز چھپانے کی سعی کی، جس سے حنفیہ کے مسلک[1] کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

زکوٰۃ ابل میں امام بخاری کی موافقتِ حنفیہ

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا "میرا قدیم طریقہ ہے کہ جب کسی بات کو صحیح بخاری میں پاتا ہوں، خواہ وہ مجمل ہی ہو، اور پھر اس کی تفصیل دوسری جگہ دیکھتا ہوں تو اس تفصیل کو بھی بخاری کے اجمال کے ساتھ ملحق سمجھتا ہوں، اور اس لحاظ سے زکوٰۃ ابل کے باب میں مذہب حنفیہ کو بخاری سے ثابت کرتا ہوں، اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ صحیفہ حضرت علیؓ میں زکوٰۃ کے مسائل کا مذکور ہونا بخاری میں اجمالاً، اور مصنفِ مذکورہ میں تفصیلاً ہے۔ اور وہ تفصیل حنفیہ ہی کے مسلک کی موید ہے۔ وللہ وسالشیخ الانور، رحمہ اللہ ورضی عنہ وارضاہ۔

وسلط علیهم رسول الله والمؤمنون (اہل مکہ پر رسول خدا ﷺ اور مسلمانوں کا تسلط ہوا، حافظ عینیؒ نے اس ارشاد نبوی پر لکھا کہ اس سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو فرماتے ہیں کہ مکہ معظمہ عنوۃً (یعنی غلبہ اور زور سے) فتح ہوا تھا، اور حضور اکرم ﷺ کا اس پر تسلط اس "حبس" کے مقابل ہے جو اصحابِ فیل کے لئے قتال سے روک کی صورت میں ظاہر ہوا تھا، یعنی قول جمہور کا ہی، اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ مکہ معظمہ صلحاً فتح ہوا تھا (عمدۃ القاری ص ۲۷۵ ج ۱) اس سے پہلے حدیث ابی شریح میں بھی حافظ عینی اس پر کلام[2] کرتے ہوئے دوسری دلیل کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

---

[1] راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس قسم کے طرز عمل سے محض یہی نہیں کہ حنفیہ کو فائدہ نہیں پہنچا، بلکہ بڑا نقصان یہ ہوا کہ شریعت اسلامی کے پختہ وراجح مسائل پس پشت ہو گئے، اور ان کی جگہ کمزور ومرجوح مسائل کو مضبوط بنا کر پیش کیا گیا، اس طرح نہ یہ حدیث وفقہ کی خدمت ہوئی، اور نہ شریعت حقہ کی۔

ہمارا ارادہ ہے کہ انوار الباری میں تمام مسائل پر بحث بلا کسی تعصب وتنگ نظری کے ہو، جو خدمت حدیث کا صحیح منشا ہے، آخر صحیفہ علیؓ جیسے مقدس، معتمد ومستند گرانقدر مجموعہ حدیث کے مذکورہ مسائل زکوٰۃ کو صرف اسی لئے نا قابل ذکر یا نا قابل التفات کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے مسلک وفقہ کے مؤید اور اپنے مسلک کے مخالف ہیں۔ یہ تو حدیث سے زیادہ فقہ کی خدمت ہوگئی، یا بقول حضرت شاہ صاحبؒ کے فقہ سے حدیث کی طرف جانے کا رجحان ہوا، حالانکہ صحیح قدم یہ ہے کہ حدیث سے فقہ کی طرف چلیں اور فقہ کو بطور خادم فن حدیث ثانوی درجہ میں جگہ دی جائے جو محققین محدثین وفقہاءِ حنفیہ کا طریقہ ہے، پھر یہی شکوہ ہمیں فقہ البخاری سے بھی ہے کہ اپنی فقہ کے مطابق احادیث کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، اور دوسرے فقہ کے مطابق احادیث کا ذکر بھی نہیں کرتے، اور اگر کوئی حدیث دوسری لائیں گے بھی تو غیر مظان میں، یعنی کسی دوسرے موقع پر۔ حافظ ابن حجر نے بھی اس طرز کو اختیار کیا ہے کہ کسی حدیث کو موقع ومحل سے ہٹا کر دوسری جگہ غیر مظان میں ذکر کرتے ہیں تا کہ دوسروں کو اس سے فائدہ نہ پہنچے، اس کی نشاندہی ہمارے حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ اوقات درس میں فرمایا کرتے تھے۔

[2] حرم سے باہر جنایت کرنے والے پر جبکہ وہ حدود حرم میں پناہ لے لے اول ابن حزم کی تائید مذہب امام اعظم وامام احمد نقل کی ہیں اور لکھا کہ ابن حزم نے ایک جماعت صحابہ وتابعین کے اقوال حدود حرم میں حد قائم کرنے کی ممانعت میں نقل کئے ہیں اور یہ دعوے بھی نقل کیا کہ اس کے خلاف کسی صحابی سے بھی منقول نہیں ہے اور لکھا ہے کہ ابن حزم نے امام مالک وشافعی پر تشنیع کی ہے کہ ان دونوں نے اس مسئلہ میں ان سب صحابہ کرام اور کتاب اور سنت کی مخالفت کی ہے اور ابن خطل کے واقعہ سے استدلال کرنے والوں کو جوابات دئے ہیں۔

اس کے بعد حافظ عینیؒ نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کا قول فان احد ترخص لقتال رسول اللہ ﷺ اس امر کی دلیل ہے کہ مکہ معظمہ عنوۃً فتح ہوا تھا جو اکثر علماء کا مذہب ہے قاضی عیاض نے کہا کہ یہی مذہب امام ابوحنیفہ کا مالک واوزاعی کا ہے۔ اور حضرات کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اہل مکہ پر احسان کر کے ان کے اموال ومساکن کو ان ہی کے پاس چھوڑ دیا اور مال غنیمت قرار دے کر تقسیم نہیں فرمایا تھا ابو عبید نے کہا کہ اس بارے میں مکہ معظمہ کو صلحاً فتح کیا گیا تھا اور حدیث الباب میں نہوں نے یہ تاویل کی کہ حضور ﷺ کے لیے قتال کو جائز قرار دیا گیا تھا کہ اگر ان کو اس کی ضرورت پیش آئے تو کر سکیں لیکن یہ تاویل (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الاوانهالم تحل لا حد قبلي ولا نحل لاحد بعدی

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس میں حق تعالیٰ کا تکوینی مقصد بتلایا گیا ہے (کہ حضرت حق نے اس بقعہ مبارکہ کو اسی حیثیت وشان کا بنایا ہے کہ اس کی بے حرمتی کرنے والوں کو تسلط اس پر نہ ہو وہ قدسیوں ہی کے غلبہ اوقتدار میں رہے مگر دنیا میں حق و باطل ملا ہوا ہے سارے کام حق تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہی نہیں ہوتے جیسے فرمایا وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون یہ تو مقصد بتلایا مگر اس کے موافق عمل کرنے والے کتنے ہیں سب کو معلوم ہے لہٰذا زمانے میں مکہ معظمہ پر کفار کا تسلط تکوین مذکور کے منافی نہیں چنانچہ جامع صغیر میں ہے کہ **ان مكة لا يحلها احد حتى يحلها اهلها** (مکہ معظمہ کی حرمت کے خلاف کوئی نہ کر سکے گا۔ مگر یہ خود اس کے باشندے ہی کسی کو اس بات کا موقع دیں)

ولا تلتقط سا قطتها الا المنشد

حافظ عینی نے لکھا امام شافعی کا قول ہے کہ حرم کی گری پڑی چیز کو اگر کوئی شخص اٹھالے تو اس کو ہمیشہ اس کے بارے میں اعلان کرنا پڑے گا اور وہ اس کا کبھی مالک نہ ہوگا نہ اس کو صدقہ کرنے کا حق ہے بس مالک ہی مل جائے تو اس کو دے دے گا غرض ان کے نزدیک لقطۂ حرم کا حکم دوسری جگہوں کے لقطہ کی طرح نہیں ہے اور امام مالک وا کثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ حل وحرم کا لقطہ برابر ہے اور اس کا اعلان بھی دوسری جگہوں کے لقطوں کی طرح صرف ایک سال تک کرنا ضروری ہے۔ پھر صدقہ بھی کر سکتا ہے لیکن مالک جس وقت بھی آئے گا۔ اس کا اختیار ہوگا۔ کہ اپنی چیز یا قیمت کا مطالبہ کرے ائمہ حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ اور ان کے نزدیک حرم کے لقطہ حرم کا حکم خاص طور سے اسی لیے بیان ہوا ہے کہ شاید موقع کوئی شخص وہاں سال بھر تک اعلان کرنے کو دوسرے مقامات کی طرح مفید نہ سمجھے اور خیال کرے کہ حج کے موقع پر مشرق و مغرب کے لوگ اگر جمع ہوئے پھر متفرق ہو گئے تو اس کے بعد اعلان کرنے کا کوئی حاصل نہیں اس وہم کو دور کرنے کے لیے حدیث میں حرم کے لقطہ کا حکم بتلایا گیا۔ ۔علامہ مازری نے کہا کہ اس سے مقصود تعریف و اعلان میں مبالغہ کرنا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی شخص چند سالوں کے بعد پھر حج کو آئے۔ لہٰذا یہاں کے لقطہ کا اعلان زیادہ طویل مدت تک ہونا چاہیے۔ دوسرے شہروں کے لیے یہ بات نہیں ہوتی۔ (عمدۃ القاری ص ۵۷۰)

قوله عليه السلام فمن قتل الخ:

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یعنی آج کے بعد مسئلہ ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ حدیث ترمذی کا حوالہ پہلے ہی گذر چکا ہے۔ جس میں بعد الیوم کی صراحت ہے اور خاص واقعہ میں جو حضور اکرم ﷺ نے کسی مصلحت سے مسامحت فرمائی تھی اس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔

قوله عليه السلام امام ان يعقل و اماان يقاد اهل القتيل

اولیاء مقتول کو خواہ دیت دلا دی جائے یا قصاص دلایا جائے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا اس حدیث کے ظاہر سے امام شافعی نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضور ﷺ کے قول مذکور فان احد ترخص لقتال رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ضعیف ہے کیونکہ اس سے تو ثابت ہوا کہ قتال کا وجود بھی ہوا ہے (صرف امکان وقوع نہیں تھا) پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ حضور ﷺ نے اعلان فرمایا تھا جو ابوسفیان کے گھر داخل ہو جائے اور امن دیا گیا اور ایسی ہی دوسری خاص خاص باتوں پر لوگوں کو امن دینے کا اعلان فرمایا اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ فتح مکہ عنوۃ ہوا تھا اگر صلحاً ہوتا تو اس طرح کے اعلان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ چونکہ کچھ وقت کے لیے عام قتال ہو چکا تھا اس لیے ایسی صورت اختیار کی گئی کہ عام لوگوں کو مختلف طریقوں سے مامون کیا جائے)

علامہ ماوردیؒ کا قول یہ ہے کہ اسفل مکہ معظمہ سے تو حضرت خالد بن ولیدؓ عنوۃ (غلبہ اور زور سے (داخل ہوئے تھے اور اعلیٰ مکہ سے حضرت زبیر بن العوام صلحاً داخل ہوئے تھے اور اسی سے حضور ﷺ بھی داخل ہوئے تھے اس لیے آپ کی داخلہ کی جہت والی بات صلحاً کی زیادہ شہرت ہوگئی (عمدۃ القاری ج ا ص ۵۴۴)

استدلال کیا ہے اوران کے یہاں قتل کے نتیجہ میں ولی مقتول کو اختیار ہے خواہ قاتل سے قصاص لے یا دیت قاتل کی رضامندی اس بارے میں ضروری نہیں ہے حافظ عینی نے ص ۴۳/۴۴ میں لکھا ہے کہ لیث اوزاعی شافعی احمد اسحٰق ابوثور کا یہی مذہب ہے سفیان ثوری اور کوفیوں کا مذہب یہ ہے کہ قتل عمد میں وہ صرف قصاص لے سکتا ہے اور دیت بغیر رضا کے قاتل نہیں لے سکتا۔ امام مالک سے بھی مشہور قول یہی ہے

حافظ ابن حجر کا تسامح

حافظ نے فتح الباری ص ۱۶۹ ج ۱۲ میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ مالک و ثوری کا مذہب یہ ہے کہ قصاص یا دیت دینے میں اختیار قاتل کو حاصل ہے لیکن یہاں بیان مذہب میں حافظ کا تسامح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ائمہ حنیفہ اور امام مالک وسفیان کا اصل مذہب یہ ہے کہ قتل عمد میں قصاص ہی کا وجوب اولی طور پر متعین ہے کیونکہ قرآن مجید میں صاف ارشاد ہے کہ کتب علیکم القصاص فی القتلی اور قصاص قود رہی ہے کہ کیونکہ قتل خطا میں بھی مال بھی صرف اسی ضرورت سے دلاتے ہیں کہ خطا کی وجہ سے ایک خون ہو گیا تو دوسرے عمداً خون کا تو بچا لیں۔ حالانکہ مال اور جان میں باہم کوئی مماثلت نہیں اور قتل عمد کی صورت میں اصل وجوب خون کے بدلہ میں خون کا ہونا چاہیے کیونکہ دونوں صورتوں اور معنی کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں لہذا قتل خطا کی صورت میں جو مجبوری وضرورت سے مال کو نفس کے برابر کر دیا گیا تھا۔ وہ ضرورت یہاں نہیں ہے

غرض قتل عمد کی صورت میں نہ تو آئمہ حنفیہ کا مذہب یہ کہ قاتل کو اختیار ہے اور نہ ہی وہ ایسی غیر معقول بات کہہ سکتے ہیں البتہ ان کا مذہب یہ ضرور ہے کہ دوسرے درجہ پر اگر اولیاء مقتول قصاص نہ لینا چاہیں اور دیت لینا چاہیں تو وہ قاتل کی رضامندی سے ایسا کر سکتے ہیں تو اس میں دونوں طرف کی رضامندی ومراضاۃ شرط ہے صرف قاتل کو بااختیار کہنا غلط ہے ممکن ہے کہ حافظ نے ایسی صورت کو سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ واللہ اعلم حدیث الباب حنفیہ کے خلاف نہیں ہے

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حدیث الباب ہمارے خلاف نہیں ہے کیونکہ یہاں حدیث میں ولی کو مقتول کا اختیار دیا گیا ہے قصاص لے یا دیت اس کو ہم بھی مانتے ہیں آگے یہ کہ یہاں رضا قاتل کا ذکر نہیں ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی جان ایسی قیمتی چیز دینے کی جگہ مال دینے پر اس کی رضامندی ظاہر تھی جو کچھ دشواری بظاہر ہوتی ہے وہ اولیاء مقتول کی رضامندی میں ہوا کرتی ہے کہ وہ دیت کو جان کے بدلے میں لیتے ہیں گویا کم درجہ کی چیز پر راضی ہوتے ہیں اور حافظ عینی نے بخیر النظرین پر لکھا کہ یہ اولیاء مقتول کے لیے تخییر نہیں ہے بلکہ ان کو بطور ترغیب کہا گیا ہے۔ کہ بہتر واصلح صورت کو اختیار کریں تو اچھا ہے اس سے یہ سمجھنا کہ ان کو مستقل طور سے اختیار دے دیا گیا ہے۔ یا ان کے لیے رضا قاتل بھی ضروری نہیں رہی حدیث نبوی کا منشا نہیں ہے۔

امام طحاویؒ کے دو استدلال

فتح الباری ص ۱۲۹ ج ۱۲ میں امام طحاویؒ کے دو استدلال اور بھی اس بارے میں نقل ہوئے ہیں جو مختصراً لکھے جاتے ہیں

(۱) حدیث انس کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کتاب اللہ قصاص ہے کیونکہ آپ ﷺ نے کتاب اللہ ہی سے قصاص کا فیصلہ ذکر کیا تخییر نہیں کی اگر ولی مقتول کو اختیا ہوتا کہ وہ اپنی مرضی سے چاہے قصاص لے یا دیت لے تو اس کو حضور ﷺ ضرور بتلاتے صرف قصاص کو کتاب اللہ کا فیصلہ فرما کر سکوت نہ فرماتے اور یوں بھی حاکموں کا قاعدہ ہے کہ وہ صاحب حق کو بتلا دیا کرتے ہیں کہ تمہیں اتنی باتوں کا حق ہے جس کو

چاہو اختیار کرلو جب آپ علیہ السلام نے صرف قصاص کو حکم الٰہی ظاہر فرمایا تو اس کی روشنی میں خیر النظرین کو بھی سمجھنا چاہیے کہ اس سے آپ کا مقصد ولی مقتول کا اختیار دینا ہے یا محض احسن واصلح کی ترغیب دینا ہے۔

(۲) اس امر پر اجماع ہے کہ اگر ولی مقتول قاتل سے کہے کہ تو مجھے اتنا مال دیدے تو میں تجھے قتل سے بچادوں گا تو قاتل کو مجبور نہیں کر سکتے کہ اس کو قبول ہی کرلے اور نہ اس کو مجبور کر کے مال لیا جاسکتا ہے۔ اگر چہ خود قاتل کو چاہیے کہ مال دے کر اپنی جان کی حفاظت کرے۔

مہلب وغیرہ کا ارشاد

اس کے بعد حافظ نے خود ہی مہلب وغیرہ کا مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے:

نبی کریم علیہ السلام کے ارشاد "**فهو بخير النظرين**" سے معلوم ہوا کہ اگر ولی مقتول سے عفو علی مال کا سوال کیا جائے تو اس کو اختیار ہے کہ اس کو قبول کرے یا رد کر کے قصاص لے، اگر چہ بہتر یہی ہے کہ اولیٰ وافضل کو پسند کرے لیکن اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قاتل کو مجبور کریں گے کہ وہ دیت ضرور ادا کرے"۔

پھر کہا: کہ آیت کریمہ سے اس امر پر استدلال کیا گیا ہے کہ قتل عمد کی صورت میں واجب قود وقصاص ہی ہے اور دیت کا مال اس کا بدل ہے اور بعض نے کہا کہ واجب دونوں ہی ہیں اور ان میں اختیار ہے، یہ دونوں قول علماء کے ہیں، زیادہ صحیح قول اول ہے"۔ (فتح الباری ۱۲ج ۱۶۹)

یہ بحث بہت لمبی ہے اگر خدا نے چاہا تو کتاب الدیات میں پہنچ کر حسب ضرورت اس کی تکمیل ہوگی، حضرت شاہ صاحبؒ کی عادت تھی کہ وہ بہت سے مسائل پر ابتدائی پاروں ہی میں سیر حاصل بحث فرمادیا کرتے تھے، اس لئے ہم بھی اس کو کسی قدر تفصیل سے لکھتے ہیں اور ان سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ائمہ حنفیہ کی کتاب وسنت پر وسعت نظر، علوم نبوت سے اعلیٰ مناسبت اور گہری نسبت نیز اتباع حق واحق کی شان معلوم ہوگی، اور ان سے آئندہ مسائل کے نشیب وفراز کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملے گی۔ **وما ذلك على الله بعزيز**.

الا الا ذخر اذخر کا ترجمہ حضرت شاہ صاحب نے مرچیا گند فرمایا کہ اور پنجابی میں کترن بتلایا، اذخر مکی مشہور ہے، یہ ایک نباتی دوا ہے، جو امراض معدہ، جگر، گردہ ومثانہ وغیرہ میں بہت نافع ہے۔

فخرج ابن عباس

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس حضور اکرم علیہ السلام کی مجلس سے باہر نکلے، اور الفاظ مذکور فرمائے، حالانکہ یہ بات خلاف واقعہ ہے، حافظ ابن حجر اور حافظ عینی وغیرہ سب نے تصریح کی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اس موقعہ پر موجود نہیں تھے، اور نہ اس وقت حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرنے والے عبید اللہ ہی وہاں موجود تھے کیونکہ وہ تو صحابی بھی نہیں ہیں بلکہ طبقہ ثانیہ کے تابعی ہیں، اس لئے واقعی بات یہ ہے کہ عبید اللہ اپنے زمانے کی بات کا ذکر کر رہے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ زمانہ نبوت کا اتنا واقعہ بیان فرما کر اپنے مکان سے باہر نکلے اور آئندہ کلمات کہے۔ چنانچہ یہی حدیث بخاری اور بھی کئی جگہ آئے گی، کتاب الجہاد ص ۴۲۹ اور باب الجزیہ ص ۴۴۹ میں تو خروج اور آگے کے کلمات سرے سے ذکر ہی نہیں ہے اور مغازی ۶۳۸، باب قول المریض ۸۴۶ اور پھر کتاب الاعتصام ص ۱۰۹۵ میں یہ صراحت ہے کہ عبید اللہ نے کہا کہ حضرت ابن عباسؓ اس طرح کے کلمات فرمایا کرتے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے بیان کے وقت اپنی رائے کا

اظہار کیا کرتے تھے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اسی بات کو حافظ ابن تیمیہ نے بھی اپنے رسالہ رد روافض میں جزم ویقین کے ساتھ لکھا ہے۔
حافظ ابن حجر نے یہاں یہ بھی لکھا ہے کہ کہ اس واقعہ سے حضور علیہ کی موجودگی میں اجتہاد کا وقوع وثبوت ہوا، (کیونکہ حضرت عمرؓ اور آپ کے ہم خیال حضرات کی ایک رائے تھی اور حضرت ابن عباسؓ کی دوسری۔
حافظ عینی نے بھی استنباط احکام کے عنوان کے ضمن میں لکھا کہ حضور علیہ کا کتابت نہ کرانا اجتہاد کی اجازت واباحت کے حکم میں ہے کہ صحابہ کرام کو اجتہاد کے لئے چھوڑ دیا۔ (عمدۃ القاری ص ۵۷۸ ج ۱)
یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ تمام علماء امت نے اس بارے میں حضرت عمرؓ اور آپ کے ہم خیال حضرات صحابہ کے اجتہاد کو حضرت ابن عباسؓ وغیرہ صحابہ کے اجتہاد پر ترجیح دی ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ وغیرہ کا علم وفضل وتفوق دوسرے خیال کو حضرات کے مقابلہ میں مسلم تھا، تو اس سے ایک طرف تو اجتہاد کا ثبوت ہوا، جس کے ساتھ ان لوگوں کے لئے جو اجتہادی صلاحیتوں سے بہرہ مند نہیں، تقلید کی ضرورت وجواز بھی ثابت ہوا، اور دوسری طرف حضرت امام اعظمؒ کا علم وفضل واجتہادی تفوق اس امر کا بھی متقاضی ہوا کہ دوسرے ائمہ مجتہدین کے فقہ واجتہاد پر اس کو ترجیح دی جائے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

تقلید ائمہ مجتہدین: اس بارے میں حضرت استاذ الاساتذہ مولانا محمود الحسن صاحب نے ایضاح الادلہ میں پوری بسط ایضاح اور دلائل سے کلام کیا ہے، ہر زمانہ کے اکابر علمائے امت اور محدثین وفقہا کا تقلید ائمہ مجتہدین کرنا اور اسکو ضروری بتلانا اس کی حقیقت واہمیت کی بڑی دلیل ہے، علامہ امام الحرمین، ابن السمعانی، غزالی، شافعی وغیرہم کا خود مقلد ہونا اور اپنے تلامذہ کو امام شافعی کی تقلید کا وجوب بتلانا ثابت ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ''الانصاف'' میں تحریر فرمایا۔ ''دوصدی کے بعد مجتہدین میں کسی مجتہد کا اتباع عام طور سے ہونے گا، اور ایسے لوگ بہت کم ہوئے ہیں جو کسی ایک معین مذہب پر اعتماد نہ کرتے ہوں، اور اس اتباع کو بدرجہ واجب سمجھا جاتا رہا ہے، نیز حضرت شاہ صاحب موصوف کا خود کو حنفی لکھنا اور مذہب حنفی کو طریقہ انیقہ مطابق کتاب وسنت بتلانا ہم معتبر حوالوں سے ثابت کر چکے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بَابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ

(رات کے وقت تعلیم وواعظ کرنا)

(۱۱۵) حَدَّثَنَا صَدَقَةُ قَالَ اَخْبَرَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ مَّعْمَرٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ هِنْدٍ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ ح وَ عَمْرٌو وَّ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنِ امْرَاَةٍ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتِ اسْتَيْقَظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَقَالَ سُبْحَانَ اللهِ مَاذَا اُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفِتَنِ وَمَا ذَا فُتِحَ مِنَ الْخَزَآئِنِ اَيْقِظُوْا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ فَرُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْاٰخِرَةِ.

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ ایک رات حضور علیہ بیدار ہوئے اور فرمایا کہ سبحان اللہ! آج کی رات کس قدر فتنے نازل کئے گئے، اور کتنے خزانے کھولے گئے، ان حجرہ والیوں کو جگاؤ، کیونکہ بہت سی عورتیں (جو) دنیا میں (باریک) کپڑا پہننے والی ہیں وہ آخرت میں برہنہ ہوں گی۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ کی رحمت کے خزانے نازل ہوئے اوراس کا عذاب بھی اترا، دوسرے یہ کہ بہت سی ایسی عورتیں جو ایسے باریک کپڑے استعمال کریں گی جن سے بدن نظر آئے، آخرت میں انہیں رسوا کیا جائے گا۔

یہ حدیث امام بخاری نے اپنی صحیح میں اپنے مختلف اساتذۂ حدیث سے مختلف الفاظ میں پانچ جگہ روایت کی ہے، روایت کرنے والی صحابیہ ہر جگہ حضرت ام سلمہ ہی ہیں، کیونکہ اس رات میں حضور اکرم ﷺ آپ ہی کے پاس تشریف رکھتے تھے۔

بخاری میں ذکر کردہ پانچوں روایات کی تشریحات

(۱) یہاں بیان کیا کہ ایک رات میں حضور اکرم ﷺ بیدار ہوئے، پھر فرمایا، سبحان اللہ! آج کی رات کتنے فتنے اترے اور کتنے خزانے کھولے گئے، حجرہ والیوں کو جگادو کہ بہت سی دنیا کا لباس پہننے والیاں آخرت کے لباس سے محروم ہوں گی (کہ دنیا میں تو اپنے مال و دولت کے سبب خوب عمدہ اور اچھے لباس پہنتے تھے مگر چونکہ آخرت کے لئے نیک عمل وتقوی کی زندگی اختیار نہ کی تھی، اس لئے وہاں لباس تقوی سے عاری ہوں گی۔ اور یہاں کے بناؤ سنگھار اور حسن و جمال کی نمائش سے جو شہرت و وجاہت حاصل کی تھی، وہاں اس کے مقابلہ میں اسی درجہ کی بے قدری اور بے وجاہتی، کسمپرسی و بے رونقی سے دوچار ہوں گی) یہ تو رات کے وقت وعظ ونصیحت کا بیان ہوا۔

(۲) اس کے بعد کتاب التہجد میں امام بخاری نے عنوان باب قائم کیا کہ نبی کریم ﷺ رات کی نماز ونوافل کی ترغیب دیا کرتے تھے اور بعض اوقات حضرت علیؓ وفاطمہ رضی اللہ عنہا کا دروازہ بھی رات کے وقت تشریف لے جا کر کھڑکھڑایا اور نماز تہجد کی فضیلت سنائی، پھر یہی حدیث ام سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا نے اس طرح ذکر کی۔ حضور اکرم ﷺ رات کو اٹھے، پھر فرمایا: سبحان اللہ! آج کی رات کس قدر فتنوں اور کتنے خزائن رحمت کا نزول ہوا، حجرہ والیوں کو کون جا کر اٹھائے؟ اچھی طرح سمجھ لو کہ یہاں دنیا میں لباس برہنگی پہننے والیاں آخرت میں بطور سزا ننگی ہوں گی، نماز چونکہ دنیا کے فتنوں اور آخرت کے عذاب سے ڈھال بن جاتی ہے، اسلئے خاص طور سے نماز کی ترغیب ہوئی۔

(۳) اس کے بعد کتاب اللباس میں عنوان باب یہ قائم کیا گیا کہ حضور اکرم ﷺ لباسوں اور فرشوں کے بارے میں کتنی گنجائش دیتے تھے، یعنی کس قسم کے لباس اور فرش کو جائز قرار دیتے تھے اور کس کو نہیں۔ یہی حدیث ام سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا اس طرح روایت کرتی ہیں: ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ رات میں کلمہ پڑھتے ہوئے بیدار ہوئے، پھر فرمایا کہ آج کی رات کس قدر فتنے اور کس قدر خزانے نازل ہوئے؟ کون جا کر حجرہ والیوں کو جگائے گا؟! بہت سی عورتیں دنیا میں لباس پہنتی ہیں، مگر قیامت میں تو وہ ننگی ہوں گی حدیث مذکورہ کے ایک راوی زہری نے کہا کہ اس حدیث کی ایک روایت کرنے والی مسماۃ ہندا پنے لباس میں تستر کا اس قدر اہتمام کرتی تھیں کہ اپنے کرتہ کی دونوں آستینوں[1] میں گھنڈیاں لگاتیں تھیں، جو ہاتھوں کی انگلیوں میں بندھتی تھیں (تاکہ کلائیاں نہ کھلیں)

(۴) آگے کتاب الادب میں باب التکبیر والتسبیح عند التعجب کا عنوان قائم کر کے بھی امام بخاری اس حدیث ام سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا کو لائے ہیں اس میں الفاظ روایت کا فرق یہ ہے کہ نزول خزائن کا ذکر نزول فتن سے مقدم ہے۔

---

[1] عرب میں دستور تھا کہ لباس فراخ استعمال کرتے تھے، چست اور تنگ لباس کو پسند نہیں کرتے تھے، عورتیں اس بارے میں اور بھی محتاط تھیں کہ جسم کی بناوٹ لباس سے نمودار نہ ہو، اس لئے بھی آستینیں چوڑی ہوتیں، اور چوڑی ہونے کی وجہ سے کلائیاں کھلنے کا احتمال تھا تو اس کے لئے گھنڈیوں کا استعمال کیا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جسم کی عریانی صرف اسی میں نہیں کہ باریک کپڑے پہنے جائیں بلکہ زیادہ چست لباس بھی تستر کے خلاف ہے، خصوصاً عورتوں کے لئے کہ ان کا تمام جسم عورت ہے اور نمائش کسی حصہ کی بھی جائز نہیں۔ (مؤلف)

(۵) اس کے بعد کتاب الفتن میں باب قائم کیا کہ "آئندہ ہر آنے والا ہر زمانہ کے لحاظ اپنے سابق زمانہ سے برا اور بدتر آئے گا" پھر یہی حدیث ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کی، اس میں یہ بھی ہے کہ حضور اکرم ﷺ گھبرا کر بیدار ہوئے، اور فرمایا کہ سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے کتنے خزانے آج کی رات اتارے، اور کتنے ہی فتنے اترے، کون جا کر حجرہ والیوں کو جگائے، آپ ﷺ کا مقصد ازواج مطہرات تھیں، تاکہ وہ اٹھ کر نماز پڑھیں اور فرمایا رُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْآخِرَةِ. اس آخری جملہ کے محدثین نے بہت سے معانی و مطالب لکھے ہیں وہ بھی یہاں یکجا لکھے جاتے ہیں۔

رب کاسیۃ کی پانچ شرحیں

(۱) دنیا میں مال و دولت کی بہتات تھی، خوب انواع و اقسام کے لباس پہنے مگر تقویٰ و عمل صالح سے خالی تھی، اس لئے آخرت کے ثواب سے عاری ہوں گی۔

(۲) نہایت باریک کپڑے استعمال کئے تھے کہ جسم کی بناوٹ نمایاں ہو، اس کی سزا میں آخرت کی عریانی ملے گی، چست لباس کا بھی یہی حکم ہے۔

(۳) خدا کی نعمت دنیا میں خوب ملی، مزے اڑائے، اچھا کھایا پہنا، مگر شکر نعمت سے خالی تھیں کہ اکثر عورتیں ناشکری ہی ہوتی ہیں، اس لئے وہاں کی نعمتوں سے عاری ہوں گی۔

(۴) بظاہر دنیا میں لباس پہنتی تھیں مگر ساتھ ہی حسن و جمال کی نمائش بھی کرتی تھیں، مثلاً دوپٹہ گلے میں ڈال لیا اور اس کے دونوں پلے کمر کی طرف پھینک دیئے، تاکہ سینہ کی نمائش ہو تو اس عریانی کی سخت سزا آخرت میں ملے گی۔

(۵) "هن لباس لكم و انتم لباس لهن" کے طریقہ سے مراد معنوی طور سے لباس پہننا اور معنوی ہی عریانی مراد ہے مطلب یہ کہ خوش قسمتی سے نیک شوہر مل گیا، لیکن اس خلعت تزوج کے باوجود خود کوئی نیک عمل دنیا میں نہ کیا، تو اس کو شوہر کی نیکی سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا، وہاں تو یہ تعلق کیا، نسبی تعلق بھی کارآمد نہ ہوں گے، قال تعالیٰ "فلا انساب بينهم" وہاں حساب کے وقت سب ایسے ہو جائیں گے جیسے ان میں کوئی نسبی تعلق تھا ہی نہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے یہ سب معانی لکھ کر بتلایا کہ یہ آخری مطلب علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے اور اس کو مناسبت مقام کے لحاظ سے ترجیح بھی دی ہے کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو ڈرایا ہے کہ وہ پیغمبروں کی بیویاں ہونے کے گھمنڈ میں آ کر لباس تقویٰ و عمل صالح سے غافل نہ ہوں، اور جب ان نفوس قدسیہ کو تنبیہ کی جا رہی ہے تو اور دوسری امت کی ماؤں بہنوں کے لئے بدرجہ اولے برائیوں سے بچنے اور بھلائیاں اختیار کرنے کی ترغیب ہے۔

بحث ونظر

یہاں حدیث الباب کو امام بخاری نے اپنے استاذ صدقۃ بن الفضل مروزی م ۲۲۶ھ میں روایت کیا ہے، اور محدثین نے لکھا ہے کہ موصوف سے اصحاب صحاح میں سے صرف امام بخاری نے ہی روایت کی ہے اور حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ وہ حنفیہ کے حق میں متشدد تھے، حافظ ابن حجر نے بھی ان کو "صاحب حدیث وسنت" نقل کیا جس طرح ان کی عادت ہے کہ وہ اہل الرائے اور صاحب حدیث کو الگ الگ نمایاں کر کے دکھلاتے

ہیں، (تہذیب ص ۱۴۷ ج ۴) اور ابن ابی حاتم نے بھی کتاب الجرح والتعدیل ص ۴۴۴ میں کان صاحب حدیث و سنة کا ریمارک دیا۔

حضرت شاہ صاحب کے ارشادات

فرمایا ماذا انزل باب تجسد معنی سے ہے، یعنی آنے والے واقعات وحالات آپ کو مجسم کر کے دکھائے گئے، اور یہ بھی ایک قسم کا وجود ہی ہے جس طرح لیلۃ البراءۃ میں آئندہ سال کے لئے مقدر ہونے والی چیزوں کا وجود تقدیری ہوتا ہے، غرض جو کچھ آپ نے اس رات میں دیکھا وہ بھی ایک قسم کا وجود ہی ہے۔

ہرشئی کے وجودات سبعہ

اور جس طرح کسی شئی کا وجود جسمانی ہوتا ہے اس کے چھ وجود اور بھی ہیں، روحانی، مثالی، علمی، تقدیری، ذری وغیرہ ہر وجود کا عالم الگ ہے، گویا سات وجود کے سات عالم ہیں اور اسی سے حدیث ابن عباسؓ کا بھی حل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات زمینیں پیدا کی ہیں، جس میں علما کو اشکال پیش آیا ہے اور حضرت نانوتوی نے اس پر مستقل رسالہ (تحذیر الناس) لکھا ہے میری رائے یہی ہے کہ حدیث مشارالیہ میں شئی کی وجودات سبعہ ہی کا ذکر کیا گیا ہے، پس چیز تو ایک ہی ہے وہ اپنے مختلف وجودوں کی وجہ سے متعدد ہو جاتی ہے، نہ یہ کہ وہ اشخاص متعددہ یا اشیاء کثیرہ ہوتی ہیں۔

حجرہ و بیت کا فرق

فرمایا حجرہ گھر کے سامنے کا گھیرا ہوا صحن بغیر چھت کے ہے، جمع حجر و حجرات اور مسقّف حصہ کو بیت کہا جاتا ہے۔ علامہ سمہودی نے وفا میں تصریح کی ہے کہ تمام ازواج مطہرات کے پاس بیت اور حجرے تھے۔

فرمایا: رب کاسیة عاریة سے وہ ظاہری لباس پہننے والیاں ہیں، جو لباس تقوی وعمل صالح سے محروم ہیں۔

انزال فتن سے کیا مراد ہے

فتن کو نازل کرنے سے کیا مطلب ہے، جبکہ اس امر کی حقیقی نسبت حضرت حق سبحانہ کی طرف موزوں بھی نہیں، محقق حافظ عینی نے لکھا کہ معنی مجازی مراد ہیں، یعنی حق تعالیٰ نے فرشتوں کو آئندہ کے امور مقدرہ کا علم عطا فرمایا۔ اور نبی کریم ﷺ کو بھی اسی روز وحی الٰہی سے ان فتنوں کی خبر دی گئی، جو بعد کو ہونے والے تھے اسی کو مجازاً انزال سے تعبیر کیا گیا۔

خزائن سے کیا مراد ہے

حافظ عینی نے لکھا کہ خزائن سے مراد حق سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت ہے، جیسے قرآن مجید میں ''خزائن رحمۃ ربی'' فرمایا ہے اور فتن سے مراد عذاب الٰہی ہے، کیونکہ وہ فتنے عذاب کا سزاوار بنادیتے ہیں۔

مہلب نے کہا کہ اس ارشاد نبوی سے معلوم ہوا کہ فتنہ مال بھی ہوتا ہے اور غیر مال بھی۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے تھے کہ ایک شخص جو فتنہ اپنے اہل و مال میں پیش آتا ہے نماز وصدقہ اس کا کفارہ کر دیتے ہیں۔

داؤدی نے کہا کہ ماذا انزل اللیلة من الفتن اور ما ذا فتح من الخزائن دونوں ایک ہی ہیں۔ اور ایسا ہوتا ہے کہ کبھی تاکید کے لئے **عطف شی علی نفسه** کر دیا کرتے ہیں، کیونکہ فتح خزائن سبب فتنہ وآزمائش ہو جایا کرتا ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد بالکل صحیح ثابت ہوا کہ آپ علیہ السلام کے بعد بکثرت فتنے بھی رونما ہوئے اور دنیا کے خزانے بھی ہاتھ آئے، کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں روم، فارس وغیرہ فتح ہوئے، اور یہ آپ علیہ السلام کے معجزات میں سے بھی ہے کہ جیسی خبر دی تھی ویسی ہی ظاہر ہوئی۔

حافظ عینی کے زمانہ میں زنان مصر کی حالت

حافظ موصوف نے لکھا کہ حضور اکرم علیہ السلام نے جن باتوں سے روکا اور ان پر عذاب سے ڈرایا تھا وہ ہمارے زمانہ کی عورتوں میں بہت عام ہوتی جارہی ہیں، خصوصاً مصری عورتیں اس برائی میں سب سے آگے ہیں، نہایت مصرفانہ لباس پہنتی ہیں، ان کی ایک چھوٹی قمیص غیر معمولی قیمت پر تیار ہوتی ہے، قمیص کی بہت بڑی اور چوڑی آستینیں پسند کرتی ہیں کہ ایک آستین کے کپڑے سے اچھی خاصی قمیص بن سکتی ہے، اس کے دامن بہت لمبے چوڑے کہ چلتے ہوئے دو دو گز سے زیادہ زمین پر گھسٹیں، پھر ایک قمیص پر اس قدر کپڑا صرف ہونے پر بھی ان عورتوں کے بدن کا اکثر حصہ نظر آتا ہے، کوئی شک وشبہ نہیں کہ ایسا لباس پہننے والیاں حدیث مذکورہ کی مصداق اور آخرت میں عذاب الٰہی کی مستحق ہیں۔

بہت بڑی اور قیمتی نصیحت

حضور علیہ السلام نے اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو رات کو جگا کر اتنی بڑی قیمتی نصیحت اس لئے فرمائی تھی کہ وہ اسراف سے بھی بچیں اور بے پردگی اور عریانی سے بھی، کہ ان باتوں کے ہولناک عواقب دینی و دنیوی پر آپ علیہ السلام مطلع ہو چکے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ امت کو بھی ان سے ڈرادیں۔

حدیث الباب میں ازواج مطہرات کو خطاب خاص کیوں ہوا؟

خاص طور سے اوّلی خطاب ازواج مطہرات کو اس لئے فرمایا کہ ان کی ارواح کو امت کی دوسری عورتوں سے قبل بیدار ہونا چاہیے۔ اور ان کے لئے سب سے پہلے یہ امر غیر موزوں ہے کہ وہ اپنی دینی وآخروی بہبود سے غافل ہو کر محض حضور اکرم علیہ السلام کی زوجیت کے شرف پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں اور بتلا دیا کہ بغیر عمل صالح کے کوئی بڑی سے بڑی زوجیت کا شرف بھی قیامت میں نفع بخش نہ ہوگا۔ (قالہ الطیبیؒ)

رات کو نماز و ذکر کے لئے بیدار کرنا

آخر میں حافظ عینیؒ نے لکھا اس حدیث سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ مردوں کو چاہیئے کہ اپنے اہل ومتعلقین کو رات کے وقت نماز وذکر خداوندی کے لئے جگایا اور ترغیب دیا کریں، خصوصاً کسی خاص فتنہ ومصیبت بلا وغیرہ کے ظہور پر یا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر۔ (عمدۃ القاری ص ۵۸۱ ج ۱)

عورتوں کا فتنہ: راقم الحروف مزید عرض کرتا ہے کہ یہ امت محمدیہ حضور اکرم علیہ السلام کے صدقہ میں عام عذاب سے محفوظ قرار دی گئی ہے مگر اس امت کو بکثرت فتنوں سے واسطہ پڑے گا، اور ان فتنوں سے گزر کر جو اپنے دین وایمان سالم نہ رکھ سکیں گے، وہ آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوں گے، اسی لئے حضور اکرم علیہ السلام نے بکثرت احادیث میں فتنوں سے ڈرایا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب فتنوں میں سے عورتوں کا فتنہ زیادہ بڑھا ہوا ہے، اسی لئے حضور اکرم علیہ السلام نے فرمایا واتقوا الدنیا واتقوا النساء (کہ دنیا کے سارے فتنوں سے بچو اور خصوصیت سے عورتوں کے فتنہ سے) یہ بھی فرمایا ما ترکت بعدی فتنہ اضرَّ علی الرجال من النساء (میرے بعد کوئی فتنہ بھی مردوں کے لئے اس قدر ضرر رساں نہ ہوگا جتنا کہ عورتوں کا) ایک دفعہ عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ما رایت من نا قصات عقل و دین

اذهب للب رجل حازم من احد اکن (باوجود کمی عقل ونقصِ دین تمہارے زمرہ کی یہ بات بڑی عجیب ہے کہ بڑے سے بڑے پختہ کار عقلمند مرد کی عقل وہوش خراب کر کے رکھ دیتی ہو) دوسری طرف عورتوں کے محاسن پر نظر کیجئے۔

عورتوں کے محاسن شارع علیہ السلام کی نظر میں

(۱) مسلم ونسائی کی حدیث ہے، دنیا کی راحت ونفع چندروزہ ہے اور دنیا کی نفع بخش چیزوں میں سے سب سے بہتر نیک عورت ہے۔

(۲) رزین کی حدیث ہے، مسکین اور بہت مسکین وہ شخص ہے جس کی بیوی نہ ہو، صحابہ نے عرض کیا حضرت! اگرچہ وہ بہت مالدار ہو، فرمایا ہاں کتنا ہی بڑا مالدار کیوں نہ ہو، پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ عورت بھی مسکین اور نہایت مسکین ہے جس کا شوہر نہ ہو، عرض کیا کہ اگرچہ وہ بہت ہی مالدار ہو فرمایا! کہ ہاں کتنی ہی مال ودولت والی کیوں نہ ہو،

(۳) بخاری ومسلم وغیرہ کی حدیث ہے، کسی عورت سے نکاح کرنے کی رغبت چار وجہ سے ہوتی ہے، مال کی وجہ سے، حسن وجمال کے سبب، عمدہ حسب نسب کی وجہ سے، اور اس کی دینداری کی وجہ سے، پھر ابو ہریرہ راوی حدیث سے خطاب کر کے فرمایا کہ سب سے زیادہ بامراد وکامیاب خوش نصیب تم جب ہی ہو سکتے ہو جب دیندار عورت کو ترجیح دو گے۔

(۴) اوسط کی حدیث ہے کہ، جس نے نکاح کر لیا اس نے اپنے نصف دین کی تکمیل کر لی، لہٰذا باقی آدھے دین میں خدا کے خوف وتقویٰ کے ساتھ عاقبت سنوار لے۔

(۵) مسلم وترمذی کی حدیث ہے، عورت جب سامنے آتی ہے یا سامنے سے جاتی ہے تو وہ شیطان کی صورت میں ہوتی ہے (یعنی شیطان اس کو تمہاری نظروں میں خوب اچھا کر کے دکھاتا ہے) لہٰذا اگر تمہاری نظر کسی عورت پر پڑ جائے (اور بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ تمہیں اچھی لگے) تو اپنے گھر آ کر اپنی بیوی سے دل بہلاؤ، اس سے وہ دل ونظر کی ساری شرارت جاتی رہے گی۔

غرض عورتوں کی تعریف وتوصیف میں بہت سی احادیث وارد ہیں، خصوصاً نیک سیرت اور دیندار عورتوں کی، اور اس سے زیادہ ان کی مدح وصفت اور کیا ہو گی کہ سید الانبیاء فخر موجودات علیہ السلام نے یہ بھی فرمادیا کہ "مجھے دنیا کی چیزوں میں سے تین چیزیں محبوب وپسندیدہ ہیں" خوشبو، عورتیں اور نماز، اس کے بعد عورتوں میں سیرت وکردار کی خوبیاں کیا ہونی چاہئیں؟

(۱) نسائی ہی میں حضور اکرم علیہ السلام سے پوچھا گیا، کون سی عورت سب سے بہتر ہے؟ فرمایا کہ جس کو دیکھ کر شوہر کا دل خوش ہو جائے، اور جب وہ اسے کسی کام کے لئے کہے تو اطاعت کرے، اور شوہر کے جان ومال کی خیر خواہ ہو، کسی معاملہ میں اس کی مخالفت نہ کرے۔

(۲) قزوینی واوسط میں اس طرح ہے کہ، خدا کے تقویٰ کے بعد کسی شخص کو نیک بیوی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ملی، اور وہ ایسی نیک ہو کہ ہر معاملہ میں اس کی اطاعت گزار ہو، اس کی طرف دیکھے تو خوش کر دے۔

اگر اس کے اعتماد پر کوئی قسم بھی اٹھالے کہ وہ ایسا کام ضرور کرے گی، تو اس کو بھی پورا کر دے، اگر کہیں باہر سفر میں چلا جائے تو اپنے نفس اور اس کے مال میں خیر خواہی کرے۔

(۳) ترمذی کی حدیث ہے، اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنے کا حکم کرتا تو بیوی کو حکم کرتا کہ وہ اپنے شوہر کو تعظیمی سجدہ کرے

(۴) مسند احمد کی حدیث ہے کہ، اگر عورت پانچ وقت کی نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، پاک دامن ہو اور اپنے شوہر کی اطاعت گذار ہو تو قیامت کے دن اس سے کہا جائے گا کہ جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔

عورتوں کو کن باتوں سے بچنا چاہیے

(۱) مسند بزار کی حدیث ہے کہ حضرت علی حضور اکرم علیہ کی خدمت میں حاضر تھے، آپ علیہ نے صحابہ سے پوچھا کہ عورت کے لئے کیا بات سب سے بہتر ہے؟ سب خاموش رہے، حضرت علی نے فرمایا کہ میں نے گھر آ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا بتاؤ! عورت کے لیے سب سے اچھی بات کون سی ہے تو کہنے لگیں "لا یرا ھن الرجال" (یہ کہ ان پر مردوں کی نظریں کسی طرح بھی نہ پڑیں) اس کے بعد میں نے آنحضرت علیہ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت اس بات کا جواب حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس طرح دیا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ، ہاں کیوں نہیں آخر وہ میری ہی تو لخت جگر ہے، (یعنی اس کا بھی حق تھا کہ میری طرح صحیح اور سچی بات کہے)

(۲) اوسط و صغیر کی حدیث ہے کہ دو آدمی ایسے ہیں کہ جن کی نمازیں ان کے سر سے اوپر نہیں اٹھتیں (کہ مقبول ہوں خدا کے یہاں جائیں) ایک تو اپنے آقا اور مالک سے بھاگا ہو غلام تا آنکہ وہ لوٹ کر آ جائے، دوسرے وہ عورت جو اپنے شوہر کو ناراض کرے تا آنکہ وہ اس کو پھر خوش کر دے۔

(۳) کبیر و اوسط میں ہے کہ، فرمایا میرے نزدیک وہ عورت نفرت کے لائق ہے، جو اپنے گھر سے چادر سمیٹے ہوئے نکلے کہ دوسرں کے پاس جا کر اپنے شوہر کی برائی کرے گی۔

(۴) قزوینی میں ہے کہ، ایک عورت آنحضرت علیہ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوئی کہ اپنے ایک بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے تھی، اور دوسرے بچے کی انگلی پکڑے ہوئے تھی، حضور علیہ نے اس کو اس حال میں دیکھ کر نہایت شفقت و رحمت سے فرمایا، کتنی مصیبت اٹھا کر حمل وولادت کے مراحل طے کرتی ہیں، اور پھر بچوں کو رحمت و شفقت سے پالتی ہیں! اگر یہ عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ ناشکری، بد مزاجی وغیرہ کی باتیں نہ کریں، تو ان میں سے نمازیں پڑھنے والیاں سیدھی جنت میں جائیں۔

(۵) بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ، فرمایا عورتوں کے بارے میں میرے اچھے برتاؤ کی وصیت قبول کرو کیونکہ وہ ٹیڑھی پسلی کی پیدائش ہیں، اور سب سے زیادہ ٹیڑھی پسلی سب سے اوپر والی ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو ٹوٹ جائے گی اور اگر یوں ہی چھوڑ دو گے تو ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی، بس بہتر علاج یہی ہے کہ صبر و شکر کے ساتھ حسن و خلق سے ان کے ساتھ نباہنے کی کوشش کرتے رہو، ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کا توڑنا طلاق دینا ہے، یعنی اگر صبر نہ کر سکو گے تو طلاق تک نوبت پہنچ کر رہے گی، جو مباح ضرور ہے، مگر بدترین مباح ہے۔

(۶) فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل کے لئے سب سے بہتر ہو، یعنی حلم، صبر، تحمل و حسن معاشرت کے ساتھ وقت گزار دے، یہ سب روایات جمع الفوائد سے ذکر کی گئی ہیں۔

سب سے بڑا فتنہ

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ نیک خصلت، نیک کردار عورت سے بہتر دنیا میں کوئی نعمت نہیں ہے اور اگر اس کو زمانہ کی مسموم فضا متاثر کردے تو اس سے بڑا فتنہ بھی دوسرا نہیں ہے، اس لئے حضور ﷺ نے عورتوں کی اصلاح کے لئے بڑی توجہ فرمائی ہے اور حدیث الباب میں بھی آنے والے فتنوں پر نظر فرماتے ہوئے، عورتوں کو خدا کی طرف رجوع ہونے کی ہدایت فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں اگر تقویٰ، نیکی اور عمل صالح نماز وغیرہ کی طرف متوجہ ہوں تو بہت سے مصائب وفتنوں سے حفاظت ہوسکتی ہے، اور اگر اس کے برعکس دینی تعلیم، اور اعمال صالحہ سے غفلت برتیں، یا اور آگے بڑھ کر برائیوں کے راستہ[1] پر پڑ جائیں تو سب سے بڑا فتنہ وہی بن سکتیں ہیں، اللھم احفظنا من الفتن کلھا واجرنا من خزی الدنیا وعذاب الآخرۃ۔

---

[1] حافظ عینیؒ نے اس حدیث الباب کے تحت اپنی زمانے کی عورتوں کے لباس کا اسراف وعریانی وغیرہ کا جو ذکر کیا ہے وہ ہم نقل کر آئے ہیں، اس ہمارے زمانے میں جو یورپ، امریکہ، روس میں عورتوں نے جو بے تحن آزادی، عریانی، فحاشی اور دوسرے غلط راستوں سے نظام امن وسکون کو درہم برہم کر رکھا ہے، وہ سب کو معلوم ہے کہ وہاں کی دنیا دوزخ بن چکی ہے پھر وہاں کے اثرات ادھر ایشیائی واسلامی ممالک میں آکر مسلمان عورتوں پر بھی پڑ رہے ہیں اور خصوصیت سے دین ودینی تعلیم سے بے بہرہ اور احکام خدا اور رسول ﷺ سے غافل طبقہ پر زیادہ ہیں، ان اثرات کو دور کرنے کے لئے نبی ﷺ کی تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے، اور اسی لئے ہم نے کچھ اشارات علوم نبوت سے اوپر پیش کر دیئے ہیں، اللہ تعالیٰ سب مسلمان عورتوں کو توفیق عمل عطا فرمائے، ان پر عمل کرنے سے اس دنیا کی زندگی بھی نمونہ جنت بن سکتی ہے۔

اسپیشل میرج ایکٹ: یہاں خصوصیت سے ہندوستان کے لئے قانون کا ذکر ضروری ہے، جو موجودہ عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی اور مذہبی تعلیم سے مسلمان عورتوں کی لاپرواہی کے سبب سخت مضر ہوگا، انگریزی دور میں سول میرج ایکٹ نافذ ہوا تھا، جس کی رو سے ہر مرد وعورت کسی دوسرے مذہب کے کسی فرد سے قانونی شادی کر سکتے تھے، لیکن مرد وعورت دونوں کے لئے ضروری تھا کہ شادی سے پہلے وہ اپنے مذہب سے انکار کر دیں، اور مسلمان مرد وعورت کے لئے اسلام سے انکار ہی اس امر کا ثبوت تھا کہ وہ اسلام اور اسلامی معاشرہ سے خارج ہو چکے ہیں العیاذ باللہ۔

لیکن اب یکم جنوری ۵۵ء سے دوسرا قانون اسپیشل میرج ایکٹ بھی نافذ کیا گیا ہے جس کی رو سے ایک عورت اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے کسی ہندو عیسائی، یہودی، پارسی وغیرہ سے شادی کر سکتی ہے، یہ شادی قانوناً جائز ہوگی، اور اس سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ بھی قانوناً جائز وارث قرار پائے گی، اور اس قانون کی رو سے اسلامی شریعت کا یہ قانون کالعدم قرار پائے گا کہ کوئی مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے کسی حالت میں بھی اسلام پر قائم رہتے ہوئے نکاح نہیں کر سکتی، اگر وہ ایسا کرتی ہے تو اسلامی معاشرہ سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا، غرض اس طرح ہندوستان کے جمہوری دور کے قانون مذکور نے مسلمان عورتوں کو ان کے مذہبی قانون کے خلاف ایسا حق دے دیا ہے کہ جب وہ چاہیں بظاہر مسلمان رہتے ہوئے بھی کسی غیر مسلم سے نکاح کر لیں، حالانکہ مسلمان عورتوں کو اسلامی شریعت کی رو سے کسی غیر مسلم سے شادی کرنا قطعاً حرام ہے اور اس نکاح سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ نسب ولد الحرام ہوگی اور کسی مرد کی حرام اولاد کی لئے اس کی شرعی وراثت کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا، علماء امت اور دردمند مسلمانوں کو اس صورت حال پر جلد توجہ کرنی چاہئے۔ واللہ الموافق

مداخلت فی الدین کی بحث: اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعض اصلاحی قوانین جو ممالک اسلامیہ میں ذمہ دار علماء اسلام کی رہنمائی میں اور شریعت اسلامی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے بنائے اور رائج کئے جاتے ہیں، ان کو نظیر بنا کر غیر اسلامی ممالک کی غیر اسلامی حکومتوں کے ارباب حل وعقد بھی قوانین بنا کر مسلم پرسنل لا میں بے جا مداخلت کرتے ہیں، یہ طریقہ نہ صحیح ہے نہ قابل برداشت، یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں مگر اسی مذکورہ بالا اسپیشل میرج ایکٹ کو اسلامی ممالک کے اصلاحی قوانین سے ملا کر دیکھ لیا جائے کہ ان میں کتنا بڑا فرق ہے، وہ لوگ شریعت اسلامی کلی حدود کے اندر رہ کر، اور ذمہ دار علماء اسلام کی رہنمائی میں ایسی معاشی ومعاشرتی اصلاحی قوانین بناتے ہیں اور ان لوگوں کے سامنے اس کی کوئی پابندی نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی زد اسلام کے اصولی مقاصد واغراض پر نہیں پڑتی، اور اگر کسی جزی میں ایسا ہوتا تو ذمہ دار علماء اسلام اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور غلطی کی نشاندہی کرتے ہیں، برخلاف اس کے "اسپیشل میرج ایکٹ" ہی کو لیجئے کہ مسلمان عورتیں اپنے سرپرستوں یا خاندان یا شوہر سے معمولی اختلاف پر بھی اس قانون سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتی ہیں، اور اسلام کی پابندیوں سے آزاد ہونے کا اقدام کر سکتیں ہیں خصوصاً جبکہ ان کے سامنے ظاہری منافع ومفاد بھی ہوں، یا غلط صحبتوں کے غلط اثرات، سول میرج والے قانون میں اس طریقہ کی قانونی آزدی ان کو حاصل نہیں تھی۔ غرض اس بارے میں خاص طور سے سوچ سمجھ کر نشیب وفراز پر نظر ہونی چاہیے۔ (مؤلف)

بَابُ السَّمَرِ بِالْعِلْمِ

(رات کے وقت علمی گفتگو یا علمی مشغلہ)

(۱۱۶)حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنِى اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِى عَبْدُالرَّحْمٰنِ ابْنُ خَالِدِ ابْنُ مُسَافِرٍ عَنْ اِبْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمٍ وَاَبِىْ بَكْرِ بْنُ سُلَيْمَانَ بْنِ اَبِىْ حَثْمَةَ اَنَّ عَبْدَاللهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ صَلّٰى لَنَا النَّبِىُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَآءَ فِىْ اٰخَرِ حَيَاتِهٖ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ قَالَ اَرَاَيْتَكُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهٖ فَاِنَّ رَاْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقٰى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ اَحَدٌ

ترجمہ:۱۱۶ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ آخر عمر میں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں عشاء کی نماز پڑھائی جب آپ نے سلام پھیرا تو کھڑے ہوگئے فرمایا کہ تمہاری آج کی رات وہ ہے کہ اس رات سے سو برس کے آخر تک کوئی شخص جو زمین پر ہے وہ زندہ نہیں رہے گا۔

(۱۱۷) حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ ثَنَا الْحَكَمُ قَالَ سَمِعْتُ سَعِيْدَ بْنَ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ فِىْ بَيْتِ خَالَتِىْ مَيْمُوْنَةَ بِنْتَ الْحَارِثِ زَوْجَ النَّبِىِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ النَّبِىُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَهَا فِىْ لَيْلَتِهَا فَصَلَّى النَّبِىُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَآءَ ثُمَّ جَآءَ اِلٰى مَنْزِلِهٖ فَصَلّٰى اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ ثُمَّ نَامَ ثُمَّ قَامَ قَالَ نَامَ الْغُلَيِّمُ اَوْ كَلِمَةً تُشْبِهُهَا ثُمَّ قَامَ فَقُمْتُ عَنْ يَّسَارِهٖ فَجَعَلَنِىْ عَنْ يَمِيْنِهٖ فَصَلّٰى خَمْسَ رَكْعَاتٍ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ نَامَ حَتّٰى سَمِعْتُ غَطِيْطَهٗ ثُمَّ خَرَجَ اِلَى الصَّلٰوةِ.

ترجمہ:۱۱۷ حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ ایک رات میں نے اپنی خالہ میمونہ بنت الحارث زوجہ نبی کریم ﷺ کے پاس گزاری اور نبی کریم ﷺ اس دن ان کی رات میں ان ہی کے پاس تھے آپ نے عشاء کی نماز مسجد میں پڑھی پھر گھر میں تشریف لائے اور چار رکعت پڑھ کر سو رہے پھر اٹھے اور فرمایا چھوکرا سو رہا ہے یا اسی جیسا لفظ فرمایا پھر آپ نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے اور میں آپ کے بائیں جانب کھڑا ہوگیا تو آپ نے مجھے دائیں جانب کھڑا کرلیا تب آپ نے پانچ رکعت نماز پڑھی، پھر دو رکعت پڑھیں پھر سوگئے حتی کہ میں نے آپ کے خراٹے لینے کی آواز سنی پھر نماز کے لیے باہر تشریف لے آئے۔

تشریح: گذشتہ باب میں امام بخاری نے رات کے وقت علم و نصیحت کا جواز بتلایا تھا یہاں کسی علمی بات یا مشغلہ کا جواز بتلا رہے ہیں فرق دونوں باب میں یہ ہے کہ وہاں رات کے وقت میں سوتے سے اٹھ کر علم و نصیحت کا ذکر تھا یہاں سونے سے قبل و بعد کے ہر قولی و فعلی علمی مشغلہ کو حد جواز میں دکھلانا ہے سمر کے ابتداء معنی رات کے وقت باتیں کرنے یا رات کا کوئی حصہ نیند کے سوا دوسرے کام میں گزارنے کے ہیں اسی سے حافظ عینی نے چند محاورات بھی نقل کیے ہیں مثلاً سمر القوم الخمر (لوگوں) نے رات شراب پینے میں بسر کی سامر الابل اونٹ رات کے وقت چرتا رہا) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان البلنا تسمر (ہمارا اونٹ رات کے وقت چرتا ہے اس کے بعد کچھ رات گئے یا عشاء کے بعد سے قصہ گوئی کرنے کے معنی میں بھی سمر کا استعمال ہونے لگا کیونکہ عرب کے لوگ اس کے عادی تھے رات کے وقت شراب کی مجلس اور قصہ گوئی ہوتی تھی۔

حضور علیہ السلام نے اس بے کار و بے سود مشغلہ کی ممانعت فرمائی کہ عشاء کی نماز کے بعد کوئی قصہ گوئی وغیرہ نہ ہونی چاہیے اور یہ حدیث بخاری ہی میں ابو برزہ اسلمی سے مروی ہے کہ آنحضرت علیہ السلام عشاء کی نماز سے قبل سونے کو اور بعد نماز عشاء باتیں کرنے کو ناپسند فرماتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر پر سارے دن کے کام ختم ہو جائیں اور اسی ذکر سے متصل نیند آ جائے دوسری غرض یہ ہو سکتی ہے کہ بعد عشاء جاگنے سے عموماً صبح کی نماز قضاء ہونے یا جماعت کے فوت ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اس کا سد باب فرمایا۔

حضرت شاہ صاحب کی رائے

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ راقم الحروف کا رجحان کچھ اس طرف تھا کہ اگر مقصود شارع علیہ السلام یہی ہے کہ خدا کے ذکر پر نیند آ جائے تو اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ نماز کے بعد کسی دنیوی مشغلہ کے بعد بھی خدا کا ذکر کر کے سو جائے اسی لیے بہ زمانہ قیام ڈابھیل ایک رات عشاء کے بعد جب میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے پائے مبارک اور بدن دبا رہا تھا سوال کر لیا کہ حضرت! شارع علیہ السلام کا مقصد کیا یہ ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد کوئی کام کوئی بات نہ کرے اور اسی پر سو جائے یا اس کی بھی گنجائش ہے کہ کسی بات یا کام کے بعد پھر ذکر کر کے سو جائے؟ ارشاد فرمایا کہ شارع علیہ السلام کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ نماز عشاء کا جو ذکر ہے اسی پر سو جائے۔

راقم الحروف نے مختلف اوقات میں حضرت سے بہت معاملات و مسائل میں استصواب کیا ہے اور سواء چند امور کے جن میں یہ امر مذکور بھی شامل ہے ہمیشہ ایسا جواب دیتے تھے کہ جس سے توسع و گنجائش نکلتی تھی مثلاً کسی مسئلہ میں فقہاء نے تنگی کی آپ نے فرمایا کہ اس میں فلاں اصول یا فلاں محدث و فقیہ کے قول پر گنجائش نکلتی ہے لیکن سوال مذکور پر میرے رجحان مذکور کے خلاف فرمایا اور کوئی گنجائش نہیں دی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت کی نظر حضرت امام اعظم اور دوسرے ائمہ حنفیہ کی طرح مقصد شارع علیہ السلام پر کس قدر مرکوز رہتی تھی کہ اس سے ادنیٰ انحراف کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ **رحمهم الله رحمة واسعة وجعلنا معهم في جنات النعيم بفضله ومنه وكرم العميم**

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ نماز عشاء کے بعد معمولی مختصر اور کم وقتی گفتگو یا کام مقصد شارع کے خلاف نہیں ہے کیونکہ حضرت شاہ صاحب کی بھی عادت مبارکہ یہی تھی کہ عشاء کے بعد جلد سو جاتے تھے تاہم معمولی گفتگو سے احتراز نہیں تھا اور آنحضرت علیہ السلام سے بھی کتاب التفسیر ص ۶۵۷ میں روایت فتحدث رسول اللہ علیہ السلام مع اهله ساعة موجود ہے یعنی آپ نے نماز عشاء کے بعد کچھ دیر اہل خانہ سے بات کی پھر سو گئے اگرچہ اس کو علمی اور دینی گفتگو سے محمول کیا جائے گا اور رسول علیہ السلام کی ساری ہی باتیں علم و دین سے متعلق تھیں۔

سمر بالعلم کی اجازت اور اس کے وجوہ

جبکہ شارع علیہ السلام کا مقصد یہی متعین ہوا کہ نماز عشاء پر ساری دینی و دنیوی کام ختم کر کے صبح کی نماز کے لیے وقت پر اٹھنے کی نیت کر کے سو جانا چاہیے تو پھر سمر بالعلم علمی گفتگو یا مشغلہ کی اجازت کیوں ہوئی اسکی وجہ یہ ہے کہ اول تو علمی گفتگو یا مشغلہ زیادہ وقت تک طویل نہ ہوگا کیونکہ اس میں سننے والوں اور مشغول ہونے والوں کا نشاط ضروری ہے نشاط کی جگہ اگر ملال و سامت (اکتانے) کی صورت پیدا ہو تو اس میں کراہت آ جائیگی اور جب وہ مختصر ہوگا تو اس کی وجہ سے صبح کی نماز با جماعت فوت ہونے کا خطرہ بھی نہ ہوگا جو وجہ ممانعت تھا اور نوم اگر ذکر اعظم (نماز) پر مرتب نہ ہوگی دوسرے ذکر علمی گفتگو یا مشغلہ پر تو ہو ہی جائیگی اور اگر وہ طویل بھی ہو تو اس تاخیر نوم کی تلافی سمر علم سے ہو جائیگی

ایک نیکی کم ہوئی تو دوسری بڑھ گئی بخلاف سمر امور دنیوی کے کہ اول تو قصوں کی طرف عام میلان ہوتا ہے خوب دل لگا کر دیر تک کہیں گے اور سنیں گے جس سے صبح کی نماز یا جماعت فوت ہو جائے گی دوسرے اس سمر کے سبب خدا سے بعد اور بے سود مشاغل کی طرف رغبت بڑھے گی۔

حضرت شاہ صاحب کی رائے

آپ کی رائے یہ ہے کہ جس سمر کی حدیث میں ممانعت ہے یعنی قصوں کہانیوں اور افسانوں والا سمر، حقیقۃ سمر علمی پر اس کا اطلاق موزوں ہی نہیں۔ اس لیے اس کا اطلاق یہاں ایسا ہی ہے جیسے تغنی کا تعلق قرآن مجید نے کیا گیا ہے حدیث میں ہے ''**لیس منا من لم یتغن بالقرآن** ''وہ شخص ہم سے نہیں جو قرآن مجید کے ذریعہ غنا حاصل نہ کرے۔ اس سے مقصد یہ نہیں کہ قرآن مجید کو گا کر پڑھے بلکہ ابن عربیؒ کی شرح کے مطابق مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو کم از کم غنا کے درجہ میں تو رکھے سب لوگ گانے سے لطف اندوز ہوتے ہیں مگر وہ دل کی بیماری ہے صحیح القلب اور مسلمانوں کا مذاق یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس کی جگہ قرآن مجید سے لطف ولذت حاصل کریں اس کی تعلیمات سے تعلق رکھیں اور دوسری تمام لایعنی چیزوں کو یکسر چھوڑ دیں جو لوگ ایسا نہ کریں گے بلکہ اپنے اوقات لہو ولعب اور غنا میں ضائع کریں گے قرآن مجید اور اس کی تعلیمات وہدایات کو پس پشت کریں گے تو وہ حضور علیہ ﷺ کے دین سے بے تعلق ہوں گے حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ابن عربی کی یہ شرح اس حدیث کی شروح میں سے سب سے زیادہ لطیف ہے دوسرے معانی قرآن مجید کی وجہ سے غنا واستغنا حاصل کرنا وغیرہ مشہور ہے۔

بحث ونظر

اَرَأَيْتَكُمْ اس میں ضمیر منفصل (کم) ضمیر متصل (ارءایت) کی تاکید ہے جب کوئی عجیب یا قابل بیان بات دیکھی جاتی ہے تو اسکی اہمیت دکھلانے کے لیے اس طرح کہا جاتا ہے یعنی ایسی بات کہ اگر تم اس کو دیکھتے تو تم بھی اس کی اہمیت کے سبب ضرور بیان کرتے۔

لایبقی الخ کی مراد

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس جملہ کی شرح میں بہت سی اغلاط ہوئیں ہیں صحیح مراد یہ ہے کہ آج کی رات میں جو لوگ زمین پر موجود ہیں وہ ایک سوسال کے اندر فوت ہو جائینگے یا ایک سوسال پورا ہونے پر ان میں سے کوئی باقی نہ رہے گا لہٰذا اس ارشاد میں ان لوگوں کا کوئی ذکر نہیں ہے جو اس ارشاد کے وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے یقیناً اس وقت ارشاد کے بعد بھی کچھ صحابہ کی ولادت ہوئی ہوگی اور ان کو یہ حکم یا پیشگوئی شامل نہیں ہے اور اسی طرح اس ارشاد سے یہ بات سمجھنا بھی غلط ہے کہ آپ کی امت کے لوگوں کی عمر ایک سوسال سے زیادہ نہ ہوگی لہٰذا اس حدیث سے یہ استدلال کرنا کہ حضرت خضر علیہ السلام بھی فوت ہو چکے ہیں یا وقت ارشاد مذکور سے ایک سوسال کے بعد صحابیت کے دعوی کو باطل قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

حیات خضر علیہ السلام

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حیات خضر کا انکار کرنے والوں میں امام بخاری بھی ہیں مگر اکثر علماء امت نے ان کی حیات تسلیم کی ہے اور سب سے بہتر استدلال ان کی زندگی پر اصابہ کا اثر ہے جو اسناد جید کے ساتھ نقل ہوا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مسجد سے نکلے اور ایک شخص کے ساتھ بات کر رہے تھے جس کو لوگوں نے دیکھا مگر پہچانا نہیں اور کچھ دیر بعد نظروں سے غائب ہو گیا پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز سے سوال کیا گیا کہ وہ کون تھے؟ تو آپ نے فرمایا خضر تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جلیل القدر تابعی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کا مرتبہ بلا شک وشبہ امام بخاری سے بہت بلند ہے۔صوفیاء کی بھی یہی تصریح ہے کہ وہ زندہ ہیں مگر وہ بدن مثالی کے ساتھ زندہ مانتے ہیں جیسا کہ بحر العلوم میں لکھا ہے۔ میرے نزدیک بدن مادی میں بھی موجود ہے جو کسی کسی کو نظر آ جاتا ہے۔ وہ ایسی خدمت میں ہیں کہ اولیاء اللہ سے ان کی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔حدیث مذکوران کی زندگی کے اس لئے خلاف نہیں ہے کہ ممکن ہے مذکورہ ارشاد نبوی کے وقت وہ زمین پر نہ ہوں بلکہ بحر وسمندر کے کسی حصے پر ہوں۔دوسرے یہ کہ حضرت خضر دوسری سابقہ امتوں میں سے ہیں۔پھر وہ نظروں سے غائب ہیں اس لئے بھی کوئی اشکال حقیقت میں نہیں ہے۔کیونکہ حضور علیہ کا ارشاد اپنی امت کے بارے میں ہے۔اور اگر آپ کے ارشاد کو عام بھی مان لیں تو میرے نزدیک وہ اس عام سے مخصوص ومستثنیٰ ہیں کیونکہ تحقیقی بات یہی ہے کہ عموم ظنی ہوتا ہے قطعی نہیں۔

بابا رتن کی صحابیت

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا فیروز پور (پنجاب) میں بابا رتن کی قبر ہے جنہوں نے ساتویں صدی کی ہجری میں صحابیت کا دعوی کیا تھا حافظ ذہبی نے رد میں رسالہ لکھا کسر الوثن عن بابارتن کی حضرت شاہ صاحب نے رتن کی صحابیت وعدم صحابیت کسی ایک امر کا فیصلہ یہاں نہیں فرمایا مگر آپ کا رجحان اسی طرف تھا کہ حدیث مذکور کے خلاف اس کو بھی قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اوپر آپ کا ارشاد نقل ہو چکا ہے کہ جو صحابہ بعد ارشاد مذکور پیدا ہوئے وہ اس کے عموم میں داخل نہیں ہیں دوسرے یہ کہ عموم خود ہی ظنی ہے اس لیے حضرت خضر کی طرح وہ بھی مخصوص ہو سکتے ہیں بطلان صحابیت کے لیے...... دلیل قطعی چاہیے۔

حافظ عینی کا ارشاد

لکھا ہے کہ امام بخاری وغیرہ نے اس حدیث سے موت خضر پر استدلال کیا ہے لیکن جمہور اس کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ حضرت خضر ساکنین بحر سے ہیں اس لیے وہ اس حدیث میں مراد نہیں ہیں اور بعض علماء نے کہا کہ حدیث کے الفاظ اگر چہ عام ہیں مگر معنی اس کے خاص ہیں کہ جن لوگوں کو تم جانتے پہچانتے ہو ان میں سے کوئی ایک سو سال سے زیادہ زندہ نہ رہے گا بعض نے کہا کہ آپ کی مراد ارض سے مدینہ طیبہ ہے جس میں آپ تشریف رکھتے تھے اسی کے لحاظ سے لوگوں کو بتلایا ساری دنیا کا حال نہیں بتلایا چنانچہ مدینہ طیبہ میں آخری صحابی حضرت جابر کی وفات اسی پہلی صدی کے اندر ہوگئی ہے جیسا کہ حضور علیہ نے خبر دی تھی بلکہ مکہ معظمہ میں آخری صحابی عامر ابو طفیل کی وفات بھی صدی کے اندر ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور فرشتے

علی وجہ الارض کی قید سے ملائکہ بھی نکل گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مستثنیٰ رہے کیونکہ وہ آسمان پر ہیں یا مراد لفظ من سے انسان ہیں جس سے ابلیس اور ملائکہ نکل گئے ابن بطال نے کہا کہ حضور علیہ کا مقصد یہ بتلانا تھا کہ اس مدت میں یہ قرن وجیل ختم ہو جائیگی جس میں ہم ہیں اور صحابہ کو اعمال کی ترغیب دینی تھی کہ بہ نسبت پہلی امتوں کے اس امت کی عمریں کم ہیں عبادت میں انہماک وتوجہ زیادہ کریں تا کہ کمی عمر و فوات وقت کی تلافی ہو سکے (عمدۃ القاری ص ۵۷۴)

جنوں کی طویل عمریں اور ان کی صحابیت

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جنوں کے بارے میں شارحین نے کچھ نہیں لکھا مگر خیال یہی ہے کہ وہ بھی حدیث الباب کے مدلول سے

خارج ہیں کیونکہ خطاب بظاہر انسانوں کو تھا اس لیے جنوں کا باوجود آپ کی امت میں داخل ہونے کے طویل عمریں پانا یا بعض جنوں کا سینکڑوں سال بعد حضور ﷺ سے روایت حدیث کرنا بھی حدیث کے خلاف نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابن عباس کی شب گزاری کا مقصد

باب کی دوسری حدیث میں بت عند خالتی میمونۃ الخ وارد ہے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ ۶۰، ۷۰ طرق تک اس کی روایت کی گئی ہے اور اسی ایک واقعہ کے اندر گیارہ اور تیرہ رکعتیں بہ اختلاف نقل ہوئی ہیں جن کی پوری بحث اپنے موقع پر آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

نیز فرمایا کہ حضرت عباس نے ابن عباس کو حضور ﷺ کی خدمت میں اس لیے بھیجا تھا کہ حضور ﷺ سے ان کا قرضہ وصول کر کے لائیں اور آپ کی رات کی نماز بھی اچھی طرح دیکھ لیں۔

قرضہ کی شکل

یہ تھی کہ حضور ﷺ حضرت عباس سے روپیہ پیشگی لے کر فقراء میں برابر تقسیم فرمادیا کرتے تھے اور جب بیت مال میں روپیہ زکوۃ کا آجاتا تو اس قرض کی ادائیگی فرمادیتے تھے۔

ایک مد کا روپیہ دوسری مد میں صرف کرنا

فرمایا میں نے اسی سے یہ گنجائش نکالی ہے کہ متدین متولی مہتمم ایک مد کا روپیہ دوسری مد میں صرف کرسکتا ہے۔ مثلاً تعمیر کی مد کا روپیہ تعلیم میں صرف کرے۔

حضرتؒ کی اس مثال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر اہم مد کا روپیہ زیادہ اہم مد میں صرف کرسکتا ہے ورنہ جس طرح آجکل کے عام مہتممان مدارس بے احتیاطی سے رقوم صرف کرتے ہیں اور تعلیم سے زیادہ غیر تعلیمی مدات پر صرف کرتے ہیں ان کو اس گنجائش سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ شریعت میں حسن الاختیار اور سئی الاختیار کا فرق کیا ہے جس کو اہل علم خوب جانتے ہیں غالباً صاحب فیض نے یہاں حضرتؒ کو مذکورہ جملہ اسی احتیاط کے پیش نظر نقل نہیں کیا کہ لوگ اس سے غلط فائدہ اٹھائیں گے۔ مگر ہم نے حضرت کے مذکورہ بالا استنباط کو اہمیت و ضرورت کے پیش نظر نقل کیا ہے پھر اس کے ساتھ تنبیہ مذکور بھی ضروری تھی۔ واللہ الموافق لکل خیر

ترجمۃ الباب سے حدیث کی مناسبت

محقق یگانہ حافظ عینی نے لکھا کہ

(۱) ابن المنیر کے نزدیک حضور ﷺ کا ارشاد "تام الغلیم ؟" (چھوکرا سوگیا)؟ موضع ترجمہ ہے کہ یہی رات کی بات ہوگئی جس کے لیے ترجمہ صحیح و مطابق ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ ابن عباس جو رات میں دین سیکھنے سے غرض سے حضور ﷺ کے احوال دیکھتے رہے یہی محل ترجمہ ہے اور یہی سمر ہے۔

(۳) علامہ کرمانی نے کہا کہ حضور ﷺ نے جو ابن عباس کو نماز تہجد بائیں سے داہنی طرف کرلیا یہی گویا اس کہنے کے قائم مقام ہے کہ میرے داہنی طرف کھڑے ہوجاؤ اور انہوں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کی گویا عرض ہی کردیا کہ میں اسی طرح کھڑا ہوگیا اس طرح فعل بمنزلہ قول ہوگیا۔

(۴) علامہ کرمانی نے مزید کہا کہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اقارب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو ان میں موانست کی باتیں ہوتی ہیں۔ تو حضور علیہ السلام کی تو سب باتیں دینی اور علمی فوائد ہی ہوتے تھے لہٰذا مستبعد ہے کہ حضور علیہ السلام نماز عشاء کے بعد دولت کدہ پر تشریف لائیں۔ اور اپنے قریبی عزیز ابن عباس کو گھر میں دیکھ کر اجنبی محسوس کریں اور ان سے اجنبی جیسا معاملہ کریں کہ کوئی بات بھی ان سے نہ کریں۔ حافظ عینی نے یہ سب اقوال نقل کر کے لکھا کہ۔

حافظ ابن حجر کے اعتراضات

حافظ ابن حجر نے ان سب کی تنقید کی ہے اور کہا: "یہ تمام توجیہات قابل اعتراض ہیں کیونکہ ایک کلمہ کہنے والے کو سامر نہیں کہا جاتا اور حضرت ابن عباس کے ترقب احوال کو سحر (بیداری) کہہ سکتے ہیں سمر نہیں کہہ سکتے کیونکہ سمر کا تعلق قول سے ہوتا ہے فعل سے نہیں اور تیسری صورت سب سے زیادہ بعید ہے کیونکہ سو کر اٹھنے پر جو بات ہوئی ہے وہ سمر نہیں کہلاتی اسکے بعد حافظ ابن حجر نے چوتھی توجیہ کرمانی لکھ کر اس پر کوئی خاص نقد نہیں کیا اور پھر اپنی رائے اس طرح لکھی" ان سب توجیہات سے بہتر یہ ہے کہ ترجمہ کی مناسبت سے اسی حدیث الباب کے دوسرے لفظ سے ہے جو دوسری طرف سے مروی ہے کتاب التفسیر میں امام بخاری نے طرق قریب سے فتحدث رسول اللہ علیہ السلام مع اھلہ ساعۃ" روایت کی ہے اس طرح سے بحمد اللہ تعالیٰ ترجمہ میں صحیح ہو گیا اور کسی بے محل تاویل اور ظنی و تخمینی انکل کے تیر بھی چلانے نہیں پڑے امام بخاری کی عادت بھی یہی ہے کہ ایسا بہت کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین بخاری کو تتبع طرق حدیث کی عادت ڈالیں اور مواقع الفاظ رواۃ کو پہچانیں کیونکہ حدیث کی تفسیر و تشریح حدیث ہی سے کرنا اس سے بہتر ہے کہ اس میں قسم قسم کے گمان گھما کر مراد تلاش کی جائے (فتح الباری ج ۱ ص ۱۲)

حافظ عینی کے جوابات

حافظ عینی نے حافظ کا مذکور بالا نقد اور مفصل رائے نقل کر کے اس پر نہایت ہی محققانہ تبصرہ سپرد قلم کیا ہے وہ بھی پڑھ لیجئے:۔ معترض مذکور کے سارے اعتراضات قابل نقد ہیں کیونکہ سمر کے معنی رات کے وقت بات کرنا ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ اس میں یہ قید کہاں سے لگ گئی کہ ایک کلمہ کہے تو وہ سمر نہیں ہے اس لیے ابن المنیر کی رائے بے غبار ہے۔

حضرت ابن عباس کے ترقب احوال کو سمر قرار نہ دینا بھی عربیت کے محاورات سے تغافل ہے کیونکہ سمر کا اطلاق قول و فعل دونوں پر ہوتا ہے اس کی مثالیں ہم اوپر لکھ چکے ہیں اور تیسری توجیہ کو بعید قرار دینا؟ سب اعتراضات سے زیادہ بے جان ہے کیونکہ سونے کے بعد اٹھ کر بات کو سمر نہ کرنا اہل لغت کے خلاف ہے (وہ تو رات کی ہر بات کو سمر کہتے ہیں اور ان کے نزدیک کوئی قید قبل و بعد نوم کے نہیں ہے۔)

بلکہ ایک لحاظ سے جس توجیہ مذکور کو حافظ نے بعید تر قرار دیا ہے وہ قریب تر ہے کیونکہ حضرت ابن عباس صغیر السن تھے بظاہر حضور علیہ السلام نے فعلی تعلیم پر اکتفا نہیں کیا ہوگا بلکہ قولی تعلیم بھی دی ہوگی۔

توجیہ حافظ پر حافظ عینی کا نقد

پھر حافظ عینی نے لکھا کہ جس کی توجیہ کو خود حافظ عینی نے پیش کیا اور اس کو دوسروں کی سب توجیہات سے بہتر بھی کہا وہ سرے سے توجیہ بننے کے ہی لائق نہیں سب سے بہتر تو کیا ہوگی کیونکہ ایک ترجمہ کا باب یہاں قائم کرنا اور اسکے تحت ایسی حدیث ذکر کرنا جس میں ترجمہ

کے مطابق کوئی لفظ نہ ہو اور اس ترجمہ کی مناسبت کسی دوسرے باب میں دوسرے طریق والفاظ کے ساتھ ذکر کی ہوئی اسی حدیث سے ثابت کرنا بہت ہی بعید الفہم بات ہے جہاں ترجمہ وعنوان بھی دوسرا ہی قائم کیا گیا ہے۔)

بے محل طنز وتعلیل پر گرفت

پھر اس بعید سے زیادہ بعید تر وہ بات ہے جو حافظ نے بطور طنز وتعلیل لکھی کہ "حدیث کی تفسیر حدیث سے کرنا اٹکل کے تیر چلانے سے بہتر ہے سبحان اللہ! یہاں حدیث کی تفسیر کا کیا موقع ہے یہاں تو صرف ترجمہ وعنوان باب کی حدیث کے مطابقت زیر بحث ہے حدیث کی تفسیر حدیث سے یہاں کس نے کی؟ جو قابل مدح ہوگئی اور حدیث کی تفسیر ظن وتخمین سے کس نے کی۔؟ جس پر طنز کیا گیا ہاں! اس کے جواب میں اگر ہم حافظ کے بارے میں کہیں کہ انہوں نے دوسروں پر رجم بالظن کیا تو زیادہ صحیح ہے (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۵۸۵)

ایک لطیفہ اور تکمیل بحث

مذکورہ بالا تفصیل سے ناظرین نے بخوبی اندازہ کر لیا ہوگا کہ تحقیق وانصاف اور دقت نظر و وسعت علم میں حافظ عینی کا پایہ کس قدر بلند ہے لیکن چونکہ ہم نے عمدۃ القاری کا مطالعہ اس عقیدت سے کیا ہی نہیں بلکہ اس کے مطالعہ کی توفیق بھی کم ہی لوگوں کو ملی ہوگی اور ہمیشہ حافظ ابن حجر اور ان کی فتح الباری کا سکہ دل پر جما رہا اس لیے تو ایک محترم شیخ الحدیث دام فیوضہم کا تبصرہ اسی مقام سے درس بخاری شریف کا پڑھ لیجئے فرمایا "امام بخاری کی عادت مستمرہ ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی کرتے ہیں کہ باب کے تحت ایسی حدیث لاتے ہیں جس میں ترجمۃ الباب سے کوئی مناسبت نظر نہیں آتی یہ بات ماء الذہب سے لکھنے کے قابل ہے لیکن علامہ عینی اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیسی بات ہے کہ باب تو یہاں ہو اور مناسبت ہو کتاب التفسیر میں۔ یہ وہی تعصب ہے ورنہ علامہ عینی بھی بعض جگہ ایسا کرتے ہیں کہ اس کی مناسبت فلاں باب کی حدیث میں ہے معلوم نہیں کہ کیوں خواہ مخواہ اعتراض کرتے ہیں جبکہ خود بھی اس کے مرتکب ہوتے ہیں" اب اس پر کیا لکھا جائے، اسلیے تبصرہ مذکور بالا تبصرہ پیش کرنا ہی زیادہ مناسب ہے البتہ ایک اہم بات کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حافظ عینی کو اس امر سے بحث نہیں ہے کہ امام بخاری کی ایسی عادت ہے یا نہیں ہے یا وہ ایسا کرتے ہیں یا نہیں کرتے" اور اس سے بھی انکار نہیں کہ حافظ عینی نے خود بھی بطور احتمال کی ایسی توجیہ کہیں ذکر کی ہوگی یہاں تو ان کا مطمع نظر ابن المنیر کرمانی وغیرہ حضرات کی توجیہات پر حافظ کی سخت نکتہ چینی اور طنز اور اپنی توجیہ کو بہت بڑھا چڑھا کر اور سب سے بہتر بتلانے پر نقد کرنا ہے تاکہ علمی تحقیق و بحث کے موقع پر اس طریق کار کی غیر موزونیت واضح ہو سکے اور ان کا حق یوں بھی ہے کہ حافظ ابن حجر ان کے تلمیذ وشاگرد ہیں پھر الٹا حافظ عینی ہی کو مطعون کرنا اور متعصب وغیرہ کہنا کیا موزوں ہے؟ واللہ اعلم

علمی اشتغال نوافل سے افضل ہے

امام بخاری نے غالباً اس لیے بھی رات کے وقت علمی مشغلہ وگفتگو کی اجازت سمجھی ہے کہ اس کی افضلیت بہ نسبت نوافل ثابت ہے چنانچہ علامہ محقق حجاعہ کنانی م ۷۳۳ھ نے لکھا ہے آیات واحادیث مذکورہ سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ خدا کے لیے علمی اشتغال، نوافل وعبادات بدنیہ نماز روزہ تسبیح دعا وغیرہ سے افضل ہے کیونکہ علم کا نفع دوسرے لوگوں کو بھی پہنچتا ہے اور نوافل کا فائدہ صرف اس شخص کو حاصل ہوتا ہے دوسرے یہ کہ عبادات کی صحت علم پر موقوف ہے لہٰذا عبادات علم کی محتاج اور ان پر موقوف ہے جبکہ علم نہ انکا محتاج ہے نہ ان پر موقوف ہے۔

تیسرے اس لیے کہ علماء وارثین انبیاء علیہم السلام ہیں اور یہ فضل و امتیاز عابدین کو حاصل نہیں ہے اسے لیے علمی امور میں دوسروں کو علماء کی اطاعت و پیروی کرنا لازم وواجب ہے چوتھے یہ کہ علم کے آثار ومنافع عالم کی موت کے بعد بھی باقی رہتے ہیں بخلاف اس کے دوسرے نوافل کا اثر و نفع موت کے بعد ختم ہوجاتا ہے پانچویں یہ کہ بقاء علم سے شریعت کا احیاء اور شعائر ملت کا حفظ و بقاء وابستہ ہے۔ (تذکرۃ السامع ص ۱۳)

بَابُ حِفْظِ الْعِلْمِ

علم کی حفاظت کرنا

(۱۱۸) حَدَّثَنَا عَبْدُالْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِاللهِ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اِنَّ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ اَكْثَرَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ وَلَوْلَا اٰيَتَانِ فِيْ كِتَابِ اللهِ مَاحَدَّثْتُ حَدِيْثًا ثُمَّ يَتْلُوْا :اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى اِلٰى قَوْلِهٖ الرَّحِيْمُ اِنَّ اِخْوَانَنَا مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ بِالْاَسْوَاقِ وَاِنَّ اِخْوَانَنَا مِنَ الْاَنْصَارِ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الْعَمَلُ فِيْ اَمْوَالِهِمْ وَاِنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَلْزَمُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِبَعِ بَطْنِهٖ وَيَحْضُرُ مَالَا يَحْضُرُوْنَ وَيَحْفَظُ مَالَا يَحْفَظُوْنَ.

(۱۱۹) حَدَّثَنَا اَبُوْ مُصْعَبٍ اَحْمَدُ بْنُ اَبِيْ بَكْرٍ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ بْنُ دِيْنَارٍ عَنِ ابْنِ اَبِيْ ذِئْبٍ عَنْ سَعِيْدِنِ الْمُقْبَرِيِّ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ اَسْمَعُ مِنْكَ حَدِيْثًا كَثِيْرًا اَنْسَاهُ قَالَ اُبْسُطْ رِدَآءَكَ فَبَسَطْتُهٗ فَغَرَفَ بِيَدَيْهِ ثُمَّ قَالَ ضُمَّ فَضَمَمْتُهٗ فَمَا نَسِيْتُ شَيْئًا حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِيْ فُدَيْكٍ بِهٰذَا وَقَالَ فَغَرَفَ بِيَدِهٖ فِيْهِ:

(ترجمہ) :۱۱۸ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ نے بہت سی حدیثیں بیان کی ہیں اور میں کہتا ہوں کہ اگر قرآن مجید میں دو آیتیں نہ ہوتیں میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا پھر یہ آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی نازل کردہ دلیلوں اور ہدایتوں کو چھپاتے ہیں آخر آیت رحیم تک حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مہاجر بھائی تو بازار کی خرید وفروخت میں لگے رہتے تھے اور انصار بھائی اپنی جائدادوں میں مشغول رہتے اور ابوہریرہ کو اپنے پیٹ بھرنے کے سوا کوئی فکر نہ تھی اس لیے ہر وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتا اور ان مجلسوں میں حاضر رہتا جن مجلسوں میں دوسرے حاضر نہ ہوتے اور وہ باتیں محفوظ رکھتا جو دوسرے محفوظ نہیں رکھتے تھے۔

(ترجمہ):۱۱۹ • حضرت ابوہریرہؓ سے نقل ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں آپ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں مگر بھول جاتا ہوں آپ نے فرمایا اپنی چادر پھیلا! میں نے اپنی چادر پھیلائی آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی چلو بنائی اور (میری چادر میں ڈال دی) آپ نے فرمایا کہ چادر کو لپیٹ لے میں نے چادر کو اپنے بدن پر لپیٹ لیا پھر اس کے بعد میں کوئی چیز نہیں بھولا۔

ہم سے ابراہیم بن المنذر نے بیان کیا ان سے ابن ابی فدیک نے اس طرح بیان کیا کہ یوں فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے ایک چلو اس چادر میں ڈال دی۔

(۱۲۰) حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَخِيْ عَنِ ابْنِ اَبِيْ ذِئْبٍ عَنْ سَعِيْدِنِ الْمُقْبَرِيِّ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ

حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِعَائَيْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ واما الآخرُ فلو بثثته قُطِعَ هٰذَا الْبَلْعُوْمُ قَالَ اَبُوْ عَبْدِاللّٰهِ اَلْبَلْعُوْمُ مَجْرَى الطَّعَامِ.

ترجمہ: (۱۲۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو ظرف یاد کر لیے ایک کو میں نے پھیلا دیا اور دوسرا برتن اگر میں پھیلاؤں تو میرا نرخرا کاٹ دیا جائے۔

تشریح: پہلی حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ نے کثرت روایت کا سبب بیان کیا اور لوگوں کے اس شبہ کو رفع کیا کہ ابو ہریرہ دوسرے بڑے بڑے صحابہ کرام سے بھی روایت حدیث میں کیسے بڑھ گئے؟ اگرچہ اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ بعض اکابر صحابہ بیان روایات سے اس لئے بھی ہچکچاتے تھے کہ کہیں کوئی غلطی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط فہمی یا بھول کے سبب سے منسوب نہ ہو جائے جو ان کا غایت درجہ کا تورّع تھا ہمارے نزدیک بڑی وجہ یہی تھی مگر حضرت ابو ہریرہؓ نے جو بڑی وجہ بیان کی وہ بھی بڑی اہم اور قابل لحاظ ہے کیونکہ واقعہ یہی ہے کہ دوسرے عام صحابہؓ اپنی عیالی، معاشی و قومی ملکی ضروریات کے پیش نظر کاروبار و زراعت میں مصروف ہوتے تھے اور یہ مصروفیت بھی تمام تر اسلامی تقاضوں ہی کے تحت تھی اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی نیت خدانخواستہ دوسرے اکابر صحابہؓ کی تحقیر و تخفیف ذقان نہ ہی تھی نہ وہ ایسا کر سکتے تھے ان کا مقصد صرف اپنی براءت و صفائی پیش کرنی تھی پھر حضرت ابو ہریرہ کی معاش کی صورت کیا تھی ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت مسکین طبع تھے اصحاب صفہ میں شامل تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو مجرد ہی رہے صرف اپنی ذات کا موٹا جھوٹا کھانے پہنے کا خرچہ تھا جس کے لئے وہ مزدوری بھی کر لیتے تھے خود ان ہی کا بیان ہے کہ میں نے ایک زمانہ میں بسرہ بنت غزوان کے یہاں اجرت پر کام کیا ہے وہ لوگ جب کہیں سفر پر جاتے تو میں بھی نوکر کی طرح ساتھ جاتا اور ان کی ضروریات مہیا کرتا بعض اوقات وہ سوار اور مجھے پیدل بھی چلنا پڑتا اور بسرہ کا یہ حال تھا کہ کسی منزل پر پڑاؤ کرتی تو مجھ سے کہتی کہ مجھے حلوہ ملیدہ تیار کر کے دے اس کے بغیر آگے سفر نہ کروں گی اس کے بعد زمانہ کا انقلاب ایسا ہوا کہ میں نے بسرہ سے شادی کی جبکہ مروان کے زمانہ میں حضرت ابو ہریرہؓ امیر مدینہ ہو گئے تھے اور اب میں بھی سوار ہو کر سفر کرتا ہوں بسرہ میری خدمت کرتی ہے اور جب ہم ان منازل سے گزرتے ہیں جہاں وہ مجھ سے بطور نوکر و خادم کے ملیدہ تیار کرواتی تھی اب میں اسے کہتا ہوں کہ بسرہ پہلے میرے لئے حلوہ ملیدہ بنا کر لاؤ بغیر اس کے سفر نہیں ہوگا۔

شبع بطن سے کیا مراد ہے؟

حضرت ابو ہریرہ نے جو فرمایا کہ صحابہؓ پر گھر بار وغیرہ کی ضروریات تھیں اس لئے وہ کاموں میں مشغول ہوتے اور مجھے صرف اپنا پیٹ بھرنا تھا اور کوئی ضرورت و ذمہ داری نہ تھی جس کے لئے کاروبار وغیرہ کرتا بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو پیٹ بھرنے کا فکر ضرور تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ دور نبوت میں پیٹ بھر کر کھانے کا رواج ہی نہیں تھا اور یہ تو بچارے خود ہی مسکین طبع تھے بڑے بڑے مالدار صحابہؓ مرد اور عورتیں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے اتباع میں کم کھانے اور فاقہ کو محبوب رکھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان تو یہ ہے کہ اسلام میں سب سے پہلی بدعت پیٹ بھر کر کھانے کی رائج ہوئی ہے دوسری معنی شبع بطن کے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ دوسرے صحابہ کو دوسری مصروفیات بھی تھیں مگر مجھے تو کوئی کام نہ تھا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں خوب جی بھر کر رہتا کیونکہ عرب کا محاورہ یوں بھی ہے فـــلان

یحدث شبع بطنه فلان یسافر شبع بطنه فلاں آدمی جی بھر کر باتیں کرتا ہے فلاں آدمی جی بھر کر سفر کرتا ہے واللہ اعلم۔

دوسری حدیث میں جو حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ پھر میں کبھی نہیں بھولا حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ مجھے اس سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ اپنی عمر میں جو کچھ بھی انہوں نے سنا تھا وہ سب ہی ان کو محفوظ ہو گیا اس میں سے کسی چیز کو نہیں بھولے یعنی اس میں صرف اسی مجلس یا دوسرے محدود ومخصوص اوقات کی تحدید نہیں ہے

تیسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور علیہ السلام سے دو برتن (ظرف) محفوظ کئے ہیں حافظ عینی نے لکھا کہ محل بول کر حال مراد لیا ہے کہ میں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں رہ کر دو قسم کے علوم جمع کئے ایسے کہ اگر ان کو لکھتا تو ہر ایک سے ایک ایک ظرف بھر جاتا جیسے حضرت امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہا امام محمدؒ سے میں نے دو بوجھ اونٹ کے علم حاصل کیا ہے اس زمانے میں کتابیں اور نوشتے محفوظ کرنے کے لئے الماریوں کا دستور نہ تھا اس لئے جیسے اور سامان برتنوں یا گھڑیوں میں رکھتے تھے کتابیں اور نوشتے بھی برتنوں میں جمع کر لیا کرتے تھے وہی تعبیر اختیار کی گئی۔

دو قسم کے علوم کیا تھے؟

حافظ عینی نے لکھا کہ اول قسم میں احکام وسنن تھے دوسری میں اخبار وفتن تھے ابن بطال نے کہا دوسری قسم میں آثار قیامت کی احادیث اور قریش کے ناعاقبت اندیش بیوقوف نوجوانوں کے ہاتھوں جو دین کی تباہی اور بربادی ہونے والی تھی اس کی خبریں تھی اس لئے حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں ان سب کے نام لے لے کر بتلا سکتا ہوں لیکن فتنے سے ڈر کر اظہار نہ کرتے تھے اور ایسا ہی ہر امر بالمعروف کرنے والے کو چاہیے کہ اگر جان کا خوف ہو تو صراحت سے گریز کرے البتہ اگر دوسری قسم میں بھی حلال وحرام بتلانے والی احادث ہوتی تو وہ ان کو ہرگز نہ چھپاتے اور احکام قرآن مجید کی رو سے ان کا چھپانا جائز بھی نہیں ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دعائے ثانی میں وہ احادث تھیں جن میں ظالم وجابر حکام کے نام احوال اور مذمت تھی اور حضرت ابو ہریرہؓ بعض لوگوں کی نشاندہی اشارہ وکنایہ سے کیا بھی کرتے تھے مثلاً فرمایا **اعوذ باللہ من راس الستین وامارۃ الصبیان** (خدا کی پناہ چاہتا ہوں ساٹھویں سال کی ابتداء اور لڑکوں کے دور حکومت سے اس سے اشارہ یزید بن معاویہ کی خلافت کی طرف میں تھا کیونکہ وہ ساٹھ ہجری میں قائم ہوئی حق تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی دعا قبول کی کہ اس سے ایک سال قبل ان کی وفات ہوگئی۔ (عمدۃ القاری ص ۵۹۳ ج ۱)

فتنے عذاب استیصال کی جگہ ہیں

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا چونکہ اس امت محمدیہ سے عذاب استیصال اٹھا دیا گیا ہے اور قیامت ان ہی لوگوں پر قائم ہوگی اس لئے یہ امت فتنوں میں مبتلا کی گئی، جن سے اہل حق واہل باطل کی تمیز ہوتی رہے گی۔

معلوم ہوا کہ اکابر کے ہوتے ہوئے اصاغر کا برسر اقتدار آنا، اتقیاء کی موجودگی میں اشرار کا آگے بڑھنا، ناعاقبت اندیش اور مسلمانوں کے معاملات سے پوری طرح واقفیت نہ رکھنے والے نوجوانوں کا سرداری حاصل کر لینا بھی اس امت کے فتنوں میں سے ہے جس طرح پہلے ذکر ہوا تھا کہ بڑے اہل علم کی موجودگی میں کم علم لوگوں سے علم حاصل کرنا زوال علم کا باعث اور علامات قیامت سے ہے واللہ اعلم۔

بحث ونظر

قول صوفیہ اور حافظ عینی کی رائے

حافظ عینی نے لکھا: متصوفہ کہتے ہیں کہ اول سے مراد علم احکام واخلاق ہیں اور دوسرے سے مراد علم اسرار ہے، جو علماء عارفین کیساتھ خاص ہے، دوسرے لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔

دوسرے صوفیہ نے کہا کہ اس سے مراد علم مکنون وسر مخزون ہے، جو خدمت کا نتیجہ اور حکمت کا ثمرہ ہے اس کو وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو مجاہدات کے سمندروں میں غواصی کریں اس کی سعادت سے وہی بہرہ مند ہو سکتے ہیں جو انوار مجاہدات ومشاہدات سے سرفراز ہوں کیونکہ وہ دلوں کے ایسے اسرار ہیں جو بغیر ریاضت کے ظہور پذیر نہیں ہو سکتے اور عالم وغیب کے ایسے انوار ہیں جن کا انکشاف صرف مرتاض نفوس ہی کے واسطے ممکن ہے۔

حافظ عینی نے کہا: ''بات تو ان لوگوں نے اچھی کہی، مگر اس کے ساتھ یہ شرط ضروری ہے کہ وہ علم قواعد اسلامیہ اور قوانین ایمانیہ کے خلاف نہ ہو، کیونکہ حق کی راہ ایک ہی متعین راہ ہے اور اس کے سوا سب گمراہی کے راستے ہیں'' للہ در الحافظ العینی۔ کیسی جچی تلی واضح بات کہی اور نہایت مختصر کلام سے سارے نزاعات کا فیصلہ فرما دیا۔

علامہ قسطلانی کا انتقاد

علامہ موصوف نے صوفیہ کے مذکورہ بالا نظریہ پر یہ نقد کیا کہ اگر دوسری نوع میں یہی علم اسرار یا علم مکنون مراد ہے تو ایسے علم کو حضرت ابو ہریرہ کیوں چھپاتے یہ تو نا صرف علم بلکہ مغز علم اور سارے علوم ظاہری کا حاصل ومقصد عظیم ہے

حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری رحمہ اللہ کا ارشاد

آپ نے تحریر فرمایا کہ علامہ قسطلانی کے نقد مذکور کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کو یہ خوف ہوا ہوگا کہ ممکن ہے کہ ان حقائق کو کچھ اہل ظاہر نہ سمجھ کر انکار وخلاف کا راستہ اختیار کریں اور اس سے فتنہ کا دروازہ کھل جائے اور مسلسلات شاہ ولی اللہ دہلویؒ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک روایت مرفوعاً مروی ہے کہ بعض علمی باتیں بہ ہیبت مکنون ہوتیں ہیں جن کو علمائے ربانی ہی سمجھ سکتے ہیں اور جب وہ ان کو بیان کرتے ہیں تو اہل ظاہر ہی ان سے منکر ہوتے ہیں''۔ حضرت شیخ الحدیث نے لکھا کہ میں نے اس حدیث کی تخریج بھی مسلسلات کی تعلیق میں کی ہے اور حضرت حکیم الامت تھانوی نے بھی اس حدیث کو ''التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف'' میں ذکر کیا ہے علامہ سیوطی نے اس کو ذیل میں نقل کیا ہے۔ (لامع الدراری ۶۲ ج ۱)

حضرت گنگوہی کا ارشاد گرامی

فرمایا: ''اہل حقیقت نے اس سے اپنا مدعا ثابت کیا ہے اور یہ کچھ بعید بھی نہیں'' اس پر حضرت شیخ الحدیث دام ظلہم العالی نے تعلیق میں لکھا کہ ان لوگوں سے حضرت شیخ کی مراد باطنیہ اور متصوفہ کے سوا دوسرے حضرات ہیں جن کا ذکر حافظ کے کلام میں آیا ہے

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ متصوفہ کے بارے میں تو اوپر حافظ عینی کا مذکورہ فیصلہ ہی زیادہ صحیح وحق معلوم ہوتا ہے اگر اس سے زیادہ تشدد کسی نے کیا ہے تو وہ محل نظر ہوگا اور غالباً حضرت گنگوہی قدس سرہ بھی حافظ عینی کے فیصلے سے تجاوز کو پسند نہ فرماتے ہوں گے البتہ باطنیہ کا طریق ومسلک ضرور غلط اور بعید عن الحق ہے کہ وہ اس حدیث سے اپنے باطن عقائد پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، اسی لئے علامہ ابن المنیر نے خاص طور سے یہاں باطنیہ کو رد کیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد گرامی

آپ نے شرح تراجم ابواب بخاری میں فرمایا: علامہ کے صحیح ترین قول کی بناء پر اس سے مراد فتن اور ان واقعات کا علم ہے جو حضور اکرم علیہ السلام کی وفات کے بعد رونما ہوئے مثلاً شہادت عثمان، شہادت حسین وغیرہ حضرت ابو ہریرہ کو ان کا علم تھا مگر غلمان نے بنی امیہ کی وجہ سے ان امور کے اظہار وافشاء اور معتین کر کے نام بتلانے سے ڈرتے تھے

ایک حدیثی اشکال وجواب

حافظ عینی نے لکھا کہ مسند ابی ہریرۃ میں اس طرح ہے کہ "میں" نے آنحضرت علیہ السلام سے تین جراب (چمڑے کے برتن) محفوظ کئے تھے جن میں سے دو کو ظاہر کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان تین میں دو جراب چونکہ ایک نوع علم کے تھے یعنی احکام وظاہر شریعت سے متعلق اور تیسرے جراب کا تعلق دوسری نوع علم سے تھا اس لئے وعائینا اور ثلاثۃ اجربۃ کی روایات میں تخالف نہیں ہے

حافظ عینی نے یہ بھی لکھا کہ نوع اول میں کیونکہ احادیث کی بہت کثرت تھی اس لئے اس کو دو جراب سے تعبیر کیا اور نوع ثانی میں چونکہ قلت تھی اس لئے اس کو ایک جراب سے ظاہر کیا اس طرح دونوں حدیث میں توفیق ہوگئی پھر حافظ عینی نے لکھا:

حافظ ابن حجر کا جواب

بعض محدثین (ابن حجر) نے اشکال مذکور کے جواب میں ایک بعید توجیہ کی ہے کہ ایک برتن بڑا ہوگا اور دوسرا چھوٹا کہ اس کے دو پہلو ایک کے برابر ہوں گے، اس لئے دوسری روایت میں تین جراب کہے گئے (عمدۃ القاری ص ۵۹۴ ج ۱)

آگے حافظ نے یہ بھی لکھا کہ **الحدث المفاصل للراء مهرمذی** میں طریق منقطع سے پانچ جراب کی روایت بھی حضرت ابو ہریرہ سے ہے، اگر وہ ثابت ہو جائے تو اس کا بھی یہی جواب ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہ نے جتنا حصہ احادیث رسول اللہ علیہ السلام کا نشر کر دیا وہ اس حصہ سے بہت زیادہ ہے جس کو نشر نہیں کیا۔

حافظ کے جواب مذکور پر نقد

حافظ کی توجیہ اس لئے بعید ہے کہ وہ دونوں نوع کو برابر کر رہی ہیں کہ دو جراب چھوٹے قرار دے کر ایک بڑے کے برابر کئے اور اس طرح پانچ جراب میں سے چار کو اتنے چھوٹے کہیں گے کہ وہ سب ایک پانچویں کے برابر ہو جائیں یا ایک طرف تین چھوٹے اور دوسری طرف دو بڑے کہیں گے حالانکہ خود بھی آخر میں اعتراف کر رہے ہیں کہ ایک نوع کا علم دوسرے سے اکثر ہے اور ممکن ہے تین اور پانچ جراب

والی روایت اسی کی طرف اشارہ کے لئے بھی ہوں کہ علم منشور، علم غیر منشور سے ازید واکثر ہے پھر جرابوں کا چھوٹا بڑا ماننے کی کیا ضرورت ہے بلکہ وہ موہوم خلاف مقصود ہے۔

حافظ عینی و حافظ ابن حجر کا موازنہ

مذکورہ بالا قسم کا نقد و تحقیق ہم اس لئے ذکر کرتے ہیں کہ بحث و تمہید سے بات اچھی طرح نکھر جاتی ہے اور علمائے محققین کے طرز تحقیق کا اندازہ ہو کر اس سے علمی ترقیات کے لئے راہیں کھلتیں ہیں ساتھ ہی یہ بھی اچھی طرح واضح ہوتا جائے گا کہ حافظ عینی کا پایہ تحقیق دقت نظر و وسعت علم و تجربہ نسبت حافظ ابن حجر کے کتنا زیادہ ہے، اور شرح صحیح بخاری نیز شرح معانی حدیث کا حق ادا کرنے میں حافظ عینیؒ حافظ ابن حجر سے کس قدر پیش پیش ہیں۔ والعلم عند اللہ۔

تکمیلی فائدہ: اوپر کی سطور لکھنے کے بعد اتفاقاً ایک ضرورت سے ''مقدمہ لامع دراری'' مطالعہ کر رہا تھا تو یہ عبارت نظر سے گزری۔

صحیح بخاری شریف کی تمام شروح میں سے زیادہ جلیل القدر علی الاطلاق جیسا کہ علمائے آفاق نے اجماع و اتفاق کیا ہے۔ فتح الباری اور عمدۃ القاری ہیں۔ پھر اول کو دوسری پر تحقیق و تنقید کے لحاظ سے فضیلت ہے اور نہ دوسری کو اول پر توضیح و تفصیل کی رو سے فضیلت حاصل ہے (ج ۱ص ۱۴۵)

ہم نے ان دونوں عظیم المرتبت حضرات اور ان کی مایہ ناز شروح بخاری کے متعلق مقدمہ میں کچھ تفصیل سے لکھا ہے اور اس سلسلے میں علامہ کوثریؒ کے تحقیقی فیصلہ کو حرف آخر سمجھتے ہیں اس لیے یہاں صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ تحقیق و تنقید کے لحاظ سے عمدۃ القاری کو مغضوقرر دینا صحیح نہیں ہے۔ جس کا ثبوت ان دونوں کی تحقیق و تنقید کے موازنوں سے انوار الباری میں ہوتا رہے گا ان شاء اللہ تعالیٰ نستعین و بہ۔

بَابُ الْاِنْصَاتِ لِلْعُلَمَآءِ (علماء کی بات سننے کیلئے خاموش رہنا)

(۱۲۱) حَدَّثَنَا حَجَّاجٌ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عَلِیُّ بْنُ مُدْرِکٍ عَنْ اَبِیْ زُرْعَةَ عَنْ جَرِیْرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَہٗ فِیْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ اِسْتَنْصِتِ النَّاسَ! فَقَالَ لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا یَّضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔

ترجمہ: ۱۲۱ حضرت جریر سے نقل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے حجۃ الوداع میں فرمایا کہ لوگوں کو خاموش کر دو! پھر فرمایا، لوگو! میرے بعد پھر کافر مت بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

تشریح: حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضرت جریرؓ صحابی سے فرمایا کہ لوگوں کو خاموش کر دو پھر سب کو یہ نصیحت فرمائی کہ میرے بعد آپس میں اختلاف نہ بڑھانا اور کافروں کی طرح دلوں میں فرق نہ آنے دینا اور جس طرح اب تمہاری حالت ایمان تقوی اور باہم محبت و موانست وغیرہ کی ہے اسی پر قائم رہنا اگر تم بدل گئے تو کافروں کی طرح **تحسبھم جمیعا وقلوبھم شتّٰی** ۔ کا مصداق ہو جاؤ گے اور ان کی طرح ایک دوسرے کو مارنے اور کاٹنے پر تل جاؤ گے امام بخاری نے ترجمۃ الباب اور حدیث مذکور سے یہ بتلایا کہ جس طرح حضور علیہ السلام نے عرفات کے مقدس میدان میں حج کے رکن اعظم وقوف عرفہ کے وقت جبکہ لوگ تلبیہ و ذکر و تلاوت قرآن مجید وغیرہ میں مشغول و منہمک تھے علمی بات سنانے کی اہمیت کے سبب ان کو خاموش اور پوری طرح متوجہ کرایا اسی طرح علماء (یعنی تابعین رسول اللہ ﷺ

سے بھی علمی باتیں سننے اور علوم نبوت حاصل کرنے کے لیے خاموش اور پوری طرح متوجہ ہو جانا چاہیے۔ معلوم ہوا کہ انفرادی ذکر واذکار اور اطاعات سے بڑھ کر علمائے ربانیین کا وعظ سننا ہے اور اس کا لوگوں کو زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

بحث ونظر

امام بخاری کی ترجمۃ الباب سے کیا غرض ہے اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

(۱) ابن بطال نے کہا کہ علماء کی بات توجہ اور خاموشی سے سننا ضروری ہے کیونکہ وہ انبیاء علیہم السلام کے وارث اور جانشین ہیں

(۲) حافظ عینی نے کہا۔ لام تعلیل کا ہے کہ علماء کی وجہ سے خاموشی اختیار کرنی چاہیے کیونکہ علم علماء ہی سے لیا جاتا ہے اور اس کا حاصل کرنا بغیر انصات (خاموشی وتوجہ کے ساتھ سننے کے) ممکن نہیں۔

فرق یہ ہوا کہ ابن بطال کے نزدیک انصات علماء کے لیے توقیر واحترام کے سبب ہے اور حافظ عینی کے نزدیک استماع کلام کے لیے ہے۔

(۳) حضرت اقدس مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ انصات للعلم کی اہمیت بتلانا ہے کہ ذکر تلبیہ تلاوت وغیرہ کے وقت بھی ان کو چھوڑ کر علم کی باتیں سننی چاہئیں۔

(۴) حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کے بعض اقوال سے یہ ثابت ہوا تھا کہ لوگ اپنی کسی قسم کی باتوں میں مشغول ہوں تو ایسے وقت ان کی باتوں کو قطع کر کے نصیحت کی باتیں نہ سنائی جائیں۔ وہ اس سے ملول ہوں گے تو امام بخاری نے یہاں متنبہ کیا کہ وہ اقوال اپنی جگہ درست ہیں مگر جب کسی اہم علمی بات کو لوگوں تک پہنچانا ضروری ہو۔ تو ایسے وقت میں اس کو پہنچانے میں تامل نہیں کرنا چاہیے جس طرح آں حضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر کیا۔

روایت جریر کی بحث

حافظ عینی نے لکھا یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ بخاری کے اکثر نسخوں میں قال لہ ہے یعنی آں حضرت ﷺ نے جریر سے فرمایا لوگوں کو خاموش کر دو لیکن حافظ عبدالبر نے جزم ویقین کے ساتھ لکھا کہ جریر آں حضرت ﷺ کی وفات سے صرف چالیس دن قبل اسلام لائے۔ گویا حجۃ الوداع سے تقریباً دو ماہ بعد تو حضور ﷺ کا آپ سے فرمانا کیسے صحیح ہوگا۔ بعض لوگوں نے اسی باعث کہا ہے کہ لہ یہاں لہ زائد ہے یعنی حضور ﷺ نے جریر سے نہیں بلکہ کسی اور صحابہ سے ایسا فرمایا ہوگا۔ لیکن تحقیقی جواب یہ ہے کہ یہاں زائد نہیں ہے اور حضور اکرم ﷺ کا خطاب جریر سے صحیح ہے کیونکہ بغوی اور ابن ماجہ نے تصریح کی ہے کہ جریر رمضان ۱۰ ہجری میں اسلام لائے تھے۔ اور خود بخاری باب حجۃ الودع میں بھی قال بجریر مروی ہے جس میں کسی احتمال وتاویل کی گنجائش نہیں لہٰذا حافظ ابن عبدالبر کا قول مجروح ومخدوش ٹھہرے گا۔ (عمدۃ القاری ص ۵۹۵)

حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں تقریباً یہی بات اپنے طریقہ پر لکھی ہے اور بغوی کے قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ البتہ انہوں نے بغوی کے ساتھ ابن حبان لکھا ہے واللہ اعلم۔

اہم نکتہ: یہاں خاص طور سے یہ بات نوٹ کر کے آگے بڑھیے کہ حافظ ابن عبدالبرامت کے چند گنے چنے نہایت اونچے درجہ کے محققین میں سے ہیں اور ان کے قول کو اکثر حرف آخر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے مگر جب ایک بات کا خالص تحقیقی زاویہ نظر سے بے لاگ فیصلہ کرنا ہوا

تو اتنی عظیم القدر شخصیت بھی اس سے مانع نہیں ہو سکی۔ حافظ نے جانب مخالف کو قوی کہا تو حافظ عینی نے اور بھی زیادہ صراحت کے ساتھ ان کے قول کو مخدوش ہی فرما دیا۔ یہ تھا قدیم اور صحیح طرز تحقیق اور آج اگر کسی بڑے شخص کی کسی تحقیق کے بارے میں کوئی خامی بتلادی جائے تو کہہ دیا جائے گا۔ کہ یہ ان کی عظمت کا قائل نہیں حالانکہ انبیاء علیہ السلام کے سوا کسی کے لیے عصمت نہیں اور سب سے غلطی ہوتی ہے بڑے بڑوں سے ہوئی ہے۔ ان کے دنیوی فضائل اور اخروی مراتب عالیہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر ان کی تحقیق کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر ضرور کسا جائے گا۔ اور اپنا ہو یا کسی لحاظ سے غیر، اس کی رائے کو تنقید سے بالاتر نہیں کہا جائے گا۔ حضرت امام ابوحنیفہ کو خادمان علوم نبوت وقوانین شریعت میں سب سے اول اعلیٰ اور اعظم مرتبہ مقام حاصل ہے موجودہ حدیثی ذخیروں میں سب سے پہلا مدون مرتب احادیث احکام کا ذخیرہ ان ہی کی ذات اقدس سے منسوب مسانید الامام کی صورت میں ہے جن کی اسانید تمام موجودہ کتب حدیث کی اسانید سے زیادہ عالی مرتبت ہیں اور ان کی مجلس تدوین فقہ کی بارہ لاکھ سے زیادہ مسائل اسی وقت سے اب تک کہ بارہ سو سال زیادہ گذر چکے ہیں۔ دائر وسائر ہیں۔

بعد کے بڑے بڑے محدثین وفقہاء نے ان پر دل کھول کر تنقیدیں بھی کیں اور اس سلسلہ میں جتنا کام حق وانصاف تحقیق واعتدال سے ہوا اس سے امت کو بڑے فوائد حاصل ہوئے۔ محققین علماء حنفیہ نے ہمیشہ تنقید پر ٹھنڈے دل سے غور وفکر کیا اور آج بھی اسی فکر وذہن سے سوچتے ہیں۔

اکابر دیوبند اور حضرت شاہ صاحب

قریبی دور میں ہمارے اکابر دیوبند کا بھی یہی طریق رہا ہے اور خصوصیت سے ہمارے حضرت شاہ صاحب نے پورے تیس سال تک تمام تفسیری حدیثی فقہی وکلامی ذخیروں پر گہری نظر فرما کر یہ معلوم کرنے کی سعی فرمائی کہ حنفی مسلک میں واقعی خامیاں اور کمزوریاں کیا کیا ہیں؟ اور آخر میں یہ فیصلہ علی وجہ بصیرت فرما گئے کہ قرآن وحدیث اور آثار صحابہؓ وتابعینؒ کی روشنی میں بجز ایک دو مسائل کے فقہ حنفی کے تمام مسائل نہایت مضبوط ومستحکم ہیں اور آپ کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ استنباط مسائل کے وقت حدیث سے فقہ کی جانب آنا چاہیے فقہ سے حدیث کی طرف نہیں یعنی سب سے خالی الذہن ہو کر شارع علیہ السلام کی مراد متعین کی جائے اور اس کی رو سے فقہی احکام کی تشخیص عمل میں آجائے۔ یہ نہیں کہ پہلے اپنی فکر وذہن کی قالب میں مسائل ڈھال کر ان ہی کو حدیث سے ثابت کرنے کی کوشش ہو، اسی زریں اصول کے تحت آپ تمام اجتہادی مسائل کا جائزہ لیتے تھے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

بَابُ مَا يُسْتَحَبُّ لِلْعَالِمِ اِذَا سُئِلَ اَيُّ النَّاسِ اَعْلَمُ فَيَكِلُ الْعِلْمَ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى

(جب کسی عالم سے سوال کیا جائے کہ اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے تو اس کے لیے بہتر ہے کہ خدا کے علم پر محول کردے کہ وہی زیادہ جاننے والا ہے)

(۱۲۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدِ نِ الْمُسْنَدِيُّ قَالَ ثَنَا سُفْيَانُ قَالَ ثَنَا عُمَرٌو وَ قَالَ اَخْبَرَ نِيْ سَعِيْدُ بْنُ جُبَيْرٍ قَالَ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ اِنَّ نَوْفًا الْبَكَالِيَّ يَزْعَمُ اَنَّ مُوْسٰى لَيْسَ مُوْسٰى بَنِيْٓ اِسْرَائِيْلَ اِنَّمَا هُوَ مُوْسٰى اٰخَرُ فَقَالَ كَذَبَ عَدُوُّ اللّٰهِ حَدَّثَنَا اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَامَ مُوْسَى النَّبِيُّ خَطِيْبًا فِيْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ فَسُئِلَ اَيُّ النَّاسِ اَعْلَمُ فَقَالَ اَنَا اَعْلَمُ فَعَتَبَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَيْهِ اِذْ لَمْ يَرُدَّ الْعِلْمَ اِلَيْهِ فَاَوْحَى اللّٰهُ اِلَيْهِ اَنَّ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِيْ بِمَجْمَعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ اَعْلَمُ مِنْكَ قَالَ يَا رَبِّ وَكَيْفَ بِهٖ فَقِيْلَ لَهٗ احْمِلْ حُوْتًا فِيْ مِكْتَلٍ

فَإِذَا فَقَدْتَهُ فَهُوَ ثَمَّ فَانْطَلَقَ وَانْطَلَقَ مَعَهُ فَتَاهُ يُوشَعُ بْنُ نُونٍ وَّحَمَلَهُ حُوتاً فِي مِكْتَلٍ حَتَّى كَانَا عِنْدَ الصَّخْرَةِ وَضَعَا رُؤُسَهُمَا فَنَامَا فَنَسَلَّ الْحُوتُ مِنَ الْمِكْتَلِ فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا وَّ كَانَ لِمُوسَى وَ فَتَاهُ عَجَبًا فَانْطَلَقَا بَاقِيَةَ لَيْلَتِهِمَا وَ يَوْمِهِمَا فَلَمَّآ أَصْبَحَ قَالَ مُوسَى لِفَتَهُ آتِنَا غَدَاءَ نَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا وَلَمْ يَجِدْ مُوسَى مَسًّا مِّنَ النَّصَبِ حَتَّى جَاوَزَ الْمَكَانَ الَّذِيْ أُمِرَ بِهٖ فَقَالَ فَتَاهُ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوتَ قَالَ مُوسَى ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّ اعَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا فَلَمَّا انْتَهَيَا إِلَى الصَّخْرَةِ إِذَا رَجُلٌ مُّسَجًّى بِثَوْبٍ أَوْ قَالَ تَسَجّٰى بِثَوْبِهٖ فَسَلَّمَ مُوسَى فَقَالَ الْخَضِرُ وَ أَنّٰى بِأَرْضِكَ السَّلَامُ؟ فَقَالَ أَنَا مُوسَى فَقَالَ مُوسَى بَنِيْ إِسْرَائِيلَ؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلٰى أَنْ تُعَلِّمَنِيْ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا يَآ مُوسَى إِنِّيْ عَلٰى عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَّمَنِيْهِ لَا تَعْلَمُهُ أَنْتَ وَ أَنْتَ عَلٰى عِلْمٍ عَلَّمَكَهُ اللّٰهُ لَا أَعْلَمُهُ قَالَ سَتَجِدُنِيْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَا أَعْصِيْ لَكَ أَمْرًا فَانْطَلَقَا يَمْشِيَانِ عَلٰى سَاحِلِ الْبَحْرِ لَيْسَ لَهُمَا سَفِيْنَةٌ فَمَرَّتْ بِهِمَا سَفِيْنَةٌ فَكَلَّمُوْهُمْ أَنْ يَحْمِلُوْهُمَا فَعُرِفَ الْخَضِرُ فَحَمَلُوْهُمَا بِغَيْرِ نَوْلٍ فَجَآءَ عُصْفُوْرٌ فَوَقَعَ عَلٰى حَرْفِ السَّفِيْنَةِ فَنَقَرَ نَقْرَةً أَوْ نَقْرَتَيْنِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ الْخَضِرُ يَامُوسَى مَا نَقَصَ عِلْمِيْ وَ عِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى إِلَّا كَنَقْرَةِ هٰذِهِ الْعُصْفُوْرِ فِي الْبَحْرِ فَعَمَدَ الْخَضِرُ إِلٰى لَوْحٍ مِّنَ السَّفِيْنَةِ فَنَزَعَهُ فَقَالَ مُوسَى قَوْمٌ حَمَلُوْنَا بِغَيْرِ نَوْلٍ عَمَدْتَ إِلٰى سَفِيْنَتِهِمْ فَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ أَمْرِيْ عُسْرًا قَالَ فَكَانَتِ الْأُوْلٰى مِنْ مُوسَى نِسْيَانًا فَنْطَلَقَا فَإِذَا غُلَامٌ يَّلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ فَأَخَذَ الْخَضِرُ بِرَأْسِهٖ مِنْ أَعْلَاهُ فَاقْتَلَعَ رَأْسَهُ بِيَدِهٖ فَقَالَ مُوسَى أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا قَالَ ابْنُ عُيَيْنَةَ وَهٰذَا أَوْكَدُ فَانْطَلَقَا حَتّٰى إِذَا أَتَيَآ أَهْلَ قَرْيَةِ نِ اسْتَطْعَمَآ أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَ فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ أَنْ يَّنْقَضَّ قَالَ الْخَضِرُ بِيَدِهٖ فَأَقَامَهُ فَقَالَ لَهُ مُوسَى لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ. قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْحَمُ اللّٰهُ مُوسَى لَوَدِدْنَا لَوْ صَبَرَ حَتّٰى يَقُصَّ عَلَيْنَا مِنْ أَمْرِهِمَا قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ ثَنَا بِهٖ عَلِيُّ بْنُ خَشْرَمٍ قَالَ ثَنَا سُفْيٰنُ بْنُ عُيَيْنَةَ بِطُوْلِهٖ.

ترجمہ: سعید بن جبیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ نوف بکالی کا یہ خیال ہے کہ موسیٰ (جو خضر کے پس گئے تھے موسیٰ بنی اسرائیل والے نہیں تھے بلکہ دوسرے موسیٰ تھے (یہ سن کر) ابن عباسؓ بولے کہ اللہ کے دشمن نے تم سے جھوٹ کہا، ہم سے ابن ابی کعب نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ (ایک روز) موسیٰ نے کھڑے ہوکر بنی اسرائیل میں خطبہ دیا، تو آپ سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ صاحب علم کون ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں ہوں، اس وجہ سے اللہ کا عتاب ان پر ہوا کہ انہوں نے علم کو اللہ کے حوالے کیوں نہ کر دیا، تب اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں میں سے ایک بندہ دریاؤں کے سنگم پر ہے وہ تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ موسیٰ نے کہا، اے

پروردگار! میری ان سے کیسے ملاقات ہو؟ حکم ہوا کہ ایک مچھلی توشہ دان میں رکھ لو جب تم وہ مچھلی گم کردو گے تو وہ بندہ تمہیں (وہیں) ملیگا۔ تب موسیٰ علیہ السلام چلے اور اپنے ساتھ خادم یوشع بن نون کو لے لیا، اور انہوں نے توشہ دان میں مچھلی رکھ لی جب ایک پتھر کے پاس پہنچے دونوں اپنے سر رکھ کر سو گئے اور مچھلی توشہ دان سے نکل کر دریا میں اپنی راہ جا لگی، اور یہ بات موسیٰ اور ان کے ساتھی کے لئے تعجب انگیز تھی، پھر وہ دونوں بقیہ رات اور دن چلتے رہے۔ جب صبح ہوئی موسیٰ نے خادم سے کہا کہ ہمارا ناشتہ لاؤ، اس سفر میں ہم نے کافی تکلیف اٹھائی، اور موسیٰ بالکل نہیں تھکے تھے اور جب اس جگہ سے آگے نکل گئے جہاں تک انہیں جانے کا حکم ملا تھا تب ان کے خادم نے کہا کہ کیا آپ نے دیکھا تھا کہ ہم جب صخرہ کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کو (کہنا) بھول گیا (یہ سن کر) موسیٰ علیہ السلام بولے یہی وہ جگہ تھی جس کی ہمیں تلاش تھی، اور پچھلے پاؤں لوٹ گئے جب پتھر کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک شخص چادر میں لپٹا ہوا (لیٹا) ہے۔ موسیٰ نے انہیں سلام کیا، خضرؑ نے کہا کہ تمہاری سرزمین میں سلام کہاں، پھر موسیٰ نے کہا کہ میں موسیٰ ہوں، خضرؑ بولے کہ بنی اسرائیل کے موسیٰ، انہوں نے جواب دیا کہ ہاں، پھر کہا کہ کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں تاکہ تم مجھے وہ ہدایت کی باتیں بتلاؤ جو خدا نے تمہیں سکھلائی ہیں، خضرؑ بولے کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کرسکو گے، اے موسیٰ مجھے اللہ نے ایسا علم دیا ہے جسے تم نہیں جانتے، اور تم کو جو علم دیا ہے اسے میں نہیں جانتا، (اس پر) موسیٰ نے کہا کہ خدا نے چاہا تو تم مجھے صابر پاؤ گے، اور میں کسی بات میں تمہاری خلاف ورزی نہیں کروں گا، پھر وہ دونوں دریا کے کنارے کنارے پیدل چلے، ان کے پاس کوئی کشتی نہ تھی، ایک کشتی ان کے سامنے سے گزری تو کشتی والوں سے انہوں نے کہا کہ ہمیں بٹھا لو، خضر علیہ السلام کو انہوں نے پہچان لیا اور بے کرایہ سوار کرلیا۔ اتنے میں ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ گئی، پھر سمندر میں اس نے ایک یا دو چونچیں ماریں (اسے دیکھ کر) خضرؑ بولے کہ اے موسیٰ! میرے اور تمہارے علم نے اللہ میاں کے علم میں سے اتنا ہی کم کیا ہوگا کہ جتنا اس چڑیا نے (سمندر کے پانی) سے، پھر خضرؑ نے کشتی کے تختوں میں سے ایک تختہ نکال ڈالا موسیٰ نے کہا کہ ان لوگوں نے تو ہمیں بلا کرایہ سوار کیا اور تم نے ان کی کشتی (کی لکڑی) اکھاڑ ڈالی تاکہ یہ ڈوب جائیں۔ خضرؑ بولے کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کرسکو گے؟ اس پر موسیٰ نے جواب دیا کہ بھول پر تو میری گرفت نہ کرو۔ موسیٰ نے بھول کر یہ پہلا اعتراض کیا تھا، پھر دونوں چلے (کشتی سے اتر کر) ایک لڑکا بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، خضرؑ نے اوپر سے اس کا سر پکڑ کر ہاتھ سے الگ کردیا، موسیٰ بول پڑے کہ تم نے ایک بیگناہ کو بغیر کسی جانی حق کے مار ڈالا خضرؑ بولے کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کرسکو گے؟ ابن عیینہ کہتے ہیں کہ اس کلام میں زیادہ تاکید ہے پہلے سے' پھر دونوں چلتے رہے، حتی کہ ایک گاؤں والے کے پاس آئے، ان سے کھانا لینا چاہا، انہوں نے کھانا کھلانے سے انکار کردیا، انہوں نے وہیں دیکھا کہ ایک دیوار سی گاؤں میں گرنے کے قریب تھی، خضرؑ نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے اسے سیدھا کردیا، موسیٰ بول اٹھے اگر تم چاہتے تو ہم گاؤں والوں سے اس کام کی مزدوری لے سکتے تھے، خضرؑ نے کہا (بس اب) ہم تم میں جدائی کا وقت آ گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ موسیٰ پر رحم کرے، ہماری تمنا تھی کہ اگر موسیٰ کچھ دیر اور صبر کرتے تو مزید واقعات ان دونوں کے ہماری علم میں آجاتے۔

محمد بن یوسف کہتے ہیں کہ ہم سے علی بن خشرم نے یہ حدیث بیان کی، ان سے سفیان بن عیینہ نے پوری کی پوری بیان کی۔

تشریح: حدیث الباب پہلے مختصراً " باب ما ذکر فی ذھاب موسیٰ فی البحر الی الخضر " میں گزر چکی ہے۔ وہاں حدیث کا نمبر ۷۴ تھا اور اس کی تشریح پھر بحث ونظر جلد سوم انوارالباری ۹۲ تا ص ۱۰۵ میں ہوچکی ہے۔ جس میں مجمع البحرین کی تعین حضرت موسیٰ وخضر علیہما

السلام کے علوم کی جدا جدا نوعیت، حضرت خضر علیہما السلام کی نبوت، حیات وغیرہ مسائل بیان ہوئے تھے، یہاں حدیث میں ان تینوں باتوں کا ذکر بھی ہے، جن کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر نہ کر سکے تھے اور بالآخر حضرت خضرؑ کا ساتھ چھوڑنا پڑا تھا۔ اس کے بعد حدیث الباب کے اہم امور کی تشریح کی جاتی ہے۔

قولہ لیس موسیٰ بنی اسرائیل:

نوفا بکالی کو یہی مغالطہ تھا کہ حضرت خضرؑ کا تلمذ یا ان سے کم علم ہونا حضرت موسیٰ ایسے جلیل القدر پیغمبر کے لئے موزوں نہیں، اس لئے وہ موسیٰ ابن میشاء ہوں گے یعنی حضرت یوسف علیہم السلام کے پوتے، جو سب سے پہلے موسیٰ کے نام کے پیغمبر ہوئے ہیں، اہل توراۃ کا بھی یہی خیال تھا کہ وہی صاحب خضر ہیں، لیکن صحیح اور واقعی بات یہ ہے کہ صاحب خضر حضرت موسیٰ بن عمران ہی تھے۔ (عمدۃ القاری ص۶۰۲ ج۱)

کذب عدو اللہ کیوں کہا گیا؟

حافظ عینیؒ نے فرمایا کہ حضرت ابن عباسؓ نے یہ الفاظ نوفا کے متعلق غصہ کی حالت میں کہے اور الفاظ وغضب کا تعلق حقیقت و واقعہ سے کم ہوتا ہے، بلکہ مقصد زجر و تنبیہ ہوا کرتی ہے، گویا مبالغہ فی الانکار کی صورت تھی، علامہ ابن التین نے فرمایا۔ حضرت ابن عباسؓ کا مقصد نوفا بکالی کو ولایت خداوندی سے نکال کر اعداء اللہ کے زمرے میں داخل کرنا نہیں تھا، بلکہ علماء کے قلوب صافیہ چونکہ کسی خلاف حق بات کو برداشت نہیں کر سکتے، اس لئے بعض اوقات سخت الفاظ میں زجر و توبیخ کیا کرتے ہیں، لہٰذا ان کے الفاظ سے معنی حقیقی مراد نہیں ہوا کرتے۔ (عمدۃ القاری ص۶۰۲ ج۱)

اس سے قبل حافظ عینیؒ نے رجال سند حدیث الباب پر کلام کرتے ہوئے نوفا بکالی کے متعلق لکھا کہ وہ عالم، فاضل امام اہل دمشق تھے۔ ابن التین نے لکھا کہ حضرت علیؓ کے حاجب رہے ہیں اور وہ قاص بھی تھے، یعنی قصہ گو، واعظ یا خطیب (عمدۃ القاری ص۵۹۷)

فسئل ای الناس اعلم؟

سوال کے الفاظ مختلف مروی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ لوگوں میں سے سب سے زیادہ علم والا کون ہے؟ فرمایا کہ "انا اعلم" (میں سب سے زیادہ علم والا ہوں) ایک روایت میں ہے **هل تعلم احد اعلم منک**؟ کیا آپ کسی کو جانتے ہیں جو آپ سے زیادہ عالم ہو؟ فرمایا نہیں! مسلم شریف میں اس طرح پھر جواب ذکر ہے "مجھے معلوم نہیں کہ زمین پر مجھ سے بہتر اور زیادہ علم والا کوئی اور شخص ہے" اس روایت میں اس سوال کا ذکر نہیں ہے، حق تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ میں ہی زیادہ جانتا ہوں کہ خیر کس کے حصہ میں زیادہ ہے، زمین پر ایک شخص تم سے بھی زیادہ علم والا ہے۔

ابن بطال کی رائے

آپ نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کو بجائے جواب کے صرف اللہ اعلم کہہ دینا چاہیے تھا، اس لئے کہ ان کا علم ساری دنیا کے عالموں پر حاوی نہیں تھا، چنانچہ ملائکہ نے بھی "**سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا**" کہا تھا اور نبی کریم ﷺ سے روح کے بارے میں سوال کیا گیا تھا تو فرمایا تھا "میں نہیں جانتا تا آنکہ حق تعالیٰ سے سوال کر کے معلوم کروں" ابن بطال کی اس رائے پر بعض فضلاء نے اعتراض کیا ہے اور کہا کہ یہ تو امر متعین ہے کہ اللہ اعلم کہنا چاہیے تھا، مگر ترک جواب ضروری نہیں، اگر جواب میں **انا و اللہ اعلم** (میں سب سے زیادہ علم والا

ہوں اور اللہ کے علم میں زیادہ ہے) کہتے تب بھی درست تھا اور صرف اللہ اعلم کہتے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا، غرض دونوں حالتیں برابر تھیں۔ چنانچہ اس طرح تمام علماء و مفتیوں کا ادب کے ساتھ طریقہ ہے وہ جواب بھی سوال کا دیتے ہیں اور آخر میں واللہ اعلم بھی لکھ دیتے ہیں، اس لئے بظاہر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مواخذہ جواب پر نہیں ہوا، بلکہ ساتھ میں واللہ اعلم نہ کہنے پر ہوا ہے۔

علامہ مازری کی رائے

آپ نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اگرھل تعلم ؟ کے جواب میں فرمایا کہ نہیں۔ تو کوئی مواخذہ کی بات تھی ہی نہیں، آپ نے اپنے علم کے موافق ٹھیک جواب دیا، اورای الناس اعلم؟ والی روایت پر جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے علوم نبوت اور علم ظاہر شریعت پر بھروسہ کر کے صحیح جواب دیا کہ بڑے جلیل القدر پیغمبر تھے اور ہر پیغمبر اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم علوم شریعت کا ہوا کرتا ہے، لیکن حق تعالیٰ کو انہیں یہ بتلانا تھا کہ کچھ دوسرے علوم باطن نظر سے نہ آنے والے بھی ہیں اور ان کا علم بھی بعض انسانوں کو دیا گیا ہے، اس لئے علم کو صرف علم ظاہر پر منحصر سمجھنا یا نہ سمجھنا کہ دوسرے علوم واسرار غیب سے واقفیت رکھنے والا انسانوں میں سے کوئی نہیں ہے اس کی غلطی وخطا پر متنبہ کرنا تھا۔

حضرت شاہ صاحب کی رائے

آپ نے فرمایا کہ یہاں صورت لفظی مناقشہ کی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اکثر پیش آئی ہے، یعنی لفظی گرفت ہے کہ ایسی بات ان کی شان کے لائق نہ تھی "مقرباں رابیش بود حیرانی" بڑوں سے معمولی باتوں پر بھی باز پرس ہو جایا کرتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نہایت جلیل القدر پیغمبر تھے، کلام خداوندی سے سرفراز ہوئے اور حق تعالیٰ کی خصوصی تربیت و نگرانی میں پلے بڑھے تھے اور غیر معمولی شفقتوں سے نوازے گئے تھے، اتنے عظیم الشان مرتبہ پر فائز ہو کر لفظی گرفت ہو جانا کچھ مستبعد نہیں، ایسے حالات سے انبیاء کی خصوصی شان رفیع وعلو مرتبت و مقام کا یہ بھی اندازہ ہوتا ہے ناواقف لوگ اس قسم کی لغزشوں کو عصمت نبوت کے خلاف سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ بھی ان کی عظمت و عصمت اور انتہائی تقرب خداوندی کی دلیل ہے۔

ابتلاء و آزمائش پر نزول رحمت و برکت

پھر حق تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کو جو ابتلات اور لفظی مناقشات پیش آئے ہیں ان میں ظاہر ہے کہ کچھ دل شکستگی بھی وقتی طور پر ہوتی ہوگی، جس پر حق تعالیٰ کی طرف سے مزید نوازشات اور رحمت خاصہ یا عامہ کا نزول ہوا کرتا ہے، جیسے حضور اکرم ﷺ ایک مرتبہ سفر میں تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہار کھویا گیا، تلاش شروع ہوئی، نماز کا وقت تنگ ہونے لگا اور پانی قریب نہ تھا کہ وضو کرتے، تیمم کا حکم اس وقت نہیں آیا تھا، تمام صحابہؓ بھی پریشان تھے، اس وقت آیت تیمم نازل ہوئی، اور حضرت اسد بن حضیرؓ نے حاضر خدمت نبوی ہو کر عرض کیا "جزاک اللہ خیرا، واللہ! آپ ﷺ پر کبھی کوئی پریشانی کی بات نہیں آئی، مگر یہ کہ حق تعالیٰ نے اس سے آپ ﷺ کو ضرور نکال ہی لیا اور مسلمانوں کے لئے بھی اس کی وجہ سے خیر و برکت اتری (بخاری ومسلم وابوداؤد، نسائی)

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو عتاب واللہ اعلم نہ کہنے پر ہوا اس کی وجہ سے نہ صرف حضرت خضر علیہم السلام کی ملاقات میسر ہوئی بلکہ بہت سے کشوف کونیہ اور اسرار تکوین حاصل ہوئے، حتی کہ آنحضرت ﷺ نے ان پر بطور غبطہ فرمایا۔

''کاش حضرت موسیٰ علیہ السلام مزید صبر کر لیتے تو ہمیں اور بھی علوم واسرار معلوم ہو جاتے''

فعتب الله عز و جل علیه

حافظ عینیؒ نے لکھا کہ عتاب سے مراد ناپسندیدگی کا اظہار ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے تنبیہ اور دوسروں کے لئے تعلیم ہے کہ وہ ایسی بات نہ کریں جس سے اپنے نفوس کا تزکیہ اور خود پسندی ظاہر ہوتی ہو۔

هو اعلم منك

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے فرمایا یعنی بعض علوم کے لحاظ سے وہ تم سے زیادہ علم رکھتے ہیں

و كان لموسى و فتاه عجبا

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حضرت یوشع علیہم السلام کو تو اسی وقت تعجب ہوا تھا جب انہوں نے حق تعالیٰ کے عجائب قدرت دیکھے تھے، یعنی مچھلی کا زندہ ہو جانا دریا میں چلے جانا وغیرہ، کیونکہ وہ اس وقت بیدار تھے اور موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت تعجب ہوا جب یہ سارا قصہ سنا، مگر چونکہ وجوہ تعجب مشترک تھے، اس لئے اختصار کے لئے ایک ہی ساتھ دونوں کے تعجب کا ذکر کیا گیا ہے۔

لقد لقينا من سفرنا هذا نصبا تشریح و تکوین کا توافق وتخالف:

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہاں تشریعی وتکوین کا اتحاد ہو گیا ہے کہ ایک طرف چلتے رہنے کا حکم تشریعی ملا ہوا تھا اور دوسری طرف تکوینی فیصلہ تھا کہ ایک جگہ پہنچ کر تھک جائیں اور آگے چلنے کی ہمت نہ ہو اور ایسا ہوا کہ اسی تھکنے کی جگہ تشریعی حکم ختم ہو گیا یا کہا جائے کہ جس جگہ چلنے کا تشریعی حکم ختم ہوا اسی جگہ تھکن پیدا کر دی گئی، اسی طرح تشریع وتکوین مل گئی لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں مخالف ہو جاتے ہیں اور نجات اسی میں ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے تشریع کا اتباع کیا جائے، تکوین جو کچھ بھی ہو ہوا کرے اور اسی طرح اس واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسیان بھی تکوینی تھا لہٰذا اس امر میں بھی کوئی خلجان واستبعاد نہ ہونا چاہیے کہ بار بار نسیان کیوں ہوتا رہا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حضرت کے اس ارشاد سے حضرت یوشع علیہم السلام کے بارے میں بھی یہ خلجان واستبعاد ختم ہو جاتا ہے کہ ان کو پہلے سے ساری بات بتلا دی گئی تھی کہ جہاں مچھلی گم ہو گی وہیں تک جانا اور وہی مقصد سفر ہے اور انہوں نے بیداری میں ...... سب امور عجیبہ بھی ملاحظہ کئے، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیدار ہونے کے بعد بتلا نہ سکے۔ یہاں تک کہ وہاں سے آگے بھی دونوں چل پڑے اور کافی مسافت تک دن اور رات چلتے رہے یہاں تک کہ تھک کر چور ہو گئے۔

غرض تکوینی امور اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں تشریعی احکام اپنی جگہ اٹل ہیں ایک کو دوسرے سے رابطہ نہیں، البتہ حسب ارشاد حضرت شاہ صاحب ایسا ضرور ہوتا ہے کہ کبھی دونوں مل جاتے ہیں یعنی ایک ہی وقت ولمحہ میں دونوں کا توافق پیش آجاتا ہے اور جدا جدا بھی رہتے ہیں، مگر تشریع بہر حال تشریع ہے اور اسی کے ہم سب مکلف ہیں۔ واللہ اعلم

قَصَصاً: حضرت شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ فرمایا ''پیڑ دیکھتے ہوئے'' یعنی اس مقام سے پچھلے پاؤں اپنے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے لوٹے تا کہ راستہ غلط ہونے کی وجہ سے کہیں دوسری طرف نہ نکل جائیں۔

اذا رجل مسجی بثوب

ایک شخص کو دیکھا چادر لپیٹے ہوئے لیٹا ہے بعض تراجم بخاری میں اس کا ترجمہ ایک آدمی کپڑے اوڑھے ہوئے بیٹھا ہے) کیا گیا، وہ اس لئے غلط ہے کہ دوسری روایت میں یہ بھی تفصیل ہے کہ اس نے اس چادر یا کپڑے کی ایک طرف اپنے پیروں کے نیچے کر رکھی ہے اور دوسری سر کے نیچے، یہ صورت لیٹنے کی ہی ہوا کرتی ہے اور شارحین نے بھی اضطجاع لیٹنے کی حالت سمجھی اور لکھی ہے، حضرت شاہ صاحب نے بھی اسی کو اختیار فرمایا۔ واللہ اعلم۔

فقال الخضرو انی بارضک السلام ؟!

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اگرچہ یہاں جواب سلام کا ذکر نہیں مگر ظاہر یہی ہے کہ حسب دستور شرعی پہلے حضرت موسیٰ علیہم السلام کے سلام کا جواب[1] سلام سے دیا ہوگا، پھر بطور حیرت کے فرمایا ہوگا" اس سرزمین میں سلام کیسے آ گیا؟!

انت علی علم الخ

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ ہر ایک کے پاس خاص خاص علم تھا اور اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے آپ کو اعلم (سب سے زیادہ علم والا) کہنا اپنے مخصوص دائرہ علم کے لحاظ سے تھا، اور یہ اس کے بھی منافی نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے مخصوص علم کے سبب افضل ہوں۔

فجاء عصفور

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ بھی تکوین تھی، تا کہ یہ بات بطور ضرب المثل مشہور ہو اور اس سے حق تعالیٰ کے علم کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کا عقیدہ بھی معلوم ہوا کہ کیا تھا یعنی علم خداوندی کے برابر کسی کا علم نہیں ہوسکتا۔

الم اقل لک

فرمایا لک یہاں مزید تاکید کے لئے ہے، زمخشری نے لکھا کہ میں سفر میں تھا ایک بدوی سے پوچھا کہ یہی شغدف ہے؟ کہنے لگا جی ہاں، یہ شغداف ہے، جیسے اردو میں روٹی کو روٹ کہہ دیتے ہیں، پھر فرمایا کہ زمخشری قرآن مجید کے بہت سے مواضع میں بعض کلمات پر کہہ دیا کرتے ہیں کہ کلمہ مزید تصویر کے لئے ہے۔ جیسے عام محاورات میں بھی مزید تصویر کے لئے کہا کرتے ہیں۔ میں نے اپنے دونوں کانوں سے اس کو سنا، یا میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے یہ بات دیکھی یہ مزید تصویر ایسا سمجھو جیسے اردو میں کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس نے واقعہ اس طرح بیان کیا کہ اس کا فوٹو ہی اتار دیا، دیکھو عربی شاعر نے بھی فوٹو اتارا ہے۔

وعینان قال اللہ کونا فکانتا فعولان بالالباب ما تفعل الخمر

(محبوب کی دونوں آنکھوں کا کیا وصف کروں ایسا خیال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کوئی خصوصی حکم دیا کہ ایسے ہو جاؤ پس وہ لوگوں کی عقل و ہوش کو اس طرح کھونے لگیں، جس طرح شراب کیا کرتی ہیں)

---

[1] مسلم شریف کی روایت کے حوالہ سے حافظ نے لکھا کہ حضرت موسیٰ علیہم السلام نے السلام علیکم کہا تو حضرت خضر علیہ السلام نے چادر ہٹا کر منہ کھولا اور کہا وعلیکم السلام۔ (فتح الباری ص ۲۹۱ ج ۸)

فرمایا کہ کونا یہاں شعر کی جان ہے اور اس کی لطافت سے معقولیوں[۱] کا ادراک عاجز ہے وہ تو یہی کہیں گے کہ جب ساری چیزیں خدا کی تکوین سے ہوتی ہیں، تو آنکھوں کی تخصیص کی کیا ضرورت تھی؟!

لا تؤاخذنی بما نسیت : پہلا واقعہ کشتی توڑنے کا پیش آیا، دوسرا لڑکے کو مارنے ڈالنے کا اور تیسرا دیوار سیدھی کرنے کا، پہلی بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے وہ عہد یاد دلا دیا کہ کسی بات پر اعتراض نہ کریں گے اور کوئی سوال نہ کریں گے اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بھول ہوگئی معاف کی جائے۔

گنگوہیؒ نے فرمایا کہ بھول کی وجہ یہ تھی کہ منکر شرعی کو دیکھ کر صبر نہ کر سکے اور سارا دھیان اسی طرف متوجہ ہوگیا اور پھر ایسی ہی صورت دوسرے اعتراض کے موقع پر بھی آئی، پھر لوشئت والے اعتراض پر فرمایا کہ یہاں نسیان نہیں بلکہ عمد تھا اور طلب فراق کے لئے تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اندازہ کر چکے تھے کہ خضر علیہ السلام کے ساتھ رہنے میں کوئی خاص بڑا علمی و دینی فائدہ نہیں ہے بلکہ وہ شان نبوت کے خلاف ہے اس لئے کہ اس سے لوگوں کے خفیہ حالات معلوم ہوتے ہیں، جن کا عدم علم ہی بہتر ہے، دوسرے یہ کہ جو مقصد تھا یعنی حضرت خضر علیہ السلام کے علم کی نوعیت معلوم کرنا وہ بھی پورا ہو چکا تھا۔

حضرت گنگوہیؒ سے یہ ارشاد بھی نقل ہوا کہ پہلا نسیان محض تھا، دوسرا نسیان مع الشرط اور تیسرا عمد بقصد فراق کہ مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ (لامع ص ۶۴ ج ۱)

روایت البخاری باب التفسیر میں ہے کہ پہلا نسیان تھا، دوسرا شرط اور تیسرا عمد، حافظ نے لکھا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً یہ روایت بھی ہے کہ تیسرا فراق تھا۔

نسیان کے مطالب و معانی

نسیان کا لفظ لسان شرع میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوا ہے اسی لئے اس کی تھوڑی تنقیح کی جاتی ہے۔ کفار، مشرکین و فساق کے لئے جہاں کہیں اس کا استعمال ہوا ہے وہاں مراد مستقل طور سے بھول و اعراض کی شکل ہے۔ جیسے فرمایا۔

فلما نسوا ما ذکروا به (انعام) جن کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور شیطان کے فریب میں آ کر بری باتوں کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں اور خدا کی ہدایت کو بھلا دیتے ہیں تو ہم ان کو اور بھی دنیا کی محبتیں خوب دے کر ڈھیل دیتے ہیں پھر اچانک پکڑتے ہیں۔

فالیوم ننساھم: (اعراف) آج کے دن ہم انہیں بھلا دیں گے۔

نسوا الله فنسیهم (توبہ) (انہوں نے خدا کو بھلایا تو خدا نے بھی ان کو بھلا دیا۔)

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ (طہٰ) جو شخص دنیا میں خدا کی یاد سے اعراض کرے گا۔ اس کی معاشی زندگی تنگی اور ترشی سے گزرتی ہے یعنی دیکھنے سے اگرچہ بہت سے مال و دولت بھی اس کے پاس ہو مگر قناعت و توکل نہ ہونے کے باعث قلبی مسرت و اطمینان اس کو میسر نہ ہوگا) اور قیامت کے دن اس کو ہم اندھا کر کے اٹھائیں گے اور وہ کہے گا یا رب! میں تو دنیا میں سماکا تھا یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ حق

---

[۱] حضرت شاہ صاحب کا اشارہ شاید ایسے ہی معقولیوں کی طرف ہوگا جن کی تنقیدات عالیہ سے تنگ ہو کر کسی شاعر نے کہا تھا۔ شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد؟!

تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم نے دنیا میں ہماری آیات و ہدایات کو بھلا دیا تھا تو آج ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا۔ نظر انداز کر دیا۔

حتی نسواالذکر (فرقان) دنیوی عیش و عشرت میں پڑ کر ایسے بے خود ہوئے کہ خدا کی یاد کو بالکل ہی بھلا دیا۔ ۱

فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم ھذا انا نسینا کم (سجدہ) آج کا دن بھلا دینے کا عذاب چکھو ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا ہے۔

لھم عذاب شدید بما نسوا (صٓ) انہوں نے ہماری آیات و ہدایات کو بھلا دیا ہے نظر انداز کیا اس لیے آخرت میں ان کے لیے سخت عذاب ہوگا و **قیل الیوم ننسا کم** (جاثیہ) قیامت کے روز کہا جائے گا آج ہم تمہیں بھلا دیں گے

استحوذ علیھم الشیطان فانساھم ذکر اللہ (مجادلہ) ان لوگوں پر شیطان پوری طرح غالب و مسلط ہو چکا ہے اسی نے تو خدا کی یاد سے غافل کر دیا)

ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم (الحشر) اے مسلمانو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنھوں نے خدا کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنی فلاح و بہبود سے غافل کر دیا کہ دنیا کی چندروزہ راحت و عزت تو حاصل کی مگر آخرت کی ابدی دولت و راحت سے محروم ہو گئے۔

نسیان کی دوسری قسم

یہ تو بڑی اور مستقل بھول تھی دوسری بھول وہ ہے جو دنیائے دار النسیان میں خدا کے مقبول اور نیک بندوں کو بھی پیش آئی ہے وہ تھوڑی دیر کی ہوتی ہے جس کو بھول چوک ذہول یا عارضی غفلت سے تعبیر کر سکتے ہیں اور بعض اوقات یہ مغالطہ اور غلط فہمی کی شکل میں بھی ہوتی ہے جیسے ہم نے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں لکھا تھا کہ تحقیقی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نہی اکل شجرہ کو نہی تشریعی نہیں بلکہ نہی شفقت سمجھتے تھے اس لئے چوک گئے اور حق تعالیٰ نے فرمایا **فنسی ولم نجد لہ عزما**۔ ان سے چوک ہوگئی ہماری نافرمانی کی طرف جان بوجھ کر کوئی قدم نہیں اٹھایا نہ اس قسم کا کوئی عزم و ارادہ اصل پوزیشن تو یہی تھی مگر چونکہ ظاہری لحاظ سے خلاف ہدایت اقدام ضرور ہوا اس لیے عتاب ہوگیا اور گرفت بھی ہوئی تاکہ دوسروں کا حکم عدولی کے بہانے ہاتھ نہ آئیں۔ اور تاویلیں کر کے ظاہری احکام کو نہ بدلیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے مین بھی ایسا ہی بھول چوک کا نسیان ہے ورنہ ایک پیغمبر اولوالعزم کی شان سے بعید ہے کہ عہد و معاہدہ کر کے اس کو بھول جائے یا اس کے خلاف کرے۔ لیکن جیسا کہ شارحین حدیث نے اشارہ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام منکر شرعی کو دیکھ کر صبر نہ کر سکے اور خیال و دھیان اپنے عہد و معاہدہ کی طرف سے ہٹ گیا اسی لیے فرمایا کہ ایسی بھول چوک پر گرفت نہ کیجائے پھر دوبارہ بھی قتل غلام دیکھ کر بول اٹھے اور تیسری مرتبہ جان بوجھ کر اعتراض کیا کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام کا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور تینوں صورتوں میں امر حق و شرعی فیصلہ کو ظاہر کرنا بروقت ضروری سمجھا جس کی وجہ سے یوں بھی سوال و اعتراض کرنے کا اقرار ثانوی حیثیت میں ہو چکا تھا پھر اسی طرح حضرت یوشع علیہ السلام کی بھول بھی ہوئی کہ ان پر حق تعالیٰ سے آگے چلتے رہنے کا خیال ایسا مسلط و غالب رہا کہ مچھلی کا قصہ بتلانا بھول گئے قاعدہ ہے کہ زیادہ اہم معاملہ کے مقابلہ میں اس سے کم درجہ کی باتیں نظر انداز ہو جایا کرتیں ہیں دوسرے وہاں شیطان نے بھی اپنا کام کیا اور بھلانے کی سعی کی اسی لیے فرمایا **وما انسانیہ الا الشیطان ان اذکرہ** یہاں حضرت عثمانی قدس سرہ نے فوائد میں لکھا کہ: یعنی مطلب کی بات بھول جانا اور عین موقع یادداشت پر ذہول ہونا شیطان کی وسوسہ اندازی سے ہوا۔

سورۂ اعراف میں ہے **ان الذین اتقوا اذا مَسَّھُمْ طائف من الشیطان تذکروا فاذاھم مبصرون**۔

اہل تقویٰ کا شعار اور طریقہ ہے کہ جب شیطان کی طرف سے ان کے اعمال میں کوئی خلل اندازی وغیرہ ہوتی ہے تو جلد ہی متنبہ ہو کر پھر خدائی بصیرت کی طرف لوٹ جاتے ہیں غرض چونکہ نسیان اتقیاء اور نسیان اشراء میں فرق تھا اس کو واضح کرنا یہاں مناسب ہوا جس سے بہت سے شبہات وخلجان رفع ہو گئے۔ والحمد للہ اولا وآخر

حدیث الباب سے استنباط احکام

علامہ محقق حافظ عینی نے آخر میں عنوان "بیان استنباط الاحکام" کے تحت مندرجہ ذیل امور ذکر کئے ہیں جن کا ثبوت حدیث الباب سے ہوتا ہے۔

(۱) تحصیل علم کے لیے سفر مستحب ہے۔

(۲) سفر کے لیے توشہ (کھانے پینے کی اشیاء) ساتھ لینا جائز ہے۔

(۳) فضیلت طالب علم، عالم کے ساتھ ادب کا معاملہ کرنا، مشائخ و بزرگوں کا احترام کرنا۔ ان پر اعتراض نہ کرنا ان کے جو اقوال وافعال بظاہر سمجھ میں نہ آئیں ان کی تاویل کرنا ان کے ساتھ جو عہد کرلیا جائے اس کو پورا کرنا اور کوئی خلاف ہو تو اس کی معذرت پیش کرنا۔

(۴) ولایت صحیح ہے اور کرامات اولیاء بھی حق ہیں۔

(۵) وقت ضرورت کھانا مانگنا جائز ہے۔

(۶) اجرت پر کوئی چیز دینا جائز ہے۔

(۷) اگر مالک رضامند ہو تو کشتی یا اور کسی سواری کی اجرت دیئے بغیر سوار ہونا جائز ہے۔

(۸) جب تک کوئی خلاف بات معمول نہ ہو تو ظاہری پر حکم کیا جائے گا۔

(۹) کذب وجھوٹ یہ ہے کہ جان بوجھ کر یا سہواً کوئی بات خلاف واقعہ بیان کی جائے۔

(۱۰) دو برائیاں یا مفسدے باہم متعارض ہوں تو بڑی برائی کو دفع کرنے کے لیے کم درجہ کی برائی ونقصان کو برداشت کر لینا چاہیے جیسے خرق سفینہ کے ذریعہ غصب سفینہ کی مصیبت ٹالی گئی۔

(۱۱) ایک نہایت اہم اصولی بات یہ ثابت ہوئی ہے کہ تمام شرعی احکام کی تسلیم واطاعت واجب ہے خواہ کسی کی ظاہری حکمت ومصلحت بھی نہ معلوم ہو اور خواہ اس کو اکثر لوگ بھی نہ سمجھ سکیں۔ اور بعض شرعی امور تو ایسے بھی ہیں جن کو سب کما حقہ سمجھتے ہی نہیں۔ جیسے تقدیر کا مسئلہ یا جیسے قتل غلام یا خرق سفینہ، کہ دونوں کی ظاہری صورت منکر شرعی کی ہے حالانکہ نفس الامر و حقیقت میں وہ صحیح تھی اور ان کی حکمتیں بھی تھیں لیکن ان کو بغیر اطلاع خداوندی کون جان سکتا تھا اسی لیے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا **وما فعلته عن امری** (یہ سب کچھ میں نے اپنی طرف سے نہیں کیا یعنی حکم خداوندی تھا اور فلاں فلاں مصلحت ان کی اندر تھی۔

(۱۲) ابن بطال نے کہا کہ اس حدیث سے یہ اصل بھی معلوم ہوئی کہ جو احکام تعبدی ہیں یعنی شریعت سے جس جس طریقہ پر عبادات واحکام کی بجا آوری کا حکم ملا ہے وہ اگر عقول کے خلاف بھی ہوں تو وہ احکام ان عقول کے خلاف حجت

وبراہان ہیں۔ عقول ناس کا یہ منصب نہیں کہ ان کو امور تعبدی کے خلاف سمجھا جائے اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اگرچہ ابتداً اعتراض کرنے میں ظاہر شریعت کے لحاظ سے صواب پر تھے لیکن جب خضر علیہ السلام نے وجہ بتلادی کہ سب کچھ خدا ہی کے امر سے ہوا تو حضرت موسیٰؑ کا اعتراض وانکار خطا بن گیا اور حضرت خضر کے کام صواب بن گئے۔

اسی سے صاف طور سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دینی احکام اور سنن رسول اللہ ﷺ کی کوئی حکمت و مصلحت معلوم ہو یا نہ ہو انکا اتباع ضروری ہے اور اگر عقول ان کا ادراک نہ کریں تو ان ہی کی کوتاہی و تقصیر سمجھی جائیگی شریعت و دین کی نہیں۔

(۱۳) **وما فعلته عن امری** سے بتلایا کہ انہوں نے سب کچھ وحی الٰہی کے اتباع میں کیا تھا اس لیے کسی اور کو جائز نہیں کہ کسی لڑکے کو مثلاً اس لیے قتل کردے کہ آئندہ اس سے کفر و شرک صادر ہونے کا خطرہ محسوس ہو کیونکہ شریعت کا عام قاعدہ یہی ہے کہ حد اس وقت تک قائم نہیں کر سکتے جب تک کہ کسی سے حد قائم کرنے کا جرم سرزدنہ ہو جائے۔

(۱۴) معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے کہ ان پر وحی اترتی تھی۔

(۱۵) قاضی نے کہا اس سے معلوم ہوا کہ بعض مال کو باقی مال کی اصلاح کے لیے ضائع کرنا جائز ہے اور اس سے چوپاؤں کو خصی کرنا اور تمیز کے لیے کچھ کان کا کاٹنا بھی جائز ٹھہرا۔ (عمدۃ القاری ج ۱ص ۶۰۵)

حدیث الباب کے متعلق چند سوال و جواب

حافظ عینی نے آخر میں حسب عادت ایک عنوان "سوال و جواب" کا بھی قائم کیا جس سے اہم سوال و جواب نقل کیے جاتے ہیں۔

(۱) حضرت یوشع نے جو فرمایا کہ میں مچھلی کا ذکر بھول گیا۔ بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسی اہم بات کو بھول جائیں جو حصول مطلوب کی خاص نشانی تھی دوسرے وہیں دو خاص معجزے بھی دیکھے تھے پکی ہوئی مچھلی کا زندہ ہو جانا جس میں سے کچھ کھائی بھی گئی تھی جیسا کہ قول مشہور ہے اور جس جگہ پانی میں مچھلی گھسی تھی اس جگہ پانی کا کھڑا ہو جانا اور طاق کی صورت بن جانا۔

جواب یہ ہے کہ شیطان کے وسوسہ نے اس طرف سے خیال ہٹا دیا دوسرے یہ کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں رہتے رہتے بڑے بڑے معجزات دیکھ چکے تھے اور ان کو دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے اسلیے ان امور مذکورہ کی اہمیت خود ان کی نظر ان میں اس قدر نہ تھی جیسی ہم محسوس کرتے ہیں۔

(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام سے کہنا کہ میں تمہارے ساتھ رہ کر تمہارے علوم سے استفادہ چاہتا ہوں یہ بتلا رہا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے کسی دوسرے شخص سے علم میں کم تھے حالانکہ ہر زمانے کے نبی کا علم اس زمانہ کے لوگوں کے علم سے زیادہ ہوا کرتا ہے اور اسی کی طرف ہر دینی معاملہ میں رجوع کرنا ضروری ہوا کرتا ہے۔

اس کا جواب علامہ زمخشری نے یہ دیا کہ نبی اگر نبی ہی سے علم کا استفادہ کرے تو اس سے اس کے مرتبہ میں کوئی کمی نہیں آتی ہاں! کم درجہ کے آدمی سے کرے تو ضرور غیر موزوں ہے۔

اس پر کرمانیؒ نے کہا کہ یہ جواب جب ہی صحیح ہو سکتا ہے حضرت خضر کی نبوت تسلیم کر لی جائے حافظ عینی نے کہا کہ جمہور کی طرح زمخشری بھی ان کی نبوت ہی کے قائل ہیں اس لیے ان کا جواب اپنے نظریہ کے مطابق صحیح و مکمل ہے حافظ عینی نے مزید لکھا کہ حضرت خضر کی

نبوت تسلیم کرنا اس لیے بھی زیادہ اہم ہے کہ اہل زیغ وفساد مبتدعین کو اس غلط دعویٰ کا ثبوت بہم نہ پہنچ سکے کہ ولی نبی سے افضل ہوسکتا ہے نعوذ باللہ من ھذہ البدعۃ

حافظ ابن حجر پر تنقید

یہاں پہنچ کر حافظ عینی نے لکھا کہ بعض لوگوں نے جواب مذکور کو اس لیے محل نظر قرار دیا ہے اور اس سے مجیب کی واجب وضروری قرار دی ہوئی چیز کی نفی لازم آتی ہے حافظ عینی نے لکھا کہ یہ ملازمت مذکورہ ممنوع ہے اور اگر اس کی کوئی خاص وجہ بیان کی جاتی تو ہم اس کا جواب دیتے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ آگے حافظ ابن حجر نے خود ہی لکھا ہے کہ نبی کے اعلم اہل زمانہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مرسل الیہم کے لحاظ سے اعلم ہوتا ہے، اور موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر کی طرف مرسل نہیں ہوئے تھے، الہٰذا حضرت خضر کے ان سے اعلم ہونے میں کوئی نقص لازم نہیں آتا، جبکہ ہم ان کو نبی مرسل مان لیں، یا اعلم کسی امر مخصوص کے ساتھ کہیں گے، اگر صرف نبی یا ولی تسلیم کریں نیز کہا، حق یہ ہے کہ مراد اس اطلاق سے اعلمیت کو امر مخصوص کے ساتھ مقید کرنا ہے، جیسا کہ حضرت خضر نے بعد کو خود ہی فرمایا کہ ایک علم تمہارے پاس ہے جو میرے پاس نہیں، اور ایک میرے پاس ہے جو تمہارے پاس نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حافظ کا اعتراض ''نفی ما اوجب'' والا درست نہیں، کیونکہ وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نبی کا اعلم اہل زمانہ ہونا اس امر کے منافی نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے نبی سے علمی استفادہ کرے اور مجیب مذکور نے بھی تو یہی بات کہی تھی واللہ اعلم وعلم اتم واحکم۔

بَابُ مَنْ سَالَ وَهُوَ قَآئِمٌ عَالِمًا جَالِسًا

(کھڑے کھڑے کسی بیٹھے ہوئے عالم سے سوال کرنا)

(۱۲۳) حَدَّثَنَا عُثْمَانُ قَالَ ثَنَا جَرِيْرٌ عَنْ مَنْصُوْرٍ عَنْ اَبِىْ وَائِلٍ عَنْ اَبِىْ مُوْسىٰ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَاالْقِتَالُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنَّ اَحَدَنَا يُقَاتِلُ غَضَباً وَّ يُقَاتِلُ حَمِيَّةً فَرَفَعَ اِلَيْهِ رَأْسَهُ قَالَ وَمَا رَفَعَ اِلَيْهِ رَأْسَهُ اِلَّا اَنَّهُ كَانَ قَائِماً فَقَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ کی خاطر لڑائی کی کیا صورت ہے؟ کیونکہ ہم میں سے کوئی غصہ کی وجہ سے اور کوئی غیرت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے تو آپ ﷺ نے اس کی صرف سر اٹھایا، اور سر اسی لئے اٹھایا کہ پوچھنے والا کھڑا ہوا تھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا، جو اللہ کے کلمے کو سر بلند کرنے کے لئے لڑے، وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتا ہے۔

تشریح: یہ حدیث ''جوامع الکلم'' میں سے ہے، جو آنحضرت ﷺ کی فصاحت وبلاغت کلام اور معجز بیانی کا خصوصی وصف ہے، جس سے آپ ﷺ دوسرے انبیاءؑ کی نسبت ممتاز ہیں ''جوامع الکلم'' وہ مختصر جامع ارشادات نبوی ہیں، جو معنوی لحاظ سے بہت سے مطالب ومقاصد کو شامل ہوتے ہیں، جس طرح یہاں حضور ﷺ نے یہاں سائل کو جواب مرحمت فرمایا۔

اگر آپ ﷺ ہر ہر جزئی کی تفصیل فرماتے تو بات بہت لمبی ہوجاتی، کیونکہ بعض اوقات غضب اور حمیت بھی خدا کے لئے ہوسکتی

ہے،جس طرح اپنے نفس یا دوسری ذاتی اغراض کے لئے ہوسکتی ہے،اسی طرح بعض صحیح احادیث میں سائل کا سوال اس بارے میں بھی ہے کہ اگر جہاد وقتال مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے کرے یا اپنے ذکر وشہرت کے لئے کرے تو کیسا ہے؟ اور بعض اوقات صحیح مقصد اور غیر صحیح دونوں نیت میں شامل ہو جاتے ہیں،تو ان سب امور کے جواب میں حضور اکرم علیہ نے ایسی مختصر و جامع بات فرمادی کہ تمام سوالات کا جواب بھی ہو گیا،اور اصل بات بھی سامنے آ گئی کہ جس جہاد کا اصل مقصد اولی اعلاء کلمۃ اللہ ہو وہی عنداللہ جہاد ہے اور جس میں دوسرے مقاصد اولی درجہ میں ہوں،یا برابر درجہ کے ہوں تو وہ بھی جہاد نہیں ہے،البتہ ضمنی طور سے دوسرے فوائد ومنافع حاصل ہوں تو وہ جہاد ہوسکتا ہے جس کی تفصیل ''بحث ونظر میں آئے گی،ان شاءاللہ تعالیٰ۔

کلمۃ اللہ سے کیا مراد ہے؟

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ص۱۹ ج۶ میں لکھا ہے اس سے مراد دعوۃ الی الاسلام ہے۔کہ خدا کے دین اسلام کی دعوت سب دعوتوں سے اوپر ہو جائے،یعنی جس طرح سے دنیا کے دوسرے لوگ اپنی دینی ودنیوی دعوتوں کو کامیاب وسر بلند کرنے کی سعی کرتے ہیں،ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے دین حق کی دعوت کو زیادہ سے زیادہ کامیاب وسر بلند کرنے کی سعی کریں،نیز معلوم ہوا کہ جب مطلوب ومقصود اعلاء کلمۃ اللہ ہی ہے تو وہ جن دوسرے مستحسن طریقوں سے بھی حاصل کیا جائے گا،وہ بھی نہ صرف مستحسن وجائز بلکہ ضروری ہوں گے۔

مقصد ترجمہ: یہاں امام بخاری کا مقصد ترجمۃ الباب سے یہ ہے کہ اگر کوئی مجلس باقاعدہ تعلیم دین کے لئے نہ ہو،مثلاً حالت سفر وغیرہ میں،اور کسی سائل کو دینی مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت پیش آ جائے،تو وہ عالم کے پاس جا کر کھڑے کھڑے بھی سوال کرسکتا ہے،اس وقت یہ ضروری نہیں کہ عالم کی خدمت میں ادب کے ساتھ بیٹھ کر سوال پیش کرے،جیسا کہ عام طور پر چاہیئے،چنانچہ حضرت امام مالک سے منقول ہے کہ وہ ایک مجمع میں سے گزرے جہاں ایک شیخ درسِ حدیث دے رہے تھے،انھوں نے چاہا کہ شریک مجلس ہوں،مگر مجلس میں جگہ نہ تھی،اور کھڑے ہو کر حدیث سننے کو خلاف ادب حدیث سمجھا،اسی لئے وہاں سے آگے بڑھ گئے،اور یہی فرمایا کہ مجھے پسند نہ ہوا کہ حدیث رسول اللہ علیہ کو کھڑے ہو کر سنوں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے توجیہ مذکور ذکر فرما کر بتلایا کہ ایک صورت یہ بھی ممکن ہے،کہ امام بخاری کے پاس اس مضمون کی حدیث مذکور تھی،اس لئے چاہا کہ اس کو بغیر ترجمہ کے ذکر نہ کریں،اور مسئلہ مذکورہ اس سے استنباط کرلیں۔

بحث ونظر

حافظ ابن حجر نے اس حدیث پر کتاب الجہاد میں بہت اچھی بحث کی ہے،جو ہدیہ ناظرین ہے۔

فرمایا یہاں پانچ مراتب نکلتے ہیں

(۱) سب سے اعلیٰ اور مقصود ومطلوب تو یہ ہے کہ صرف اعلاء کلمۃ کی نیت سے جہاد کیا جائے۔دوسرا کوئی مقصد وغرض سامنے نہ ہو۔

(۲) باعث جہاد اور مقصد اوّلی تو اعلاء کلمۃ اللہ ہی ہو،پھر دوسرے منافع ضمناً حاصل ہو جائیں،یہ مرتبہ بھی مقبول عند الشرع ہے،محقق ابن ابی جمرہ نے کہا کہ: محققین کا مذہب یہی ہے کہ جب باعث اولیٰ قصد اعلاء کلمۃ اللہ ہو تو اس میں اگر بعد کو دوسری نیات بھی شامل ہو جائیں تو

کوئی حرج نہیں ہے، اور اس امر پر کہ غیر اعلائی مقاصد ضمناً آ جائیں تو وہ اعلاء کے خلاف نہیں ہوں گے، اگر مقصد اولیٰ اعلاء ہی ہو، حسب ذیل حدیث ابی داؤد بھی دلالت کرتی ہے، **باب فی الرجل یغزو و یلتمس الاجر والغنیمة**، اس شخص کا حال جو غزوہ میں جائے اور اجر و ثواب اخروی کے ساتھ مال غنیمت کا بھی طالب ہو، عبداللہ بن حوالہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایک جگہ کفار سے لڑنے کے لئے بھیجا تاکہ ہم مال غنیمت حاصل کریں، اور ہم نے پیدل سفر کیا، سواریاں پاس نہ تھیں پھر ہم بغیر مال غنیمت کے واپس ہوئے، اور حضور ﷺ نے ہمارے چہروں بشروں سے تعب و مشقت کا اندازہ فرما لیا تو خطبہ اور دعا کے لئے کھڑے ہو گئے، فرمایا: اے اللہ! ان لوگوں کا معاملہ میرے[1] سپرد نہ فرمایئے! کہ شاید میں بوجہ ضعف ان کی مدد نہ کرسکوں، اور نہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کہ اپنی مدد آپ کریں، ممکن ہے کہ وہ پریشان ہوں، اور اپنی اس تعب و نقصان تلافی نہ کرسکیں اور نہ ان کو دوسرے لوگوں کے حوالے کیجئے! کہ وہ اپنا فائدہ ان سے مقدم سمجھیں گے۔

پھر آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے سر پر رکھ کر فرمایا: اے ابن حوالہ! جب تم دیکھو کہ خلافت و ریاست عامہ ارض مقدس (شام) میں چلی جائے تو زلزلے، ہموم و حزان، بڑے بڑے مصایب و فتن آئیں گے، اور قیامت کے آثار اور نشانیاں اس وقت لوگوں سے اس سے بھی زیادہ قریب ہو جائیں گی، جتنا کہ میرا ہاتھ تمہارے سر سے قریب ہے۔

(۳) اعلاء کلمۃ اللہ اور دوسری کوئی غرض دنیوی دونوں نیت میں برابر درجہ کی ہوں، یہ مرتبہ نظر شارع میں ناپسندیدہ ہے جیسا کہ حدیث ابی داؤد و نسائی میں ابوامامہ سے باسناد جید مروی ہے کہ ایک شخص آیا، عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! جو شخص جہاد سے اجر اور ذکر و شہرت دونوں کا طالب ہو تو اس کو کیا ملے گا؟ فرمایا کچھ نہیں، سائل نے تین بار سوال کا اعادہ کیا اور آپ ﷺ نے تینوں مرتبہ یہی جواب دیا۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ صرف اسی عمل کو قبول فرماتے ہیں، جو ان کے لئے خاص نیت سے ہو، اور جس سے صرف ان ہی کی مرضی حاصل کرنا مقصود ہو تو اس لئے معلوم ہوا کہ جس نیک عمل کے لئے دو اچھی و بری نیات برابر درجہ کی ہوں، وہ عمل مقبول نہیں۔

(۴) نیت دنیوی مقصد کی ہو، اور ضمناً اعلاء کلمۃ اللہ کا مقصد بھی حاصل کیا جائے یہ بھی ممنوع ہے۔

(۵) نیت صرف دنیوی مقصد کی ہو اور اس کے ساتھ ضمناً و طبعاً بھی اعلاء کلمۃ اللہ کا مقصد نہ ہو یہ صورت سب سے زیادہ قبیح و ممنوع ہے، اور حدیث الباب میں اسی سے بظاہر سوال تھا، اور آپ ﷺ نے اسی کا جواب دیا، مگر ایسا جامع دیا جس سے تمام صورتوں کا حکم واضح ہو گیا۔

سلطان تیمور اور اسلامی جہاد

اس حدیث کے درس میں حضرت شاہ صاحب نے سلطان تیمور کا قصہ بیان فرمایا کہ اس نے ملک فتح کرنے کے بعد مقتولین جنگ

---

[1] اس وقت بظاہر بیت المال میں بھی اتنی گنجائش نہ ہوگی کہ آپ ﷺ ان کی مدد فرما دیتے، اور نہ وہ خود اس قابل رہے تھے کہ اپنے حالات کو درست کرسکیں کیونکہ جہاد میں نکلنا تن من دھن کی بازی لگانا ہوتا ہے، وہاں سے لوٹ کر بڑی مشکل سے معاشی و اقتصادی حالات کو سنبھالا جا سکتا ہے، دوسرے لوگوں کو ان کا معاملہ سپرد کر دیا جاتا کہ وہ ان کی مدد کریں تو یہ بھی اس وقت دشوار تھا کہ اکثر لوگ خود ہی ضرورت مند تھے، ان حالات میں آپ ﷺ نے ان کی خصوصی امداد و اعانت خداوندی کے لئے دعا فرمائی کہ وہ غیب سے ایسے حالات رونما فرما دیں، جس سے وہ سنبھل جائیں، تو یہ سب کچھ یعنی آپ ﷺ کا ان کے لئے ایسی توجہ و عنایت خاص خاص سے دعائیں کرنا اور شفقت فرمانا اس لئے تھا کہ باوجود نیت مال غنیمت کے بھی وہ اجر و ثواب اخروی و رضائے مولیٰ کریم کے مستحق بن چکے تھے، کیونکہ مال غنیمت کا حصول ان کی نیت میں ثانوی درجہ کا تھا، جو شرعاً ممنوع نہیں ہے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم۔

کی کھوپڑیاں جمع کرائیں، پھر ان پر اپنا تخت بچھوایا، پھر اس پر ظالمانہ مستبدانہ شان سے جلوس کیا، اور اس بارے میں علماء وقت سے سوال کیا کہ وہ اس کے ایسے ظلم وجور کو اسلامی جہاد قرار دے کر مدح وثنا کریں مگر ان میں سے ایک عالم اٹھا، اور یہی حدیث پڑھ کر سنائی کہ اسلامی جہاد تو صرف وہ ہے جس کا مقصد محض اعلاء کلمۃ اللہ ہو، تیمور سمجھ گیا کہ عالم مذکور نے حدیث بیان کر کے اپنی جان چھڑائی ہے اور اس سے کچھ تعرض نہیں کیا۔

صاحب بہجہ کے ارشادات

محقق ابن ابی جمرہ نے بہجۃ النفوس میں یہ بھی لکھا کہ اگر ابتداء میں جہاد کا ارادہ دوسرے اسباب ووجوہ کے تحت ہوا، مثلاً وہ امور جن کا ذکر سائل نے کیا ہے پھر نیت خالص اعلاء کلمۃ اللہ کی ہوگئی، تو وہ نیت بھی مقبول ہوگئی، کیونکہ کسی چیز کے ان بواعث واسباب کا اعتبار نہیں ہوتا جو مقصود و نتیجہ تک پہنچنے سے قبل ہی ختم ہو جائیں، پس حکم اور آخری فیصلہ سب کے بعد کے اور نئے ارادہ پر مبنی ہوا کرتا ہے، جب آخر میں صرف نیت جہاد کی صحیح رہ گئی، تو وہ عمل مقبول ہوگیا۔

نیز محقق موصوف نے دوامر اہم اور بھی حدیث الباب سے مستنبط کئے، ایک یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت علیہ السلام کی حرکت وسکون پر نظر رکھتے تھے، تاکہ کامل اتباع کریں اور انھوں نے جو یہ بیان کیا کہ حضور اقدس علیہ السلام نے سائل کی طرف سر مبارک اٹھا کر جواب دیا، کیونکہ وہ کھڑا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ جوارع کے تصرفات بھی بے ضرورت اور عبث نہیں ہونے چاہیے، دوسرے یہ کہ قتال کفار ان پر غیض وغضب غصہ وعناد اور تعصب وغیرہ امور نفسانی کے سبب سے نہیں ہونا چاہئے بلکہ خالص غرض ومقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہونا چاہیے۔ (بہجۃ النفوس ص ۱۴۹ ج ۱)

بَابُ السُّؤَالِ الْفُتْيَا عِنْدَ رَمْيِ الْجِمَارِ

رمی جمار کے وقت فتویٰ دریافت کرنا

(۱۲۴) حَدَّثَنَا اَبُونُعَيْمٍ قَالَ ثَنَاعَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ اَبِيْ سَلَمَةَ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عِيْسَى بْنِ طَلْحَةَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ الْجَمْرَةِ وَهُوَ يُسْاَلُ فَقَالَ رَجُلٌ يَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَحَرْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ فَقَالَ ارْمِ وَلَاحَرَجَ قَالَ اٰخَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَنْحَرَ قَالَ انْحَرْ وَلَا حَرَجَ فَمَا سُئِلَ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلَا اُخِّرَ اِلَّا قَالَ اِفْعَلْ وَلَا حَرَجَ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرو کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ علیہ السلام کو رمی جمار کے وقت دیکھا آپ علیہ السلام سے کچھ پوچھا جارہا تھا، تو ایک شخص نے عرض کیا، یارسول اللہ علیہ السلام میں نے رمی سے پہلے قربانی کرلی؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا (اب) رمی کرلو، کچھ حرج نہیں ہوا، دوسرے نے کہا، یارسول اللہ میں نے قربانی سے پہلے سر منڈا لیا؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا (اب) قربانی کرلو، کچھ حرج نہیں ہوا۔ (اس وقت) جس چیز کے بارے میں بھی جو آگے پیچھے ہوگئیں تھیں، آپ علیہ السلام سے پوچھا گیا، آپ علیہ السلام نے یہی جواب دیا کہ (اب) کرلو کچھ حرج نہیں ہوا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: ترمذی شریف کی حدیث میں ہے کہ سعی صفا ومروہ اور رمی جمار (جمرات پر کنکریاں مارنا) ذکر اللہ کا قائم کرنے کے لئے ہے۔ چونکہ بظاہر یہ دونوں فعل معنی کے ذکر سے خالی تھے، اس لئے ان کے بارے میں خصوصی توجہ فرما کر تنبیہ کی گئی کہ ان کو بھی ذکر میں داخل سمجھا جائے، وجہ یہ کہ دونوں افعال مقربین میں سے تھے، اسی لئے ان کو حج ایسی اعلیٰ

عبادت کا جزو بنا دیا گیا، اوران کے افعال کی نقل اور یادگاری صورت کو مستقل ذکر ہی کے برابر کر دیا گیا۔

مقصد ترجمہ: امام بخاریؒ کا مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ دونوں فعل عبادت بن گئے، تو ذکر کے درمیان سوال کرنا اس میں مخل ہوگا یا نہیں؟ تو بتلایا کہ فتویٰ لینا دینا مخل ذکر نہیں ہوگا، کیونکہ وہ بھی ذکر ہے یا ہوسکتا ہے امام بخاری کی نظر اس راویت پر ہو، جس میں ہے کہ قاضی کو غیر اطمینانی حالت میں قضا اور فیصلہ نہیں کرنا چاہیے اور یہ بھی ایک قسم کے ذکر میں مشغولیت کا وقت ہے اس حالت میں فتوی دے یا نہ دے؟ تو بتلایا کہ بیدار مغز، حاضر حواس ذہین آدمی کے لیے ایسا کرنا جائز ہے۔

پھر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے بعض محدثین کے تذکرے میں دیکھا ہے کہ ایک وقت میں بہت سے طلبہ کو درس دیتے تھے طلبہ قراءت کرتے تھے اور وہ محدث ہر ایک کو الگ جواب ایک ہی وقت میں دیتے تھے اور ہر ایک کے غلط وصواب پر بھی متنبہ رہتے تھے تو یہ ایسی بات ہے کہ جس میں لوگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔

ابن بطال نے کہا مقصد اس باب کا یہ ہے کہ علمی بات کسی عالم سے ایسے وقت بھی دریافت کر سکتے ہیں وہ جواب بھی دے سکتا ہے جبکہ وہ کسی طاعت خداوندی میں مشغول ہو کیونکہ وہ ایک طاعت کو چھوڑ کر دوسری طاعت میں مشغول ہو رہا ہے (عمدۃ القاری ج اص ۶۰۸)

حضرت اقدس مولانا گنگوہی نے یہاں یہ بھی فرمایا بشرطیکہ جس طاعت میں مشغول ہے کلام اس کے منافی نہ ہو جیسے نماز کہ اس وقت میں کلام ممنوع ہے اور اس کو فاسد کر دیتا ہے (اس لیے اس میں علمی ودینی مسئلہ بتانا جائز نہ ہوگا) (لامع ج اص ۶۴)

بحث ونظر

ایک اعتراض اور حافظ کا جواب حافظ نے (فتح الباری ج اص ۱۵۹) میں لکھا کہ یہاں کچھ لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ ترجمۃ الباب میں تو عند رمی الجمار ہے کہ سوال جواب کرنا رمی جمار کے وقت کیسا ہے؟ مگر یہ ترجمہ حدیث الباب کے مطابق نہیں کیونکہ حدیث میں اس امر کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے سوال رمیٔ جمار کے وقت کیا گیا بلکہ وہاں یہ ہے کہ آپ جمرہ کے پاس تھے اور لوگ سوال کر رہے تھے اسی حالت میں ایک شخص آیا اور اس نے ترتیب کے بارے میں سوال کر لیا بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے سوالات قبل یا بعد رمی کے جمرہ کے قریب ہو رہے تھے۔ حافظ نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا کہ امام بخاری کی عادت ہے بسا اوقات عموم الفاظ سے حدیث سے استدلال کیا کرتے ہیں پس جمرہ کے پاس سوال عام ہے کہ حالت اشتغال رمی میں ہوا ہو یا اس سے فراغت کے بعد ہوا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس طرح کے عموم سے ترجمۃ الباب کی مطابقت دل کو نہیں لگتی۔ خصوصاً جبکہ وہاں عام سوالات ہو رہے تھے اور لوگ آپ کے گرد جمع تھے اس سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ آپ سے سوالات خاص رمی کے وقت نہیں بلکہ بعد یا قبل ہوئے میں ہونگے اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ سب ہی لوگوں نے ایسے وقت سوالات شروع کر دیئے ہوں۔ جبکہ آپ رمی میں مشغول تھے پھر سوالات کا تعلق بھی ترتیب رمی ونحر وحلق سے تھا خاص رمی ہی کے بارے میں یا اس کی کسی کیفیت کا سوال نہ تھا کہ آپ کی رمی کا بھی انتظار نہ کیا جاتا۔ یعنی اگر رمی ہی کی کسی کیفیت کے بارے میں یہ سوال ہوتا تو یہ بھی متصور تھا کہ رمی کرنے والے اپنی رمی کو صحیح کرنے کے لیے بروقت ہی تصحیح کے لیے بے چین ومضطرب ہوں گے۔ اس لئے آپ کی رمی کے عین وقت ہی سوال کر دیا ہوگا۔

اس کے علاوہ احقر کی رائے ہے کہ امام بخاری حسب عادت جس رائے کو اختیار کرتے ہیں چونکہ بقول حضرت شاہ صاحب اسی کے مطابق حدیث لاتے ہیں اور دوسری جانب نظر انداز کر دیتے ہیں اس لیے ترتیب افعال حج کے سلسلہ میں چونکہ وہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے سے مخالف ہیں۔ اس لیے اپنے خیال کی تائید میں جگہ جگہ حدیث الباب افعل ولاحرج کو بھی لائے ہیں پھر تو اسی توغل میں یہ بھی ہوا ہوگا کہ زیادہ رعایت ومناسبت ترجمہ وحدیث کی بھی نظر انداز ہوگئی اور معمولی دور کی مناسبت یا تاویل وتوجیہ کافی سمجھی گئی غرض مقصد تو کتاب الایمان کی طرح بار باراس حدیث کو پیش کرنا ہے جو امام صاحب کے مسلک سے بظاہر غیر مطابق ہے والعلم عند اللہ العلی الحکیم۔

حلق قبل الذبح میں امام مالک امام شافعی امام احمد واسحٰق فرماتے ہیں کہ اس سے کوئی دم غیرہ حج کرنے والے پر لازم نہیں ہوتا امام ابو یوسف امام محمد بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ ہیں اور یہی حدیث الباب ان کی دلیل ہے امام اعظم اور شیخ ابراہیم نخعی وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس پر دم لازم ہوگا کیونکہ امام ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباسؓ ہی سے روایت کی ہے کہ افعال حج میں کوئی رمی مقدم یا موخر ہو جائے تو اس کے لیے خون بہائے امام طحاوی نے اس روایت کو ذکر کیا ہے اور حدیث الباب کا جواب یہ ہے کہ اس حرج منفی سے مراد گناہ ہے اس کی تلافی فدیہ ودم سے کرنے کی نفی نہیں ہے۔

دوسرا جواب امام طحاوی نے یہ دیا ہے کہ حضرت ابن عباس کا مقصد اباحت تقدیم وتاخیر نہ تھی۔ بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ حجۃ النبی ﷺ کے موقع پر جو کچھ لوگوں نے ناواقفیت کے سبب تقدیم وتاخیر کی اس میں ان کو معذور قرار دیا اور آئندہ کے لیے ان کو مناسک پوری طرح سیکھنے کا حکم فرمایا۔ حافظ عینی نے اس کو نقل کیا ہے ہمارے حضرت شاہ صاحب اسی جواب کو اور زیادہ مکمل صورت میں بیان فرمایا کرتے تھے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بات صرف خصائص حج میں سے ہے کہ کسی عذر سے ارتکاب ممنوع پر گناہ تو ہٹ جائے دم لازم رہے جیسے کفارہ ذی حج قران میں۔

لہٰذا ایجاب جزاء اور نفی حرج کے جمع ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے پھر فرماتے تھے کہ میرے نزدیک اس میں بھی بعد نہیں ہے کہ اس وقت جزاء بھی مرتفع ہوگئی ہو کیونکہ وہ شریعت کا ابتدائی دور تھا لوگ پورے دین سے واقف نہ ہونے میں معذور تھے لیکن اس کے بعد جب قانون شریعت مکمل ہو گیا اور سب کے لیے اس کا جاننا ضروری ہو گیا تو پھر اس سے ناواقفیت عذر نہیں بن سکتی۔

اس مسئلہ پر مکمل بحث اپنے موقع پر آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ یہاں صرف اتنی ہی بات لکھنی تھی جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے مسائل میں ہر ترجمہ وحدیث الباب میں پوری مناسبت ومطابقت تلاش کرنا اور اس کے لیے تکلف یارد کی راہ اختیار کرنا موزوں نہیں

آج اس قسم کے تشدد سے ہمارے غیر مقلد بھائی اور حرمین شریفین کے نجدی علماء، ائمہ حنفیہ کے خلاف محاذ بناتے ہیں اور حنفیہ کو چڑانے کے لیے امام بخاری کی یک طرفہ احادیث پیش کیا کرتے ہیں ۱۹۵۹ء کے حج کے موقع پر راقم الحروف نے کئی نجدی علماء کو دیکھا کہ حج کے مناسک بیان کرتے ہوئے بڑے شدومد سے اور بار بار روزانہ تکرار کے ساتھ اس حدیث الباب کے واقعہ افعل ولاحرج کو پیش کرتے تھے گویا یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کے پاس کوئی حدیث نہیں ہے حالانکہ خود امام بخاری کے استاذ حدیث ابن ابی شیبہ نے بھی وجوب دم کی روایت کی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے اور امام بخاری یا کسی اور محدث کا کسی حدیث کی روایت نہ کرنا اس کی وجود وصحت وقوت کسی امر کی بھی نفی نہیں کر سکتا اسلیے ہم نے ابن ابی شیبہ کے حالات میں لکھا تھا کہ گو انہوں نے امام صاحب پر چند مسائل میں اعتراض کیا ہے مگر مشہور مختلف فیہ مسائل میں سے کسی مسئلہ پر بھی اعتراض نہیں کیا بلکہ امام صاحب کی موافقت میں احادیث روایت کی ہیں جیسا کہ وجوب دم کی روایت کا ذکر اوپر ہوا ہے

اوراسی قسم کا انصاف واعتدال اگر بعد کے محدثین بھی اختیار کرتے تو نہ اختلافات بڑھتے نہ تعصبات تک نوبت پہنچتی واللہ المستعان

بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلاً

(اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تمہیں تھوڑا علم دیا گیا)

(۱۲۵) حَدَّثَنَا قَيْسُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ عَبْدُالْوَاحِدِ قَالَ ثَنَا الْاَعْمَشُ سُلَيْمَانُ بْنُ مِهْرَانَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ بَيْنَآ اَنَا اَمْشِيْ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خَرِبِ الْمَدِيْنَةِ وَهُوَ يَتَوَكَّأُ عَلٰى عَسِيْبٍ مَعَهٗ فَمَرَّ بِنَفَرٍ مِّنَ الْيَهُوْدِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ سَلُوْهُ عَنِ الرُّوْحِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا تَسْئَلُوْهُ لَا يَجِیٓ فِيْهِ بِشَيْءٍ تَكْرَهُوْنَهٗ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لَنَسْئَلَنَّهٗ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ يَآ اَبَا الْقَاسِمِ مَاالرُّوْحُ فَسَكَتَ فَقُلْتُ اِنَّهٗ يُوْحٰى اِلَيْهِ فَقُمْتُ فَلَمَّا نَجَلٰى عَنْهُ فَقَالَ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلاً قَالَ الْاَعْمَشُ هِيَ كَذَافِيْ قِرَاءَ تِنَا وَمَا اُوْتُوْا.

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ مدینہ منورہ کے کھنڈرات میں چل رہا تھا اور آپ کھجور کی چھڑی پر سہارا دے کر چل رہے تھے تو کچھ یہودیوں کا ادھر سے گزر ہوا ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا ان سے روح کے بارے میں کچھ پوچھو، ان میں سے کسی نے کہا مت پوچھو، ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی ایسی بات کہہ دیں جو تمہیں ناگوار ہو مگر ان میں سے بعض نے کہا کہ ہم ضرور پوچھیں گے۔ پھر ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا اے ابوالقاسم! روح کیا چیز ہے؟ آپ نے خاموشی اختیار فرمائی میں نے دل میں کہا کہ آپ پر وحی آرہی ہے اس لیے میں کھڑا ہو گیا جب آپ سے وہ کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے قرآن کا یہ ٹکڑا جو اس وقت نازل ہوا تھا ارشاد فرمایا۔ (اے نبی!) تم سے یہ لوگ روح کے بارے میں پوچھ رہے ہیں کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم سے پیدا ہوتی ہے اور تمہیں علم کی بہت تھوڑی مقدار دی گئی ہے (اس لیے تم روح کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے) اعمش کہتے ہیں کہ ہماری قراءت وما اوتو ہے وما اوتیتم نہیں۔

تشریح: روح کی حقیقت کے بارے میں یہودیوں نے جو سوال کیا تھا اس کا منشاء بظاہر یہ تھا کہ چونکہ تورات میں بھی روح کے متعلق یہی بیان کیا گیا کہ وہ خدا کی طرف سے ایک چیز ہے اس لیے وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ان کی تعلیم تورات کے مطابق ہے یا نہیں؟ یا یہ بھی فلسفیوں کی طرح روح کے سلسلہ میں ادھر ادھر کی باتیں کہتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ صحیح روایات[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ روح کے بارے میں سوال مکہ معظمہ میں بھی ہوا تھا اور حدیث الباب وغیرہ سے مدینہ منورہ کا سوال معلوم ہوتا ہے میرے رائے ہے کہ دونوں واقعات صحیح ہیں۔

---

[1] **آیت کا شان نزول:** حافظ ابن حجر نے باب التفسیر میں لکھا کہ یہاں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آیت یسئلونک عن الروح الایہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی اور ترمذی میں روایت حضرت ابن عباس ہے کہ قریش نے یہود سے کہا ہمیں کوئی بات بتلاؤ جس کے بارے میں اس شخص آنحضرت ﷺ سے سوال کریں۔ انہوں نے بتایا کہ روح کے بارے میں سوال کرو انہوں نے سوال کیا تو یہ آیت اتری اس حدیث کی سند میں رجال، رجال مسلم ہیں اور ابن اسحٰق کے پاس بھی دوسرے طریق سے حضرت ابن عباس سے اسی طرح مروی ہے پھر حافظ نے لکھا کہ دونوں روایات کو متعدد نزول مان کر جمع کر سکتے ہیں اور دوسری بار میں حضور ﷺ کا سکوت اس توقع پر ہوا ہوگا کہ شاید حق تعالیٰ کی طرف سے روح کے بارے میں مزید تفصیل و تشریح نازل ہو جائے اس کے بعد حافظ نے یہ بھی لکھا کہ اگر تعداد نزول کسی وجہ سے قابل تسلیم نہ ہو تو پھر صحیح کی روایت کو زیادہ صحیح قرار دینا چاہیے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۶۷۹)

روح سے کیا مراد ہے؟ حافظ عینی نے لکھا کہ اس کے متعلق ستر اقوال نقل ہوئے ہیں اور روح کے بارے میں حکماء وعلماء متقدمین میں بہت زیادہ اختلاف رہا ہے پھر علماء میں سے اکثر کی رائے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے روح کا علم صرف اپنے تک محدود رکھا ہے اور مخلوق کو نہیں بتلایا حتی کہ یہ بھی کہا گیا کہ نبی کریم علیہ بھی اس کے عالم نہیں تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حضور علیہ کا منصب ومرتبہ بلند وبرتر ہے اور حبیب اللہ ہیں اور ساری مخلوق کے سردار ہیں ان کو روح کا علم نہ دیا جانا کچھ مستبعد سا ہے۔

حق تعالیٰ نے ان پر انعامات واکرامات کا اظہار فرماتے ہوئے **وعلمک مالم تکن تعلم و کان فضل اللہ علیک عظیما** کے خطاب سے نوازا ہے۔ اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ آیت **قل الروح من امر ربی** میں کوئی دلیل اس امر کی نہیں ہے کہ روح کا علم کسی کو نہیں ہوسکتا اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم علیہ بھی اس کو نہیں جانتے تھے۔

روح جسم لطیف ہے؟

حافظ عینی نے یہ بھی تصریح کی کہ اکثر متکلمین اہل سنت کے نزدیک روح جسم لطیف ہے جو بدن میں سرایت کئے ہوئے ہوتا ہے جیسے گلاب کا پانی گلاب کی پتی میں سرایت کیے ہوئے ہوتا ہے۔

روح ونفس ایک ہیں یا دو؟

اس میں بھی اختلاف ہوا ہے کہ روح ونفس ایک ہی چیز ہے یا دو الگ الگ چیزیں؟ زیادہ صحیح یہ ہے کہ دونوں متغائر ہیں اور اکثر فلاسفہ نے دونوں میں فرق نہیں کیا وہ کہتے ہیں کہ نفس ایک جوہری بخاری جسم لطیف ہے جو قوت حس وحرکت ارادی وحیات کا باعث ہے اور اسی کو روح حیوانی بھی کہا جاتا ہے جو بدن اور قلب (نفس ناطقہ) کے درمیان واسطہ ہے دوسرے فلاسفہ اور امام غزالی کہتے ہیں کہ نفس مجرد ہے وہ جسم ہے نہ جسمانی اور امام غزالی نے کہا کہ روح جوھر محدث قائم بالذات غیر متحیز ہے نہ وہ جسم میں داخل ہے نہ اس سے خارج نہ جسم سے متصل ہے نہ اس سے جدا اس نظریہ پر اعتراضات بھی ہوئے ہیں جو اپنے موقع پر ذکر ہوئے ہیں۔ (عمدۃ القاری ج۱ص۶۱۲)

بحث ونظر

سوال کس روح سے تھا؟

اوپر معلوم ہوا کہ روح کے بارے میں ستر اقوال ہیں تو یہ امر بھی زیر بحث آیا ہے کہ سوال کس روح سے تھا؟ حافظ ابن قیم نے کتاب الروح ص ۱۵۴ میں لکھا کہ جس روح سے سوال کا ذکر آیت میں ہے وہ وہی روح ہے جس کا ذکر آیت **یوم یقوم الروح والملائکۃ صفاً لا یتکلمون** (سورۂ نباء) اور **تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم** (سورۂ قدر) میں ہے یعنی فرشتہ روح المقدس حضرت جبریل علیہ السلام) پھر لکھا کہ ارواح بنی آدم کو قرآن مجید میں صرف نفس کے نام سے پکارا گیا ہے البتہ حدیث میں ان کے لیے نفس اور روح دونوں کا اطلاق آیا ہے اس کے بعد حافظ ابن قیم نے یہ بھی لکھا ہے کہ روح کے من امر اللہ ہونے سے اس کا قدیم اور غیر مخلوق ہونا لازم نہیں آتا۔

حافظ ابن قیم کی رائے پر حافظ ابن حجر کی تنقید

حافظ ابن حجر نے حافظ ابن قیم کی رائے مذکور نقل کر کے لکھا ہے کہ ان کا روح کو بمعنی ملک راجح قرار دینا، اور بمعنی نفس وروح بنی آدم کو مرجوح

کہنا صحیح نہیں۔ کیونکہ طبری نے عوفی کے طریق سے حضرت ابن عباسؓ سے اسی قصہ میں روایت کی ہے کہ ان کا سوال روح انسانی کے بارے میں تھا کہ کس طرح اس روح کو عذاب دیا جائے گا۔ جو جسم میں ہے اور روح تو اللہ تعالیٰ کے طرف سے ہے اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

علم الروح و علم الساعة حضور علیہ السلام کو حاصل تھا یا نہیں؟

اس کے بعد حافظ نے یہ بھی لکھا کہ بعض علماء نے یہ بھی کہا کہ آیت میں اس امر کی کوئی دلیل نہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو بھی حقیقت روح پر بھی مطلع نہیں فرمایا بلکہ احتمال اس کا ہے کہ آپ کو مطلع فرما کر دوسروں کو مطلع نہ فرمانے کا حکم دیا ہو۔ اور علم قیامت کے بارے میں ان کا یہی قول ہے۔ واللہ اعلم۔

روح کے متعلق بحث نہ کی جائے؟

پھر حافظ نے لکھا کہ چنانچہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ روح کے متعلق بحث کرنے سے احتراز کیا جائے جیسے استاذ الطائفہ ابو القاسم عوارف المعارف میں (دوسروں کا کلام روح کے بارے میں نقل کرنے کے بعد ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ روح کے بارے میں سکوت کیا جائے اور آنحضرت علیہ السلام کے ادب کی تقلید کی جائے پھر حضرت جنید کا قول نقل کیا، روح کا علم خدا نے اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ اور مخلوق میں سے کسی کو اس پر مطلع نہیں فرمایا لہٰذا اس سے زیادہ کچھ کہنا مناسب نہیں کہ وہ ایک موجود ہے۔ یہی رائے ابن عطیہ اور ایک جماعت مفسرین کی بھی ہے۔

عالم امر و عالم خلق

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ من امر ربی سے مراد روح کا علم امر ہونا ہے جو عالم ملکوت ہے یعنی عالم خلق سے نہیں ہے جو عالم غیب وشہادت ہے۔

ابن مندہ نے اپنی کتاب الروح میں محمد بن نصر مروزی سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ روح کے مخلوق ہونے پر اجماع ہو چکا ہے اور اس کے قدیم ہونے کا قول صرف بعض غالی روافض وصوفیہ نے نقل کیا ہے۔

روح کو فنا ہے یا نہیں؟

پھر ایک اختلاف اس بارے میں ہے کہ بعث وقیامت سے پہلے فناء عالم کے وقت روح بھی فنا ہو جائے گی یا وہ باقی رہے گی دونوں قول ہیں۔ واللہ اعلم (فتح الباری ج ۸ ص ۲۸۱)

روح کے حدوث وقدم کی بحث

محقق آلوسی نے لکھا کہ: تمام مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ روح حادث ہے جس طرح دوسرے تمام اجزاء عالم حادث ہیں البتہ اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ روح کا وجود وحدوث بدن سے پہلے ہے یا بعد؟

ایک طائفہ اس کا حدوث بدن سے قبل مانتا ہے جن میں محمد بن نصر مروزی اور ابن حزم مظاہری وغیرہ ہیں اور ابن حزم نے حسب عادت اسی امر کو اجماع بھی قرار دیا ہے کہ وہ جس مسلک کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے لیے پوراز ور صرف کر دیتے ہیں مگر یہ اختراع ہے۔ حافظ

ابن قیم نے انکی مستدل حدیث کا جواب دیا ہے اور دوسری حدیث اپنی استدلال میں پیش کی ہے اور لکھا کہ خلق ارواح قبل الاجساد کا قول فاسد وخطاء صریح ہے اور قول صحیح جس پر شرع اور عقل دلیل ہے وہ یہی ہے کہ ارواح اجساد کے ساتھ پیدا ہوئیں ہیں جنین جس وقت چار ماہ کا ہو جاتا ہے تو فرشتہ اس میں نفخ کرتا ہے اسی نفخ سے جسم میں روح پیدا ہو جاتی ہے (روح المعانی ج ۱۵ ص ۱۵۷)

حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات

فرمایا روح کا اطلاق ملک پر بھی ہوا ہے اور مدبر بدن (روح جسدی پر بھی، حافظ ابن قیم نے دعویٰ کیا کہ آیت **ویسئلونک الخ** میں روح سے مراد ملک ہی ہے مگر میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ مدبر بدن مراد ہو کیونکہ سوال عام طور پر لوگ اسی کا کرتے ہیں اور روح بمعنی ملک کو صرف اہل علم جانتے ہیں لہٰذا آیت کو عام متعارف معنی پر ہی محمول کرنا چاہیے دوسرے یہ کہ مدبر بدن کے معنی میں روح کا استعمال احادیث میں ثابت ہے۔ چنانچہ حافظ نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ روح خدا کی طرف سے ہے اور وہ ایک مخلوق ہے خدا کی مخلوقات میں سے جس کی صورتیں بھی بنی آدم کی صورتوں کی طرح ہیں۔ (فتح الباری ص ۲۰۸ ج ۸)

حافظ نے حافظ ابن قیم پر اس بارے میں تنقید بھی کی ہے جس کا ذکر ہوا ہے اور فتح الباری ج اص ۱۵۹) میں بھی لکھا ہے کہ اکثر علماء کی رائے یہی ہے کہ سوال اسی روح کے بارے میں تھا جو حیوان میں ہوتی ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ سہیلی نے ''الروض الانف'' میں اس روایت کو موقوفاً ذکر کیا ہے اور اس کی مراد پوری طرح سہیلی کا کلام پڑھ کر واضح ہوئی کہ فرشتہ کی نسبت روح کی طرف ایسی ہے کہ جیسی بشر کی نسبت فرشتہ کی طرف ہے، جس طرح فرشتے ہمیں دیکھتے ہیں اور ہم انہیں نہیں دیکھتے اسی طرح روح ملائکہ کو دیکھتی ہیں اور فرشتے اس کو نہیں دیکھتے معلوم ہوا کہ روایت مذکورہ کا مقصد صرف یہی بتلانا نہیں ہے کہ ارواح خدا کی مخلوق ہیں یہ تو ظاہر بات تھی بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ ایک مستقل نوع مخلوقات ہے جس طرح ملائکہ وانسان۔ پھر فرمایا کہ روح ونفس کا فرق سب سے بہتر طریقہ پر سہیلی ہی نے لکھا ہے اس کو دیکھنا چاہیے اور ابن قیم نے جو کچھ لکھا ہے وہ مکاشفات صوفیہ پر مبنی ہے۔

عالم امر وعالم خالق کے بارے میں حضرت شاہ صاحب کا ارشاد

فرمایا ان دونوں کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے بعض کی رائے ہے مشہود عالم خلق ہے اور غائب عالم امر، پس ظاہر ہے کہ عالم شہادت والوں کے لیے حقائق عالم امر کا ادراک ممکن نہیں اسی لیے فرمایا تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے تم ان کو نہیں سمجھ سکتے۔

مفسرین نے کہا کہ خلق علام تکوین ہے اور امر عالم تشریع، اس صورت میں جواب کا حاصل یہ ہوا کہ روح خدائے تعالیٰ کے امر سے ہے اس کے امر سے وجود میں آئی۔ چونکہ تمہارا علم تھوڑا ہے اس لیے اس کی حقیقت اس سے زیادہ تم پر نہیں کھل سکتی۔ اس طرح گویا ان کو اس کے بارے میں زیادہ سوال اور کھود کرید میں پڑنے سے روک دیا گیا اور صرف اسی حد تک بحث اس میں جائز ہوگی جتنی قواعد شریعت سے گنجائش ہوگی۔

حضرت شیخ مجدد سرہندی قدس سرہ نے فرمایا کہ عرش الٰہی سے نیچے سب عالم خلق ہے اور اس کے اوپر عالم امر ہے حضرت شیخ اکبر کا قول ہے کہ حق تعالیٰ نے جتنی چیزوں کو کتم عدم سے لفظ کن سے پیدا کیا وہ عالم امر ہے اور جن کو دوسری چیزوں سے مثلاً انسان کو مٹی سے پیدا کیا وہ عالم خلق ہے۔

پھر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میرے نزدیک حق تعالیٰ نے یہود کے جواب میں روح کی صرف صورت وظاہر سے خبر دی ہے حقیقت ومادہ روح کی طرف کوئی تعرض نہیں کیا اور بظاہر اس کی حقیقت سے بجز حق تعالیٰ کے کوئی واقف نہیں۔ واللہ اعلم

حضرت علامہ عثمانی کی تفسیر

آپ نے قرآن مجید کی تفسیری فوائد میں روح کے بارے میں نہایت عمدہ بحث کی ہے جو دل نشین اور سہل الحصول بھی ہے نیز اپنے رسالہ ''الروح فی القرآن'' میں اچھی تفصیل سے کلام کیا ہے اس کا حسب ضرورت خلاصہ اور دوسری تحقیقات ہم بخاری شریف کی کتاب التفسیر میں ذکر کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حافظ ابن قیم کی کتاب الروح

آپ نے مذکورہ کتاب میں روح کے متعلق بہترین معتمد ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس کا مطالعہ اہل علم خصوصاً طلبہ حدیث وتفسیر کے لیے نہایت ضروری ہے یہ کتاب مصر سے کئی بار چھپ کر شائع ہو چکی ہے اس کے کچھ مضامین میں ہم بخاری شریف کی کتاب الجنائز میں ذکر کریں گے۔

عذاب قبر کے بارے میں بہت سی شکوک وشبہات قدیم وجدید پیش کیے جاتے ہیں ہمارے پاس کچھ خطوط بھی آئے ہیں کہ اس پر کچھ لکھا جائے مگر ہم یہاں اس طویل بحث کو چھیڑنے سے معذور ہیں کتاب الروح میں بھی اس پر بہت عمدہ بحث ہے علماء اس سے استفادہ وافادہ کریں

بَابُ مَنْ تَرَکَ بَعْضَ الْاِخْتِيَارِ مَخَافَةَ اَنْ يَّقْصُرَ فَهْمُ بَعْضِ النَّاسِ فَيَقَعُوْا فِيْ اَشَدَّ مِنْهُ

(بعض جائز واختیاری امور کو اس لیے ترک کر دینا کہ ناسمجھ لوگ کسی بڑی مضرت میں مبتلا نہ ہو جائیں)

(۱۲۶) حدثنا عبيد الله بن موسىٰ عن اسرائيل عن ابی اسحٰق عن الاسود قال قال لی ابن الزبير كانت عائشة تسر اليک كثيرا فما حدثتک فی الكعبة قلت قالت لی قال النبی صلی الله عليه وسلم يا عائشة لو لا ان قومک حديث عهدهم قال ابن الزبير بكفر لنقضت الكعبة فجعلت لها بابين بابا يدخل الناس وبابا يخرجون منه ففعله ابن الزبير.

ترجمہ: اسود بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے مجھ سے کہا کہ ام المومنین حضرت عائشہ تم سے بہت باتیں چھپا کر کہتیں تھیں تو کیا تم سے کعبہ بارے میں بھی کچھ بیان کیا میں نے کہ (ہاں) مجھ سے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ اگر تیری قوم دور جاہلیت کے ساتھ۔ قریب العہد نہ ہوتی بلکہ پرانی ہوگئی ہوتی ابن زبیر نے کہا یعنی کفر کے زمانہ سے قریب نہ ہوتی) تو میں کعبہ کو پھر سے تعمیر کرتا اور اس کے لیے دو دروازے بناتا ایک دراوازے سے لوگ داخل ہوتے اور ایک دروازے سے باہر نکلتے۔ تو بعد میں ابن زبیر نے یہ کام کیا۔

تشریح: قریش چونکہ قریبی زمانہ میں مسلمان ہوئے تھے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے احتیاطاً کعبہ کی نئی تعمیر کو ملتوی رکھا حضرت زبیر نے یہ حدیث سن کر کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی اور اس میں دو دروازے ایک شرقی اور ایک غربی نصب کئے لیکن حجاج نے پھر کعبہ کو توڑ کر اسی شکل پر قائم کر دیا جس پر عہد جاہلیت سے چلا آ رہا تھا اس باب کے تحت حدیث لانے کا منشا یہ ہے کہ ایک بڑی مصلحت کی خاطر کعبہ کا دوبارہ تعمیر کرنا رسول اللہ ﷺ نے ملتوی فرما دیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مستحب یا سنت پر عمل کرنے سے فتنہ وفساد پھیل جانے کا، یا اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچ جانے

کا اندیشہ ہوتو وہاں مصلحتاً اس سنت کو ترک کر سکتے ہیں لیکن اس کا فیصلہ بھی کوئی واقف شریعت متدین اور سمجھ دار عالم ہی کر سکتا ہے ہر شخص نہیں۔

بیت اللہ کی تعمیر اول حضرت آدم سے ہوئی:

کعبۃ اللہ کی سب سے پہلی بنا حضرت آدم کے ذریعہ ہوئی جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ کعبۃ اللہ کے پہلے بانی حضرت آدم علیہ السلام تھے ان کو حکم دیا گیا تھا کہ عرش الٰہی کے محاذ میں زمین پر بیت اللہ کی تعمیر کریں اور جس طرح انہوں نے ملائکہ اللہ کو عرش الٰہی کا طواف کرتے ہوئے دیکھا ہے اسی طرح خود اس کا طواف کریں۔ (البدایہ ج۱ص۹۲)

تعمیر اول میں فرشتے بھی شریک تھے

یہ سب سے پہلی تعمیر کعبہ ہے۔ جس کی جگہ حضرت جبریل علیہ السلام نے بحکم الٰہی متعین کی تھی اور یہ جگہ بہت نیچی تھی جس میں فرشتوں نے بڑے بڑے پتھر لا کر بھرے ان میں سے ہر پتھر اتنا بھاری تھا کہ اس کو تیس آدمی بھی نہ اٹھا سکتے تھے غرض حضرت آدم علیہ السلام نے اس جگہ بیت اللہ کی بنا کی اس میں نمازیں پڑھیں اور اس کے گرد طواف کیا اور اسی طرح ہوتا رہا حتی کہ طوفان نوح علیہ السلام کے وقت اس کو زمین سے آسمان پر اٹھالیا گیا (الجامع اللطیف فی فضل مکۃ واھلھا وبناء البیت الشریف۔ص۴۷)

بیت معمور کیا ہے: حضرت شاہ صاحب نے درس بخاری شریف میں یہاں فرمایا کہ "بیت اللہ کو طوفان نوح میں آسمان پر اٹھالیا گیا، اور وہ بیت المعمور ہوا، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے زمین پر بنایا اور اس وقت سے پھر نہیں اٹھایا گیا، اسی مکرر میں ترمیم وغیرہ ہوتی رہی اور موجودہ تعمیر حجاج کی ہے"

جامع لطیف میں بیت معمور پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ مشہور صحیح قول یہ ہے کہ وہ ساتویں آسمان پر ہے، کیونکہ یہ قول روایت صحیح مسلم کے موافق ہے، جس میں حضرت انس کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی، جس وقت وہ بیت معمور سے پیٹھ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، قاضی عیاضؒ نے شفاء میں لکھا کہ حضرت انسؓ سے جتنی احادیث اس بارے میں روایت کی گئی ہیں، یہ ثابت بنانی والی حدیث ان سب سے اصوب اوضح ہے۔

دوسری تعمیر ابراہیمی

جیسا کہ اوپر لکھا گیا بیت اللہ کی سب سے پہلی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی جس میں فرشتوں کی بھی شرکت ہوئی ہے، اس کے بعد دوسری بناء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی، اور وہ جگہ پہلے سے معروف مشہور تھی، ساری دنیا کے مظلوم و بے کس بے سہارے لوگ اسی مقام پر آ کر دعائیں کیا کرتے تھے، اور ہر ایک کی دعا قبول ہوتی تھی، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انبیاء علیہ السلام اس جگہ آ کر حج بھی کرتے تھے (الجامع ص۷۵)

تیسری تعمیر قریش

تیسری بناء قریش نے کی، کیونکہ کسی عورت کے دھونی دینے کے وقت غلاف کعبہ میں آگ لگ گئی تھی جس سے عمارت کو بھی نقصان پہنچا، پھر کئی سیلاب متواتر آئے، جن سے مزید کمزوری آئی، اس کے بعد ایک عظیم سیلاب ایسا آیا کہ دیواریں شق ہوگئیں اور بیت اللہ کو منہدم

کر کے پھر سے تعمیر کے بغیر چارہ نہ رہا۔ اسی میں نبی کریم ﷺ نے حجر اسود اپنے دست مبارک سے رکھا تھا۔

چوتھی تعمیر حضرت ابن زبیر

چوتھی بناء کعبۃ اللہ حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے کی۔ جبکہ یزید بن معاویہؒ کی طرف سے سردار لشکر حصین بن نمیر نے مکہ معظّمہ پر چڑھائی کر کے جبل ابوقبیس پر منجنیق نصب کر کے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب و رفقاء پر سنگباری کی، اس وقت بہت سے پتھر بیت اللہ شریف پر بھی پڑے تھے۔ جن سے عمارت کو نقصان پہنچا اور غلاف کعبہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، عمارت میں جو لکڑی لگی ہوئی تھی اس نے بھی آگ پکڑ لی، پتھر بھی ٹوٹ پھوٹ گئے غرض ان وجوہ سے کعبۃ اللہ کی تعمیر کرنی پڑی اور اسی وقت حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے حدیث الباب کی روشنی میں بناء ابراہیمی کے مطابق تعمیر کرائی اور درمیانی دیوار نکال کر حطیم کو بیت اللہ میں داخل کیا، اور دو دروازے کر دیئے اور پہلے دروازے کا ایک پٹ تھا، آپ نے اس کے دو پٹ کرا دیئے۔

پانچویں تعمیر و ترمیم

پانچویں بار بیت اللہ شریف کی تعمیر حجاج ثقفی نے کی، اس نے خلیفہ وقت عبدالملک بن مروان کو خط لکھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کعبہ میں زیادتی کر دی ہے جو اس میں داخل نہیں ہے اور اس میں ایک نیا دروازہ بھی کھول دیا ہے مجھے اجازت دی جائے کہ پہلی حالت پر کر دوں، خلیفہ نے جواب دیا کہ ہمیں ابن زبیر کی کسی برائی میں ملوث ہونے کی ضرورت نہیں، جو کچھ بیت اللہ کا طول زیادہ کرا دیا ہے اسی کو کم کرا دو، حجر (حطیم) کی طرف جو حصہ بڑھایا ہے، وہ اصل کے مطابق کرا دو، اور جو دروازہ مغرب کی طرف نیا کھولا ہے اس کو بند کرا دو، حجاج نے خط ملتے ہی نہایت سرعت کے ساتھ مندرجہ بالا ترمیم کرا دیں اور مشرقی صدر دروازے کی دہلیز بھی حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے نیچی کرا دی تھی اس کو بھی اونچا کرا دیا۔

اس کے بعد خلیفہ کو معلوم ہوا کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا تھا، وہ حضور اکرم ﷺ کے دلی منشا کے مطابق تھا اور حجاج نے مغالطہ دے کر مجھ سے ایسا حکم حاصل کیا تو بہت نادم ہوا اور حجاج کو لعنت و ملامت کی، غرض اس وقت جو کچھ بھی بناء کعبہ ہے وہ سب حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ ہی کی ہے، بجز ان ترمیمات کے جو حجاج نے کی ہیں۔

خلفاء عباسیہ اور بناء ابن زبیر

اس کے بعد خلفاء عباسیہ نے چاہا کہ اپنے دور میں بیت اللہ شریف کو پھر سے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی بناء پر کر دیں، تاکہ حدیث مذکور کے مطابق ہو جائے، مگر امام مالکؒ نے بڑی لجالت سے ان کو روک دیا کہ اس طرح کرنے سے بیت اللہ کی عظمت و ہیبت لوگوں کے دلوں سے نکل جائے گی اور وہ بادشاہوں کا تختۂ مشق بن جائے گا کہ ہر کوئی اس میں ترمیم کرے گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: اس سے معلوم ہوا کہ راجح کا علم ہوتے ہوئے بھی مرجوح پر عمل جائز ہے جبکہ اس میں کوئی شرعی مصلحت ہو، اور امام مالکؒ نے بھی مفاسد کے دفعیہ کو جلب مصالح و منافع پر مقدم کیا، نیز فرمایا کہ اختیار سے امام بخاریؒ کی مراد جائز امور ہیں جن کو اختیار کر سکتے ہیں۔ اور حضور ﷺ نے بناء بیت اللہ بناء ابراہیمی پر لوٹا دینے کے جائز و اختیاری امر کو مصلحۃ ترک فرما دیا، یہی محل ترجمہ ہے۔

بَابُ مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا دُوْنَ قَوْمٍ كَرَاهِيَةَ اَنْ لَّا يَفْهَمُوْا وَقَالَ عَلِيٌّ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَدِّثُوْا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ اَتُحِبُّوْنَ اَنْ يُّكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ.

ہر ایک کو اس کی عقل کے مطابق تعلیم دینا "علم کی باتیں کچھ لوگوں کو بتانا اور کچھ کو نہ بتانا اس خیال سے کہ ان کی سمجھ میں نہ آئیں گی" حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے "لوگوں سے وہ باتیں کرو جنہیں وہ پہچانتے ہوں، کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام کو جھٹلا دیں۔"

(۱۲۷) حَدَّثَنَا بِهٖ عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسٰى عَنْ مَّعْرُوْفٍ عَنْ اَبِي الطُّفَيْلِ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ بِذٰلِكَ

ترجمہ: ہم سے عبیداللہ بن موسیٰ نے بواسطہ معروف وابی الطفیل، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کو روایت کیا ہے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: امام بخاریؒ کا اس باب سے مقصد یہ بتلانا ہے کہ علم ایک اعلیٰ شریف امتیازی چیز ہے، اس کو خاص لوگوں کے ساتھ مخصوص کرنا چاہیے یا نہیں؟! گویا پہلے باب میں ذہین وذکی آدمی کو بلید وغبی سے ممتاز کیا تھا، اور یہاں شریف اور کمینہ میں فرق کرنا ہے، یہ بھی فرمایا کہ ہم نے سنا ہے، عالمگیرؒ نے تعلیم کو شرفاء اور خاندانی لوگوں کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا، صرف سواپارہ کی سب کے لئے عام اجازت تھی اور نماز کی صحت کے لئے۔

میرا خیال ہے کہ انہوں نے اچھا کیا تھا، تجربہ سے یہی ثابت ہوا کہ ادنیٰ لوگوں کو پڑھانے سے نقصان وضرر ہوتا ہے۔ حضرتؒ کا مطلب یہ ہے کہ فن شریف کے لئے طبائع شریفہ ہی زیادہ موزوں ہیں، کمینہ فطرت کے لوگ علم اور دین کو ذلیل کرتے ہیں، اور ان کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا، کیونکہ کمینگی فطرت کے ساتھ بے حسی بھی اکثر ہوتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صرف شرفاء اور خاندانی لوگوں کے لئے ہی علم کو مخصوص کر دیا جائے اور دوسرے لوگوں کو یکسر محروم کر دیا جائے، بلکہ حسب ضرورت زمانہ وحالات ان کو تعلیم بھی دی جائے، دوسرے یہ کہ ضروری نہیں کہ اچھے خاندان کے سب ہی لوگ شریف الطبع ہوں، ان میں بہت سے برعکس بھی نکلتے ہیں، اور بہت سے کم درجہ کے خاندانوں میں سے نہایت عمدہ صلاحیت وکردار اور اونچی شرافت وتہذیب کے نمونے مل جاتے ہیں۔

"یخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی" حق تعالیٰ کی بڑی شان ہے اور دنیا میں قاعدہ کلیہ کوئی نہیں ہے، ہم نے خود دیکھا ہے کہ ایک بظاہر کم درجہ خاندان کے شخص نے علم وفضل کے جواہر گرانمایہ سے اپنا دامن مراد بھر کر اپنے اعلیٰ اخلاق وکردار اور غیر معمولی فہم وبصیرت کا سکہ ہر موافق ومخالف سے منوایا، اور نہایت برگزیدہ سلف کے وہ خلف بھی دیکھے جو باوجود اپنی ظاہری علم وفضل ومشیخت کے، حب جاہ ومال میں بری طرح مبتلا اور اپنے کردار وعمل سے اپنے سلف اور علم ودین کو بدنام کرنے والے ہیں، حق تعالیٰ ہم سب کی اصلاح فرمائے۔ آمین۔

ترجمۃ الباب کے بعد امام بخاریؒ نے پہلے ایک اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر فرمایا کہ آپ ارشاد فرمایا کرتے تھے لوگوں کو علم نبوت پہنچاؤ، مگر سوچ سمجھ کر کہ کون کس بات کو سمجھ سکتا ہے ایسا نہ ہو کہ کوئی کم فہم تمہاری بات نہ سمجھنے کی وجہ سے خدا اور رسول کی باتوں کو جھٹلانے پر اتر آئے (اور اس سے اس کا دین برباد ہو)

بحث ونظر

یہاں امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب کے تحت بجائے حدیث نبوی کے پہلے ایک اثر صحابی لفظ حدثنا کے ساتھ ذکر کیا ہے اس کے بعد

آگے دو حدیثیں بھی ذکر کی ہیں، دوسری بات یہ کی کہ اثر پہلے ذکر کیا اور اس کی سند بعد کو لکھی، محقق حافظ عینیؒ نے لکھا کہ علامہ کرمانی نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں۔

(۱) اسناد حدیث اور اسناد اثر میں فرق کرنے کے لئے۔ (۲) متن اثر کو ترجمۃ الباب کے ذیل میں لینا تھا۔

(۳) معروف راوی اس سند میں ضعیف تھے، لہٰذا اس سند کو موخر کر کے ضعیف سند کی طرف اشارہ کیا ہے جیسے ابن خزیمہ کی عادت ہے کہ وہ جب سند قوی ہوتی ہے تو اس کو پہلے لاتے ہیں، ورنہ بعد کو لاتے ہیں، مگر یہ ان کی خاص عادت کہی جاتی ہے۔

(۴) بطور تفنن ایسا کیا اور دونوں امر کا بلا تفاوت جائز ہونا بتلایا، چنانچہ بعض نسخوں میں سند مقدم بھی ہے متن پر۔

علامہ کرمانیؒ کے چاروں جواب نقل کر کے حافظ عینی نے ایک جواب اپنی طرف سے لکھا کہ ہوسکتا ہے کہ امام بخاریؒ کو اسناد مذکور اثر کو معلقاً ذکر کرنے کے بعد ملی ہو، پھر لکھا کہ یہ جواب اور جوابوں سے زیادہ قریب تر معلوم ہوتا ہے، اس سے بعید تر کرمانی کا پہلا جواب ہے کیونکہ یہ جواب مطرد نہیں ہے کہ بخاری میں ہر جگہ چل سکے اور سب سے بعید تر آخری جواب ہے۔ **کمالا یخفی** (عمدۃ القاری ص ۶۱۷ ج ۱)

اس کے بعد یہاں ضروری اشارہ اس طرف کرنا ہے کہ مطبوعہ بخاری شریف ص ۲۴ میں حدثنا عبید اللہ پر حاشیہ عمدۃ القاری سے ناقص نقل ہوا ہے جس سے کرمانی کے مذکورہ بالا جوابات تو حافظ عینی کے سمجھے جائیں گے اور خود عینی کے رائے اور نقد مذکور کا حصہ وہاں ذکر ہی نہیں ہوا، معلوم نہیں کہ ایسی صورتیں کیوں پیش آئی ہیں۔ ضرورت ہے کہ آئندہ طباعت میں ایسے مقامات کی اصلاح کر دی جائے واللہ المستعان۔

علم کے لئے اہل کون ہے؟ علم کس کو دیا جائے، کس کو نہیں، اس کا فیصلہ ایک مشہور عربی شعر میں اس طرح کیا گیا ہے۔

ومن منح الجهال علما اضاعه ومن منع المستوجبين فقد ظلم

(جس نے جبلی جہالت پسند لوگوں کو علم عطا کیا، اس نے علم اور اس کی قدر و منزلت کو ضائع کیا، اور جس نے علم سے طبعی و فطری مناسبت رکھنے والوں کو علم سے محروم کیا اس نے بڑا ظلم کیا۔)

شیخ المحدثین ابن جماعہؒ نے اپنی مشہور کتاب "تذکرہ اسامع والمتکلم فی ادب العالم والمتعلم" میں لکھا کہ جس کے اندر فقر قناعت اور دنیا طلبی سے اعراض کے اوصاف نہ ہوں گے، وہ علم نبوت حاصل کرنے کا اہل نہیں، پھر ص ۵۱ میں ایک عنوان قائم کیا کہ نااہل کو علم کی دولت نہیں دینی چاہیے، اور اگر کوئی طالب بھی ہو تو صرف اس کی ذہن و فہم کی وسعت کے مطابق تعلیم دینی چاہیے، پھر اس سلسلہ میں چند اکابر کے اقوال نقل کئے۔

(۱) حضرت شعبہؒ سے نقل ہے کہ اعمش میرے پاس آئے اور دیکھا کہ میں کچھ لوگوں کو حدیث کا درس دے رہا ہوں، کہنے لگے کہ شعبہ! افسوس ہے کہ تم خنازیر کی گردنوں میں موتیوں کے ہار پہنا رہے ہو۔

(۲) روبہ ابن الحجاج کہتے ہیں، میں نسابہ بکری کی خدمت میں حاضر ہوا تو کہنے لگے، تم نے نادانی کی بات کی اور دانائی کی بھی، کیوں آئے ہو؟ میں نے کہا طلب علم کے لئے! فرمایا: میرا خیال ہے کہ تم اسی قوم سے ہو جن کے پڑوس میں میری رہائش ہے، ان کا حال یہ ہے کہ اگر میں خاموش رہوں تو خود سے کبھی کوئی علمی بات نہ پوچھیں گے اور اگر میں خود بتلاؤں یاد نہ رکھیں گے، میں نے عرض کیا امید ہے کہ میں ان جیسا نہ ہوں گا، پھر وہ کہنے لگا تم جانتے ہو کہ مروت و شرافت کی کیا آفت ہے؟ میں نے کہا نہیں، فرمایا کہ برے پڑوسی کہ اگر کسی کی کوئی بات اچھی دیکھیں تو اس کو دفن کر دیں کسی سے اس کا ذکر نہ کریں اور اگر برائی دیکھیں تو سب سے کہتے پھریں پھر فرمایا، اے روبہ! علم کے لئے

بھی آفت، قباحت اور برائی ہے، اس کی آفت تو نسیان ہے کہ اس کو محنت سے حاصل کیا اور یاد کر کے بھول گئے، اس کی قباحت یہ ہے کہ تم نے نااہل کو سکھایا کہ بری جگہ پہنچایا اور اس کی برائی یہ ہے کہ اس میں جھوٹ کو داخل کیا جائے۔

حضرت سفیان ثوری کا ارشاد

حصول علم کے لئے حسن نیت نہایت ضروری ہے، کہ خالص خدا کو خوش کرنے کی نیت سے علم حاصل کرے اور اس پر عمل کرنے کا عزم ہو، شریعت کا احیاء اور اپنے قلب کو منور کرنا اولین مقصد ہو، اور قرب خداوندی آخری منزل، حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ مجھے سب سے زیادہ مشقت اپنی نیت کو صحیح کرنے میں برداشت کرنی پڑی ہے کہ اغراض دنیویہ، تحصیل ریاست، وجاہ و مال اور ہمعصروں پر فوقیت، لوگوں سے تعظیم کرانے کی نیت ہرگز نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

(۱۲۸) حَدَّثَنَا اِسۡحٰقُ بۡنُ اِبۡرٰهِيۡمَ قَالَ اَنَا مَعَاذُ بۡنُ هِشَامٍ قَالَ حَدَّثَنِيۡ اَبِيۡ عَنۡ قِتَادَةَ قَالَ ثَنَا اَنَسُ بۡنُ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ وَمَعَاذٌ رَّدِيۡفُهٗ عَلَى الرَّحۡلِ قَالَ يَا مَعَاذُ بۡنُ جَبَلٍ قَالَ لَبَّيۡكَ يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ وَسَعۡدَيۡكَ قَالَ يَا مَعَاذُ بۡنُ جَبَلٍ قَالَ لَبَّيۡكَ يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ وَسَعۡدَيۡكَ ثَلٰثًا قَالَ مَا مِنۡ اَحَدٍ يَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوۡلُ اللّٰهِ صِدۡقًا مِنۡ قَلۡبِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ قَالَ يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُخۡبِرُ بِهِ النَّاسَ فَيَسۡتَبۡشِرُوۡنَ قَالَ اِذًا يَّتَّكِلُوۡا وَاَخۡبَرَ بِهَا مَعَاذٌ عِنۡدَ مَوۡتِهٖ تَاَثُّمًا.

(۱۲۹) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا مُعۡتَمِرٌ قَالَ سَمِعۡتُ اَبِيۡ قَالَ سَمِعۡتُ اَنَسًا قَالَ ذُكِرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِمُعَاذٍ مَّنۡ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشۡرِكُ بِهٖ شَيۡئًا دَخَلَ الۡجَنَّةَ قَالَ اَلَا اُبَشِّرُ بِهِ النَّاسَ قَالَ لَا اِنِّيۡ اَخَافُ اَنۡ يَّتَّكِلُوۡا.

ترجمہ: (۱۲۸) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت معاذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر سوار تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے معاذ! میں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دوبار) فرمایا اے معاذ! میں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے سہ بار فرمایا میں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ (اس کے بعد) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سچے دل سے اس بات کا اقرار کرلے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، اور محمد اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے، میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا اس بات سے لوگوں کو باخبر نہ کردوں تا کہ وہ خوش ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (جب تم یہ بات سناؤ گے) اس وقت لوگ اس پر بھروسہ کر بیٹھیں گے (اور عمل چھوڑ دیں گے) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے انتقال کے وقت یہ حدیث اس خیال سے بیان فرمادی کہ کہیں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپانے کا ان سے آخرت میں مواخذہ نہ ہو۔

ترجمہ (۱۲۹) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے بیان کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ سے فرمایا کہ جو شخص اللہ سے اس کیفیت کے ساتھ ملاقات کرے گا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو، وہ یقیناً جنت میں داخل ہوگا، معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا اس بات کی لوگوں کو خوشخبری نہ سنادوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، مجھے خوف ہے کہ لوگ اس پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔

تشریح: اصل چیز یقین واعتقاد ہے اگر وہ درست ہو جائے تو پھر اعمال کی کوتاہیاں اور کمزوریاں اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے، خواہ ان اعمال

بد کی سزا بھگت کر جنت میں داخل ہو یا پہلے ہی مرحلے میں اللہ تعالیٰ کی بخشش شامل حال ہو جائے۔

پہلی حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص بھی صدق دل سے توحید و رسالت کی شہادت دے گا، دوزخ کی آگ اس پر حرام ہو جائے گی، علامہ عینیؒ نے لکھا کہ اس میں صدق دل کی شہادت کی قید سے منافقانہ شہادت و اقرار نکل گیا۔ بعض حضرات نے کہا: جس طرح صدق سے مراد قول کی مطابقت مخبر عنہ اور واقعہ کے ساتھ ہوتی ہے اس طرح عملی طور پر عمدہ افعال و اعمال پر عمل کر کے دکھلا دینا بھی اس میں داخل ہے۔ قرآن مجید میں ہے: **والذی جاء باالصدق و صدق به** یعنی جو سچی بات لے کر آیا اور اپنے قول کی عمل سے بھی مطابقت کر کے دکھلا دی! حافظ عینی نے فرمایا کہ اس معنی کی تائید علامہ طیبیؒ کے قول سے بھی ہوتی ہے انہوں نے کہا "صدقا" یہاں قائم مقام استقامت کے ہے (اور ظاہر ہے کہ استقامت کا مطلب دین کو پوری طرح تھامنا ہے کہ تمام واجبات و سنن بجالائے اور تمام منکرات شرعیہ سے اجتناب کرے، **ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل علیهم الملائکه الآیه**. جو لوگ صرف خدا کو اپنا رب مان کر استقامت کے ساتھ اس پر ڈٹ گئے، ان پر جب دنیوی مصائب و پریشانیاں آتیں ہیں تو خدا کے فرشتے ان کے دلوں کی ڈھارس بندھاتے ہیں اور اخروی بشارتوں سے ان کو پوری مطمئن کرتے ہیں تو یہ بات ظاہر ہے کہ خدا کے نافرمان و فاسق و فاجر بندوں کو حاصل نہیں ہو سکتی) لہٰذا اس سے وہ شبہ بھی دفعہ ہو گیا کہ حدیث مذکورہ سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہادتیں والے مسلمان سب ہی دخول جہنم سے محفوظ رہیں گے، حالانکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک قطعی دلائل سے یہ امر ثابت شدہ ہے کہ فاسق و فاجر مسلمانوں کا بھی ایک گروہ عذاب جہنم کا مستحق ہوگا، پھر شفاعت اور حق تعالیٰ کی خصوصی رحمت کے صدقہ میں وہاں سے نکالے جائیں گے، علامہ طیبیؒ نے لکھا کہ چونکہ یہ بات یہاں حدیث میں واضح نہ تھی اسی لئے حضور علیہ السلام نے معاذؓ کو بشارت سنانے کی اجازت نہیں دی تھی۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے: چونکہ ساری شریعت اس کے احکام مقتضیات آنحضرت علیہ السلام کے سارے ارشادات آپ علیہ السلام کی آخری زندگی تک مکمل ہو کر سب صحابہ کرامؓ کے سامنے آچکے تھے، اسی لئے آپ علیہ السلام کے بعد حضرت معاذؓ نے اس حدیث مذکورہ کو روایت بھی کر دیا، کیونکہ اب کسی کے لئے یہ موقع نہیں رہا تھا کہ وہ شریعت کے کسی ایک پہلو کو سامنے رکھے اور دوسرے اطراف سے صرف نظر کرے اس لئے اگرچہ آخری روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت معاذؓ نے گناہ سے بچنے کیلئے حدیث مذکور کو بیان کر دیا، مگر زیادہ بہتر توجیہ وہ معلوم ہوتی ہے جو اوپر بیان کی گئی۔ واللہ اعلم۔

بحث و نظر

حافظ عینی نے لکھا کہ علاوہ سابق کے مذکورہ بالا شبہ کے اور بھی جوابات دیئے گئے ہیں مثلاً یہ کہ (۲) حدیث الباب میں مراد وہ لوگ ہیں جو شہادتیں کے ساتھ سب معاصی سے تائب ہوئے اور اسی پر مر گئے (۳) حدیث میں غالب و اکثری بات بیان ہوئی ہے کہ مومن کی شان یہی ہے کہ وہ طاعت پر مائل اور معاصی سے مجتنب ہوگا۔ (۴) تحریم نار سے مراد خلود نار ہے جو غیر موحدین کے لئے خاص ہے (۵) مراد یہ ہے کہ غیر موحدین کی طرح بدن کا سارا حصہ جہنم کی آگ میں نہیں جلے گا، چنانچہ ہر مومن کی زبان نار سے محفوظ رہے گی، جس نے کلمہ توحید ادا

کیا ہے یا عملی باتیں بیان کی ہیں اور مسلم کے مواضع سجود (اور اعضاء وضوء) بھی آگ میں جلنے سے محفوظ رہیں گے۔اور پہلے گزر چکا کہ جو بدقسمت لوگ اعمال خیر سے بالکل ہی خالی ہوں گے، ان کا سارا بدن دوزخ کی آگ میں[3] جھلس جائے گا، مگر جب سب سے آخر میں ان کو بھی حق تعالیٰ نکال کر نہر حیات میں غسل دلائیں گے، تو ان کے جسم بالکل صحیح سالم اصل حالت پر ہو کر جنت میں جائیں گے، اس لئے اس صورت سے وہ بھی نار کے مکمل اثرات سے تو محفوظ ہی رہے۔(۶) بعض نے کہا کہ یہ حدیث نزول[1] فرائض اور احکام امر و نہی سے پہلے کی ہے۔یہ قول حضرت سعید[2] بن المسیب اور ایک جماعت کا ہے۔ (عمدۃ القاری ص۶۲۰ ج۱)

(۷) حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: بعض حضرات نے جواب دیا کہ نار جہنم دو قسم کی ہیں، ایک کفار کے لئے دوسری گنہ گار مومنوں کیلئے۔ پھر فرمایا تقسیم نار والی بات اگر چہ فی نفسہ صحیح ہو اور صحیح احادیث میں مختلف انواع عذاب کا بھی ذکر بھی وارد ہوا ہے، مگر وہ زیر بحث حدیث کی شرح نہیں بن سکتی اور میرے نزدیک بہتر جواب یہ ہے کہ،(۸) طاعات کا التزام اور معاصی سے اجتناب، حدیث الباب میں بھی ملحوظ و مرعی ہے، اگر چہ عبارت و الفاظ میں اس کا ذکر نہیں ہے، کیونکہ پہلے شارع کی طرف سے ان سب کا ذکر تفصیل و تشریح کے ساتھ بار بار ہو چکا تھا، ایک ایک طاعت کی ترغیب دی جا چکی تھی، اور ایک ایک معصیت سے ڈرایا جا چکا تھا، پھر ان کو بار بار دہرانے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی، سلیم الفطرت اصحاب واقف ہو گئے تھے کہ کون سے اعمال نجات کا سبب اور کون سے اعمال ہلاکت و خسران آخرت کا موجب ہیں۔

اور یوں بھی متعارف و معروف طریقہ ہے کہ ایک بات جو پہلے سے معلوم و مسلم ہو، اس کا بار بار اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی

---

[1] حضرت شاہ صاحب نے بھی وقت درس اس جواب کو ذکر فرمایا تھا، اور یہ کہ ابتداء اسلام میں نجات کا مدار صرف توحید پر تھا، چنانچہ مسلم شریف "باب الرخصة فی التخلف عن الجماعة" میں حضور علیہ السلام کا ارشاد اس طرح ہے: اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ اس شخص پر حرام کر دی ہے جو لا الہ الا اللہ کہے، اور اس سے اس کا مقصد صرف خدا کی رضا ہو، پھر اس کے بعد کی روایت میں امام زہری کا یہ قول بھی مسلم میں ہے، اس کے بعد فرائض و احکام کا نزول ہوا جن پر شریعت کی بات مکمل و منتہی ہو گئی، پس جس سے ہو سکے کہ (پوری بات سے بے خبری و غفلت میں نہ رہے تو اس کو چاہیے کہ ایسا ہی کرے، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ بات کچھ بعید سی ہے، کیونکہ حضرت معاذ بن جبل انصاری ہیں اور مدینہ طیبہ زادہا اللہ شرفا میں ان لوگوں کی آمد تک کچھ بھی احکام نازل نہ ہوئے ہوں، یہ کس طرح ہوا ہوگا؟

[2] حافظ ابن حجر نے اس قول پر اعتراض کیا ہے کہ ایسی ہی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مسلم میں ہے، حالانکہ ان کی صحابیت اکثر فرائض کے نزول سے متاخر ہے، اور ایسے ہی حضرت ابو موسیٰ کی حدیث کو امام احمد نے بسند حسن روایت کیا ہے اور وہ بھی اسی حال میں مدینہ منورہ پہنچے ہیں جس میں حضرت ابو ہریرہؓ پہنچے ہیں، پھر اس حدیث کی روایت کو قبل نزول فرائض کیسے کہا جا سکتا ہے؟

اس پر حافظ عینی نے لکھا کہ حافظ ابن حجر کی اس نظر میں نظر ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں حضرات نے یہ روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ان کی قبل نزول فرائض کے زمانہ ہی کی روایت کردہ نقل کی ہوں۔(عمدۃ القاری ص۶۲۰ ج۱)

[3] مسلم شریف میں باب شفاعت و اخراج موحدین من النار میں ہے کہ جو لوگ پوری طرح مستحق نار ہی ہوں گے، وہ تو اس میں اس حال سے رہیں گے کہ نہ ان کے لئے زندگی ہوگی، نہ موت ہی ہوگی، لیکن تم (مسلمانوں) میں سے جو لوگ نار میں اپنے گناہوں کے سبب داخل ہوں گے ان پر حق تعالیٰ ایک قسم کی موت طاری کر دے گا، جب وہ جل کر کوئلہ بن جائیں گے تو ان کے بارے میں شفاعت کی اجازت مل جائے گی، پھر وہ جماعت جماعت بن کر نکلیں گے اور جنت کی نہروں پر پہنچیں گے۔ اہل جنت سے کہا جائیگا کہ تم بھی ان پر پانی وغیرہ ڈالو اس آب حیات سے غسل کر کے وہ لوگ نئی زندگی اور نشو و نما پائیں گے پھر بہت جلد قوت و طاقت حاصل کر کے اپنے اپنے جنت کے محلات میں چلے جائیں گے'

یہ سب تفصیل امام نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھنے کے بعد اپنی رائے لکھی کہ مومنوں کو جو موت وہاں ہوگی وہ حقیقی ہوگی، جس سے احساس ختم ہو جاتا ہے اور ان کو دوزخ میں ایک مدت تک بطور محبوس و قیدی کے رکھا جائے گا اور ہر شخص کو بقدر اس کے گناہوں کے عذاب ہوگا، پھر دوزخ سے مردہ کوئلہ جیسے ہو کر نکلیں گے، اس کے بعد امام نووی نے قاضی عیاض کی رائے نقل کی کہ ایک قول تو ان کا بھی یہی ہے کہ موت حقیقی ہوگی، دوسرا یہ کہ موت حقیقۃً نہ ہوگی بلکہ صرف تکالیف کا احساس ختم ہو جائے گا اور یہ بھی کہا کہ ممکن ہے ان کی تکالیف بہت ہلکے درجہ کی ہوں (شرح مسلم نووی ص۱۰۴ ج۱) معلوم ہوا کہ کفار و مومنین کے عذاب میں فرق ہوگا۔ واللہ اعلم

اس کا عدم ذکر بھی بمنزلہ ذکر ہی ہوا کرتا ہے، البتہ ایسے امور ضرور قابل ذکر ہوا کرتے ہیں، جن کی طرف انتقال ذہنی دشوار ہو، اس کے بعد یہ بات زیر بحث آتی ہے کہ تمام اجزاء دین میں سے صرف کلمہ کو ذکر کیا گیا؟۔

کلمہ طیبہ کی ذکری خصوصیت

وجہ یہ ہے کہ وہ دین کی اصل واساس اور مدار نجات ابدی ہے، اعمال کو بھی اگرچہ تحریم نار میں اخل ہے اوران سے لاپرواہی وصرف نظر ہرگز نہیں ہوسکتی، تاہم موثر حقیقی کا درجہ کلمہ ہی کو حاصل ہے، یااس طرح تعبیر زیادہ مناسب ہے کہ تحریم نار کا توقف تو مجموعہ ایمان واعمال پر ہے مگر زیادہ اہم جزو کا ذکر کیا گیا، جوکلمہ ہے جیسے درخت کی جڑ زیادہ اہم ہوتی ہے کہ بغیر اس کے درخت کی حیات نہیں ہوسکتی۔

ایک اصول وقاعدہ کلیہ

حضرت نے فرمایا: یہاں سے ایک عام قاعدہ سمجھ لو کہ جہاں جہاں بھی وعدہ ووعید آئی ہیں، ان کے ساتھ وجود شرائط اور رفع موانع کے ذکر کی طرف تعرض نہیں کیا گیا، وہ یقیناً نظر شارع میں ملحوظ ومرعی ہوتے ہیں، مگر ان کے واضح وظاہر ہونے کے سبب ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، اور بات اطلاق وعموم کے ساتھ پیش کردی جاتی ہے، عوام خواہ اس کو نہ سمجھیں مگر خواص کی نظر تمام اطراف وجوانب پر برابر رہتی ہے، اسی لئے وہ کسی مغالطہ میں نہیں پڑتے، اس کی بہت واضح مثال ایسی سمجھو جیسے طبیب ہر دواء کے افعال خواص سے واقف ہوتا ہے، اور اس کے طریق استعمال کو بھی خوب جانتا ہے کہ کس وقت کس مرض کس طریقہ سے میں اس کو استعمال کرایا جائے، علم طب سے جاہل وناواقف ایک ہی دواء کا ایک وقت میں کچھ اثر اور دوسرے وقت دوسرا اثر دیکھ کر طبیب[1] کو جھٹلائے گا۔ مگر وہ یہ نہیں سوچے گا کہ فرق جو کچھ پڑا وہ مریض کے غلط طریقہ پر استعمال کرنے، یا اس کے ساتھ پرہیز وغیرہ نہ کرنے سے ہوا کرتا ہے۔

فی نفسہ دوا کا اثر نہیں بدلا، اسی طرح حضرت شارع علیہ السلام نے ہر عمل کے اچھے برے اثرات، منافع ومضار بتائے ہیں، جو اپنی جگہ پر یقینی ہیں، لیکن وہاں بھی اثر کے لئے شرائط وموانع ہیں، مثلاً نماز کے لئے دینی ودنیوی فوائد بتائے گئے ہیں، مگر وہ جب ہی حاصل ہوں گے کہ اس کو پوری شرائط وآداب کے ساتھ ادا کیا جائے اور موانع اثر سب اٹھادیئے جائیں، ورنہ وہ میلے کپڑے کی طرح نمازی کے منہ پر مارنے کے لائق ہوگی، نہ اس سے کوئی دینی واخروی فائدہ ہوگا نہ دنیوی۔

حضرت شاہ صاحب کی طرف سے دوسرا جواب

شارع علیہ السلام نے اچھے برے اعمال کے افعال وخواص بطور ''تذکرہ'' بیان فرمائے ہیں، بطور قراباء دین کے نہیں۔ ''تذکرہ'' اطباء کی اصطلاح میں ان کتابوں کے لئے بولا جاتا ہے جن میں صرف مفرد ادویہ کے افعال وخواص ذکر ہوتے ہیں اور ''قراباد ین'' میں مرکبات کے افعال وخواص لکھے جاتے ہیں، ادویہ مرکبات ومعجونات وغیرہ کے اوزان مقرر کرنا نہایت ہی حذاقت علم طب ومہارت فن

---

[1] مشہور ہے کہ ایک شخص کو حبس بول کا عارضہ ہوا، بہت علاج کئے گئے مگر فائدہ نہ ہوا، آخر ایک طبیب حاذق کو بلایا گیا، اس نے خربوزہ کے بیج گھٹوا کر بطور ٹھنڈائی پلائے، عارضہ دفعہ ہوگیا، یہ موسم گرما تھا، یہی عارضہ اس شخص کو موسم سرما میں ہوا، گھر کے آدمیوں نے سوچا کہ حکیم کو بلانے کے مصارف کیوں کئے جائیں، وہی سابق نسخہ استعمال کیا اس سے تکلیف میں اور بھی اضافہ ہوگیا، مجبوراً پھر وہی طبیب بلائے گئے، انہوں نے بیج گھٹوائے اور اس کو نیم گرم کرا کے استعمال کرایا، مریض کو فوراً فائدہ ہوگیا یہی مثال احکام شرعیہ کی بھی ہے کہ ان کو شارع علیہ السلام کی پوری ہدایت وشرائط اور رفع موانع کے ساتھ ادا کرنے پر ہی فلاح موقوف ہے، دوسرے سب طریقے بے سود غلط اور مضر ہیں، اسی سے بدعت وسنت کا فرق بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

وحساب واقسام ضرب وتقسیم جزرو غیرہ کا محتاج ہے۔

مرکبات میں مختلف مزاجوں کی ادویہ، بارد، حار، رطب یابس اور بالخاصہ نفع دینے والی شامل ہوتی ہیں اور مجموعہ کا ایک مزاج الگ بنتا ہے، جس کے لحاظ سے مریض کے لئے اس کو تجویز کیا جاتا ہے، تو اس طرح ہم جو کچھ اعمال کررہے ہیں سب کے الگ الگ اثرات مرتب ہورہے ہیں اور آخرت میں جو دارالجزاء ہے ان سب کے مرکب کا ایک مزاج تیار ہوکر ہمارے نجات یا ہلاکت کا سبب بنے گا، بہت سی دواؤں میں تریاقی اثرات زیادہ ہوتے ہیں اور بہت سی میں سمیاتی اثرات زیادہ ہوتے ہیں، اسی طرح اعمال صالحہ کو تریاقی ادویہ کی طرح اور معاصی کو سمیاتی ادویہ کی طرح سمجھو، جس شخص کا ایمان اعمال صالحہ کے ذریعہ قوی و مستحکم ہوگا وہ کچھ بداعمالیوں کے برے اثرات بھی برداشت کرلے گا اور اس کی مجموعی روحانی و دینی صحت قائم رہے گی، جیسے قوی وتوانا مریض بہت سے چھوٹے چھوٹے امراض کے جھٹکے برداشت کرلیا کرتا ہے اور شائد یہی مطلب ہے اعمال صالحہ کے سیئات کے لئے کفارہ ہونے کا، کہ وہ اپنے بہتر تریاقی اثرات کے ذریعہ برے اعمال کے مضر اثرات کو مٹاتے رہتے ہیں، لیکن اگر ایمان کی قوت علم نبوت اور صحیح اعمال صالحہ کے ذریعہ مکمل کرنے کی سعی نہیں ہوئی ہے، تو اس کے لئے گناہوں کا بوجھ نا قابل برداشت ہوگا اور وہ اپنی روحانی و دینی صحت وقوت کو قائم نہ رکھ سکے گا، جس طرح کمزور جسم کے انسان اور ان کے ضعیف اعضاء بیماریوں کے حملے برداشت نہیں کرسکتے، مگر یہاں ہمیں دنیا میں کسی کو معلوم نہیں ہوسکتا کہ ہمارے اچھے برے اعمال کے مرکب معجون کا مزاج کیا تیار ہوا، اس میں تریاقیت، صحت وتوانائی کے اجزاء غالب رہے یا سمیت، مرض وضعف کے جراثیم غالب ہوئے، **یوم تبلی السرائر**، یعنی قیامت کے دن میں جب سب ڈھکی چھپی، اور انجانی اور بے دیکھی چیزیں بھی، چھوٹی اور بڑی سب مجسم ہوکر سامنے آجائیں گی، اور ہر شخص اس دن اپنے ذرہ ذرہ برابر اعمال کو بھی سامنے دیکھے گا اس دن ہماری معجون مرکب کا مزاج بھی معلوم ہوجائے گا اور داہنے بائیں ہاتھ میں اعمال نامے آنے سے بھی پاس وفیل کا نتیجہ اجمالی وتفصیلی طور سے معلوم ہوجائے گا، پھر اس سے بھی زیادہ حجت تمام کرنے کے لئے میزان حق میں ہر شخص کے ہر عمل کا صحیح وزن قائم کرکے اس میں رکھ دیا جائے گا، جتنے گرم مزاج کے اعمال ہوں گے وہ حاروی ادویہ کی طرح یکجا ہوں گے، جتنے بارد مزاج کے اعمال ہوں گے وہ بارد مزاج تریاقی ادویہ کی طرح یکجا کردیئے جائیں گے، اگر گرم مزاج اعمال کا وزن بڑھ گیا تو وہ گرم جگہ کیلئے موزوں ہوگیا، جہنم میں اس کا ٹھکانہ ہوا کیونکہ گرم جگہ اسی کو کہا گیا ہے "**فامه هاویه وما ادراک ماهیه نار حامیه**" ہمارے حضرت شاہؒ صاحب کفار کے لئے فرمایا کرتے تھے کہ وہ گرم جگہ میں جائیں گے اور اگر بارد مزاج اعمال کا وزن بڑھ گیا تو جہاں آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون واطمینان ملے گا وہاں پہنچ جائے گا۔"**فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین جزاء بما کانو یعملون**" اعمال صالحہ کا بالخاصہ اثر یہ بھی ہے کہ وہ ایمان واخلاص کی وجہ سے، بہت زیادہ وزن دار ہوجاتے ہیں، بخلاف اعمال قبیحہ یا اعمال صالحہ بے ایمان واخلاص کے کہ وہ کم وزن ہوتے ہیں اس لئے باعمل مومنین مخلصین کے اعمال کے پلڑے قیامت کے میزان میں زیادہ بھاری ہوں گے اور بے عمل یاریا کار عاملین کے پلڑے ہلکے ہوں گے اور اس طرح بھی بھاری وزن والوں کو جنت کا اور کم وزن والوں کو جہنم کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

غرض حضرت شاہؒ صاحب کے اس دوسرے جواب کا حاصل یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے بطور تذکرہ اطباء ہر عمل کے خواص بتلا دیئے مثلا حدیث الباب میں کلمہ توحید کا بالخاصہ اثر یہ بتلایا کہ اس کیوجہ سے دوزخ کی آگ بے شک وشبہ حرام ہوجائے گی مگر اس کے ساتھ معاصی بھی شامل ہوں گے تو ظاہر ہے کہ کلمہ مذکور کے مزاج ووصف خاص پر ان کا اثر بھی ضرور پڑے گا پھر وہ معاصی صرف اس درجہ تک رہے کہ کلمہ کے آثار

طیبہ ان کے مضر اثرات پر غالب آ گئے تب وہ کلمہ گنہگار مومن کو جنت میں ضرور پہنچا دے گا اگر خدا نہ کردہ برعکس صورت ہوئی تو دوسرا راستہ ہو گا۔ والعیاذ باللہ دنیا ضرورتیں پوری کرنے کی جگہ ہے اس سے زیادہ اس میں سر کھپانا بے سود ہے، اسی لئے سلیم الفطرت لوگوں کیلئے ہر عمل خیر کا وشر کا نفع وضرر بتلا دیا گیا اب ہر شخص کا اپنا کام ہے کہ وہ ہر وقت اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا رہے کہ شر ومعصیت کا غلبہ نہ ہونے پائے، برائیوں کا کفارہ حسنات وتوبہ استغفار وغیرہ سے اولین فرصت میں کیا جائے، واللہ الموفق لکل خیر۔

اعمال صالحہ وکفارہ سیئات

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہاں یہ بھی فرمایا کہ حدیث میں آتا ہے کہ نماز نماز تک کفارہ ہے، جمعہ جمعہ تک کفارہ ہے اور رمضان رمضان تک کفارہ ہے، وغیرہ، تو اس پر شراح محدثین نے بحث کی ہے کہ عام کے ہوتے ہوئے نیچے کے درجے کی کیا ضرورت ہے، مثلاً رمضان سے رمضان تک کا کفارہ ہو گیا۔ تو جمعہ سے جمعہ تک کی سیئات باقی کہاں رہیں۔ اس کا بھی میں یہی جواب دیتا ہوں کہ ان امور کا تجزیہ تو قیامت میں ہوگا، یہاں تو سب امور جمع ہوتے رہیں گے۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ بھی تو ہمیں معلوم نہیں کہ ہماری کون سی عبادت قبول ہو کر قابل کفارہ سیئات ہوتی ہے اور کون سی نہیں؟! اس کے علاوہ دوسرے شارحین کے جوابات اپنے موقع پر آئیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

من لقی اللہ الخ کا مطلب

یہاں حدیث میں بیان ہوا کہ جو شخص حق تعالیٰ کی جناب میں اس حالت میں حاضر ہونے کے لائق ہو سکا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شرک نہ کیا ہو تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا، دوسری احادیث میں آتا ہے کہ جس شخص کا وقت موت آخری کلام لا الہ الا اللہ ہوگا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا تو مقصد تو دونوں کا ایک ہی ہے کہ اس کا دل عقیدہ توحید سے منور اور عقیدہ شرک سے خالی ہو، مگر جہاں حدیث میں آخری کلمہ کا ذکر وارد ہے وہاں بھی اس سے مراد بطور عقیدہ اس کو کہنا نہیں ہے کہ اسی پر نجات موقوف ہو، البتہ اس کلمہ کا آخری کلام ہونا اور زبان پر جاری ہو جانا بھی ایسا نیک عمل اور مقدس وبابرکت نیکی ہے کہ ایسی کٹھن گھڑی میں اس کا اجر نجات ابدی کا سبب بن گیا، پس یہ اتنی بڑی فضیلت عقیدہ توحید کی نہیں بلکہ صرف زبان پر کلمہ توحید کے جاری ہونے کی بیان ہوئی ہے اسی لئے جس شخص کی زبان پر کلمہ کسی تکلیف و سختی موت کے سبب جاری نہ ہو سکے تو اس پر حکم کفر نہ کیا جائے گا، دوسرے یہ کہ آخرت کا مطلب ہے کہ اس کے بعد اس کی زبان سے کوئی اور بات دنیا کی نہ نکلے اگر ایک شخص کلمہ حق کہہ کر بے ہوش ہو گیا تو خواہ اس پر کتنا ہی وقت گزر جائے اور پھر وہ مر جائے تو اس کو بھی یہی اجر مذکور حاصل ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آداب تلقین میت: ہاں اگر وہ پھر ہوش میں آیا اور دوسری باتیں کیں تو آخری کلام پھر کلمہ توحید ہی ہونا چاہیے اور ان امور کی رعایت تلقین کرنے والوں کو کرنی چاہیے کہ اگر وہ ایک دفعہ کلمہ توحید کہہ لے اور پھر خاموش ہو جائے تو یہ بھی خاموش ہو جائیں کہ مرنے والے کا آخری کلام کلمہ توحید ہو چکا البتہ اگر وہ پھر کوئی دنیا کی بات کر لے تو تلقین کی جائے، یعنی اس کے سامنے کلمہ پڑھا جائے، تاکہ اسے بھی خیال آ جائے اور طرح ایک بار پھر وہ کلمہ پڑھ لے تو کافی ہے، تلقین کرنے والوں کو خاموشی کیساتھ اس کے لئے دعائے خیر اور ذکر اللہ وغیرہ کرنا چاہیے، اور اگر مرنے والا کسی وجہ سے کلمہ نہ کہہ سکے تو اس بات کو برا سمجھنا یا مایوس نہ ہونا چاہیے، جیسا کہ حضرت شاہؒ صاحب نے فرمایا کہ اس

وقت کلمہ پڑھنا اظہار[1] عقیدہ کے لئے ضروری نہیں ہے، **واللہ اعلم و علمہ اتم واحکم۔**

اللھم انا نسألک حسن الخاتمۃ بفضلک و منک یا ارحم الراحمین۔

قولہ علیہ السلام ''اذا یتنکلوا'' کا مطلب: حدیث ترمذی شریف میں '' **ذر الناس یعملون** '' وارد ہے یعنی ''لوگوں کو چھوڑ دو کہ وہ عمل میں کوشاں رہیں اس حدیث کی شرح جیسی راقم الحروف چاہتا تھا، عام شروح حدیث میں نہیں ملی، حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ کی مطبوعہ تقریر درس ترمذی و بخاری میں بھی کچھ نہیں ہے، شارح ترمذی علامہ مبارک پوریؒ نے بھی تحفۃ الاحوذی میں جملہ ذرالناس کی کچھ شرح نہیں کی، حافظ عینی و حافظ ابن حجر نے جو کچھ لکھا ہے اس کو نقل کر کے یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات نقل کریں گے، **واللہ الموفق والمیسرہ۔**

حافظ ابن حجر کے افادات: **یتنکلوا** جواب وجزا شرط محذوف ہے کہ اگر تم ان کو خبر پہنچاؤ گے تو وہ بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے دوسری روایت اصیلی وغیرہ کی **ینکلوا** (**بضم الکاف نکول سے**) کہ تم ان کو بشارت سنادو گے تو وہ عمل سے رک جائیں گے، روایت بزار بطریق ابوسعید خدریؓ میں مذکورہ قصہ اس طرح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذؓ کو بشارت دینے کی اجازت دی تھی، حضرت عمرؓ ان کو راستہ میں ملے اور کہا کہ جلدی مت کرو، پھر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض یا رسول اللہ! آپ ﷺ کی رائے

---

[1] حضرت شاہ صاحبؒ نے دوسرے وقت اس بارے میں یہ بھی فرمایا کہ کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' کلمہ ایمان بھی ہے اور کلمہ ذکر بھی کفر سے ایمان میں داخل ہونے کے وقت یہی کلمہ، کلمہ ایمان ہے اور مسلمان اس کو پڑھتا ہے تو اور اذکار کی طرح یہ بھی ذکر ہے اور حدیث میں ہے کہ افضل ذکر ہے۔ نیز فرمایا کہ کافر اور مشرک اگر مرنے کے وقت کلمہ پڑھے، تو نزع موت اور غرغرہ سے قبل معتبر ہے اس کے بعد جمہور امت کے نزدیک غیر معتبر ہے شیخ اکبر کی اس مسئلہ میں میرے نزدیک یہ رائے ہے کہ بحیثیت ایمان کے معتبر اور بحیثیت توبہ کے غیر معتبر ہے۔

یہ بھی فرمایا کہ جس حدیث میں بطاقہ لا الہ الا اللہ کو وزن کرنے کا ذکر ہے وہ بھی کلمہ ذکر ہی ہے۔ کلمہ ایمان نہیں ہے، کیونکہ ایمان کو کفر کے مقابلے میں وزن کرنا موزوں ہے، اعمال کے مقابلے میں نہیں اور شاید خدائے تعالیٰ کا اسم شریف اعمال کے پلڑے میں سے بھی وزن کے وقت نکال دیں گے، کیونکہ خدا کے نام مبارک کے ساتھ کوئی چیز وزن نہیں کی جاسکتی اور خدا کے ایک ہی نام کا وزن ساری دنیا و مافیہا سے بڑھ جائے گا۔ (ترمذی ص ۸۸ ج ۲ میں ہے **ولا یثقل مع اسم اللہ شئی** ایک گنہگار کیلئے بطاقہ کو وزن کریں گے، وہ بھی صرف اہل محشر کو دکھانے کے لئے کریں گے، اور ممکن ہے درجہ کہ اس نے وہ کلمہ لا الہ الا اللہ نہایت اس لئے اخلاص سے کہا ہو اس لئے یوں تو سب ہی اصل ایمان میں برابر ہیں مگر اس کلمہ طیبہ کو اپنے میں رنگ لینا و راس کو اپنا حال وقال بنالینا، اس بارے میں غیر متناہی مراتب نکلتے ہیں، یہ گویا کلمہ ایمان کا حق ادا کرنا ہے، جیسے نماز کا حق کوئی کم ادا کرتا ہے کوئی زیادہ اس میں بھی بہت سے مراتب نکلتے ہیں۔ حدیث ابوداؤد میں وارد ہے کہ ایک شخص نماز پڑھ کر نکلتا ہے مگر اس کے لئے اس کی نماز کا صرف دسواں حصہ ثواب کا یا نواں، آٹھواں، ساتواں، چھٹا، پانچواں، چوتھا اور تیسرا اور کسی کا آدھا اجر لکھا جاتا ہے، حضرتؒ نے فرمایا کہ کسی کو شاید کچھ بھی اجر نہ ملتا ہو، والعیاذ باللہ، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ بعض لوگ ایسی نماز پڑھتے ہیں کہ وہ میلے کپڑے کی طرح ان کے منہ پر مارنے کے لائق ہوتی ہے۔

غرض حضور موت کے وقت کلمہ لا الہ الا اللہ کی بہت بڑی فضیلت ہے، اگرچہ وہ ایمان کا کلمہ ہونے کی حیثیت سے اس وقت ضروی نہیں ہے اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ اگر اس وقت اس کی زبان سے کلمہ کفر بھی نکل جائے تو اس پر حکم کفر نہیں کریں گے کہ وہ وقت بڑی شدت وتکلیف کا ہوتا ہے اور انسان کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس کی زبان سے کیا کچھ نکل رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

بات کافی لمبی ہوگئی، مگر ہم ایسے مواقع میں حضرت شاہ صاحبؒ اور دوسرے محدثین و محققین کے منتشر کلمات یکجا کر کے اس لئے ذکر کر دیتے ہیں کہ درحقیقت یہی علوم نبوت کے نکھرے ہوئے موتی اور علمی و تحقیقی مسائل کی ارواح ہیں، حضرت علامہ عثمانی قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ تو بہت بڑی جان مار کر اور مطالعہ کتب میں سرکھپا کر صرف مسائل تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں، مگر حضرت شاہ صاحبؒ مسائل کی ارواح پر مطلع تھے، وہ علم بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ **رحمھم اللہ رحمۃ واسعۃ ونفعنا بعلومۃ الممتعۃ**

مبارک سب سے اعلیٰ وافضل ہیں لیکن لوگ جب اس کو سنیں گے تو اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ "اچھا ان کو لوٹاؤ" چنانچہ یہ بات حضرت عمرؓ کی موافقات میں سے بھی شمار کی گئی ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام کی موجودگی میں اجتہاد کرنا جائز تھا، پھر حافظؒ نے جملہ "عند موتہ" پر کلام کیا اور لکھا کہ اس سے مراد حضرت معاذ کی موت ہے یعنی انہوں نے اپنے مرنے کے وقت اس حدیث کو بیان کیا تاکہ اُن کو حدیث وعلوم نبوت چھپانے کا گناہ نہ ہو۔

پھر حافظ نے لکھا کہ کرمانیؒ نے عجیب بات کی کہ عند موتہ کی ضمیر کو آنحضرت علیہ السلام کی طرف بھی جائز قرار دیا، حالانکہ مسند احمد کی روایت سے اس کا رد ہوتا ہے جس میں حضرت معاذ ہی کا قول اپنے وقت وفات پر نقل ہے کہ میں نے اس حدیث کو اس ڈراب تک اس لئے بیان نہیں کیا تھا کہ لوگ بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔

نقد پر نقد اور حافظ عینی علیہ السلام کے ارشادات

حافظ ابن حجر کے نقد مذکور حافظ عینیؒ نے اس طرح نقد کیا کہ حدیث مذکور سے کرمانی کا رد نہیں ہوتا، کیونکہ ممکن ہے کہ حضرت معاذ نے آنحضرت علیہ السلام کی وفات پر بھی کچھ خاص لوگوں کو یہ حدیث سنا دی ہو، اور عام طور سے اپنی موت کے وقت سنائی ہو پھر ان دونوں میں کیا منافات ہے؟ پھر یہ کہ حضرت معاذؓ کا پہلے سے خبر نہ دینا بطور احتیاط تھا بوجہ حرمت نہ تھا کہ اس کو حرام سمجھتے ہوں، ورنہ پھر بعد کو خبر نہ دیتے اس کے علاوہ بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ یہی مقید تھی اتکال کے ساتھ، تو اگر آپ نے پہلے سے ایسے لوگوں کو خبر دیدی ہو جن سے اتکال کا ڈر نہیں تھا، تو اس میں کیا حرج ہے، اس سے یہ اعتراض بھی رفع ہوگیا کہ حضرت معاذؓ نے کتمان کے گناہ سے بچنے کا تو خیال کیا تھا، لیکن حضور علیہ السلام کی مخالفت سے بچنے کا ارادہ کیوں نہیں کیا کہ آپ نے بشارت سنانے سے روک دیا تھا۔

ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام کی ممانعت کا تعلق صرف عوام سے تھا، جو اسرار الٰہیہ کو سمجھنے سے عاجز ہیں خواص سے نہیں تھا اسی لئے خود آپ نے بھی صرف حضرت معاذؓ کو خبر دی جو اہل معرفت میں سے تھے اور ان سے اتکال کا ڈر نہیں تھا، پھر اسی طریقہ پر حضرت معاذ بھی چلے ہوں گے کہ خاص لوگوں کو خبر دی ہوگی اور شاید حضور کا حضرت معاذؓ کو بار بار ندا کرنا اور بتلانے میں توقف کرنا بھی اسی لئے تھا کہ بات اس وقت عام لوگوں میں کرنے کی نہ تھی۔

قاضی عیاض کی رائے: آپ نے کہا کہ حضرت معاذؓ نے حضور اکرم علیہ السلام کے فرمان سے ممانعت تو نہیں سمجھی تھی مگر اس سے ان کا عام طور سے اعلان وبشارت دینے کا ولولہ اور جذبہ ضرور سرد ہوگیا تھا۔

حافظ کا نقد اور عینی کا جواب: حافظ ابن حجرؒ نے قاضی صاحب موصوف کی اس رائے پر بھی تنقید کی ہے اور لکھا کہ اس سے بعد کی روایت میں صراحۃ نہی موجود ہے، پھر حضرت معاذ کی نہی نہ سمجھنے کی بات کیسے صحیح ہوسکتی ہے؟

اس پر محقق حافظ عینی نے لکھا کہ نہی کی صراحت تو دوسری روایت میں بھی قابل تسلیم نہیں کیونکہ حقیقتاً نہی کا مفہوم دونوں حدیثوں سے بطور دلالۃ النص فحوائے خطاب سے نکالا گیا ہے۔

حافظ عینیؒ نے آخر میں عنوان "استنباط احکام" کے تحت لکھا کہ اس حدیث میں "موحدین" کے لئے بشارت عظیمہ ہے اور دو آدمی ایک سواری پر سوار ہوسکتے ہیں، اس کا بھی جواز نکلتا ہے وغیرہ، (عمدۃ القاری ص۶۲۱ ج۱)

حضرت شاہ صاحب کے ارشادات

اوپر کے اقوال سے کچھ یہی بات نکلتی ہے کہ اتکال سے مراد عقائد وایمانیات پر بھروسہ کر کے اوران کونجات کے لئے کافی سمجھ کر کچھ عمل سے بے پرواہ ہوجانا ہے، جن میں فرائض وغیرہ بھی آجاتے ہیں مگر شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں اتکال عن الفرائض مراد لینا صحیح نہیں بلکہ اتکال عن الفضائل مراد ہے اس لئے کہ ترک واجبات فرائض وسنن موکدہ تو کسی کم سے کم درجہ کے مسلمان سے بھی متوقع نہیں چہ جائیکہ صحابہ کرام ﷺ سے اس کا ڈر ہوتا، پھر یہ کہ ترمذی شریف میں انہی معاذ بن جبل ﷺ سے (جو یہاں حدیث الباب کے روای ہیں) حدیث کی طویل روایت اس طرح ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھا ایک دن صبح کے وقت آپ ﷺ کے قریب تھا کہ چلتے ہوئے میں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ مجھے ایسا عمل بتائیے کہ جس سے میں جنت میں داخل ہوجاؤں اور دوزخ سے دور ہوجاؤں : فرمایا تم نے بڑی بات پوچھی ہے اور وہ اسی شخص پر آسان ہوتی ہے جس پر حق تعالیٰ آسان فرمادیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اور رمضان کے روزے رکھو، حج بیت اللہ کرو، پھر فرمایا کہ میں تمہارے سارے ہی ابواب خیر (خدا تک پہنچنے کے راستے) کیوں نہ بتلادوں؟ روزہ ڈھال ہے نار جہنم ومعاصی سے، صدقہ پانی کی طرح گناہوں کی آگ ٹھنڈی کردیتا ہے، اور آدھی رات کی نماز تہجد بھی ایسی ہی ہے، اس پر آپ ﷺ نے آیت کریمہ "**تتجا فی جنوبهم عن المضاجع یدعون ربهم خوفا و طمعا و مما رزقناهم ینفقون، فلا تعلم نفس ما اُخفِیَ لهم من قرۃ اعین جزاء بما کانو یعملون**" تلاوت فرمائی، پھر فرمایا کہ تمام نیکیوں کی جڑ بنیاد اسلام ہے، ستون نماز ہے اس کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھنے کے لئے جہاد کرنا ہوگا اور سارے دینی امور کو پوری طرح قوی ومستحکم بنانے کے لئے تمہیں اپنی زبان پر قابو حاصل کرنا ضروری ہوگا کہ کوئی ناحق اور غلط بات کہ کوئی فساد انگیز جملہ اور بے فائدہ گفتگو زبان پر نہ لاؤ گے، یعنی "**قل الخیر والا فاسکت**" (اچھی بھلی بات کہہ دو ورنہ چپ رہو) پر عمل کرنا ہوگا، حضرت معاذ ﷺ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! کیا ہماری باتوں پر بھی حق تعالیٰ کے یہاں مواخذہ ہوگا، فرمایا کہ لوگوں کو اوندھے منہ دوزخ میں ڈالنے والی یہی زبان کی کھیتیاں تو ہیں۔ جن کو وہ اپنی زبان کی تیز قینچیوں سے ہروقت بے سوچے سمجھے کاٹتے رہتے ہیں، یعنی زبان کے گناہوں سے بچنے کی تو نہایت سخت ضرورت ہے۔

(ترمذی شریف ص ۸۶ ج ۲ باب ماجاء فی حرمۃ الصلوٰۃ)

اس حدیث میں تمام اعمال واجبہ ومسنونہ مؤکدہ آچکے ہیں، پھر کیا رہا سوائے فضائل وفواضل کے؟ اس کے علاوہ حضرت معاذ ﷺ سے ہی دوسری حدیث بھی ترمذی میں ہے، معاذ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص رمضان کے روزے رکھے، نماز پڑھے، اور حج بیت اللہ کرے، یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ زکوٰۃ کا بھی ذکر کیا تھا کہ یا نہیں، اس کا حق ہے اللہ تعالیٰ پر کہ اس کی مغفرت فرماوے خواہ اس نے ہجرت بھی کی ہو یا اپنی مولد ومسکن ہی میں رہا ہو، معاذ نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو یہ خبر لوگوں تک پہنچا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا رہنے دو لوگوں کو، عمل کریں گے، کیونکہ جنّت میں سو درجے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ جتنا زمین وآسمان کے درمیان ہے، اور فردوس سب سے اعلیٰ وافضل جنت ہے اس کے اوپر عرش رحمان ہے، فردوس ہی سے چار نہریں جنتوں کی طرف بہہ کر آئیں گی (ان میں سے ایک نہر صاف شفاف عمدہ پانی کی، دوسری دودھ کی، تیسری شہد کی، اور چوتھی میں بہترین عمدہ پھلوں[۱] کے رس چلتے ہوں گے)

---

[۱] یہ نہر خمر شراب کی ہے، مگر چونکہ جنت کی شراب میں دنیوی شراب کی خرابیاں نہ ہوں گی، مثلاً سرگرانی، نشہ وغیرہ اور نہ اس سے قے آئے گی، نہ پھیپڑے وغیرہ خراب ہوں گے اس لئے دونوں کا نام ایک ہی اچھا نہ معلوم ہوا، اور اس کی تعبیر پھلوں کے رس سے کی گئی، جن میں تازگی، خوش مزگی تفریح وتقویت وغیرہ اوصاف بدرجہ اتم ہوں گے واللہ اعلم

پس جب بھی تم خدا سے سوال کرو تو فردوس ہی کا سوال کیا کرو، (ترمذی شریف ص ۷۶ ج ۲ باب ماجاء فی صفۃ درجات الجنۃ) اس حدیث میں بھی فرائض کا ذکر ہے اور درجہ علیا حاصل کرنے کی ترغیب بھی ہے۔

لہٰذا یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ حدیث مجمل میں بھی اتکال عن الفرائض ہرگز مراد نہیں ہے حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا مذکورہ دوسری حدیث ترمذی کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ بعینہ زیر بحث بخاری شریف والی ہی روایت ہے، اور پہلی میں مجھے شک ہے، اور مشکوٰۃ شریف میں مسند احمد سے ایک اور بھی روایت ہے جس میں احکام مذکور ہیں، اس کے بارے میں بھی مجھے یقین ہے کہ وہ یہی حدیث ہے، پھر فرمایا یہ خصوصی ذوق سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک حدیث ہے یا دو، وغیرہ۔

فضائل و مستحبات کی طرف سے لاپرواہی کیوں ہوتی ہے؟

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ انسان کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ تحصیل منفعت سے بھی زیادہ دفع مضرت کی طرف مائل ہوتا ہے، جب اس کو معلوم ہوگا کہ دوزخ کے عذاب سے بچنے کے لئے پختگی عقیدہ اور تعمیل فرائض کافی ہے تو وہ صرف ان ہی پر قناعت کرلے گا، اور نوافل و مستحبات کی ادائیگی میں سستی کرے گا جس کی وجہ سے مدارج عالیہ تک نہ پہنچ سکے گا، چنانچہ انسان کی اسی فطری کمزوری کی طرف حق تعالیٰ نے آیت کریمہ **الٰئن خفف الله عنكم و علم ان فيكم ضعفا** میں ارشاد کیا ہے، حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب نے اس آیت کے ذیل میں لکھا اول کہ مسلمان یقین میں کامل تھے، ان پر حکم ہوا تھا کہ اپنے سے دس گنے کافروں پر جہاد کریں، پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے، تب یہی حکم ہوا کہ اپنے سے دوگنوں پر جہاد کریں، یہی حکم اب بھی باقی ہے لیکن اگر دوگنوں سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے، آنحضرت ﷺ کے وقت میں ہزار مسلمان اسی ہزار سے لڑے ہیں۔

غزوہ موتہ میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ کفار کے مقابلہ میں ڈٹے رہے، اس طرح کے واقعات سے اسلام کی تاریخ الحمدللہ بھری پڑی ہے، دوسرے جتنا بوجھ زیادہ پڑتا ہے، آدمی اس کو پورا کرنے کی سعی کرتا ہے، اور جتنی ڈھیل ملتی ہے، آدمی میں تساہل، کسل و سستی آتی ہے، اسی طرح انسان آخرت کی فلاح کے لئے بھی ڈر اور خوف کے سبب زیادہ کوشش میں لگا رہتا ہے، پھر اگر کسی وجہ سے اس کو اپنی نجات کی طرف سے اطمینان ہوتا ہے، تو سست پڑ جاتا ہے، اسی سبب سے حضور ﷺ نے حضرت معاذ کو اعلان و تبشیر عام سے روک دیا تھا، آپ ﷺ جانتے تھے کہ صرف فرائض و واجبات پر اکتفا کرلینا اور فضائل اعمال سے سستی کرنا ان کے لئے بڑی کمی اور محرومی کا باعث ہوگا، اور وہ طبقات عالیہ تک رسائی حاصل نہ کرسکیں گے، حالانکہ حق تعالیٰ بلند ہمتی، عالی حوصلگی، اور تحصیل معالی امور کے لئے سعی کو نہایت پسند فرماتے ہیں چنانچہ حضرت حسان نے آنحضرت ﷺ کی مدح میں جو قصیدہ نظم کیا تھا، اس میں آپ کا یہ وصف خاص بھی ظاہر کیا تھا۔

له همم لا منتهى ل كبارها وهمة الصغرى اجل من الدهر

(آپ کے بلند حوصلوں، ہمتوں اور اولوالعزمیوں کا تو کہنا ہی کیا ہے، جو چھوٹا درجہ کی حوصلہ کی باتیں ہیں، وہ بھی سارے زمانوں سے بڑی ہیں)

غرض اس تمام تفصیل سے یہ بات ثابت ہے کہ حدیث الباب میں کوئی مفروض و واجب قطعی مقدار نہیں ہے، بلکہ فضائل و فواضل اعمال کی طرف سے تساہل و تقاعد مراد ہے، اور جو کچھ وعدہ عذاب جہنم سے نجات کا کیا گیا ہے، وہ تمام احکام شرعیہ، اوامر و نواہی کی بجا آوری کے لحاظ سے رعایت کے بعد کیا گیا ہے اور اتکال (بھروسہ کر بیٹھنے کا) درجہ اس کے بعد کا ہے اور بشارت سنانے میں چونکہ اجمال

اور ابہام کا طریقہ موزوں و مناسب ہوا کرتا ہے اس لیے بشارت دینے کے موقعہ پر حضور علیہ السلام نے بھی وجود شرائط اور رفع موانع وغیرہ تفاصیل ترک فرمادیا، واللہ اعلم

حضرت شاہ صاحب کی تحقیقات عالیہ کا تعلق چونکہ مسلم معاشرہ کی دینی تکمیل اور فضائل و مستحبات اسلام کی طرف ترغیب سے تھا جو فی زمانہ نہایت ہی اہم ضرورت ہے اس لیے احقر نے اس بحث کو پوری تفصیل سے ذکر کیا۔ واللہ الموافق لکل خیر۔

بَابُ الْحَيَاءِ فِي الْعِلْمِ وَقَالَ مُجَاهِدٌ لَا يَتَعَلَّمُ الْعِلْمَ مُسْتَحِي وَلَا مُسْتَكْبِرٌ وَقَالَتْ عَائِشَةُ نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْاَنْصَارِ لَمْ يَمْنَعُهُنَّ الْحَيَآءُ اَنْ يَّتَفَقَّهْنَ فِي الدِّيْنِ.

(حصول علم میں شرمانا! مجاہد کہتے ہیں کہ متکبر اور شرمانے والا آدمی علم حاصل نہیں کر سکتا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ انصاری عورتیں اچھی عورتیں ہیں کہ شرم انہیں دین میں سمجھ پیدا کرنے سے نہیں روکتی)

(۱۳۰) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ اَخْبَرَنَا اَبُوْ مُعَاوِيَةَ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ جَآءَتْ اُمُّ سُلَيْمٍ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ فَهَلْ عَلَى الْمَرْاَةِ مِنْ غُسْلٍ اِذَا احْتَلَمَتْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَاَتِ الْمَاءَ فَغَطَّتْ اُمُّ سَلَمَةَ تَعْنِيْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوَ تَحْتَلِمُ الْمَرْاَةُ قَالَ نَعَمْ تَرِبَتْ يَمِيْنُكِ فَبِمَ يُشْبِهُهَا وَلَدُهَا.

ترجمہ: حضرت زینب بنت ام سلمہ رضی اللہ عنہا حضرت ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں کہ ام سلیم رسول اللہ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ علیہ السلام! اللہ تعالیٰ حق بات بیان کرنے سے نہیں شرماتا (اس لیے میں پوچھتی ہوں) کہ کیا احتلام سے عورت پر بھی غسل ضروری ہے؟ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں اور جب عورت پانی دیکھ لے یعنی کپڑے وغیرہ پر منی کا اثر معلوم ہو تو یہ سن کر حضرت ام سلمہ نے پردہ کر لیا یعنی اپنا چہرہ چھپالیا (شرم کی وجہ سے) اور کہا یا رسول اللہ علیہ السلام کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے آپ نے فرمایا ہاں تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں پھر کیوں اس کا بچہ اس کی صورت کے مشابہ ہوتا ہے۔

تشریح: ضرورت کے وقت دینی مسائل دریافت کرنے میں کوئی شرم نہیں کرنی چاہیے اس لیے کہ بے جا شرم سے نہ آدمی کو خود کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ نہ دوسروں کو زندگی کی جتنے بھی پہلو ہیں وہ خلوت کے ہوں یا جلوت کے ان سب کے لیے خدا نے کچھ حدود اور ضابطے مقرر کیے ہیں اگر آدمی ان سے ناواقف رہ جائے۔ تو پھر وہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھائے گا۔ اور پریشان ہوگا۔ اسی لیے تمام ضابطوں اور قاعدوں سے واقفیت ضروری ہے۔ جن سے کسی نہ کسی وقت واسطہ پڑتا ہے انصار کی عورتیں ان مسائل کے دریافت کرنے میں کسی قسم کی روایتی شرم سے کام نہیں لیتی تھیں۔ جن کا تعلق صرف عورتوں سے ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر وہ رسول اللہ علیہ السلام سے ان مسائل کو وضاحت کے ساتھ دریافت نہ کرتیں۔ تو آج مسلمان عورتوں کو اپنی زندگی کے ان گوشوں کے لیے کوئی رہنمائی کہیں سے نہ ملتی۔ جو عام طور پر دوسروں سے پوشیدہ رہتی